

سلسلہ مواعظِ اشرفیہ نمبر ۸

اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

حقیقت مالِ حجابہ

از اضافات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی

مرتبہ ✓
غسٹی عتب الرحمن خاں

تالیف کردہ

مکتبہ اشرف المعارف، چمپائی

ملتان شہر ————— قون نمبر ۲۶۷

۱۰۰

۱۳۷ روپے
اگست ۱۹۴۲ء

تعداد

قیمت

اشاعت اول

ناشر

مکتبہ اشرف المعارف - چلیک - ملتان شہر

طابع

ولیمٹ پنجاب پرنٹنگ پریس - اردو بازار

لاہور

✓ ۲۹۷۶۲
۲۵۵
۱۱۲۲۴

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ
أَوْلَادُكُمْ فَبَيْنَهُمْ



تمہارے اموال اور اولاد میں
تمہاری آزمائش کے لئے ہیں

ترتيب

١٤	المال والحياه	١
٨٣	احكام المال	٢
١٩٩	احكام الحياه	٣
٢٤٥	خير المال للرجال	٤
٣٤٩	خير الاثاث للامثاث	٥
٤١٩	علاج الحرص	٦
٤٤٤	وعظ مير ط	٧
٥٢٤	وعظ الحيات	٨
٦٢٣	مطاهير الاموال	٩
٦٩٩	تاسيس البيان	١٠

تفصیل

صفحہ	مضمون	نمبر شمارہ	صفحہ	مضمون	نمبر شمارہ
۳۹	علماء اور مال و جاہ	۹		۱۔ المال والجاہ	
۴۱	جدید طبقہ کے افکار	۱۰	۲۰	فہم القرآن	۱
۴۲	علماء اور کافر گیری	۱۱	۲۲	حکماء و اُمت	۲
۴۵	اسلام اور ترقی	۱۲	۲۴	منافقین کی حالت	۳
۴۹	محبوب ترین چیزیں	۱۳	۲۹	صلی علی النبی کا اثر	۴
۵۲	حقیقتِ حُب	۱۴	۳۱	سماع قرآن کا اثر	۵
۵۴	حقیقتِ حیاة دنیا	۱۵	۳۴	حقیقی علم	۶
۵۸	مقام بزرگان	۱۶	۳۵	آیت کریمہ کا شان نزول	۷
۶۰	احبیت اور محبوبیت کا فرق	۱۷	۳۷	مقصود بیان	۸

۱۰۳	مال کے حقوق	۱۲	۶۳	محبت کی علامت	۱۸
۱۰۶	مکافاتِ عمل	۱۳	۶۶	احدیث کی علامت	۱۹
۱۰۷	سودی مال اور محق کی	۱۴	۷۲	رعونت کی علامت	۲۰
	حقیقت		۷۴	ضرورت کی چیزیں	۲۱
۱۰۸	رشوت کا اثر	۱۵	۷۷	تفسیری نکات	۲۲
۱۱۰	برکت کی حقیقت	۱۶		۱-۲ احکام المال	
۱۱۱	رشوت کی شرابی	۱۷	۸۵	معاملات میں معصیت	۱
۱۱۳	حضورؐ اور چندہ	۱۸	۸۶	ریوے کی حق تلفی	۲
۱۱۳	مقام ابو بکرؓ	۱۹	۸۸	مالخدا کاٹنے کی سزا	۳
۱۱۷	چندہ میں بے احتیاطی	۲۰	۸۹	استعداد نفس اور	۴
۱۱۶	پیروں کی حالت	۲۱		نور فراست	
۱۱۷	معاشرتِ رسولؐ	۲۲	۹۱	کبید نفس	۵
۱۱۹	قابلِ قدر عقل	۲۳	۹۳	دروع مصلحت آمیز	۶
۱۲۱	کورانہ تقلید	۲۴		کے معنی	
۱۲۲	ناسجانہ آمدنی	۲۵	۹۴	نفس کی نگرانی	۷
۱۲۶	رائے اور مسئلہ کی قیمت	۲۶	۹۷	اہل علم کی بے احتیاطی	۸
۱۲۹	مشائخ کی حالت	۲۷	۹۷	فقہ اور اہل علم	۹
۱۳۲	حلال و حرام کی تمیز	۲۸	۹۹	منصور اور علماء	۱۰
۱۳۲	دین میں غلو	۲۹	۱۰۱	علماء اور امراء	۱۱

۱۸۷	رسم پرستی	۴۸	۱۳۶	شریعت میں چیزوں	۳۰
۱۹۱	اعتدال کی ضرورت	۴۹		کی اقسام	
۱۹۳	انراجات کی حدود	۵۰	۱۳۹	مجتہد کا کام	۳۱
۱۹۶	نام اور کام کی اہمیت	۵۱	۱۴۳	شریعت میں وسعت	۳۲
	۳۔ احکام الحجاء		۱۴۶	اہل خصوصیت کا تقویٰ	۳۳
۲۰۱	تمہید	۱	۱۴۸	ہمارا تقویٰ	۳۴
۲۰۲	ایک اہم کوتاہی	۲	۱۵۱	نیوٹن کے مفاسد	۳۵
۲۰۳	شریعت کی آسانی	۳	۱۵۵	میراث کی خرابیاں	۳۶
۲۰۵	علماء سے وحشت	۴	۱۵۷	آمد و خرچ کے معاملات	۳۷
۲۰۷	شریعت پر تنگی کا الزام	۵	۱۵۹	مسلمانوں کی تباہی کا راز	۳۸
۲۱۰	خرگوش کی دانائی	۶	۱۶۲	زمین کی حقیقت	۳۹
۲۱۲	ہماری کم فہمی و بے عقلی	۷	۱۶۵	اسراف و تبذیر	۴۰
۲۱۴	آج کل کے محققین	۸	۱۷۰	ایک قابل عمل بات	۴۱
۲۱۶	تعلق باللہ	۹	۱۷۳	قرآن اور جمہوری نظام	۴۲
۲۱۹	تقرب الی اللہ	۱۰	۱۷۶	شیطان کا ٹکڑا	۴۳
۲۲۰	شرط طلب و رضا	۱۱	۱۷۸	اہل اللہ کی معاشرت	۴۴
۲۲۳	تعلق بالخلق	۱۲	۱۸۱	ہر چیز میں نفاخہ	۴۵
۲۲۵	اثر و جاہت	۱۳	۱۸۳	یورپ کی اندھی تقلید	۴۶
۲۲۸	ترقی کی حقیقت	۱۴	۱۸۶	انگریزی طرز اخلاق	۴۷

۲۸۱	استحقاق اور فضل	۲	۲۳۲	قرآن فہمی	۱۵
۲۸۲	شغل اور استغراق	۳	۲۳۴	جاہ کی حدود	۱۶
۲۸۵	غم اور فکر	۴	۲۳۶	حکومت اور شریعت	۱۷
۲۸۸	محبت اور عمل	۵	۲۴۰	بادشاہت اور جمہوریت	۱۸
۲۹۲	نادان کی دوستی	۶	۲۴۳	جاہل واعظ	۱۹
۲۹۴	احکام و آثار	۷	۲۴۴	کنہہ ناتراش پیر	۲۰
۲۹۶	غزوہ احمد	۸	۲۴۸	شیخ کامل کا معیار	۲۱
۲۹۹	داخلہ جنت کی خوش فہمی	۹	۲۵۲	جذب منصب کی صورت	۲۲
۳۰۱	دین و دنیا کا تعلق	۱۰	۲۵۵	حضور کی بدنی قوت	۲۳
۳۰۴	اہل اللہ کی حالت	۱۱	۲۵۷	حضور کا اصلی مذاق	۲۴
۳۰۹	رزق حلال کا اثر	۱۲	۲۵۸	جاہ طلبی	۲۵
۳۱۰	تعلق باللہ کا تعلق دنیا پر اثر	۱۳	۲۶۱	جاہ کا مصرف	۲۶
۳۱۲	دین اور فہم	۱۴	۲۶۵	حکام اور میاں جی کے لئے دستور العمل	۲۷
۳۱۵	چند غلط فہمیوں کا ازالہ	۱۵	۲۶۶	نسب اور فخر	۲۸
۳۱۸	مذہب کا اثر	۱۶	۲۶۹	باطنی تصرف	۲۹
۳۲۰	کورانہ تقلید	۱۷	۲۷۱	سفارش کا مسئلہ	۳۰
۳۲۲	بعثت انبیاء کا مقصد	۱۸		۴ خیر الممالک للرجال	
۳۲۶	کسب حلال اور حلال ثبات	۱۹	۲۷۸	علم اور عمل	۱

۳۸۰	خوارج اور معزولہ کا مذہب	۶	۳۲۸	علماء اور کسبِ دنیا	۲۰
۳۸۲	حُب اللہ و بغض اللہ	۷	۳۳۲	علماء اور امراء کے	۲۱
۳۸۸	حق تعالیٰ کے غنی ہونے کے معنی	۸	۳۳۳	احتیاط کا اثر	
۳۸۹	شیطان سے رعایت	۹	۳۳۶	علماء اور تنخواہ	۲۲
۳۹۱	احتیاط کی ضرورت	۱۰	۳۳۹	آزمائش علماء	۲۳
۳۹۳	مقام طالب و مطلوب	۱۱	۳۴۳	اہل اللہ کا استثناء	۲۴
۳۹۵	کفار کی غلط فہمی	۱۲	۳۴۶	جمعیتِ قلب	۲۵
۳۹۷	دولت اور کفار کی	۱۳	۳۵۰	طریق تزیینت	۲۶
	مصلحت		۳۵۲	طریق عمل	۲۷
۳۹۹	حُب مال کے اثرات	۱۴	۳۵۳	مختصر مشائخ کی حکمت	۲۸
۴۰۱	مال اور فخر	۱۵	۳۵۶	عادت اللہ	۲۹
۴۰۵	عورتوں کا مذاق	۱۶	۳۶۰	ذکر اللہ	۳۰
۴۰۷	عورت اور زیور	۱۷		عمل اور ایچہ	۳۱
۴۰۸	عورت اور حُرمتِ مینت	۱۸	۳۷۱	۵۔ خیر الاثبات للاناث	
۴۱۰	عزیب اور راحت	۱۹	۳۷۲	تہیہ	۱
۴۱۳	ایک آسان مراقبہ	۲۰	۳۷۴	دو قسم کے امراض	۲
۴۱۵	شادی میں بربادی	۲۱	۳۷۶	عورتوں کی حرص	۳
۴۱۶	اہل اللہ کی کوشش	۲۲	۳۷۷	عورتوں کی ناشکری	۴
				عورت اور حُبِ جاہ	۵

۲۵۸	شفاعتِ انبیاء اور پیر	۱۹	۲۲۱	۴- علاجِ الحرم	۱
۲۵۹	حرم کا طبع علاج	۲۰	۲۲۲	تمہید	۲
۲۶۲	تعلق باللہ	۲۱	۲۲۳	عورت اور حرم	۳
۲۶۶	توجہ الی اللہ	۲۲	۲۲۴	موت اور اختیار	۴
۲۶۷	اعمالِ ظاہرہ	۲۳	۲۲۹	نکاح بیوگان	۵
۲۶۹	مضید مستحبات	۲۴	۲۳۱	فناخت اور ضرورت	۶
۲۷۲	رج اور تجارت	۲۵	۲۳۲	تفویض کی اہمیت	۷
۲۷۹	عہد و عہد میرٹھ	۱	۲۳۴	موت کے مشتاق	۸
۲۸۱	طلب اور ذریعہ	۲	۲۳۶	راحت کی صورت	۹
۲۸۳	اسباب اور آفات	۳	۲۳۷	جاہ کی ہوس	۱۰
۲۸۵	اسباب اور اثر	۴	۲۳۹	آدم اور انسان	۱۱
۲۸۷	طلبِ جنت کا ذریعہ	۵	۲۴۱	آج کل کی ترقی	۱۲
۲۸۹	حاصل اور کمال	۶	۲۴۳	ترقی بخیر	۱۳
۲۹۳	حصولِ جنت کے طریقے	۷	۲۴۵	ہوس اور موت	۱۴
۲۹۵	موت اور بے خودی	۸	۲۴۸	گناہ اور طاعت کا کمال	۱۵
۲۹۸	بقیہ اور فتنی کا فرق	۹	۲۵۰	ماہِ رمضان اور شیطان	۱۶
۵۰۱	طلبِ جنت کا گمراہ	۱۰	۲۵۱	خود رانی کا علاج	۱۷
	افراطِ خوف اور کفر		۲۵۳	معاہدہ بیعت	۱۸
			۲۵۴	ضرورتِ رہبر و دست گیر	

۵۳۴	نئی ترائش و خواہش	۲۷	۵۰۲	خوشنہ محمود	۱۱
۵۳۷	خواہش نفسانی کا علاج	۲۸	۵۰۶	ضرورتِ خود و فکر	۱۲
۵۴۰	طاہرت کی لذت	۲۹	۵۰۷	قریب نفس اور اتباعِ نفس	۱۳
۵۴۱	طاہرت کی تدبیر	۳۰	۵۰۹	ابراہیم اور نعیم	۱۴
۵۴۷	فلاح کا طریقہ	۱	۵۱۳	احسانات اور کفرانِ نعمت	۱۵
۵۴۹	ذکر اللہ اور دنیا	۲	۵۱۶	معصیت کی دنیاوی	۱۶
۵۵۲	جنت کی اہمیت	۳		معجزات	
۵۵۴	دنیا کی دھن	۴	۵۱۸	طاہرت کا اثر	۱۷
۵۵۶	راحتِ قلب	۵	۵۱۹	ریا اور عبادت	۱۸
۵۵۹	اہل حال و اہل مقام	۶	۵۲۱	معصیت اور حضرت	۱۹
۵۶۲	تغویض اور راحت	۷	۵۲۴	ایمانداری کی مثال	۲۰
۵۶۷	نعمتِ دنیا و آخرت	۸	۵۲۶	ایثار کی نادر مثال	۲۱
۵۶۸	ترجیحِ دنیا کی مذمت	۹	۵۲۷	اتباعِ فتویٰ	۲۲
۵۷۰	علامتِ حبیب اللہ	۱۰	۵۲۹	محبتِ الہی اور مصالحتِ دنیوی	۲۳
۵۷۵	اعمال کی حقیقت	۱۱			
۵۷۸	عبدیت اور رسالت	۱۲	۵۳۰	اتباعِ حق کی ضرورت	۲۴
۵۷۹	عمل اور جنت	۱۳	۵۳۲	اتباع کی چیزیں	۲۵
۵۸۱	محبت اور الماعت	۱۴	۵۳۴	صحیح طریقِ تعلیم	۲۶

۴۱۵	کچھ عورتوں کے متعلق	۳۱	۵۸۲	کمالاتِ انبیاء	۱۵
۴۱۸	علاجِ شیخ کی اہمیت	۳۲	۵۸۶	شانِ اولیاء	۱۶
۴۱۹	ہار و مرت کی ضرورت	۳۳	۵۸۹	حضرت سلیمانؑ اور سلطنت	۱۷
۴۲۵	تمہید	۱	۵۹۰	ایمان اور تردد	۱۸
۴۲۷	مال اور مسلمان	۲	۵۹۲	قرآن اور ترجمہ	۱۹
۴۳۰	طلبِ منصب	۳	۵۹۳	دساوس اور اسباب	۲۰
۴۳۳	مدح میں قدح	۴	۵۹۵	فضیلتِ آخرت	۲۱
۴۳۴	کمالاتِ انبیاء	۵	۵۹۸	مومن اور دنیوی متاع	۲۲
۴۳۸	بزرگوں کی قسمیں	۶	۵۹۹	تارکِ دنیا اور	۲۳
۴۴۰	ترغیبِ اتفاق	۷		متروکِ دنیا	
۴۴۲	ایک عجیب سوال	۸	۶۰۰	حسبِ حق	۲۴
	وجواب		۶۰۳	طریقِ اصلاح	۲۵
۴۴۴	تذہب و تقدیر	۹	۶۰۴	بچوں کی تربیت	۲۶
۴۴۶	حقیقت کی کنجی	۱۰	۶۰۶	اہل اللہ کی اصلاح	۲۷
۴۴۸	مصیبت و راحت	۱۱	۶۰۹	علم اور اصلاح	۲۸
۴۵۲	زیارتِ مال کے اثرات	۱۲	۶۱۱	اہل اللہ کی قوتِ قلبیہ	۲۹
۴۵۵	علماء کی کوتاہی	۱۳		وجہانِ نبیہ	
۴۵۷	حفاظتِ دین کا انتظام	۱۴	۶۱۲	حیاتِ آخرت	۳۰

۷۰۳	اعمال باطنیہ	۲	۶۵۹	سادگی اور عزت	۱۵
۷۰۴	اعمال شریعت	۳	۶۶۲	سادگی کی چند مثالیں	۱۶
۷۰۶	سہولت احکام	۴	۶۶۵	طلب اور اتباع	۱۷
۷۰۹	سنگی اور پریشانی کی وجہ	۵	۶۶۷	بے جا گھبراہٹ	۱۸
۷۱۴	مساجد کی عدم	۶	۶۷۰	چندہ کی تحریک	۱۹
	خبرگیری		۶۷۱	آیت متلوہ کا شان	۲۰
۷۱۷	سفارش کی خوبیاں	۷		نزول	
۷۱۹	حضور کی تبلیغ اسلام	۸	۶۷۵	طہارت ظاہری و	۲۱
۷۲۱	نااہل کو عظیم یا مہتمم	۹		باطنی	
	بنانا		۶۸۰	اہل اللہ کی اصلاح	۲۲
۷۲۲	کام کی برکت	۱۰	۶۸۵	طہارت باطنیہ کے حصول	۲۳
۷۲۸	سادگی اور سجادہیت	۱۱		کا طریق	
۷۲۹	خودداری کا تقاضا	۱۲	۶۸۸	ترک معاصی کی ضرورت	۲۴
۷۳۲	علماء اور ترقی	۱۳	۶۹۲	نسبتِ راستہ کا اثر	۲۵
۷۳۳	شانِ علماء	۱۴	۶۹۴	مجاہدہ کی ضرورت	۲۶
۷۳۶	طاعت اور توفیق	۱۵	۶۹۵	مراقبہ موت کی ضرورت	۲۷
۷۳۸	زکوٰۃ، خیرات اور	۱۶	۶۹۷	خاتمۃ البیان	۲۸
	احسان			انتسابی البیان	
۷۳۹	بغداد علم کی صورت	۱۷	۷۰۱	تمہید	۱

۷۴۲	مکان اور تقوے	۲۶	۷۴۲	مسجد ضرار کی وجہ تسمیہ	۱۸
۷۴۵	مکان اور ضرورت	۲۷	۷۴۶	قرآنی طرز نصیحت	۱۹
۷۴۷	عشق اور وظیفہ	۲۸	۷۵۰	تعمیری بنیاد	۲۰
۷۷۱	تواضع اور زعم کا	۲۹	۷۵۱	مکان کی اہمیت	۲۱
	فقدان		۷۵۳	قوم عاد کی تقلید	۲۲
۷۷۶	عبادت اور نخوت	۳۰	۷۵۵	اہل فساد کے	۲۳
۷۷۶	تعمیر میں خلوص کا اثر	۳۱		فلسفی	
۷۷۸	قلب اور موت	۳۲	۷۵۷	مدد اور کھالیں	۲۴
	..	۳۳	۷۵۹	تعمیر مساجد اور احتیاط	۲۵

المال والجاه

مال و جاہ کی نسبت یہ وعظ ۱۱ صفر المنظر ۱۳۳۱ھ کو باغیچہ مکان
 عبدالباقی خاں صاحب الہ آباد میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ جو
 تین گھنٹہ میں ختم ہوا۔ مولانا سعید احمد صاحب نقاوی
 نے قلمبند فرمایا

خطبة ما لوره

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله محمدًا ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل
 عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا
 من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له
 وشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له وشهد
 ان محمدًا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى آله
 واصحابه وبارك وسلم اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان
 الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم هُمُ الَّذِينَ
 يَقُولُونَ لَا نَفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ
 يَنْفَضُوا وَ لِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ لَكِنَّ
 الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ يَقُولُونَ لِنَبِيِّنَا رَجَعْنَا إِلَى
 الْمَدِينَةِ لِيُخْرِجَنَا الْأَعْرَابُ مِنْهَا الْأَذَىٰ وَاللَّهُ الْعَزِيزُ
 الرَّسُولُ لَهُ وَالْمُؤْمِنِينَ وَ لَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ

ترجمہ

یعنی یہ منافقین وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ
رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو
لوگ جمع ہیں ان پر کچھ خرچ صرفت کر دیا
تاک کہ یہ آپ غمگین ہو جائیں گے۔ خدا تعالیٰ
ہی کہے ہیں سب خزانے آسمانوں کے
اور زمینوں کے لیکن منافقین سمجھتے نہیں
ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ میں لوٹ
کر جائیں گے تو عزت والا وہاں سے دولت
والے کو باہر نکال دے گا۔ اللہ ہی کی
ہے عزت اور اس کے رسول صلی اللہ
علیہ وسلم کی اور مسلمانوں کی لیکن منافقین
جانتے نہیں! —————

فہم قرآن | حضرات! یہ آیتیں ہیں سورہ منافقون کی۔ اس میں حق سبحانہ
 تعالیٰ نے بعض اقوال منافقین کے بیان فرمائے ہیں اور یہ
 فرقہ منافقین کا یعنی ان کا حکم اس وقت باقی نہیں رہا اور اس وقت تو کیا خود
 حضورؐ کے زمانہ کے بعد ہی یہ نفاق جو اصطلاح شرعی میں ہے رفع ہو گیا
 تھا۔ مگر نفاق بمعنی عدم اتفاق یا بمعنی مطلق ظاہر کا خلاف باطن ہونا موجود ہے
 مگر اس محاورہ کو چھوڑ دینا چاہئے۔ کیونکہ اس وقت قرآن مجید کے ترجمے چھپ
 گئے ہیں۔ اور لوگ دیکھتے ہیں اور اس میں کامیابی ہونا مشکل ہے کہ لوگ ترجمہ
 دیکھنا چھوڑ دیں۔ اور اس وقت بھی اس مضمون سے کہ ترجمہ نہ دیکھیں، شاید
 وحشت ہوتی ہو۔

مگر بات یہ ہے کہ ان امور میں تجربہ کو زیادہ دخل ہے اور تجربہ ان امور
 کا اہل علم کو زیادہ ہے۔ تو میں چونکہ ان واقعات کو مشتبہ و روز دیکھتا ہوں

اس لئے عین بارہا کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ ترجمہ اگر دیکھنے کو جی چاہے تو اس کی صورت صرف یہ ہونا چاہئے کہ کسی عالم سے اس کو حاصل کیا جائے۔ چنانچہ ہرن کے ساتھ ایسا ہی عمل کیا جاتا ہے۔ تو علم تفسیری بغیر کسی عالم سے حاصل کئے نہیں آسکتا۔ تو عرض یہ ہے کہ اگر اول ترجمہ کسی عالم سے پڑھ لے اور پھر دوسری تفاسیر دیکھے تو غلطیوں سے بچ سکتا ہے اور اگر اول ہی سے ترجمہ دیکھے گا اور کسی عالم سے نہ پڑھے گا۔ تو اس کو مواقع مشتبہ کی تعبیر ہی میں سخت وقت ہوگی۔ کیونکہ مبادی و شروع کی باتیں جن یہ آگے علوم کا جاننا موقوف ہو، اور اصول و قواعد کا اس کو علم نہیں اور اگر ہوگا، تو بے موقع ہوگا۔

اسی لئے اگر ترجمہ پڑھے بھی تو کسی متبحر عالم سے پڑھے۔ صرف عربی جاننے والے سے پڑھنا بھی کافی نہیں اور متبحر عالم سے بھی سبقاً سبقاً پڑھے۔ پھر ان ہی سے پوچھے کہ میرا فہم قرآن شریف کے مضامین کا متحمل ہے یا نہیں اگر وہ متحمل تباویں تو خیر ورنہ چند روز کے لئے چھوڑ دیا جاوے اور پھر علماء سے مبادی اور اصول کو حاصل کرے اور پھر اس کے بعد ترجمہ پڑھے۔ تو قرآن مجید کا ترجمہ دیکھنے کے متعلق یہ تفصیل ہے۔ تو اگر دیکھا جاوے، تو اس طرح دیکھیں۔

لیکن ممکن ہے کہ اس پر کوئی عمل نہ کرے اور ایسا شخص اس میں منافق وغیرہ کا لفظ دیکھے جن میں لوگوں کی اصطلاحات بدل گئی ہیں تو اصطلاح بدلنے میں یہ خرابی ہوگی کہ جب آپ قرآن مجید میں دیکھیں گے کہ منافقین جہنم کے بیچے

کے و وجہ ہیں اور منافقین کے معنی آپ سمجھیں گے نا اتفاق کرنے والے
تو آپ ان گنہگاروں کے لئے یہ حکم دیں گے جو کہ محض غلط ہے۔

اس پر مجھے ایک قصہ یاد آیا کہ دیوبند میں ایک معقولی طالب علم آئے
میں حجرہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ پوچھنے لگے کیا لکھتے ہو۔ میں نے کہا کہ
تصویر شیخ کا عسلہ لکھ رہا ہوں۔ تو تصویر شیخ کا لفظ سن کر کہا کہتے ہیں کہ شیخ بوعلی سینا
کا۔ انہوں نے عمر بھر سوائے بوعلی سینا کے اور کسی شیخ کا نام ہی نہیں سنا تھا
تو جہاں کہیں شیخ کا ذکر آئے گا وہ تو یہی سمجھیں گے کہ بوعلی سینا مراد ہیں۔ تو
جو اصطلاح ذہن میں گچی ہوئی ہوتی ہے۔ ان الفاظ کو ہر جگہ اسی پر محمول کیا جاتا

ہے۔

۱۱۳۶

حکماء و امت

اسی طرح ایسا نہ سمجھنے والا شخص کرے گا۔ اور آج کل

بڑی گلیظ کی وجہ سے خود توجہ دیکھتے ہیں۔ اور

شرعی اصطلاحات اور اصول سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لئے لڑتے ہیں
اور اول خود لڑتے ہیں پھر علماء کو بھی شریک کر لیتے ہیں کہ ان سے اپنے مقابل
کے لئے فتویٰ لیتے ہیں۔ اگر علماء ان سے منبہ ہو کر ان کی اصلاح
کرتے ہیں تو یہ لوگ ان کو سمجھتے ہیں کہ ان کے خلاف ہیں۔ حالانکہ خوش اخلاقی
کی بدولت ہی یہ فتنے پیدا ہوتے ہیں۔

مثلاً کسی نے استفتاء کیا کہ ایک شخص نے ایسا کہا تو اس کا ایمان کیا یا
رہا۔ جیسا کہ اس شخص کا خط آیا ہے کہ زید نے فقہ کی فلائی کتاب کو بڑا کہا
تو زید کا ایمان رہا یا گیا۔ تو اگر میں اس خوش اخلاقی کو کام میں لاؤں جن کو وہ

خوش اخلاقی سمجھتے ہیں کہ بدون اس کے کہ اُن کے سوال میں جرح قدح کروں کہ اُن کی مرضی کے موافق لکھ دوں جیسا ظاہری عنوان سوال کا مقتضا ہے۔ تو وہ دوسرے کو دکھلاوے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دیکھنے والے کہیں گے کہ اس کو فلاں شخص نے کافر کہہ دیا۔ بس یہ کافر ہے۔ پھر اُس فائل کو خبر ہوگی۔ تو بات بڑھے گی تو خوش اخلاقی سے یہ فتنے برپا ہوئے اور عام طور پر یہی فتنے مولویوں میں پھیل رہے ہیں۔

ہمارے مولانا فرمایا کرتے تھے کہ مولوی لوگ بھی بادشاہوں سے کم نہیں جیسے اُن کے یہاں پلیٹن اور رسالے ہوتے ہیں، اسی طرح ان کے یہاں کتابیں اور رسالے ہیں۔

غرض عوام الناس ترجے اور کتابیں دیکھ دیکھ کر مولویوں تک میں یہ فتنے پھیلا دیتے ہیں۔ اس لئے محققین ان کو ایسے مطالعہ سے روکتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ بعضی بات ظاہر میں تو معمولی سی ہوتی ہے مگر فساد کی جڑ ہوتی ہے۔ حکماء اُمرت کو حق تعالیٰ نے ادراک ایسا عنایت فرمایا ہے کہ وہ ذرا سی بات کو سمجھ لیتے ہیں کہ نتیجہ اس کا یہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ جو اوروں کو اُبلنے میں نظر آتا ہے اہل نظر کو اینٹ میں نظر آتا ہے۔ سو ایسے مصلحین کو آج کل منہ مصدب کہا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات یہ لوگ ایسی چیز کو جو بظاہر عبادت ہے رک دیتے ہیں تو ان کو خشک بتلایا جاتا ہے اور چاہا جاتا ہے کہ ایسے تر ہو جاویں کہ ڈوب ہی جاویں۔

خیال تو فرمائیے خود حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم نے بعض ایسے امور کو

روک دیا ہے جو کہ حضورؐ کے زمانے میں ہوتے تھے مثلاً عورتوں کا مسجد میں آنا کہ نصاً ثابت ہے اور صحابہ اُس کو روکتے ہیں۔ تو بظاہر یہ نص سے معارضہ ہے مگر حکماء اُمت نے اچھی طرح اس کا راز سمجھ کر اتفاق کر لیا۔ کسی نے سختی کے ساتھ اور کسی نے ذرا نرمی کے ساتھ۔

چنانچہ ہمارے امام صاحبؒ نے اس باب میں نہایت سختی فرمائی ہے کہ عجز و دُبطھیا، کو بھی مسجد میں آنے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ فرماتے ہیں۔
 لکن ساقطۃ لا قسطۃ
 ہر گئی پڑھی چیز کا اٹھانے والا
 موجود ہے یعنی ہر عورت کی طرف سے کوئی نہ کوئی میلان کرنے والا
 موجود ہے۔

اور دوسرے علماء نے بھی اگرچہ کسی قدر نرمی کی ہو مگر اولیٰ اسی کو سمجھا ہے لیکن کسی نے اس انکار کو رو نہیں کیا۔

غرض علماء بوجہ اپنے تجربہ اور انجام بینی کے بعض ایسے امور کو روک دیتے ہیں جو بظاہر عبادت ہے لیکن چونکہ وہ معضی الی المعاصی دگنا ہوں گی طرف پہنچا بیوں ہوتے ہیں اس لئے علماء و روک دیتے ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس باب میں ہر شخص کی رائے قابل اعتبار نہیں ہوا کرتی۔

مثلاً اگر پارلیمنٹ کے ممبر ایک رائے تجویز کریں اور ایک ویہاٹی یہ کہے کہ میری رائے اس کے خلاف ہے تو دیکھئے کیا گت بنتی ہے۔ اور معتز وہی ہو گا جو ممبروں کی رائے ہے۔

اسی طرح دنیاوی معاملات میں وکیل کے سامنے کوئی نہیں بولتا اور اسی

رائے کا اعتبار کرتا ہے جو وکیل کی رائے ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر اپنی سمجھ میں وکیل کی رائے نہ بھی آوے جب بھی انہی کی رائے پر اعتبار کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم چونکہ قانون سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اس وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

مگر عجیب بات ہے کہ دین میں ہر شخص اپنے کو ماہر سمجھتا ہے اور اپنی رائے کو دخل دیتا ہے۔ اور دین میں یہ خیال نہیں ہوتا کہ چونکہ ہم اُس کے اصول اور مبادی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اس لئے ہماری رائے قابل اعتبار نہیں ہے اور علماء کی رائے میں دخل دینا مناسب نہیں۔ غرض ہر شخص کی رائے قابل اعتبار نہیں ہوتی جیسا اب نیا ترجمہ دیکھ کر اپنے کو اہل الرائے سمجھنے لگتے ہیں۔

ایک صاحب نے ترجمہ یا دکیا تھا اور ایک عالم کے پوچھنے پر لڑنا تھا کہ معنی بہت جوش مارنے والے بتلائے۔ خیر یہاں تک تو خبریت تھی۔ آگے اُن عالم نے پوچھا، بہت کا ہے کہ معنی اور جوش مارنے والے کا ہے کہ معنی۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ لڑنا کے معنی بہت اور خٹان کے معنی جوش مارنے والے۔

تو کیا ایسوں کی بھی رائے معتبر ہوگی۔ البتہ جو لوگ مبادی اور اصول کے ماہر اور علوم عربیہ سے اچھی طرح واقف اور متبحر عالم ہوں اُن کی رائے معتبر ہوگی۔ اور دوسروں کو ایسے لوگوں کی تقلید ضروری ہوگی نہ کہ اُن کے فتووں پر قیل وقال اور جواب و سوال۔ اور مصلحین کو بھی سچا ہٹے کہ ایسوں کے سوالات کے جوابات مضابطہ سے دیا کریں۔ عرفی خوش خلقی کو کام میں نہ لایا کریں۔

Handwritten text in the upper section of the page, consisting of several lines of script.

Handwritten text in the middle section of the page, appearing as a distinct block.

Handwritten text in the lower-middle section of the page, continuing the script.

Handwritten text in the bottom section of the page, including the final lines of the document.

عرض علماء اور حکماء اُمدت کو چونکہ حق تعالیٰ نے نتائج تک پہنچنے کا اور ک
عطا فرمایا ہے۔ اُن کی نظر نتیجہ پر ہوتی ہے اور اس لئے وہ بعضی ایسی چیزوں
کو بھی روک دیتے ہیں جو بظاہر مستحسن ہوں اور اسی طرح سے ترجمہ قرآن مجید میں
بھی گو بظاہر کوئی خرابی نہیں لیکن نتیجہ اُس کا یہ ہے کہ بغیر مبادی اور اصول کی
واقفیت کے جب تک اُستاد سے نہ پڑھا جائے گا اُس وقت تک یہ
اندر لیشہ ہے کہ شاید غلطی ہو جائے جیسے معنی نفاق میں عرض کیا گیا۔

اب میں پھر اپنے اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں تو

منافقین کی حالت

کافر ہو اور خاص موقعوں پر اُس کفر کو ظاہر بھی کر دے اور ظاہر میں مسلمان ہو تو
اُس وقت ایسے لوگ بھی تھے۔ اور گو حضور کو علم ہو گیا تھا اُن کے منافق ہونے
کا مگر حکم یہ تھا کہ جو اپنے کو مومن کہے اُس کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ کیجئے
کہ اس میں مصلحت تھی۔ اور اس وقت چونکہ کوئی مصلحت نہیں۔ لہذا اگر دلیل
سے کفر ثابت ہو جاوے گا، اُس کے ساتھ کفار کا معاملہ کریں گے۔

خیر یہ تو لفظ نفاق کے متعلق کسی قدر بیان ہو گیا۔ اصل مقصود یہ ہے کہ اس
مقام پر حق تعالیٰ نے منافقین کے متعلقہ کو بیان فرما کر اُن کا رد کیا ہے۔ اول
میں ترجمہ عرض کرتا ہوں :-

وہ منافقین وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اُن لوگوں پر خروجِ مدت کرو

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں تاکہ وہ منتشر ہو جاویں

اور اللہ ہی کے لئے ہی ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے

ولیکن منافقین نہیں سمجھتے (اور) یوں کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ میں لوٹ
 کی گئے تو ہم میں جو عزت والا ہے (یعنی ہم) وہ وقت والے کو
 (یعنی صحابہ کو) نکال دے گا۔ اور اللہ ہی کے لئے سے عزت اور
 اُس کے رسول کے لئے اور اہل ایمان کے لئے ولیکن منافقین
 نہیں جانتے۔

قصہ یوں ہوا تھا کہ ایک غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین
 اور انصار وغیرہ سب تھے۔ اور غزوہ (جہاد) اور لڑائیوں میں منافقین بھی اکثر
 ساتھ جایا کرتے تھے اور ان کی غرض کبھی تو یہ ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے اہل راز و خفیہ
 معلوم کیے کے کفار کو اطلاع دیں جیسے جاسوس کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ
 وفیکم سمعون لہم۔ یعنی تم میں ان کے کچھ جاسوس
 موجود ہیں۔

قرآن مجید میں موجود ہے۔ اور کبھی غنیمت میں حصہ لینے کو جانتے تھے کیونکہ
 ظاہری اسلام کے سبب مال غنیمت میں ان کو بھی حصہ ملتا تھا۔ اور حکمت اس
 کی یہ کہ لڑائی لڑنے والے اپنی ملک کی قوت پر لڑا کرتے ہیں۔ تو چونکہ یہ لوگ
 ظاہر میں بطور ملک کے جانتے تھے ان کو بھی مال غنیمت میں حصہ ملتا تھا اور ان
 سے معاملہ مسلمانوں کا سا کیا جاتا تھا اور وہ جانتے بھی تھے کہ مسلمان ہم سے
 یہ برتاؤ کریں گے۔ اور بعض مرتبہ دونوں طرف سے لیتے تھے کہ کفار سے جا کر
 کہتے تھے کہ ہم نے تمہارے بھلے کی یہ رائے دی تھی۔ تو غرض یہ ہے کہ
 منافقین بھی جایا کرتے تھے۔ تو اس غزوہ میں بھی یہ لوگ شریک تھے اور

جہاں مختلف طبائع کے لوگ ہوتے ہیں وہاں اختلاف ہو ہی جاتا ہے۔ بلکہ اچھوں میں بھی ہو جاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اچھوں کو اس پر اصرار نہیں ہوتا۔

تو اتفاق سے دو شخصوں میں کچھ گفتگو پڑھ گئی۔

ایک مہاجر تھے اور ایک انصاری۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی۔ حضور نے فرمایا کہ یہ ایک گندی بات ہے۔ تو وہ جوش اُن لوگوں کا فوراً کم ہو گیا۔

اور تعجب نہ ہو کہ اتنی سی بات میں کیوں کر جوش کم ہو گیا۔ تو اس کا نمونہ اب بھی موجود ہے کہ عرب عرب سے زیادہ سخت مشہور ہیں۔ بالخصوص بدوی کہ اُن میں محسوسات کا بھی علم نہیں۔

چنانچہ ایک شخص کہتے تھے کہ کسی قافلہ کی لوٹ میں بدوؤں کو ایک گھڑی ملی۔ اُس کی آواز سن کر مکیٹی ہوئی کہ اس میں کیا ہے۔ انہیں تشخص یہ ملتی کہ اس میں جن ہے۔ پھر اس کو توڑا تو وہ بند ہو گئی۔ تو کہتے ہیں کہ

غصتنا الجبنی۔ یعنی ہم نے جن کو مار ڈالا۔

تو ایسی قوم بہت ہی خطرناک ہوگی۔ اور اُن کو دین کی بھی اطلاع نہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ کنواں موجود ہے اور تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ بعض نماز ہی نہیں پڑھتے۔ غرض اُن میں نہایت ہی جہل ہے۔ غصہ میں فوراً تلوار نکل آتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے یہ حالت ہے کہ کیسے ہی جوش میں ہوں اور ایک ادنیٰ سا آدمی بیچ میں جا کر کہہ دے کہ

یعنی ایسے شیخ! رسول اللہ صلی

یا شیخ صلی علی النبی

ایک مرتبہ میرے پاس ایک عہدہ دار کا خط آیا کہ کافر سے سو لینا کیوں حرام ہے میں نے لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے اور خلاصہ اُن کے اس سوال کا عدت کا سمجھنا تھا۔ تو سمجھ لیجئے کہ عدت کا سمجھنا خواص کا کام ہے۔ تو اُن عہدہ دار صاحب نے عدت پوچھی تھی۔ تو اگر میں خوش خلقی کو کام میں لاتا اور کچھ لکھ دیتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ

مغز یا خورد و خلق خود بدید

ہمارا مغز کھایا اور لینا خلق پھاڑا۔ یعنی ہمارا دماغ بھی خالی کیا اور خود کو ٹی فائدہ نہ اٹھایا۔

تو میں نے یہ لکھ دیا کہ زنا کیوں حرام ہے۔ وہ بہت خفا ہوئے اور مجھ کو لکھا کہ علماء کو ایسا خشک اخلاق نہ ہونا چاہئے۔ میں نے اُس کو ردی میں ڈال دیا اس کے بعد اتفاق سے وہ مجھے ایک سفر میں ملے اور زبانی گفتگو سے سمجھ گئے اور پھر کبھی کوئی بات فضول نہیں پوچھی۔

اس پر میں عرض کرتا ہوں کہ اگر اول ہی سے جواب میں ضابطہ کا برتاؤ کیا جائے تو سائلین کی جرأت کی یہاں تک نوبت کیوں آئے۔

اسی طرح ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ افریقہ دارا الحرب ہے یا دارالاسلام اب اگر میں ان کے ساتھ خوش خلقی کرتا تو چار گھنٹہ تک مغز مارتا۔ اس لئے میں نے اُن سے کہا کہ اول یہ بتلا دو کہ اگر دارالاسلام ہونا معلوم ہو جائے، تو کیا کرو گے اور اسی طرح دارا الحرب ہونا بھی پس چُپ ہو گئے۔ تو ایسی باتوں کو اس طرح روکنا چاہئے۔

عرض علماء اور حکماء اُمرت کو چونکہ حق تعالیٰ نے نتائج تک پہنچنے کا اور ک
عطا فرمایا ہے۔ اُن کی نظر نتیجہ پر ہوتی ہے اور اس لئے وہ بعضی ایسی چیزوں
کو بھی روک دیتے ہیں جو بظاہر مستحسن ہوں اور اسی طرح سے ترجمہ قرآن مجید میں
بھی گو بظاہر کوئی خرابی نہیں لیکن نتیجہ اُس کا یہ ہے کہ بغیر مبادی اور اصول کی
واقفیت کے جب تک اُستاد سے نہ پڑھا جائے گا اُس وقت تک یہ
اندر لیشہ ہے کہ شاید غلطی ہو جائے جیسے معنی نفاق میں عرض کیا گیا۔

اب میں پھر اپنے اصل مطلب کی طرف رجوع
منافقتین کی حالت کرتا ہوں کہ نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں تو

کافر ہو اور خاص موقعوں پر اُس کفر کو ظاہر بھی کر دے اور ظاہر میں مسلمان ہو تو
اُس وقت ایسے لوگ بھی تھے۔ اور گو حضور کو علم ہو گیا تھا اُن کے منافق ہونے
کا مگر حکم یہ تھا کہ جو اپنے کو مومن کہے اُس کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ کیجئے
کہ اس میں مصلحت تھی۔ اور اس وقت چونکہ کوئی مصلحت نہیں۔ لہذا اگر دلیل
سے کفر ثابت ہو جاوے گا، اُس کے ساتھ کفار کا معاملہ کریں گے۔

خیر یہ تو لفظ نفاق کے متعلق کسی قدر بیان ہو گیا۔ اصل مقصود یہ ہے کہ اس
مقام پر حق تعالیٰ نے منافقتین کے مقولہ کو بیان فرمایا اُن کا رو کیا ہے۔ اول
میں ترجمہ عرض کرتا ہوں :-

وہ منافقتین وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اُن لوگوں پر خروجِ مدت کرو
جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں تاکہ وہ منتشر ہو جاویں
اور اللہ ہی کے لئے ہی ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے

اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجیے۔

فورا تلوار کو نیام میں کر لیتے ہیں اور اللہم صل علی سیدنا محمد
پر طعنے لگتے ہیں۔

تو اب بھی ایک داعی (دین کی طرف بلائے والے) کے سبب جوش فرو
ہو جانے کا ایک نمونہ موجود ہے اور یہ نمونہ میں نے اس لئے بیان کیا کہ آج کل
ہر واقعہ کو نظیر ہی سے مانا جاتا ہے۔

چنانچہ رام پور میں معراج کے متعلق ایک صاحب نے یہی سوال کیا کہ اس
کی کوئی نظیر بھی ہے۔ حالانکہ اگر نظیر بھی نہ ہو لیکن نقل صحیح ہو اور عقل کے خلاف
نہ ہو تو بس مان لو مگر پھر بھی انکار ہوتا ہے۔ جیسا کہ محدثین کے حافظہ کا انکار
ہے کہ دو ورق کی حدیث کیسے یاد ہوئی۔ کہتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور ایک
مقدمہ کا ضمنی دعویٰ ہے کہ جو سمجھ میں نہ آوے وہ غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر
سمجھ سے کسی خاص آدمی کی سمجھ مراد لی جائے تو کبریٰ اس تباہ کا غلط ہے کیونکہ
کسی خاص کی سمجھ میں نہ آنے سے کوئی بات غلط نہیں ہو جاوے گی اور جو عام
مراد ہو تو صغریٰ غلط ہے۔ کیونکہ یہ تو ٹھیک ہے کہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن
تمہاری سمجھ میں نہ آنے سے یہ کہاں لازم آیا کہ کسی کی سمجھ میں نہ آوے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بخیل شہد سے روٹی کھا رہا تھا
اُس کے ایک دوست آگئے۔ تو بخیل نے یہ خیال کیا کہ یہ بھی کھانے میں شریک
ہو جائے گا۔ کوئی ایسی صورت کرنی چاہئے کہ یہ نہ کھاوے۔ تو روٹی چھپا دی
اور شہد اس خیال سے پیش کر دیا کہ خالی شہد کیا کھاوے گا۔ مگر وہ لگا چاٹنے تو

بخیل کہتا ہے کہ

یا اخی انہ یحرق القلب یعنی بھائی! یہ قلب کو جلا دیتا،

بخیل کے دوست نے یہ سنا اور نہیں کہہ سکا کہ

نعم ولكن قلبك ہاں یہ سچ ہے مگر آپ کے دل کو

تو جیسے بخیل کا یہ کہنا تو سچ ہے لیکن کس کا قلب۔ اسی طرح یہ تو ٹھیک ہے

کہ سمجھ میں نہیں آتا لیکن کس کی سمجھ میں۔ ہماری تو سمجھ میں آتا ہے گو نمونہ بھی نہ

دیکھا جاتا۔ مگر حق تعالیٰ نے اس زمانہ میں ایک نمونہ اس کا بھی ظاہر فرما دیا۔

میں نے متعدد معتبر آدمیوں سے حافظ رحمت اللہ صاحب الہ آبادی

کے حافظہ کے واقعات سنے ہیں۔ قاضی وصی الدین صاحب کانپور میں قرقین

تھے اور نہایت ثقہ (معتد) اور معتبر آدمی تھے۔ گو جنید بغدادی نہ ہوں لیکن تاہم

ایک ثقہ اور معزز آدمی تھے اور جو لوگ معزز ہوتے ہیں وہ عادتاً جھوٹ نہیں

بولتے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک مرتبہ حافظ صاحب کانپور میں آئے۔ میں نے

درخواست کی کہ آپ کا حافظہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ فرمایا کوئی کتاب لاکر میرے

سامنے طویل عبارت پڑھ دو۔ وہ کہتے ہیں کہ میں کتب خانہ میں سے افتق المبین

نکال لایا۔ جو بہت باریک لکھی ہوئی تھی اور بڑی تقطیع پر تھی۔ اور اس کے دو

صفحے ان کے سامنے پڑھے۔ انہوں نے بعینہ تمام عبارت سنا دی۔

اور بھی بعض علماء کی اس قسم کی حکایت سنی گئی ہے۔ تو حق تعالیٰ کو سب

قدرت ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ گو تمہاری سمجھ میں نہ آوے

اسی طرح حق تعالیٰ نے صحابہ کے اخلاق کا نمونہ کھنڈا سا اب بھی باقی رکھا ہے

کہ ایسے جاہل عرب بدوی جن میں علم بھی نہیں اور ایسے سخت اور جوشیلے کہ ذرا سی بات میں معمولی غصہ میں تلوار نکال لیتا اور آپس میں کشت و خون کر ڈالتا ان کے نزدیک ایک معمولی سی بات سے مگر باوجود اس کے چاہے کیسے ہی غصہ میں بھرے ہوں جن وقت صل علی ابی دہبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوات بھیجی گئی فوراً غصہ کم ہو جاتا ہے۔ اور اللہم صل علی سیدنا۔ الخ پڑھنے لگتے ہیں۔ تو اب تعجب نہ ہوگا کہ دو صحابی جو آپس میں بگڑ رہے تھے حضور کے منع کرنے سے ان کا غصہ فوراً کم ہو گیا۔

ہاں تو قصہ یوں ہے کہ وہاں ایک رئیس تھا عبد اللہ
سماح قرآن کا اثر ابن ابی منافق اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت

حسد تھا اور وہ جو حسد کی یہ تھی کہ حضور کی تشریف آوری سے قبل لوگوں کا قصد تھا کہ اس کو سردار بنا دیں مگر جب حضور تشریف لائے تو گو آپ کو سرداری کی تمنا نہ تھی مگر منجانب اللہ آپ ہی کو سرداری ملی یہ سچ ہے۔

اگر شہرت ہوس داری امیر دام عزت ثنوی
 کہ در پرواز دار و گوشہ گیری نام عنقا
 یعنی اگر شہرت کی خواہش ہے تو گوشہ نشینی اختیار کرو۔ اس لئے کہ
 گوشہ گیری ہی سے عنقا کی شہرت ہے۔

اور عادت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ من تو اضع اللہ فعم اللہ یعنی جو شخص اللہ کے لئے تو اضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے مراتب بلند فرما دیتے ہیں، حتیٰ کہ مکہ میں ایک مرتبہ کفار نے باہم مشورہ کر کے ایک شخص کو پیام دے

کر بھیجا اور یہ درخواست کی تھی کہ آپ ہمارے بتوں کو بُرا نہ کہئے۔ تو آپ جو کچھ کہتے اُس کے لئے ہم موجود ہیں۔ اگر آپ کو عورتوں کی تمنا ہو تو جن عورتوں کو آپ پسند فرمائیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں اور اگر آپ کو مال کی خواہش ہو تو جس قدر چاہیں ہم سے مال لے لیں۔ اور اگر آپ سرداری چاہیں تو ہم آپ کو سردار بنانے کے لئے موجود ہیں۔ اور اس رائے میں تمام بڑے بڑے کفار ابو جہل وغیرہ بھی شریک تھے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کی اس درخواست کو نہایت تحمل سے سنتے رہے گو حضور کو سخت ناگوار ہوا۔ اس سے حضور کی کمال خوش اخلاقی بھی ثابت ہوتی ہے۔ آج ذرا سی بات خلاف مزاج ہو تو تحمل نہیں ہو سکتا جب کفار کہہ چکے تو حضور نے بسم اللہ پڑھ کر یہ آیتیں شروع کیں۔

حم تنزيل من الرحمن الرحيم کتاب فصلت آیاتہ

قرانا عربيا لقوم يعلمون — الخ

حم، یہ کلام رحمن رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی زبان میں ہے۔ ایسے لوگوں کے واسطے مفید ہے جو دانشمندانہ ہیں۔

جب اس آیت پر حضور پہنچے۔

فان اعرضوا نقل انذار تکم ضعفة مثل ضعفة عاد وثمود
یعنی پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایسی

آفت سے بچانا ہوں جیسی عاوا اور ثود پر آفت آئی تھی۔

تو وہ شخص گھبرا گیا اور کہا پس کیجئے۔ اور وہاں سے بھاگا۔ اور اس کھٹی میں پھنسا
 تو ابو جہل اتنا عاقل تھا کہ اس شخص کو دور سے دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ گیا تھا اور چہرہ سے
 اور آڑھ ہے اور چہرہ سے۔ اس کا تو خیال بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس
 نے آکر بیان کیا کہ بھائیو، قرآن سن کر میری تو حالت بدلنے لگی۔ خصوصاً آیت
 پر تو مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ایک بجلی گری اور میرا کام تمام ہوا۔ بڑی مشکل
 سے وہاں سے نکلا۔

حق تعالیٰ علم سے
 میں اس قصہ سے کہ ابو جہل نے اس شخص کے بشرہ (پیشانی)
 سے کیا استدلال کیا۔ جو اس کے بڑے عاقل فلسفی ہونے کی
 دلیل ہے۔ یہ امر بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ اس وقت لوگ کہتے ہیں کہ علم کو بہت
 ترقی ہے۔ سو علم کو بیشک ترقی ہے مگر کون سے علم کو یہی ریل تار، فونو گراف
 بس ان کو ترقی ہے۔ مگر حقیقت میں خود ان کو علم کہنا ہی غلطی ہے۔ اس کو صنعت
 کہتے تدبیر کہتے گو بالمعنی الاعم را عم معنی کے اعتبار سے، علم ہی یہی یوں بعض
 علوم وہ بھی ہیں جن کی شان میں حدیث ہے۔

ان من العلم لجهلا بعض علوم جہل ہوتے ہیں۔

مگر علم مطلوب واقعی میں تو وہی ہے کہ

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت زنگ گمراہی زد دل بز و آیدت
 واقع میں علم وہی ہے جو تم کو محبوب حقیقی کی راہ پر لگا دے اور
 تمہارے دل سے گمراہی کا زنگ دور کر دے۔

ایں ہوس کا ازسرت بیروں کند خوف و خشیت دولت افزوں کند
خواہشات نفسانی و شیطانی کو تمہارے سر سے نکال کر اللہ تعالیٰ
کا خوف و خشیت تمہارے دل میں زیادہ کر دے۔

اگر کہا جاوے کہ علم کے معنی جاننے کے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ کل ایک
ہنتر کو بھی حق ہو گا کہ وہ اپنے کو ذی علم کہے کیونکہ صحت کے لئے صفائی کی
ضرورت اور ہنتر صفائی کے فن کو جانتا ہے مگر آپ اس کو علم نہیں کہتے۔
جو جس طرح آپ اس کو علم نہیں کہتے ہم ریل، تار، فونو گراف وغیرہ جاننے کو
علم نہیں کہتے۔ ہاں صنعت ہے اور ضروری ہے۔ بس ایسا ہی ابو جہل فلسفی تھا
وہ بھی ابو جہل معبر بھی ایسا ہی تھا۔ تو تعبیر بھی کوئی بزرگی کی بات نہیں ہے بلکہ
ایک قسم کی فراست ہے۔ تو باوجود ان علوم کی مخالفت کے سبب جس کا نشاء
علم مطلوب کا نہ ہونا تھا ابو جہل ہو گیا۔

غرض حضور نے اہل مکہ کو یہ جواب دیا تھا
پس نہ مکہ میں حضور نے سرداری کی دولت

پتہ کریمہ کا نشان نزول

اور نہ مدینہ میں مگر بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس کو پڑا بنائیں اس کو کون چھوٹا کر
سکتا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرداری کی تمنا نہ تھی مگر آپ کی تشریف
وردی پر لوگوں نے آپ کو سردار بنا لیا۔ تو عبداللہ بن ابی سلم مرکہ میری سرداری
پ کی بدولت گئی۔ اور کیوں نہ ہوتی۔

طلعة الشمس ما یغنیئ
یعنی سورج کے طلوع ہونے
عن زحل۔
سے زحل سے بے پردائی برتی

جاتی ہے۔

تو خلاصہ یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس وجہ سے سخت حسد تھا۔ اور ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ تو اس واقعہ سے اس کو سخت ناگوار ہی ہوئی کہ شہری لوگوں کے مقابلہ میں ان پرسیوں کو اتنی دلیری ہو گئی۔ تو اس نے اپنی جماعت میں کہا کہ تم ہی تھے تو ان کو جبری کیا۔ تو اب مدینہ چل کر معاملہ کو بدل ڈالو۔ اور اس کی یہ صورت بتلائی کہ جس کا ذکر اس آیت میں ہے پس اس کا پہلا معقولہ ہے کہ

ہم الذین یقولون لا ننفقوا علی من عند رسول اللہ

حتی ینفصوا

یعنی کچھ خرچ مت کرو رسول اللہ کے ساتھیوں پر کہ سب متفرق ہو جاویں کیونکہ یہ سب روٹیاں کھانے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور جب یہی نہ رہیں گی تو سب منتشر ہو جاویں گے۔

ایک معقولہ تو یہ تھا اور دوسرا یہ تھا کہ

لیکن جن الاعن منها الاذل کہ مدینہ چل کر معزز ذلیل کو

نکال دیں گے۔ اور معزز اپنے کو سمجھتے ہیں۔

تو یہ عبداللہ بن ابی نے کہا اور آہستہ اپنی جماعت میں کہا۔ مگر زید بن ارقم

نے یہ سن لیا اور جوش بدتابی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ آپ نے

فورا عبداللہ بن ابی کو بلایا اور پوچھا۔ تو اس نے آکر قسم کھالی کہ غلط ہے میں

نے ہرگز نہیں کہا۔ اسی کو تو کہتے ہیں کہ

اذا جاهدك المنفقون قالوا نشهد انك لرسول الله
 یعنی جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم
 گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں۔
 زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے ان کو ملازمت کی کہ تم کو کیا ضرورت پڑی تھی
 کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا۔ یہ مارے رنج کے گھسوں بیٹھو رہے
 کہ اب کیا منہ دکھلاؤں۔ اللہ اکبر کیا غیرت تھی حق تعالیٰ کو ان کی یہ حالت رنج
 کی گوارا نہ ہوئی اور اس وجہ سے یہ سورت نازل فرمائی۔ حالانکہ صرف ایک
 شخص کا قصہ تھا۔ مگر مقبول ہونا یہ ہے کہ ایک شخص کے لئے ایک سورت نازل
 فرمائی جو کہ قیامت تک کے لئے نمازوں میں پڑھی جاوے گی اور عبداللہ
 بن ابی کا وہ مقولہ بالمقترح (ظاہر طور سے) نقل فرمایا کہ اس نے ضرور یہ کہا
 ہے تاکہ زید بن ارقم کی راست بیانی اچھی طرح ثابت ہو جاوے۔
 جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ارقم رضی
 اللہ عنہ کو بلایا اور ان کی تصدیق کے لئے سورت نازل ہونے کی ان کو بشارت سنائی
 زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے۔ یہ خلاصہ تھا اس قصہ کا۔

مقصود بیان

اب میں یہ بیان کرتا ہوں کہ مقصود میرا اس قصہ کے ذکر
 سے کیا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر حکایت سے
 ایک مقصود ہوا کرتا ہے اور یہی راز ہے کہ قرآن شریف میں قصے زیادہ مفصل بیان
 نہیں ہوئے۔ بہت لوگ قرآن سے مفصل قصے تلاش کرتے ہیں اور نارنجوں سے
 دیکھ کر منطقی کرتے ہیں۔ اگر کوئی قصہ مل جاتا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں اور

اگر نہیں ملتا تو اس کو می سمجھ کر جواب کے طالب ہوتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ کے اعتبار سے گو قصہ ناتمام ہے مگر واقعہ تو مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود صرف نتیجہ ہے۔ جتنے جزو سے نتیجہ نکلے اور وہی مذکور ہونا کافی ہے۔ تو یہاں بھی چونکہ قصہ ذکر کیا ہے یہاں بھی کوئی نتیجہ ضرور ہوگا۔ اور اس کی تعیین اکثر قرآن ہی سے ہو جاتی ہے چنانچہ یہاں اس قصہ سے مقصود ایک علم ہے جو ساتھ ہی مذکور ہے چنانچہ منہ فقیر کے پہلے مقولہ کے ساتھ فرمایا کہ

والله خزائن السموات و الارض
 کہ حق تعالیٰ ہی کے لئے سب کچھ ہے۔

اور ان کے دوسرے مقولہ کے ساتھ فرمایا۔

وَاللّٰهُ الْعَزِيزُ الرَّسُوْلُ
 اور اس کے رسول اور مومنین کی ہے۔

ان دونوں آیتوں کے مضمون میں غور کرنے سے مفہوم ہوگا کہ مقصود کیا ہے تو پہلی آیت میں تو مقصود ہے مال کے ایک اثر کو بیان کرنا اور پھر اس کو رد کرنا اور دوسری آیت میں مقصود ہے عزت کے اثر کو بیان کرنا اور پھر اس کو رد کرنا۔ کیونکہ پہلی آیت میں منافقین کو مال کا دعویٰ تھا حق تعالیٰ نے اس کو رد فرمایا کہ منافقین مال کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ان کا دعویٰ غلط ہے کیونکہ آسمان و زمین کے سارے خزانے تو حق تعالیٰ کے پاس ہیں اور دوسری آیت میں منافقین کو عزت کا دعویٰ تھا وہ اپنے آپ کو معزز خیال کر کے کہتے تھے کہ

یعنی مدینہ چل کر معزز ذلیل کو

یعنی جن المعز منها الافلک۔

نکال دیں گے۔

تو حق تعالیٰ نے اس کو بھی رد فرمایا کہ عزت تو خدا اور رسول اور مومنین کے لئے ہے۔ تو خلاصہ ان دونوں آیتوں کے مضمون کا یہ ہوا کہ ایک آیت یعنی پہلی آیت کے متعلق ہے اور دوسری سجاہ کے متعلق ہے۔

اب یہ بات کہ اس وقت میں نے اس کو کیوں ذکر کیا تو دل یوں سجاہ کرتا ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہو وہ بتلائی جاوے۔ تو آج کل جو امر زیادہ ضرور رسال اور زیادہ آزار دہ ہے وہ اختلافات ہیں جو باہم مسلمانوں میں پیدا ہو گئے ہیں۔ بالخصوص جب کہ دونوں طرف بڑے بڑے لوگ ہوں کہ چھوٹے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے ہوں۔ اس لئے بڑا ضروری امر اس وقت اختلافات کا فیصلہ ہے۔

سو منجملہ ان اختلافات کے ایک بڑی جماعت کا

علماء اور مال و سجاہ | یہ اختلاف ہے کہ مال اور سجاہ قابل تحصیل اور مطلوب

ہیں یا نہیں۔ اور دونوں جانب بڑے بڑے لوگ ہیں۔ ایک جانب تو وہ لوگ

ہیں جو اہل الرائے اور معزز طبقہ کے کہلاتے ہیں اور دوسری جانب علماء ہیں اور

ممکن ہے کہ دونوں کی کچھ کچھ غلطیاں بھی ہوں اور کوئی زائد غلطی میں ہو۔ چنانچہ

آج کل کے عقائد تو اس میں منہمک ہیں کہ مال اور سجاہ قابل تحصیل اور مطلوب ہیں۔

ان کی ترقی ہونی چاہئے۔ اور علماء کی رائے پر مشہور کی جاتی ہے کہ مال اور سجاہ

اصلاً قابل تحصیل اور مطلوب نہیں اور ان کی ترقی کی کچھ ضرورت نہیں اور بعض مرتبہ

تو قول ہی نا تمام ہوتا ہے اور بعض مرتبہ نا تمام پہنچایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر علماء دین کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یوں چاہتے ہیں کہ مسلمان بوجہ تیار چٹھائے پھر میں۔ چنانچہ عموماً ان پر یہی گمان ہے کہ یہ علماء ترک دنیا کرتے ہیں اور جب یہ گمان ہو گیا تو اس خیال کی بناء پر یہ بھی شبہ ہو گیا کہ علماء کی زیادہ سختی اس لئے ہے کہ یہ زمانہ کی ضرورتوں سے بے خبر ہیں۔ ان کو یہ خبر نہیں کہ کس جگہ مال اور جاہ کو منع کرنے سے ترقی رکھتی ہے اور اگر ان کو خبر ہوتی تو اتنی سختی نہ کرتے بلکہ اپنے فتویٰ میں اس کی رعایت رکھتے۔ ایسا نہ کرتے کہ ہر لو کو بھی لایحوز جاہ نہیں، اور تجارت بھی ناجائز۔ تو ان کے نزدیک نہ حیات کے افعال جائز نہ موت کے افعال۔

چنانچہ فتوح میں ایک صاحب نے کہا کہ ساری شریعت کا حاصل یہ ہے کہ نہ ہنسنے کی جگہ ہنسوانہ رونے کی جگہ روؤ۔ میں نے کہا، سبحان اللہ، خوب سمجھے تو شریعت اس طرح بدنام کی جا رہی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض علماء کی تعلیم میں کہیں لفظی اجمال ہو مگر اس اجمال کا مضائقہ بھی نہیں کیونکہ مخاطب مسلمان کم و بیش مسائل دین سے ضرور تعلق رکھتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ممانعت تو اسی کی ہو گی جو حرام ہو مگر ان کی مناسبت کے اعتماد پر بعض جگہ عنوان میں کچھ ابہام رہ گیا ہو۔ مثلاً اگر کسی مریض کو طبیب مریض سے منع کرے اور کچھ تفصیل نہ کرے، تو وہی درجہ ممنوع ہو گا جو مریض کے لئے مضر ہو۔ تو اس طرح سے بھی غلط نہیں ہو گی ہے اور اس کی وجہ سے اختلاف ہو گیا۔

پس ایک طبقہ تو حامی ہو گیا تعلیم دین کا جس کی غایت مال و جاہ نہیں ہے

اور ایک طبقہ حاتی ہو گیا تعلیم دنیا کا جس کا مقصود ہی صرف مال و جاہ ہے۔
 اس طبقہ کی طرف سے پہلے طبقہ کی نسبت
جدید طبقہ کے خیالات یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ تو کھانے پینے

کے ذریعہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ سب سے اول یہ سوال ہوتا ہے
 کہ اگر تعلیم دنیا کا اہتمام نہ ہو تو کھائیں کہاں سے اور علم دین کی ضرورت کا وہ
 انکار تو نہیں کرتے مگر علم دین صرف نماز روزہ ہی کے مسائل کو سمجھتے ہیں۔

مگر اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی کہے کہ قانون گورنمنٹ صرف یہ ہے
 کہ حکام کی تعظیم و تکریم کرو۔ پھر چاہے رات کو ڈکیتی ہی کا شغل ہو۔ لیکن تعجب
 ہے کہ ایسے شخص کا یہ اجتہاد تو کوئی نہ سُننے گا مگر دین کے باب میں ایسی رائیں
 مسموع (سنی جانے والی) ہوتی ہیں۔

شاید کوئی شخص کتاب راہ نجات کے نام سے استدلال کرے کہ راہ
 نجات میں دیکھو نماز روزہ ہی کا بیان ہے اور پھر اس کا نام راہ نجات ہے اس
 سے معلوم ہوا کہ نجات کا راستہ یہی نماز روزہ ہے و بس۔ تو یہ تو ٹھیک کہ نماز
 و روزہ نجات کا راستہ ہے لیکن یہ کا ہے سے معلوم ہوا کہ پورا راستہ وہی ہے
 اور کسی جزو کی ضرورت نہیں۔

جیسے کوئی شخص سڑک پر جا رہا ہو تو یہ سڑک اس کا راستہ ضروری ہے لیکن
 یہ کا ہے سے معلوم ہوا کہ پورا راستہ یہی سڑک ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ دور کے بعد
 دوسری سڑک بھی ملے کہ نا پڑے۔ تو بہت لوگوں نے دین میں بس یہ اختصار
 کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ بعضے تو قرآن شریف پڑھنے کو بھی تفسیح اوقات سمجھتے ہیں

چنانچہ رام پور میں ایک صاحب نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ تم اپنے بچے کو انگریزی کیوں نہیں پڑھاتے۔ انہوں نے کہا کہ وہ قرآن پڑھ رہا ہے۔ ختم کر لے تو انگریزی پڑھاؤں۔ کہنے لگے کتنے دنوں میں کتنا قرآن ہوا ہے؟ انہوں نے کہا کہ دو برس میں آدھا قرآن۔ تو آپ کہتے ہیں کہ دو سال تو ضائع ہو گئے دو سال اور بھی کیوں ضائع کرتے ہو۔

اور قرآن سے بے تعلقی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی ایک بیسٹر کی نسبت فرماتے تھے کہ انہوں نے مولانا سے کہا کہ اس وقت تو علماء اگر سود کو حلال کہہ دیں تو مصلحت ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ توبہ کرو جو چیز قرآن میں حرام ہے اس کو کون حلال کہہ سکتا ہے اور آیت پڑھی۔

احل اللہ البیع وحرم الربوا یعنی اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال

کیا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے۔

تو کہنے لگے اے اللہ توبہ! میں تو اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ مولویوں نے مل کر اس کو حرام کر رکھا ہے۔ توبہ حالت بے خبری کی ہو گئی ہے اور یہ جھٹی جاتی ہے۔

یہیں الہ آباد کا قصہ ہے کہ ایک بچہ کی انگریزی تعلیم بہت دور تک ہو گئی تھی مگر وہ الحمد للہ شریف دیکھ کر بھی نہ پڑھ سکا۔ میں نے حروف پچنواسے تو معلوم ہوا کہ اس نے الف باتا بھی نہیں پڑھی اور میں نے ایک بہت بڑے شخص کے بچے کو دیکھا کہ وہ میم کی گود میں پلتا تھا اور باپ کو اس پر فخر تھا کہ وہ کلمہ

پڑھ سکتا تھا جیسے ہم اپنے طوطے کو کلمہ پڑھا دیں۔ تو اسلام سے یہ بے خبری کی نوبت ہو گئی ہے اور صاحب آپ نے تو پھر بھی چونکہ ایسے لوگوں کی آغوش میں پرورش پائی ہے جو پرانی روش کے محضے۔ آپ تو خیر اتنے کو تو ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر یہ بچے جو آپ کی اور میم کی گود میں پرورش پا رہے ہیں یہ تو اتنا بھی نہ سمجھیں گے۔ یہ حالت دیکھتے ہوئے مجھے تو خوف ہے کہ چند روز میں شاید لوگ اپنے کو مسلمان کہنا بھی پسند نہ کریں گے۔ جیسا کہ اس وقت میں اکثر عربی طلباء کو دیکھتا ہوں کہ وہ اپنے کو ایسی وضع سے رکھنا پسند نہیں کرتے جس سے طالب علم سمجھے جاوے۔ صاحب سن لیجئے۔

پاکش برہیزہ نسیل عاشقی یا فرشتہ جاہمہ تقویٰ بہ نسیل
یا تو محبوب حقیقی کے عشق کا دعویٰ امرت کرو اور اگر کرتے ہو، تو عاشقوں کی وضع کو اختیار کرو۔

یا مکن یا پیلبا ناں دوستی یا بنا کن خانہ بر اندازہ پیل
یعنی یا تو فیلبان سے دوستی مرت کرو یا اپنا مکان مانتھی کے موافق بناؤ۔ یعنی یا طلباء اور اللہ والوں میں مرت داخل ہو۔ اگر داخل ہوتے ہو تو ان کی وضع اختیار کرو۔

تو جب یہ کیفیت طلباء میں داخل ہو گئی تو اوروں کا تو کیا ٹھکانہ ہے۔ تو جس طرح طلباء کو ایسی وضع بنانے میں عار ہے جس سے لوگ ان کو طالب علم کہیں گے۔ تو دیکھئے اب یہ اپنے کو طالب علم کہنا پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح اسلام کو بھی عجب نہیں کہ عار سمجھیں۔ چنانچہ نام تو بدلنے لگے ہیں کہ کوئی یہ نہ سمجھے

کہ یہ مسلمان ہیں۔ تو نام بدل گئے، وضع بدل گئی، خیالات بدل گئے مگر ان کے نزدیک وہ اسلام ہی کچھ ایسا لو ہے جڑا ہے کہ کسی طرح الگ ہی نہیں ہوتا۔

بس ایسا ہے جیسے مولانا شاہ رفیع الدین صاحب نے ایک سبق کو نماز کی تاکید کی اور وضو کرا کر بتلا دیا۔ غالباً ایک ماہ کے بعد پوچھا کہ نماز بھی پڑھتا ہے معلوم ہوا پڑھتا ہے۔ فرمایا وضو بھی کرتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کیوں اس دن کرا نہیں دیا تھا۔ تو جیسا اس کا وضو تھا ایسا ہی آج کل کا اسلام ہے۔

علماء اور کافر گری

پھر اس حالت پر اگر علماء کچھ کہہ دیتے ہیں تو علماء پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ یہ بہت جلد کافر بناتے ہیں

مگر یہ الزام سراسر غلط ہے کیونکہ کافر بنانے کا مفہوم تو ایسا ہے جیسا مسلمان بنانے کا اور مسلمان بنانے کے معنی ظاہر ہے کہ یہی ہیں اسلام سکھانا، اسلام کی ترغیب دینا و تشریح کرنا۔ چنانچہ کہتے ہو کہ علماء کو حق تعالیٰ نے اس لئے بنایا کہ وہ کافروں کو مسلمان بنائیں۔ تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں کو مسلمان کہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں کو اسلام سکھلا دیں۔ اسلام کی ترغیب دیں اور اسلام کی طرف بلائیں تو اسی طرح کافر بنانے کے بھی یہی معنی ہوں گے کہ کافر ہونے کی تشریح کریں اور جب یہ معنی متعین ہوئے تو اب غم ہی بتلاؤ کہ کون سا عالم کفر کی تشریح کر رہا ہے۔ بس معلوم ہو گیا کہ علماء کافر نہیں بناتے۔ ہاں بے شک علماء بناتے ہیں کہ فلاں بات سے کافر ہو گیا۔ تو کافر تو خود ہو گیا تھا مگر علماء نے صرف بتلا دیا۔

جیسے کوئی شخص امتحان میں فیل ہو جائے اور کوئی اس کو بتلا دے

کہ تم فیل ہو گئے۔ تو کیا یہ کہا جائے گا کہ اس بتلانے والے نے اس کو فیل کر دیا نہیں بلکہ فیل تو خود ہوا۔ اس شخص نے صرف بتلا دیا۔ ہاں اگر کوئی ناحق کفر کا فتویٰ دے تو بے شک وہ بُرا ہے۔ تو علماء پر یہ الزام محض اس لئے ہے کہ ان لوگوں کو بھی خبر نہیں کہ اسلام کیا ہے اور زیادہ تو ایسے ہی لوگ ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں کہ وہ بے خبر تو نہیں ہیں بلکہ اُن کو خبر سب سے پھر بھی استہزا (سنسی مذاق) کہتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کی اُن کی ضرورتیں اُن کے خیال میں واجب الرعایت ہیں اور شریعت میں اُن کے نزدیک اُن کی کابل رعایت ہے نہیں۔ اس لئے کچھ نیکان کہ اُن پر شریعت کو منطبق کرتے ہیں اور علماء اُن پر انکار کرتے ہیں۔ اس لئے وہ علماء سے اُلجھتے ہیں۔

ان میں بعض ایسے ہیں کہ یورپ کی تحقیقات کو بھی صحیح نہیں سمجھتے مگر پھر بھی کہتے ہیں کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا تو اس جماعت نے دین عرف قوم کا نام رکھا ہے۔

اسلام اور ترقی

چنانچہ افسوس ہے کہ آج کل ایک طبی وفد ترکوں کی مدد کو گیا ہے تو جہاں میں سوار ہونے کے بعد آپس میں گفتگو ہوئی کہ ہم لوگوں کو وارہی رکھنا مناسب ہے یا نہ رکھنا۔ تو میں کیسے کہوں کہ یہ اسلام ہے۔ دیکھتے اول تو ایسے دینی کام کو جارا ہے ہیں تو یہ دین کے خلاف تجویز کیسی۔ دوسرے ممکن ہے کہ اُن کے ایک گولی آکر لگ جائے۔ تو کیا وہ چاہتے تھے کہ ایسی حالت میں خاتمہ ہو جو کہ اسلام کے خلاف ہو۔ تو اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس وقت مذہب

سے کوئی مطلب باقی نہیں رہا۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ان کو کسی وقت یہ معلوم ہو جاوے کہ اس مذہب کو اختیار کر کے ہماری قومیت باقی نہیں رہ سکتی اور فلاں مذہب اختیار کرنے سے باقی رہ سکتی ہے، تو فوراً اس مذہب اسلام کو چھوڑ کر وہ دوسرا مذہب اختیار کر لیں۔

چنانچہ لکھنؤ میں میرے ایک دوست میرے پاس روزانہ آتے ایک روز آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ آنے کے بعد میں نے تانیر کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بیان کیا کہ آج ایک کمیٹی تھی اس کے تماشے میں دیر ہو گئی اور گو میں اس کا ممبر نہ تھا۔ اور اس کا ممبر نہ ہونا ہی اچھا تھا۔ کیونکہ بعض کمیٹی کا ممبر ہی نہ ہونا اچھا ہے۔

چنانچہ مشہور ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ایک کمیٹی نبوت کی قائم ہوئی اس میں ملا دوپازہ بھی حاضر تھے۔ کوئی نبی بنتا تھا، کوئی ابوبکر، کوئی عمر۔ یہ خاموش تھے۔ ان سے پوچھا گیا بھائی تم کیا بنو گے۔ انہوں نے کہا کہ میں ابوجہل بنوں گا تم سب کی تکذیب کروں گا۔ سو واقعی بعضی مجلس کا ابوجہل ہی ہونا اچھا ہے۔ اسی طرح اس کمیٹی کا ممبر ہی نہ ہونا اچھا تھا۔

سوا انہوں نے بیان کیا کہ اس کمیٹی میں یہ بحث تھی کہ مسلمانوں کی ترقی نہیں ہوتی۔ تو انہوں نے تحقیق کے درجے میں یہ طے ہوا کہ اسلام کو باقی رکھ کر مسلمانوں کی جماعت ترقی نہیں کر سکتی اور یہ رائے قائم کی کہ اگر ترقی مطلوب ہے تو اسلام کو چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ اس میں حلال و حرام کا بڑا فرقہ ہے۔ مثلاً ایک انجن نے تو ایک تجویز کی کہ مسلمانوں کو یہ کرانا سچا ہے تو مذہب اسلام

کی رو سے وہ حرام ہے تو اب اس چیز پر عمل کیسے ہو۔
چنانچہ ایک بار میں لاہور گیا تو وہاں کے عقلاء نے یہ تجویز کر رکھا تھا کہ
علماء پر زور ڈال کر سود کو حلال کرانا چاہئے۔ جب علماء نے مباحثت نہ کی
تو وہ لوگ بولے بس صاحب اب ترقی کی کوئی امید نہیں۔

اسی طرح اس جماعت نے یہ رائے قائم کی کہ یہ ساری خرابیاں اور
مسلمانوں کی لپٹی اسلامی کی قید اور حرام و حلال کی بدولت ہیں۔ مثلاً اگر کوئی تجارت
کرے تو شریعت میں تو روک ہے کہ ناجائز معاملہ نہ کرے، سود نہ لے پھر ترقی
کہاں۔ اس لئے اس قید سے آزاد ہو جانا چاہئے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر شریعت
کو چھوڑ بھی دیا مگر آزادی تو پھر بھی میسر نہ ہوئی۔ کیونکہ گورنمنٹ کے قوانین کی
قید اب بھی ہے۔

اگر کہو کہ کچھ کچھ تو آزادی ہو گئی۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس کچھ قید کچھ آزادی
سے تو بالکل قید ہی اچھی۔ ایک طرف تو ہوئے۔ اس لئے چاہئے کہ جو خدا
سے آزاد ہو وہ گورنمنٹ سے بھی آزاد ہو جاوے۔ پھر علاوہ حلال و حرام
کی روک ٹوک کے ایک اور بات سے بھی ان لوگوں کو اسلام سے توجہ
دلفرت ہوا۔ وہ یہ کہ انہوں نے دیکھا کہ بعض مسلمانوں میں تعصب اتنا ہے کہ
کوئی آئین پر لڑتا ہے کوئی رفع یدین پر۔ تو جب اسلام ہی نہ ہوگا تو یہ سب
کچھ بھی نہ ہوگا جس سے قوم کو ضرر پہنچ رہا ہے۔

انہوں نے جھگڑوں کے اعتبار سے اسلام کو ایسا سمجھ رکھا ہے جیسے
کسی بادشاہ کے بڑے بھائی محض محذوب کہ برہمنہ رہتے۔ بادشاہ نے کہا

کہ پانچامہ تو پہن لیجئے۔ انہوں نے کہا، پھر کہتے بھی لوں گا۔ بادشاہ نے کہا، وہ بھی حاضر ہے۔ وہ بولے پھر تو پی بھی لوں گا۔ بادشاہ نے کہا وہ بھی حاضر ہے اسی طرح سلسلہ چلاتے چلاتے سلطنت کی ضرورت ظاہر کی۔ بادشاہ نے کہا وہ بھی حاضر ہے۔ کہنے لگے تو میں پانچامہ ہی پہن کر کیا کروں گا جس سے یہ سب جھگڑے پیدا ہوں۔

اسی طرح انہوں نے کہا کہ سارے قصے اسلام ہی کے ہیں تو مسلمان ہی کیوں رہیں اور یہ لوگ جو مسلمانوں کو الزام دیتے ہیں کہ ذرا ذرا سی بات میں جھگڑا کیے ہیں۔ چنانچہ آئین ہی پر دیکھئے کس قدر اختلاف اور جھگڑا ہو رہا ہے۔ تو واقعی اتنے اختلاف کو تو ہم بھی پسند نہیں کرتے مگر یہ دیکھئے اصل سبب اس اختلاف کا کیا ہے۔ تو اصل سبب یہ ہے کہ مسلمان کی نظر میں دین کی تکمیل اتنی ضروری ہے کہ ذرا ذرا سی بات کو بھی وہ جانچتا ہے پھر اس میں کبھی نفاذ نہ بھی آگئی جس کی وجہ سے اس میں زیادتی ہونے لگی۔ تو اصل میں خرابی یا ضرر جو کچھ لازم آیا وہ اسلام سے نہیں بلکہ نفاذ نیت سے۔ مگر انہوں نے اس ضرر کو بھی اسلام کی طرف منسوب کیا۔ تو انہوں نے یہ تجویز کر لیا کہ اسلام کو باقی رکھ کر ترقی نہیں ہو سکتی۔ مگر تجویز ہی تھی، اپنے نزدیک اسلام کو ابھی چھوڑا نہیں مگر صاف جوا اسلام نے تو خود انہیں چھوڑ دیا۔ تو یہ لوگ متروک الاسلام (اسلام کے چھوٹے ہوئے) تو ہو ہی گئے۔ غرض یہاں تک مذاق بدل گیا ہے۔

ایک اور قصہ ہے رٹکی کا۔ وہاں ایک کمیٹی میں ایک یہ تجویز ہوئی تھی کہ نکاح بھی فضول ہے۔ آزادی تو یہ ہے کہ جیسے اور سووے سلف کا معاملہ

ہوتا ہے کہ جس سے جو معاملہ ٹھہر جاوے۔ اسی طرح بیویاں بھی حاصل کر لی جاویں۔ یہ رائے بھی عقلاء کی۔

تو سبب اس کا فقط یہی ہے کہ ان کی نظریں دنیا اصل چیز ہے۔ علماء نے اس مفہوم کو دیکھ کر روکا اور دیکھنے کا مطلب یہ تھا کہ اس درجہ کی دنیا کو چھوڑو مگر اس کے معنی غلط یہ سمجھے گئے کہ علماء کی رائے یہ ہے کہ دنیا کو بالکل چھوڑ دو۔ اس لئے اختلاف ہوا اور یہ گفتگو ہونے لگی کہ آیا اصل میں دنیا مطلوب ہے اور دین بقدر ضرورت حاصل کرنا چاہئے یا اصل میں دین مطلوب ہے اور دنیا بقدر ضرورت ہونی چاہئے۔ یہ ہے وہ مسئلہ جو اس بیان سے اصل مقصود ہے۔ اور مجھے ان آیتوں سے بھی نتیجہ نکالنا ہے۔

محبوب ترین چیزیں | تو دنیا میں دو ہی چیزیں ہوتی ہیں، مال اور جاہ اور یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو ہر ایک کو محبوب ہیں۔ چنانچہ کیمیا جو ہر ایک کو ایسی محبوب ہے کہ اگر کسی کو بتلائی جاوے تو اہل اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں کہ اس سے انکار کرے۔ تو اس کی یہی وجہ ہے کہ اس میں مال و جاہ و دلوں جمع ہیں اور اس کے سوا دنیا میں بہت کم ذرائع ایسے ہیں کہ اس میں مال اور جاہ و دلوں جمع ہوں۔ اکثر سبب بدوں مال کے تلف کئے ہوئے نہیں ملتا اور اس میں مال و جاہ و دلوں جمع ہیں۔ اس لئے یہ اس درجہ کی محبوب ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ دلوں چیزیں نہایت ہی محبوب ہیں اور انہیں کا نام دنیا بھی ہے۔ تو اب میرا یہ کہنا کہ دنیا مطلوب ہے یا نہیں۔ اس میں مالی و جاہ و دلوں آگئے۔ تو اب دنیا سے مراد ان دلوں کا مجموعہ ہوگا۔ پس حاصل یہ ہوا

کہ مال و حجاجہ مطلوب ہیں یا نہیں حق تعالیٰ نے اس کا فیصلہ ان آیات میں فرمایا ہے
پس منافقین کے اوّل مقولہ کے بعد فرماتے ہیں۔

وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ
یعنی اللہ ہی کے ہیں تمام خزانے
آسمانوں کے اور زمینوں کے۔

اس سے تو احکام مال کے بتلانا مقصود ہیں۔ اور دوسرے مقولہ کے بعد فرماتے ہیں

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَ
لِلْمُؤْمِنِيْنَ
یعنی اللہ ہی کی ہے عزت اور
اس کے رسول کی اور مسلمانوں کی

اس سے احکام حجاجہ کے بتلانا مقصود ہیں۔

پس اب اس میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سو غور کرنے سے وہ باتیں
معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ مال فی نفسہ محمود ہے۔ دوسرے یہ کہ مال سے اگر کوئی

مفسدہ مرتب ہونے لگے تو مذموم ہے۔ مال کافی نفسہ محمود ہونا تو اس لئے

معلوم ہوا کہ اپنے کو مالک الاموال (سب مالوں کا مالک) فرما رہے ہیں چنانچہ

ارشاد ہے۔ وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی آسمانوں اور زمین کے

خزانے اللہ ہی کی ملک میں ہیں۔ پس اگر مال فی نفسہ کوئی بڑی اور معیوب چیز

ہوتی تو جس طرح سے مخصوص کے ساتھ اپنے کو خالق الکلاب والحننا زبیر نہیں

فرمایا، اسی طرح اپنے کو مخصوص کے ساتھ مالک الخزان (خزانوں کے مالک)

نہ فرماتے۔ اور اس میں نفوذ عروض (روپیہ و اسباب) سب داخل ہو گئے اور

مال کا باعتبار عارض کے مذموم ہونا اس سے معلوم ہوا کہ مال سے ان کو یہ ضرر

ہوا کہ انہوں نے اس کو بے موقع استعمال کیا۔ چنانچہ کہا کہ

لا تفتقوا علی من عند

یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ

رسول اللہ

علیہ وسلم کے پاس جمع ہوں

ان پر کچھ مت خرچ کرو۔

سوائے اپنے متول کو وہ اس طرح کام میں لائے کہ مسلمانوں پر خرچ کرنا متوف
 کر دیا جس سے ان کو تکلیف پہنچی۔ تو یہ سویر (بر) استعمال ہوا مال کا۔ پس حق تعالیٰ
 نے اس پر رد فرمایا کہ تم کیا چیز ہو، خرچ کرنے تو سارے ہمارے پاس ہیں۔ پس
 ان کی یہ مذمت سویر استعمال کی وجہ سے کی گئی۔ پس اس سے دوسری بات
 بھی ثابت ہو گئی کہ جب مال کے ساتھ سویر استعمال ہو تو وہ مذموم ہے۔

اسی طرح دوسرے مقولہ کے بعد فرمایا۔

وللہ العزۃ ولسولہ

یعنی عزت اللہ ہی کی ہے

اور اس کے رسول کی اور

وللمؤمنین

مسلمانوں کی۔

تو یہاں بھی بتلا دیا کہ جاہ فی نفسہ مذموم نہیں مگر سویر استعمال کی وجہ سے
 مذموم ہو جاتا ہے۔ پس اس سے بھی دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ جاہ فی نفسہ
 محمود ہے۔ دوسرے یہ کہ جب سویر استعمال ہو تو مذموم ہے۔ جاہ کا فی نفسہ محمود
 ہونا تو اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے وللہ العزۃ — الایۃ فرمایا۔ تو اپنے
 لئے عزت ثابت فرمائی۔ اگر جاہ کوئی بری چیز ہوتی تو اپنے لئے ثابت نہ
 فرماتے۔

اب اگر یہ شبہ ہو کہ جاہ اچھی چیز تو ہے لیکن یہ ممکنات کے لئے نہیں بلکہ

حق تعالیٰ کے لئے ہے۔ تو سمجھو کہ اگے وللمؤمنین (اور مسلمانوں کی) یعنی تو ہے
 تو پس مسلمانوں کا ذمی عزت ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے۔ تو یہ شبہ نہ رہا
 کہ شاید ممکنات کے لئے محمود نہ ہو اور جاہ کا مذموم ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ
 ساتھ ہی ساتھ منافقین کی اس بات پر مذمت بھی فرمائی ہے کہ انہوں نے
 اُس کا بے موقع استعمال کیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ

لیخ جن الاعتر منها الاذل یعنی جو عزت والا ہے وہ

دینہ سے ذلت والے کو نکال دے گا۔

تو ان کا یہ کہنا سوء استعمال ہوا جاہ کا کہ ذریعہ بنا یا جاہ کو مسلمانوں کے
 ضرر کا۔ اس پر حق تعالیٰ نے رد فرمایا کہ تم ہو کیا چیز، معزز تو خدا اور سولہ و مسلمان
 ہیں۔ پس ان کی یہ مذمت سوء استعمال کی وجہ سے کی گئی۔ پس ان دونوں آیتوں
 سے چار مسئلے ثابت ہوئے۔

ایک یہ کہ مال اچھی چیز ہے۔

دوسرا یہ کہ جاہ اچھی چیز ہے۔

تیسرا یہ کہ مال کو ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے۔

چوتھا یہ کہ جاہ کو ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے۔

تو ان چاروں مسئلوں کو مان لینے سے اگر دونوں جانب انصاف ہو

تو سب اختلاف رفع ہو جاوے۔ کیونکہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ مال بُری چیز

نہیں ہے تو اب مال کا مطلقاً بُرا کہنا ٹھیک نہ ہوگا۔ اسی طرح جاہ کو بھی اور

جب یہ ثابت ہو گیا کہ مال و جاہ ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے تو وہ

لوگ باز آویں گے جو مال و جاہ کو علی الاطلاق محمود و مطلوب کہہ رہے ہیں۔ تو اتنے بڑے اختلاف کا فیصلہ ہو جاوے گا اور یہی مقصود ہے مجھے بیان کرنے سے اور یہ اجمال کے درجہ میں تو ثابت ہو گیا مگر میں تفصیل کے لئے کچھ اور بیان کروں گا۔ اور گو مقصود معلوم ہو گیا ہو مگر ابھی بہت مبہم ہے۔ اس لئے اس کا عنوان بھی واضح اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ پس دوسرے عنوان سے عرض کرتا ہوں۔

حقیقتِ حُب

ایک تو ہے مال اور ایک ہے حُب مال۔
اسی طرح ایک ہے جاہ اور ایک ہے حُب

جاہ۔ تو مذمت مال کی نہیں ہے بلکہ حُب مال کی ہے۔ جس سے بڑے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ تو مذموم دو چیزیں ہوئیں حُب مال اور حُب جاہ۔ باقی رہے مال اور جاہ سو یہ دونوں مذموم نہیں کیونکہ حق تعالیٰ امتنان و نعمت دینا کے طور پر فرماتے ہیں۔

ان الذین امنوا و عملوا الصالحات
سجعل لہم الریحان ودا
کہ ہم مومنین اہل عمل صالح کے
لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے۔

اور محبوبیت ہی کا نام جاہ ہے۔ لوگ جاہ کے معنی بھی غلط سمجھتے ہیں کہ لوگ ہمارے خوف کی وجہ سے ہمارے تعظیم کریں۔ حالانکہ جاہ کی حقیقت ہے ملک القلوب (یعنی دلوں کا مالک ہونا) پس ملک المال (مال کا مالک ہونا) تو توکل ہے اور ملک القلوب (دلوں کا مالک ہونا) جاہ ہے اور خوف اور محبت ہو تو وہ صورتِ جاہ ہے۔ حقیقتِ جاہ نہیں اذیہ خود ہی اپنے

کو معزز سمجھتے ہیں ورنہ لوگوں کے دلوں میں کچھ بھی ان کی عزت نہیں ہوتی چنانچہ ان کے پیچھے لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ بعض لوگ اپنی نظروں میں بڑے ہوتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کلاب اور خنازیر (کتنے اور سوڑ) سے بدتر ہوتے ہیں اور ان کے سامنے خوف کی وجہ سے لوگ تعظیم کرتے ہیں۔ تو یہ کوئی عزت نہیں ہے کیونکہ ایسی عزت تو سانپ کی بھی ہے۔

ایک مرتبہ دہلی میں بیان کر رہا تھا۔ رات کا وقت تھا کہ کچھ آہٹ ہوئی جس سے لوگوں کو سانپ کا شبہ ہوا۔ بس سانپ کے ڈر سے سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ تو کیا یہ اس کی عزت تھی۔ ہرگز نہیں! تو جو تعظیم خوف کی وجہ سے ہو وہ جاہ نہیں ہے۔ جاہ تو یہ ہے کہ

صاحبِ دہ بادشاہ جمہاست صاحبِ دل شاہِ دلہائے شہاست
یعنی گاؤں کا مالک جموں کا بادشاہ ہے اور اہل دل دلوں کا
بادشاہ ہے۔

تو جموں کا شاہ ہونا جاہ نہیں ہے بلکہ دلوں کا شاہ ہونا جاہ ہے اور یہ بات محبوبیت سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ پس محبوبیت ہی اعلیٰ درجہ کی جاہ ہے۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

سَجْعَلْ لَہْدَ الرَّحْمٰنِ وِدَا اللّٰہِ تَعَالٰی اِن کَے لَئے مَحْبُوْبِیَّتِ
پیدا کیے دیں گے۔

پس معلوم ہوا کہ جاہ بڑی چیز نہیں بلکہ یہ تو ایک اچھی چیز ہے کہ حق تعالیٰ

بطور اتقان (نعت) اپنے صالح بندوں کو عنایت فرماتا تھا رہے ہیں ایسی طرح مال کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

نعم المال الصالح للرجل نیک آدمی کے لئے نیک

الصالح مال اچھی چیز ہے۔

پس مال اور حجاب مذموم خود نہیں ہیں بلکہ مذموم حُجُب مال اور حُجُب جہاہ ہیں۔ جس کی نسبت حضور فرماتے ہیں۔

ما ذنبان جائعان ارسلا یعنی حُجُب مال اور حُجُب شرف

فی غنم بافسد لہامن حُجُب آدمی کے دین کو ایسا تباہ کیتی

المال والشرف الدین المدی ہے کہ آگے دو بھڑیٹے بھوکے

بھی بکریوں کے گلہ میں چھوڑ دیئے جاویں تو وہ بھی بکریوں کو اس

قدر تباہ نہیں کر سکتے۔

پس حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حُجُب کا لفظ تصریحاً فرما دیا

ہے۔ تو حُجُب بڑی چیز ہے۔ اب جہاں مال کی مذمت آوے اور اس کے

ساتھ حُجُب کی قید نہ ہو تو سمجھ لیں کہ اس سے مراد وہی حُجُب کا درجہ ہوگا کیونکہ

بعض قرائن ایسے موجود ہوتے ہیں جن سے وہ قید معلوم ہو جاتی ہے اور اس

کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ تو چونکہ غالب عادت یہی ہے کہ حُجُب

مال ہوتا ہے تو حُجُب مال بھی ہوتی ہے۔ پس یہ اس کا قرینہ ہے کہ مال سے

مراد وہی ہے جو حُجُب کے درجہ میں ہو۔

جیسے کوئی شخص پوچھے کہ رہن رکھنا کیسا ہے تو چونکہ عادت رہن سے

انتفاع کی ہے۔ لہذا یہ بھی گنجائش ہے کہ ہم جو اب میں اس کو حرام کہہ دیں۔ تو بعض اوقات قرآن پر اعتماد کرنے کی وجہ سے قیود کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس کی حدیث سے تائید لیجئے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

ليس من البر الصيام في

يعني سفر میں ایسی حالت میں

روزہ رکھنا نیکی نہیں۔

السفر

یہ آیت نے اس وقت فرمایا تھا جب کہ ایک شخص نے نہایت سختی کی حالت میں سفر کے اندر روزہ رکھا تھا اور گہری اور پیاس کی شدت کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ سفر میں روزہ ہی رکھنا چاہئے ہرگز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں روزہ رکھنا اچھا نہیں۔ پس مراد خاص حالت ہے۔ مگر ایسی حالت کی قید تصریحاً نہیں فرمائی۔ کیونکہ قرینہ بتھمیں موجود ہے۔ تو اسی طرح اگر کوئی مال کی مذمت کرے تو مطلب یہی ہوگا کہ حُرَب کے درجہ میں مذموم ہے۔

اسی طرح قرآن شریف سے اس کی تائید لیجئے

حقیقت حیات دنیا

وما الحیوة الدنیا الا لعب ولهو۔ یعنی

دنیاوی زندگی تو کچھ بھی نہیں بجز کھیل کود کے، اس آیت میں حیات دنیا کی مذمت فرمائی ہے اور دوسری جگہ اس کی مدح بھی کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے

اولم نعلمکم ما یتذکر

یعنی کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ

دی تھی کہ سمجھ سکتا اس میں وہ

نیہ

بشخص جس کو سمجھنا ہوتا۔

تو مطلب یہ ہے کہ حیات دنیا جب بُرے کاموں میں صرف کی جاوے
تو وہ لہو و لعب ہے۔ ورنہ اچھی چیز ہے بلکہ حیات تو وہ چیز ہے کہ اُس کی
فضیلت کے متعلق خود حضورؐ کا فتویٰ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ دو شخص ساتھ ایمان لائے۔ اُن میں سے ایک
تو جہاد میں شہید ہو گیا۔ دوسرے کا اُس سے ایک ہفتہ بعد انتقال ہوا۔ صحابہ
نے اُس کے لئے دعا کی کہ اے اللہ! اس کو اس کے ساتھی کے ساتھ لاجت
کہہ دیجئے۔ یعنی گو یہ اُس کے درجہ کا نہیں مگر اُس کے درجہ میں پہنچا دیجئے۔ حضورؐ
سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سنا تو فرمایا کہ اُس کے اس ہفتہ کے عمل
کہاں گئے۔ واللہ اُس کے اور اس کے درجہ میں اتنا فرق ہے جیسے زمین اور
آسمان میں۔

تو دیکھئے کہ حیات دنیا ایسی چیز ہے کہ صرف ایک ہفتہ کی زیادہ زندگی
سے اُس نے اتنی فضیلت حاصل کر لی۔ مگر باوجود اس کے پھر بھی اس زندگی
کو لہو و لعب فرمایا۔ تو یہ اسی حالت کے اعتبار سے ہے جب کہ اُس کو بُرے
کاموں میں صرف کیا جاوے۔ تو دیکھئے حیات کی مذمت ایک خاص حالت
کے اعتبار سے ہے۔ حالانکہ وہاں اس قید کی تصریح نہیں ہے۔ پس قرآن سے
بھی اس کی تائید ہو گئی کہ بعض اوقات لفظوں میں ایک قید نہیں ہوتی اور ارادہ
میں ہوتی ہے۔

ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت چونکہ لوگ بہت بے خبر ہو
گئے ہیں اُس لئے بہتر یہی ہے کہ مذمت کرتے وقت حُرْب کا لفظ بڑھا دیا

کہیں۔ اور یہاں سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ حضورؐ نے
 حب الدنيا راس کل یعنی دنیا کی محبت تمام گناہوں
 خطیئہ کی بڑ ہے۔

کیوں فرمایا اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ جہاں مطلق دنیا کو فرمایا ہے وہاں بھی یہی
 مراد ہے۔ ورنہ ارشاد ہے۔

کسب الخلال فريضة بعد الفريضة
 حلال کمائی فرض ہے، بعد
 فرائض کے۔

ہاں یہ قید ہے کہ وہ فرض ہے بعد فرض کے۔ دیکھئے کسب الدنيا کو اس جگہ فرض
 فرما رہے ہیں۔ پس اب سمجھیں آگیا ہوگا کہ دنیا کو جو ملعون کہا جاتا ہے، اس
 سے مراد حب دنیا ہے۔

اب لوگ چونکہ اس کا مطلب نہیں سمجھتے اس لئے
مقاہم بزرگال کہتے ہیں کہ لو دنیا ہی کو ملعون کہتے ہیں۔ آپ ان سے
 خفا ہوتے ہیں لیکن خود دنیا ان سے خفا نہیں ہوتی کیوں کہ دنیا خود ان کے پاس
 آتی ہے۔ تو خفگی میں کیسے آتی اور وہ دنیا طلب کرنے کے لئے کسی کے
 پاس نہیں جاتے۔ کیا آپ نے کسی بزرگ کو بھی کسی بادشاہ کے دروازے پر
 دیکھا ہے کہ مانگنے گئے ہوں۔

اگر کہئے کہ گئے ہیں تو وہ ایسے ہی بزرگ ہوں گے جیسے کہ میری تفسیر
 لکھنے کے زمانہ میں ایک شاہ صاحب بھیک مانگنے آئے تھے بڑے ٹھاٹھ
 کے ساتھ کہ ایک جہ پھینے ہوئے تھے۔ تسبیح ہاتھ میں تھی اور گلے میں سورہ ازلہ

پر کھڑے ہو کر آپ نے سوال کیا۔ مکان سے کوئی چیز بھیج دی گئی۔ آپ نے اس کو واپس کر دیا کہ میں کوئی معمولی فقیر نہیں ہوں۔ یہ لوں گا وہ لوں گا۔ غرضیکہ وہ جھگڑا کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ان کی آواز مجھ تک پہنچی۔ میں کو کھٹے پر بیٹھا ہوا تفسیر لکھ رہا تھا۔ طبیعت پریشان ہونے لگی۔ آخر میں اُدھر سے اتر آیا اور میں نے کہا کہ شاہ صاحب! آپ جھگڑا کیوں کرتے ہیں، جو توفیق ہوئی وہ پیش کر دیا۔ آپ دھمکا کر کہنے لگے۔

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست شاید کہ پلنگ خفتہ باشد۔
 ہر جنگل میں یہ گمان نہ کرو کہ خالی ہے ممکن ہے چیتا سویا ہوا ہو
 یعنی ہر شخص کی نسبت یہ گمان نہ کرنا چاہئے کہ یوں حقیر و معمولی
 شخص ہے۔

میں نے کہا حضرت میں بھی یہی شعر پڑھتا ہوں کہ ع
 ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست
 آپ کو بھی میری نسبت یہی گمان کرنا چاہئے۔ اس پر وہ بہت جھلائے اور
 چلے گئے اور پڑوس سے ایک رزائی یا ایک دری لے گئے۔
 تو ان کو یا ایسے لوگوں کو اگر کوئی بزرگ سمجھے تو اس کا تو کوئی علاج ہی
 نہیں۔ بزرگ تو یہ ہیں کہ حضرت عوث پاک صاحبؓ کے پاس ملک سخر نے
 لکھا تھا کہ میں ملک نیمروز کا ایک جزو آپ کے لئے مقرر کرنا چاہتا ہوں
 آپ نے اس کو نامنتور کیا اور لکھ دیا۔

چوں پتر سخری رخ بختم سیاہ باد در دل اگر بود ہوس ملک سخرم

پتھر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کا
و سوسہ بھی ہو۔

زانکہ یا فتح خیر از ملک نیم شب من ملک نیمروز بیکت بونی خرم
مجھے جرب سے ملک نیم شب کی سلطنت حاصل ہے نیمروز
کی سلطنت میری نظر میں ایک جو کے برابر بھی نہیں۔

نیم شب اور نیم روز کا کیا اچھا مقابلہ ہے۔ پس بزرگ تو دنیا داروں
کے دروازے پر کبھی نہ آتے ہوں گے اور دنیا دار اپنی دنیاوی حاجتیں
کر پچاس دفعہ اُن کے دروازے پر گئے ہوں گے۔ اب بتلایئے کہ ترک دنیا
کیسی چیز ہے کہ تارکین دنیا تو طالبین دنیا کے در پر نہیں جاتے اور طالبین
کو اُن کے در پر جانا پڑتا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بزبان حال
دنیا دار خود اقرار کر رہے ہیں کہ ترک دنیا اچھی چیز ہے۔ اور
اتتہ الدنیا وہی راعمہ اُن کے پاس دنیا خاک ملتی
اور ناک رگڑتی آتی ہے۔

کے یہی معنی ہیں کہ دنیا دار اُن کے پاس آتے ہیں۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ جو شخص دنیا کا طالب
ہو اور اس کو حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ تارک دنیا ہو جائے۔ خبر یہ
اس پر یاد آگیا تھا کہ لوگ دنیا کو ملعون کہنے سے بُرا مانتے ہیں۔

اصل مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ دنیا

احدیث اور محبوبیت کا فرق | مذمت نہیں ہے بلکہ حب و

کی مذمت ہے۔ دیکھئے اس میں بھی شریعت کا کتنا بڑا احسان ہے کہ حُرْبِ نِیَا کی قید لگا دی اور اُسی کی ممانعت کی اور مطلق دنیا کی ممانعت نہیں کی۔ اس سے زیادہ اور کیا رعایت ہوگی کہ اول تو یہیں سے اُسو پو نچھو دیئے پھر اور بھی سعادت کی کہ حُرْبِ میں بھی تفصیل کر دی یعنی حُرْبِ کے دو درجے قرار دیئے۔ اس میں سے صرف ایک درجہ کی ممانعت کی اور دوسرے درجہ کی ممانعت نہیں کی۔ اور یہ ایک آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَاَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وِتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وِمَسْكِنٌ اتْرَفْتُمْوهَا احِبَّ اليكُم مِّنْ اللّٰهِ وِرَسُولُهُ وِجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهِ۔

یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کینہ اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تخم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تخم پسند کرتے ہو تخم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں تو تخم منظور ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب بھیج دیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگر دنیا کی چیزیں اللہ رسول اور ان کے احکام سے زیادہ محبوب ہوں تو عذاب کے لئے تیار ہو جاؤ۔ پس اس آیت میں جس تعالیٰ نے ان چیزوں کی احب ہونے پر وعید فرمائی اور محبوب ہونے پر نہیں فرمائی

پس اس سے معلوم ہوا کہ نفس محبوبیت بھی مذموم نہیں ہے اور اس سے
 اس حُب دنیا کی بھی تفسیر کر دی جس کی حدیث
 حُب الدنیا راس کل یعنی دنیا کی محبت تمام گناہوں
 خطیہ کی جڑ ہے۔

دیگرہ میں مذمت فرمائی ہے کہ اس سے مراد اجدیت زیادہ محبوب ہونا
 کا وجہ ہے۔ اس آیت میں تو یہ بات مہرح ہے کہ نفس حُب مذموم نہیں اور
 ایک دوسری آیت سے بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو استنباط
 کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

زین للناس حب الشهوات من النساء والبنین والقناطیر
 المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسومة والانعام
 والحرمات ذلك متاع الحياة الدنيا والله عند حسن الحساب
 یعنی خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی عورتیں
 ہوئیں، بیٹے ہوئے، لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے چاندی کے
 نشان لگے ہوئے گھوڑے ہوئے، مویشی ہوئے اور زراعت
 ہوئی۔ یہ دنیاوی زندگی کی استعمالی چیزیں ہیں اور انجام کار کی خوبی
 تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

حضرت عمرؓ کے پاس جب سامان کسریٰ کا آیا تو کیر و ڈول روپے کا سامان
 تھا۔ آپ نے دیکھ کر یہ آیت پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں
 ان چیزوں کی محبت مزین کر دی گئی ہے یعنی محبت ان کی طبعی امر ہے اور

یہ سب حیات دنیا کا سامان ہے۔ سو دنیا کی محبت کو امر طبعی فرمایا۔ پس حضرت عمرؓ نے اس آیت کو پڑھ کر یہ دعا کی کہ اے اللہ! اس پر تو ہم قادر نہیں کہ دنیا کی محبت نہ رہے کیونکہ وہ امر طبعی ہے لیکن اے اللہ! ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ یہ محبت آپ کی محبت کی معین ہو جاوے مزا جم نہ ہو۔ پس اس میں فیصلہ کر دیا ہے کہ احبیت (زیادہ محبوب ہونا) مذموم ہے نہ کہ نفس محبوبیت اور احبیت کی تفسیر بھی کر دی کہ جو تیری محبت کے معارض ہو پس نتیجہ یہ نکلا کہ مال بھی اچھا، اُس کا کمانا بھی اچھا، اُس کی محبت بھی اچھی۔ اسی طرح جاہ بھی مگر ان کی احبیت بُری ہے۔ یعنی دنیا کو خدا و رسولؐ سے زیادہ محبوب نہ سمجھو

اس کی علامت یہ ہے کہ دین پر دنیا کو ترجیح نہ دو۔ اگر کسی صورت میں دنیا کے حاصل کرنے

محبت کی علامت

سے دین کا کوئی حرج ہوتا ہو اور خدا و رسولؐ کے حکم کے خلاف ہوتا ہو تو اس صورت کو چھوڑ دو چاہے دنیا کا کتنا ہی نقصان ہو کیونکہ خدا و رسولؐ کی محبت کی حقیقت کیا ہے۔ یہی تو ہے کہ ہر فعل و ہر قول میں اُس کی خوشی کو مقدم اور مطلوب سمجھیں اور اُس کا نام محبت نہیں ہے کہ کسی مضمون کو سن کر رونے لگے صرف رونے سے کیا ہوتا ہے۔

عربی اگر بگیرے طیر شدی وصال صد سال می توں بہ تمنا گر بسین

یعنی اگر رونے سے وصال محبوب ہو جا یا کیسے تو سو برس اس کی

آرزو میں رو سکتے ہیں۔

سو یہ محبت نہیں ہے کہ مضمون سن کر نور و دیتے ہیں لیکن نہ اتباع ہے نہ

عمل ہے۔ ہاں یہ بھی محبت کا ایک درجہ ہے مگر یہ درجہ مطلوب نہیں۔

تعصی الرسول وانت تظہر حبہ هذا العمی فی الفعال
بدیع لوکان حبک صادقا لاطعته ان المحب لمن یحب
یطیع۔

یعنی تم رسول کی محبت تو ظاہر کرتے ہو اور پھر ان کی مخالفت
بھی کرتے ہو۔ یہ عجیب بات ہے۔ ایسا کب ہو سکتا ہے اگر تم
کو واقعی محبت ہوتی تو تم ضرور ان کی اطاعت کرتے۔ کیونکہ جو
محب ہوتا ہے وہ محبوب کی اطاعت ہی کیا کرتا ہے۔

سو محبت نامور بہادر جس کا حکم کیا گیا ہو، یہ ہے اور جس کو آپ محبت سمجھ
رہے ہیں وہ تو فطری محبت ہے۔ ایسی محبت تو خدا اور رسول کے ساتھ ہر شخص
کو ہے حتیٰ کہ کفار کو بھی۔ اور یہ خدا کے ساتھ ہونا تو ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کو پہچانے
گا اس کو خدا تعالیٰ کے ساتھ فطری محبت ہوگی۔ باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ
ہونا، سو وہ اس لئے کہ جو لوگ دشمن ہیں وہ آپ کے اخلاق وغیرہ سے واقف
نہیں۔ ان کو حضور کی سوانح عمری صحیح طور پر نہیں پہنچی۔ تو حضور کو بھی جو پہچانے گا
اس کو آپ کے ساتھ محبت ضرور ہوگی۔ کیونکہ جو محبت کا منشاء ہے یعنی
اخلاق حسنہ وہ حضور میں اکمل اور اتم درجہ میں موجود ہیں۔ اس لئے خواہ مخواہ ایک
قسم کی محبت ہو جائے گی۔

مثلاً ستم سے ہم کو کیا تعلق ہے کچھ بھی نہیں۔ مگر بچپن میں جو ہم شاہنامہ پڑھا
کرتے تھے، اس میں اس کی شجاعت و بہادری کا ذکر دیکھ کر دل میں بے اختیار

محبت پیدا ہو گئی۔

سو کافر بھی اگر منصف ہو تو ضرور حضورؐ سے محبت کرے گا۔ پس اگر مسلمان نے بھی ایسی ہی محبت کی جیسی کافر بھی کرتے ہیں تو کیا کمال کیا مسلمان کی تو یہ حالت ہونی چاہئے کہ۔

زندہ کنی عطائے تو در بکشتی فدائے تو
دل شدہ مٹبائے تو ہر چہ کنی فدائے تو
یعنی اگر زندہ رکھیں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر
قربان ہوں۔ دل آپ پر فریفتہ ہو گیا ہے جو کچھ کریں آپ سے
راضی ہوں۔

پس محبت ایسی ہونی چاہئے لیکن آج کل یہ بات کہاں ہے جب ہم
اقوال و افعال میں حضورؐ کی مخالفت کرتے ہیں تو پھر ہم کو محبت کہاں ہوتی جا جو
اگر کسی کسی پر عاشق ہو جاویں تو پھر دیکھئے کہ کیا حال ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ کہے
کرنے کے لئے تیار، نہ مال کا خیال نہ عزت کی پروا۔ تو کسی کے عشق میں تو یہ
حال ہے۔

تو عاشق بچوں خودی زائب و گل
رُباید ہی صبر و آرامِ دل
یعنی تمہارا عشق اپنے جیسے پانی اور مٹی سے بنے ہوئے کے ساتھ
دل سے آرام و صبر کو دور کر دیتا ہے۔

اُس پر ایسے دیوانے ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ اپنے ہاتھ سے پیٹ بھی لے
تو گوارا ہے۔ اور کچھ رنج نہیں ہوتا۔ کیونکہ
نہ ساز و عشق را کبچہ سلامت
خوشنار سوانی کوئے سلامت

عشق گوشہ سلا متنی کی موافقت نہیں کرتا بلکہ کوشے ملا مرت کو چاہتا ہے۔ سو محبوب کے کوچہ کی رسوائی بہت اچھی چیز ہے۔

سو یہاں تو یہ حال ہے اور خدا اور رسول کی محبت میں یہ حالت ہے کہ زبان سے تو محبت کا دعویٰ ہے مگر اتباع نبوی میں ہزاروں خدشے کہ اگر ایسا کریں گے تو یوں طعن ہوگا۔ سو یہ کسی محبت ہے۔

اگر واقعی محبت ہوتی تو مخالفت ترک کرنے کے لئے اتنی ہی بات کافی تھی کہ بعضی روایات میں آیا ہے کہ ہر ہفتہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دو بار اُمرت کے اعمال پیش ہوتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمرت دعوت سے بھی بہت تعلق تھا تو بجز اُمرت اُجابت سے تو کتنا ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جتنا تعلق ہوتا ہے ویسا ہی اُس کی تباہی سے صدمہ ہوتا ہے اور دل دکھتا ہے۔ تو اگر ہم کو حضور کے ساتھ واقعی محبت ہوتی تو ہم محض اس خیال سے کہ جب حضور کے سامنے ہماری نافرمانیاں پیش ہوں گی تو حضور کا دل دکھے گا، اپنی ان حرکات سے باز آجاتے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی محبت مامور بہا یہ ہے کہ عمل اور اطاعت کی محبت ہو۔ پس جب یہ بات معلوم ہو گئی۔

تو اب یہ سمجھنا چاہئے کہ احادیث جو کہ مطلوبہ ہیں، اُس کی علامت کیا ہے۔ تو اگر

احادیث کی علامت

کا فیصلہ یہ ہے کہ دو حالتیں ہیں۔ ایک تو وہ کہ جہاں دونوں کا اجماع ہو سکتا ہے یعنی دین و دنیا دونوں حاصل ہو سکتے ہیں۔ تو اس حالت میں تو معلوم نہیں ہوگا کہ

ان میں زیادہ محبوب اُن کے نزدیک کون سی شے ہے۔ اور دوسری حالت یہ ہے کہ دین و دنیا میں تعارض ہو اور دونوں کا اجتماع نہ ہو سکتا ہو۔ تو اس حالت میں معلوم ہو جاوے گا کہ یہ کس کو زیادہ محبوب رکھتا ہے۔

دیکھئے اگر آپ کو دو دوستوں سے محبت ہو اور آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ان دونوں میں سے کس کی محبت زیادہ ہے تو یہ اُس وقت معلوم ہوگی جب کہ ان دونوں میں لڑائی ہو جاوے۔ جس سے زیادہ محبت ہوگی آپ اسی کے ساتھ ہو جاویں گے۔

اسی طرح دین و دنیا میں جب تعارض ہو کہ اگر دین کی رعایت کرنے ہیں تو دنیاوی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اور اگر دنیا کی طرف جاتے ہیں، تو دین کے خلاف ہوتا ہے۔ تو اس صورت میں اب جس کا اتباع کرو گے اسی کا احب ہونا متعین ہو جاوے گا۔ پس اگر اس صورت میں دین کو ترجیح دی تو ظاہر ہو جاوے گا کہ اس کو دین زیادہ محبوب ہے۔ اور اگر دنیا کو ترجیح دی، تو ظاہر ہو جاوے گا کہ اس کو دنیا زیادہ محبوب ہے۔ جس کی حق تعالیٰ نے ممانعت فرمائی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہر شخص پر یہی واجب ہے کہ ایسی صورت میں دین ہی کو ترجیح دے۔

لیکن اب ایک جماعت اس کے خلاف فیصلہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ دنیا کو لو اور دین کو چھوڑ دو۔ مسلمان کے قلم سے یہ فیصلہ نہایت ظلم کا فیصلہ ہے۔ اس پر شاید کوئی صاحب یہ شبہ کریں کہ نہیں، پہ تو کون کہہ سکتا ہے کہ دنیا کے مقابلے میں دین کو چھوڑ دینا سچا ہے مگر بعض مرتبہ مجبوراً چھوڑنا پڑتا ہے مثلاً

ایک نوکری ہے سو روپے کی اور ایک ہے پانچ سو روپے کی۔ مگر سو والی حلال ہے اور پانچ سو والی حرام۔ تو اب یہاں بوجہ اس کے کہ سو روپے میں اخراجات پورے نہیں ہوتے ہیں مجبوراً دین کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ تو یہ اس وجہ سے نہیں کہ دنیا دین سے زیادہ محبوب ہے بلکہ ضرورتوں سے مجبور ہو کر چھوڑتے ہیں۔ گو چھوڑتے ہوئے دل بہت دکھتا ہے۔ تو علماء سے جو اس کے متعلق کہتے ہیں سو وہ ایک فریاد ہے فیصلہ نہیں ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ فریاد عام نہیں بلکہ زیادہ تو وہ جماعت ہے کہ دین کے چھوڑ دینے سے اُن کا دل نہیں دکھتا اور نہ حسرت ہوتی ہے، نہ ندامت، نہ اپنے کو خطا وار سمجھتے ہیں بلکہ نہایت کوشش اور شوق سے یہ رائے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اور یوں کہتے ہیں کہ اب معاملات کو وسعت ہو گئی ہے لہذا اب احکام کو بھی بدل دینا چاہئے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ اب اخباروں میں بھی اس قسم کے مضمون شائع ہونے لگے چنانچہ مصر سے ایک اخبار آتا ہے اُس میں بھی ایک سُرخنی تھی۔

رعاية الاصلم فی الشوع شرع میں اصلاح کی رعایت

اور اس سُرخنی کے ذیل میں ایک مضمون اسی قسم کا لکھا ہوا تھا اور اُس کی عبارت عربی تھی تاکہ لوگ یہ خیال کریں کہ جب یہ عربی میں ہے تو ضرور صحیح ہوگا۔ مگر کیا عربی عبارت میں جو مضمون ہو وہ صحیح ہوتا ہے۔

اس پر مجھے یاد آیا کہ ایک ہمارے دوست تھے قاری مصنف الدین انہوں نے مجھ سے اپنا قصہ بیان کیا کہ جب علیہ المصلیٰ پڑھتے تھے اُس وقت

انہوں نے یہ مسئلہ پڑھا کہ کلام ناس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے پس آپ نے کیا کیا کہ ایک مرتبہ مغرب کی نماز ہو رہی تھی۔ امام کو سہو ہوا کہ پہلے قعدہ کو اخیر قعدہ سمجھ کر بہت دیر تک جلوس کیا۔ آپ نے سوچا کہ اردو میں تہلانے سے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ لاؤ عربی میں کہہ دو۔ پس آپ نے کہا فسر دکھڑے ہو جاتی خیر ان کے کہنے سے امام کو بھی یاد آ گیا کہ یہ پہلا قعدہ ہے اس لئے وہ کھڑا ہو گیا اور سلام پھیرنے کے بعد کہا کہ یہ فسر والے کون تھے۔ آپ بولے میں تھا۔ انہوں نے کہا تم نے نماز میں کلام کیوں کیا۔ آپ فرماتے کیا ہیں کہ میں نے تو عربی میں کہا تھا یہ کوئی کلام ناس بخوڑا ہی ہے جس سے نماز فاسد ہو جاوے۔ تب ان کو کلام ناس کا مطلب سمجھایا گیا۔

سو بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جو عربی میں ہو وہ سب ٹھیک ہے ابی عربی زبان میں تو گالیاں بھی ہیں تو گالیاں بھی ٹھیک ہیں۔ تو مضمون چاہے عربی میں ہو چاہے انگریزی میں اس میں سب یکساں ہیں کہ جو حق ہے حق ہے اور جو باطل ہے باطل ہے پس اس قسم کے پرچے نکلنے لگے ہیں۔

میں نے ایک زمانہ میں اخبار کے متعلق کچھ لکھا تھا کہ اخبار ہرگز نہ دیکھنا چاہئے۔ اس پر اعتراض ہونے لگے کہ جو صاحب اخبار کو بھی منع کرتے ہیں اور واقع میں اخبار کو منع نہیں کرتا بلکہ ان اشادات کو جو ایڈیٹر صاحب کی مثلاً خاص الخاص تحقیقات ہوتی ہیں۔ جو اکثر مذہب کے خلاف ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک اخبار میں دیکھا کہ یہ رائے دی گئی کہ مذہب کے اختلاف کو تو بالکل اٹھا دینا چاہئے۔ اس طرح کہ ایک مذہب پیچ پیچ میں تجویز کیا جائے

جس میں ہندو مذہب کی رعایت ہو اور اس کو توجیز بھی کر دیا کہ شاید اگلی نسلیں مان
 لیں۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو یہ چاہئے کہ صرف توحید لیں اور رسالت
 کو جزو مذہب نہ بنائیں اور دوسرے مذہب والوں کو چاہئے کہ کم از کم
 توحید کو ضرور مان لیں۔ اور لکھا تھا کہ اگر یہ مذہب عام ہو جائے تو یہ روزِ
 کی لڑائی کٹائی نہ ہو۔ سو ایسے لوگ بھی ہیں۔ میں تو ان کی نسبت کہا کرتا ہوں۔

گر بہ میر و نسک وزیر و موش را دیواں کنند

ایں جنیں ارکان دولت ملک اویراں کنند

یعنی اگر بلی حاکم، کتا وزیر اور چوہا دیوان کر دیا جائے تو یہ ارکان

دولت ملک کو ویراں کر دیں گے۔ یعنی نا اہلوں کو اگر دین کے

کام سونپے جاویں تو وہ دین کو برباد کریں گے۔

پس میں جو اخبار دیکھنے کو منع کرتا ہوں تو ایسے اخباروں کو۔ اور ان کو

دیکھنا واقعی مذموم ہے۔ اگر اخبار دیکھنے کا شوق ہو تو ان کے علمی مضامین جن

میں ایڈیٹر صاحبان کی تحقیقات اور مذاہب کے متعلق راہیں ہوتی ہیں، چھوڑ

دیا کرو۔ خیر اس کا ذکر تو استطراداً ہو گیا۔

اصل مقصود میر یہ تھا کہ زیادہ لوگ اسی قسم کے ہیں کہ وہ شوق سے ایسا

کہتے ہیں۔ ان کا دل نہیں دکھتا۔ پس ان کے دل میں تو دنیا کی اجدیت ظاہر

ہے۔ پس اس کا یہ کہنا تو فریاد ہو بھی نہیں سکتا۔ مگر کچھ لوگ پرانی وضع کے بھی ہیں

وہ الینہ اس کو نا جائز ہی سمجھتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ اگر اس صورت میں

دنیا کو چھوڑیں تو گاڑی اٹکتی ہے لیکن ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ کچھ تو ایسے ہیں

کہ جتنے اخراجات درحقیقت ضروری ہیں ان کے موافق تو آمدنی ہے، مگر فضول اخراجات بڑھا رکھے ہیں اور ان کی ضرورت گھٹتی گئی ہے۔ اس کا اندازہ یوں ہوگا کہ گھر میں جا کر دیکھو کہ کتنی چیزیں جمع ہیں اور ان میں کس قدر چیزیں کام کی آتی ہیں۔ عاقل شخص کو عرف کا پابند نہ ہونا چاہئے کہ آج کل موڈ سے کرسیاں وغیرہ بھی ضروری ہو گئی ہیں۔ پس جب آپ اس نظر سے چیزوں کو دیکھیں گے تو ادھی سے زیادہ چیزیں آپ کے گھر میں ایسی نکلیں گی کہ ان کے ہونے کی خبر بھی آپ کو نہ ہوگی۔ تو اب آپ ہی بتلائیے کہ کیا یہ چیزیں بھی ضروری ہیں۔ ضروری تو وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کے نہ ہونے سے تکلیف ہو اور ان کا معیار آسانی کے لئے بتلانا ہوں کہ جتنی چیزیں سفر میں انسان ساتھ لیتا ہے پس وہ ہیں ضروری سفر میں کیا کوئی ضروری چیز کم ہو جاتی ہے۔ نہیں بلکہ بعض چیزیں اس میں بھی ضرورت سے زیادہ فضول ہو جاتی ہیں۔ پس یہ ہے ضروری سامان۔ سو ظاہر ہے کہ ہر شخص کے گھر میں اتنا سامان نکلے گا جو اس مقدار سے بہت زیادہ ہوگا۔ اسی کو صائب کہتا ہے۔

حرم قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش

آنچه مادر کار داریم اکثرے در کار نیست

یعنی حرم کی وجہ سے قناعت نہیں ہے ورنہ اسباب معاش جو

ہمارے پاس موجود ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں جن کی ضرورت نہیں ہے

پس ضروری اخراجات تو معلوم ہو گئے۔ اب ان سے زائد جو کچھ ہووے

بیکار ہے۔ سو جن کو اتنا ملتا ہے، وہ تو یہ سوال کہہ ہی نہیں سکتے۔ اب وہ وہ

گئے جن کو اتنا بھی نہیں ملتا۔ اُن کی فریاد البتہ سُنی جاوے گی۔ اور کہا جاوے گا کہ میں آپ سے فی الحال اُس نوکری کے چھوڑنے کو نہیں کہتا مگر اتنا تو کیجئے کہ اپنے کو گنہگار سمجھئے اور استغفار کیجئے اور یہ دُعا کیجئے کہ اللہ مجھے اس سے نجات دےجئے اور حلال نوکری کی تلاش میں رہئے۔ اگر آپ حلال نوکری نہ ملنے کی وجہ سے پھر بھی اس میں مبتلا رہیں گے تو بھی کم سے کم اتنا تو فائدہ ہے کہ آپ دنیا کو ترجیح دینے والے تو نہ ہوں گے اور آپ کے اندر دنیا کی اجدیت تو نہ ہوگی اب اس کے بعد ترجیح کا کیا عذر رہا۔ اب تو سارے عذر ختم ہو گئے اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ دنیا کو ترجیح دینا کسی وقت بھی جائز نہیں۔

رعونت کی علامت

ایسے لوگ جن کو اتنا ضروری سامان بھی نہ ملتا ہو واقع میں بہت ہی کم ہیں ورنہ زیادہ تو ایسے ہی لوگ ہیں کہ اُن کو ضرورت نہیں۔

میں نے ایک منصرم کو دیکھا ہے جن کی پچاس روپیہ تنخواہ لیکن کچھری ہمیشہ پیادہ جاتے اور لوگ فٹن میں جاتے تھے اور دارسولوں میں چمڑے اور رشتہ داروں کی تنخواہیں مقرر کر رکھی تھیں اور جب اُن کی پنشن ہوتی تو اخراجات بھی اُدھے کر دیئے اور جتنا دارسولوں اور رشتہ داروں کو دیتے تھے اُس کو بھی اُدھا کر دیا۔ آخر یہ بھی تو اپنی ضروریات ٹھوڑے میں انجام دیتے ہی تھے۔ باقی رہا فٹن وغیرہ پر سوار ہونا تو یہ کون سے ضروریات سے ہے۔

میں تو فٹن کو فتن (فتنوں) میں داخل سمجھتا ہوں اور اس قسم کی جتنی بھی چیزیں ہیں ان میں کوٹ کوٹ کر کبر اور رعونت بھری ہے۔ وضع بھی ایسی سواری بھی

ایسی غرض ہر سامان میں سے رعونت ٹپکتی ہے اور جو شخص چاہے اس کا احساس کر سکتا ہے۔ جو لوگ ان کا استعمال کرتے ہیں ان کی حالت دیکھ لیجئے کہ ان کے اندر کسی رعونت آجاتی ہے۔

اس رعونت پر ایک قصہ یاد آگیا۔ ایک شخص ولایت سے پڑھ کر آئے تھے۔ وہ جب اپنے آبا جہان سے ملے تو کہتے ہیں ویل بڑھا تم اچھا ہے۔ پھر ایک تیسری بات اور بھی ہے کہ یہ فعل ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔ نئے فیشن کی جتنی چیزیں ہیں اکثر اسی قسم کی ہیں کہ ان سے خود ہی منتفع ہو سکتا ہے۔ دوسرے کو اس کا نفع نہیں ہوتا۔ چار پائی اور کرسی ہی کا فرق دیکھ لیجئے کہ چار پائی تو ایسی چیز ہے کہ اس پر اگر ایک جماعت بیٹھی ہو اور ایک آدمی اور آسٹے اس میں اس کی بھی گنجائش نکل آئے گی اور ایک کرسی ہے کہ اس میں اپنے ساتھ ایک کو بھی نہیں بٹھا سکتے۔ اسی طرح عامہ کہ اگر ہم چاہیں تو پھاڑ کر ایک حصہ اس میں سے اپنے بھائی کو دے دیں مگر آپ گلوبند میں سے تو پھاڑ کر دے دیجئے غرض نئے فیشن کی اکثر چیزیں وہ ہیں کہ ان میں سراسر خود غرضی ہے۔ تو خلاف ہمدردی ہی سمجھ کر چھوڑ دیجئے۔ یا اگر بالکل نہ چھوڑیں تو کم ہی کر دیجئے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم برا ہی سمجھ لیجئے۔

غرض کہ ان چیزوں میں بہت سے مفاسد ہیں اور سب سے بڑا مفاد یہ ہے کہ اخراجات بڑھتے ہیں۔ پس یہ تو ان کا بیان تھا کہ دنیا و دین میں تعارض ہونے کے وقت کیا برتاؤ کرنا چاہئے اور اسی طرح جاہ میں بھی معمول رکھنا چاہئے کہ جو صورتیں جاہ کی خلاف شریعت ہیں ان سے بچنا چاہئے۔

ضرورت کی چیزیں

بس اب شکایت یہ ہے کہ بچنا تو درکنار اس کو

بڑا بھی نہیں سمجھتے۔ تو اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ ایک تو علم کی کیونکہ جب تک ان کی بُرائی کا علم نہ ہوگا۔ تو اس وقت ان کو بُرا کیسے سمجھے گا۔ پس علم دین سیکھنا چاہئے خواہ اردو میں ہی ہو اور ایک عمل اور ہمت کی۔ اس پر تو عقلاً موقوف ہے۔ اور ایک تیسری چیز کی ضرورت ہوگی۔ اور وہ ضرورت عادی ہے۔ گو عقلاً وہ موقوف علیہ نہیں ہے اور وہ اہل اللہ کی صحبت ہے کیونکہ جس ہمت کی ضرورت مذکور ہوئی ہے۔ وہ ہمت اہل اللہ کی صحبت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ تو ضرورت اس کی بھی ہے کہ اہل اللہ کی صحبت میں جاوے۔ پس علم دین بھی حاصل کیجئے اور اہل اللہ کی صحبت بھی اختیار کیجئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سب ابو حنیفہؒ اور جنید بغدادیؒ ہو جاویں مگر ضروری علم دین تو حاصل کریں اور جب موقع ملتا جاوے اہل اللہ کی صحبت میں جا کریں اس سے جذبات و جانہ میں ایک قسم کی قوت پیدا ہوگی۔ اس سے آپ اپنی بُرائی حالت پر آئسو بہائیں گے اور اس کے جاتے رہنے سے آپ کو تاسف ہوگا۔ اور اصلاح کی فکر ہوگی اور یہ بھی اللہ و رسولؐ کی اجابت ہے۔

غرض جاہ ہو یا مال ہو ان کی اجابت نہ ہوتی چاہئے۔ اسی پر وعید فرماتے ہیں فترو لصبوا کہ منتظر رہو یہاں تک کہ کوئی وبال نازل ہو اور اس کا وبال دنیا میں تو یہ نازل ہوا کہ دنیا ہی سب سے اول برباد ہو رہی ہے۔ چنانچہ دنیا کو جس قدر طلب کرتے ہیں مگر وہی دنیا ہم سے چلی جا رہی ہے اور ہم تو کیا ہماری

سلطنتوں کی بھی یہی حالت ہے کہ دین کے چھوڑنے کی وجہ سے برباد ہو رہی ہیں اور وہ خود بھی اس کو سمجھ رہے ہیں کہ یہ تباہی دین چھوڑنے کی بدولت ہے اور کیوں نہ ہو دین چیز ہی ایسی ہے کہ اس سے آخرت بھی درست ہوتی ہے اور دنیا میں بھی ترقی ہوتی ہے۔

دیکھئے شیخ سنوسی ایک افریقی بدو تھے جو دین کی حمایت کے لئے آئے تھے۔ اب اُس کی بدولت صاحب سلطنت ہو گئے اور ایک وہ اسلامی قابہ سلطنت ہے کہ دین کے چھوڑنے کی وجہ سے دینی سہلی جا رہی ہے اور دین کا چھوڑنا اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ میں نے سنا ہے کہ اُس کی پارلیمنٹ میں ایک مرتبہ یہ گفتگو ہوئی کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہر فرقہ سے ہونے چاہئیں تاکہ رعایا میں مساوات رہے۔ پس جب کہ پارلیمنٹ کے اجزاء غیر مذہب کے لوگوں کو تیار کیا کہ جن پر خیر خواہی کا اطمینان بھی نہیں معن مساوات کے دعویٰ میں تو پھر ایسی سلطنت کو کیا عروج ہو سکتا ہے۔ بے شک شریعت مساوات سکھاتی ہے مگر مطلق مساوات نہیں بلکہ اس کی ایک حد مقرر ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری کا میرٹھی ایک نصرانی تھا جب وہ حضرت عمر فاروق سے ملنے آئے تو آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ آیت نہیں پڑھی۔
 لا تأخذوا بالثناة من دونکم
 لا یأیکم حسابا
 اپنا ہر اذمت بناؤ۔ وہ تم کو

ضرر پہنچانے میں کمی نہیں کریں گے۔

انہوں نے کہا کہ وہ حساب خوب جانتا ہے اس لئے ایسا کیا حضرت

عمر رضی نے فرمایا کہ کیا کام اس پر منحصر ہے۔ اگر وہ مرجائے تو پھر کیا کرے گا۔
آخر میں میں جا کر دیکھا کہ وہ مر گیا تھا۔ کیوں نہ ہو کوئی ایسی ویسی زبان ٹھوڑا ہی
تھی۔ وہ زبان تھی جس کی شان میں ہے۔

الحق ینطق علی لسان عمر
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان

پر حق بات جاری ہوتی تھی۔

غرض کہ غیر مسلم کو ہمارا بنانے کی حق تعالیٰ نے ممانعت فرمائی ہے اور
خود عقل بھی تو اس کی ایجادت نہیں دیتی۔ چنانچہ دیکھئے کہ روزمرہ کے معاملات
میں کیا ہم پسند کرتے ہیں کہ اپنے راز پر غیر کو مطلع کریں، بہرگاہ نہیں بعض اوقات
اپنے اسرار سے پیوی کو بھی مطلع نہیں کرتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے دین کو چھوڑا اور اس کی ایسی برکت ہوئی
کہ مدتوں بھی اس کا خمیازہ نہ بھولیں گے۔ واللہ لوگ سمجھتے تو یہ ہیں کہ دین کو
چھوڑ کر ترقی ہوگی مگر خدا تعالیٰ دکھلا دیتے ہیں کہ وہ بھی حاصل نہ ہوا جس کے
لئے انہوں نے دین کو چھوڑا۔ سو اس کا ہر سلطنت کی تو دین کے چھوڑنے
سے ایسی تباہی ہوئی اور ان بدوی کو دیکھئے جو دین کی حمایت کو آئے تھے
کہ وہ صاحب سلطنت ہو گئے اور یہ زندہ نظیریں ہیں اس امر کی کہ طالب دین
ہر طرح کی ترقی کر سکتا ہے۔ اور الحمد للہ کہ اب اس کو عقلا مان بھی گئے ہیں
لہذا تطویل کی ضرورت نہیں۔

پس احببت دین کی اعتقاداً تو ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور اگر

ممکن ہو تو عقلاً بھی ورنہ ناسفا ہی سہی۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کو چھوڑیے اور اگر

مجبوری کے سبب نہ چھوڑ سکیں تو بُرا تو کہئے۔ یہ ہے فیصلہ اس کا۔ اب میں اصل مقصود تو عرض کر چکا ہوں صرف آیت کے بعض اجزا کا حل رہ گیا ہے وہ بھی عرض کرتا ہوں۔

نفسیری نکات کہ مال کے قصہ میں تو منافقین کے اس قول کے جواب کے ختم میں۔

لا تفتقوا علی من عند رسول

یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہیں

ان پر مرت خروج کرو یہاں تک کہ وہ آپ منتشر ہو جائیں گے

لا یفقهون (وہ سمجھتے نہیں ہیں) فرمایا اور آگے جاہ کے قصہ میں ان کے جواب

کے خاتمہ میں لا یعلمون (وہ جانتے نہیں ہیں) فرمایا۔ اس میں ایک نکتہ

ہے کہ فقہ خاص ہے علم سے۔ فقہ تو خاص ہے امور خفیہ کے ساتھ اور علم عام

ہے جلی کے لئے بھی پس اب اس کی وجہ سمجھیں آگئی ہوگی۔ کیونکہ مال کے

قصہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

یعنی آسمان اور زمین کے تمام

وللہ خزائن السموات و

خزائنہ خدا تعالیٰ ہی کے اختیار

الارض

میں ہیں۔

سوا اس کے لئے تو سمجھ کی ضرورت ہے کیونکہ بظاہر تو وہ ہمارے

ہاتھوں میں ہے۔ پس یہاں تا مل کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر ہمارے ہاتھوں

میں ہونے کے اسباب کس کے ہاتھ میں ہیں۔ پس چونکہ یہ ذرا شخصی اور استدلال

کا محتاج تھا۔ اس لئے یہاں لا یفتقون فرمایا اور جہاں کے قصہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

وللہ العزۃ ولرسولہ و

یعنی عزت اللہ اور اس کے

للمؤمنین رسول اور مؤمنین ہی کیلئے ہے

اور یہ بالکل ظاہر تھا۔ خدا تعالیٰ کے لئے عزت ہونا تو اس لئے کہ عباد

کے اندر جو تصرفات ہوتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ہمارے اختیار میں نہیں۔ مثلاً

زلزلہ ہے اور بارش ہے۔ اب اگر کہتے کہ یہ سب کچھ صورت نوعیہ کی

سے ہوتا ہے تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اس بات کو تو وہ خود ہی تسلیم کرتے ہیں

کہ طبیعت اور نیچر ہی شعور نہیں تو میں کہتا ہوں کہ طبیعت کو فاعل قرار دینے

کی مثال ایسی ہوگی جیسے کہ دو شخصوں نے ایک خوبصورت گھڑی دیکھی۔ اس

پر تو دونوں کو اتفاق ہوا کہ اس کو کسی نے بنایا ہے لیکن اس میں اختلاف ہوا کہ

کس نے بنایا ہے۔ ایک نے تو یہ کہا کہ بالکل اندھے، لٹچے، لنگڑے بے شعور

نے بنایا ہے اور ایک نے یہ کہا کہ کسی بڑے عقلمند اور کامل گھڑی ساز نے

بنایا ہے۔ تو ظاہر بات ہے کہ یہ دوسرا شخص حق کہتا ہے تو جیسا ان دونوں

میں فرق ہے ایسا ہی مسلمان اور اہل کتاب میں فرق ہے کہ اہل اسلام تو ان

تمام مصنوعات عجیبہ کا اللہ تعالیٰ کو فاعل کہتے ہیں اور اہل کتاب طبیعت کو

جس کو کچھ شعور تک بھی نہیں۔ وہ خدا کے قائل نہیں اور اگر وہ یہ کہیں، کہتے

کہ ہم خدا کے بھی قائل ہیں اور طبیعت کے بھی۔ تو میں کہتا ہوں کہ جب خدا تعالیٰ

کو فاعل مانتے ہیں تو اس کے ساتھ طبیعت کے فاعل ماننے کی ضرورت ہی نہیں

ورنہ اس کی مثال ایسی ہوگی کہ کوئی کہے کہ اس گھڑی کو ایک کابل اور ایک
 اندھے نے مل کر بنایا ہے۔ تو اس ضمن سے کہا جاوے گا کہ کابل کے ساتھ
 اس اندھے کے ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پس ایک شخص جمع نہیں کر سکتا
 خدا اور سائنس کو۔ پس خدا کا غلبہ تو اس سے ثابت ہو گیا۔ اور حضور صلی اللہ
 علیہ وسلم کا غلبہ حضور کے واقعات سے ظاہر ہے۔ باقی وللمومنین یعنی
 مومنین کا غلبہ تو اس کو جب چاہے تجربہ کر لیجئے کہ جتنا ایمان ہوگا اتنی ہی عزت
 بھی ہوگی۔ چنانچہ صحابہ کرام اس کا نمونہ ہیں۔ ان کے ایمان کی حالت یہ تھی کہ
 حق تعالیٰ ان کے حق میں ارشاد فرماتے ہیں۔

الذین ات مکننا ہم فی الارض
 اقاموا الصلوٰۃ
 یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر
 ہم ان کو دنیا میں حکومت دے

دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں۔

اور ان کے غلبہ کی یہ حالت تھی کہ تمام قومیں اس کی قائل ہیں کہ ان کے
 برابر کوئی قوم ترقی یافتہ نہیں ہوئی۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ یہ نمونے بہت بُرائے
 ہو گئے ہیں تو اب بھی دیکھ لیجئے کہ جو مسلمان اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں ان
 کی کتنی عزت ہے خیر خواہان ترقی کی نگاہ میں بھی وہ محض نہیں ہے اور وجہ یہ
 ہے کہ اصل تو خدا کی عزت ہے۔ پھر جو لوگ ان کے ساتھ وابستہ ہوں گے،
 ان کی بھی عزت ضرور ہوگی۔ اگر کسی کو خدا ہی کی عزت کی خبر نہ ہو، تو دوسری
 بات ہے۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ مالک الاموال ہونا چونکہ کسی قدر محض تھا اس لئے

وہاں لا یفقہون (وہ سمجھتے نہیں) فرمایا اور صاحب عزت ہونا ظاہر تھا۔

اس لئے وہاں لا یعلمون (وہ جانتے نہیں) فرمایا۔

نیز اس سے ایک اور مسئلہ ثابت ہوا کہ مال تو اس واسطے ہے کہ اس سے انتفاع حاصل کیا جاوے اور جاہ اس واسطے ہے کہ اس کے ذریعہ سے اپنے کو ضرر سے بچایا جاوے نہ اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں پر وباؤ ڈال کر انتفاع حاصل کیا جاوے۔

اول کی تویہ دلیل ہے کہ جب منافقین نے کہا کہ مسلمانوں پر خرچ ممت کرو تا کہ جب کھانے کو نہ ملے گا خود منتشر ہو جاویں گے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ رد فرمایا کہ خزان کے مالک تو ہم ہیں تم اپنے مالوں سے ان کو منتفع نہ کرو گے تو ہم اپنے خزان سے ان کو دیں گے تا کہ وہ اس سے منتفع ہوں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ مال انتفاع کے لئے ہے۔

دوسری جزو کی یہ دلیل ہے کہ منافقین نے اپنے جاہ سے مسلمانوں کو ضرر پہنچانا چاہا تھا تو حق تعالیٰ نے اس پر رد فرمایا کہ عزت تو اللہ اور رسول اور مومنین کے لئے ہے یعنی چونکہ ہم نے ان کو جاہ عنایت کی ہے اس لئے تم ان کو ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ مومنین اس جاہ سے تمہارے ضرر کو رفع کر دیں گے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ جاہ دفع ضرر کے لئے ہے۔

اب میں بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے جو مضمون بیان سے مقصود تھا اس کا اعادہ پھر کئے دیتا ہوں کہ اس آیت میں یہ بات بتلائی گئی ہے کہ مال اور جاہ تو مذموم نہیں لیکن اگر ناجائز طور پر ان کا استعمال ہو، تو مذموم

ہیں۔ بس جو لوگ مال اور رباہ کو علی الاطلاق مذموم کہتے ہیں۔ اُن کو چاہئے کہ اس میں یہ
یہ قید لگا دیں۔ جو لوگ علی الاطلاق اچھا کہتے ہیں وہ سود استعمال کی صورت کو مستثنیٰ کریں
یہ تو تحقیق علمی معنی۔

مگر چونکہ مقصود عمل ہے اس لئے اب طرز عمل سننا چاہئے کہ جہاں دین
و دنیا میں تعارض نہ ہو وہاں خوب کماٹے اور جہاں تعارض ہو وہاں قدر ضرورت
سے زیادہ کو چھوڑے اور جہاں یہ بھی نہ ہو سکے وہاں تاسف کرے پس اب
اپس میں اختلاف بھی نہ رہے گا نہ گناہوں کے پورے جمع ہوں گے۔

اب میں اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ عمل
کی توفیق اور دین کی اجمہیت عطا فرمائے۔ و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ نبی خلیفہ
محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

تشمیر:- اور فرمایا کہ اول آیت میں

اللہ خزائن السموات

اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں خزانے

اسماؤں کے۔

فرما کر اموال کو اپنے ساتھ خاص فرمایا اور آیت ثانی میں عزت کو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے لئے بھی ثابت فرمایا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے
کہ مسلمانوں کا مالدار ہونا تو لازمی امر نہیں گو اتنا مال ہر ایک کو ملے گا جس سے اپنی
ضروریات پوری کر سکیں۔ اور اس قدر ملنا یہ بھی خود اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے
کیونکہ مقصود روکا یہ ہے کہ ان فتنائیں منتشر ہونا نہ ہوگا۔ اور یہ اس وقت ممکن
ہے کہ سماجیات مرتفع ہوتی رہیں، ورنہ اُن منافقین کا مقصود حاصل ہو جاتا۔ اور

صاحب عزت ہونا کامل مسلمان کا لازمی امر ہے۔ فقط!

اشرف علی!

احکام املا

مال کی آمد و نسیج کے احکام کے متعلق یہ وعظ ۱۲ رجب ۱۳۲۶ھ
 کو بھوپال ہاؤس لکھنؤ میں کر شی پر بیچ کر بیان فرمایا۔ ۵۰۰ کی حاضر
 تھی۔ پوسٹے پانچ گھنٹے میں ختم ہوا۔ شہر یوسفنا ولد سردار علی سکندر صاحب
 قاضیاں بجنور نے قلمبند کیا۔

خطبة بالوره

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله محمد وآل محمد ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل
 عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا
 من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له
 ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له و
 نشهد ان سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله آتبع
 فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن
 الرحيم ولا تأكلوا اموالكم بينكم بالباطل وتداولوا
 بها الى الحكام لتأكلوا فريقا من اموال الناس باثم
 وانتم تعلمون ط

معاملات میں معصیت | یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے
 معاملات، مالِیہ کی حفاظت اور اس کی تصحیح
 کے متعلق مضمون ارشاد فرمایا ہے۔ ضرورت اس وقت اس کے اختیار کرنے کی
 یہ ہوتی کہ کم و بیش دنیا ہر شخص کے پاس موجود ہے اور اس کو معاملہ کرنے کی ضرورت
 بھی واقع ہوتی ہے اور حق تعالیٰ نے معاملات مالِیہ کی تصحیح کا اہتمام فرمایا ہے
 پس ہر شخص کو تصحیح معاملات کی ضرورت ہے۔ مگر باستثناء شاذ کے کوئی اس کو ضروری
 نہیں سمجھتا اور یہ نہیں خیال کرتا کہ معاملات مالِیہ کی رعایت نہ کرنے سے کج معصیت
 ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں جو معاصی پیدا ہوتے ہیں ان کا ظاہر میں کوئی
 اثر معلوم نہیں ہوتا اور ان کے علاوہ جو معاصی ہیں ان کا اثر ظاہر میں بھی محسوس ہوتا
 ہے۔ پس اگر کسی کی حقائق پر نظر ہے تو وہ ان معاصی کا اثر اور ان کے قبائح دیکھ

کر مقبہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک غیبت ہی ہے کہ اُس کا اثر ہے تا اتفاقی ہو جانا آپس میں مناقشات پیش آ جانا۔ اُس کی وجہ سے پریشانی ہونا۔ اس لئے اس میں معصیت کا رنگ صاف نظر آتا ہے یا مثلاً ڈاکہ ہے کہ اس میں سزائیں ہوتی ہیں۔ یہ خرابیاں اس میں آنکھوں سے نظر آتی ہیں جو باعث ہو جاتی ہیں اُن کے قبیح سمجھنے کا۔ اس لئے انسان اُن کو چھوڑ دیتا ہے اور معاملاتِ مالیہ میں یہ صورت پیش نہیں آتی۔ اس لئے اُن کے معاصی ہونے پر مقبہ نہیں ہوتا۔ اگر حقوقِ مالیہ کے تلف ہونے پر بھی آثارِ ظاہر ہوتے اور رسوائی وغیرہ ہوتی تو اُن کے قبیح پر بھی مقبہ ہو جاتا جو محرک ہوتا اُن کے ترک پر۔ اگر دینی مصلحت کی وجہ سے ان سے محترز نہ ہوتا تو خیر دنیا ہی کی حفاظت کی غرض سے ہوتا مگر یہاں یہ بھی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اور جتنے معاصی ہیں اُن پر مقبہ ہونے کے اسباب مجتمع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اکثر اُن پر مقبہ ہو جاتا ہے اور یہاں یہ ہے نہیں اس لئے اُن کی ذمہ داری بھی پر و انہیں کی جاتی۔

عوام الناس کا تو فتویٰ ہی ہے کہ کفار کا مال جس طرح بھی ملے لیا جائے سب روا ہے۔ چنانچہ ریل

ریلوے کی حق متعلق

میں بے احتیاطیوں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس طرف توجہ ہی نہیں کہ تعداد سے زیادہ اسباب ریل میں سے جانا چاہئے یا نہیں؟ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ کفار کا قانون ماننا ضروری محذور ہی ہے مگر خوب سمجھ لیجئے کہ یہ کوئی قانون ملکی نہیں ہے جو یہ عدلہ کیا جائے بلکہ یہ قانون اجازت کے متعلق ہے۔ اگر من حیث السلطنت اس کا ماننا ضروری نہ بھی ہو تو من حیث الاستیجار تو ماننا ضروری ہے۔ شرائط اجارہ

میں سلطنت اور غیر سلطنت برابر ہیں جن شروط پر اجارہ قرار پائے۔ اُن کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے تو اُن کا قانون بحیثیت اجارہ تو واجب الامتثال ہے۔ جب اُنہوں نے قانون مقرر کر دیا ہے کہ پندرہ سیر سے زیادہ کسی کو اسباب بلا کر ایسے جانے کی اجازت نہیں تو اگر محفوظ اچھی اس سے زیادہ ہوگا تو بوجہ اس کے کہ غیر کی حق تلفی ہے اس کا لے جانا نہرگز جائز نہ ہوگا۔ بہت لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کفار کا مال ہے چاہے جس طرح تصرف کرو۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔

بعض لوگوں نے اس کی یہ وجہ گھڑی ہے کہ بہت سے حقوق ہمارے گورنمنٹ کے ذمہ رہ گئے ہیں۔ ہمیں جائز ہے کہ ہم خفیہ طور سے وصول کر لیں اول تو اس میں یہ بات ہے کہ ساری ریلیں گورنمنٹ کی نہیں ہیں۔ بہت سی ریلیں کمپنی کی ہیں۔ دوسرے اگر ساری ریلیں گورنمنٹ ہی کی ہوں تو کیا ہر شخص کا حق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گیا ہے اور پھر جن کے حقوق گورنمنٹ کے ذمہ ہوں بھی تو کیا اس کا حساب اُن کے پاس ہے کہ کتنے حق اُن کے گورنمنٹ کے ذمہ ہیں اور کتنے گورنمنٹ کے اُن کے ذمہ ہیں۔ یہ سب نفس کی تاویل ہیں بلکہ اگر ثابت بھی ہو جاوے کہ اُس کا حق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گیا ہے تب بھی حفاظت نفس کا تقاضا یہی ہے کہ ایسا نہ کیا جاوے۔

ناز اس کا یہ ہے کہ نفس کو جیسی عادت ڈالی جاتی ہے ویسی ہی پڑ جاتی ہے۔ اگر اس کی عادت ڈالی گئی تو اس کا خوگر ہو جاوے گا اور آئندہ حد سے تجاوز کرے گا۔ جہاں قطعاً جائز نہ ہوگا وہاں بھی اس عادت پر کار بند ہوگا نفس کو تو ذرا سا بہانہ چاہیے۔

حدیث میں ہے۔ لعن الله السارق يسرق البیضة

فتقطع یداه ویسرق الخبیل فتقطع یداه یعنی اللہ

ہاتھ کاٹنے کی سزا

چور پر لعنت کیسے کہ وہ ایک انڈا چراتا ہے اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور ایک رسی چراتا ہے اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔

اس حدیث میں اشکال یہ ہوتا ہے کہ ایک انڈا چرانے سے یا رسی چرانے سے ہاتھ کہاں کاٹا جاتا ہے۔ ہاتھ کاٹنے کا نصاب تو اس سے زیادہ ہے اور

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک انڈے اور ایک رسی پر ہاتھ کاٹنے پر فرما رہے ہیں۔ ہمارے (یعنی حنفیہ کے) نزدیک قطع ید کا نصاب دس درہم ہیں۔ دوسرے

ائمہ کے نزدیک اس کی اور مقدار ہے۔ بہر حال اہل مذاہب متبوعہ میں کوئی ایسا نہیں کہ جس کے نزدیک اس کا کوئی نصاب نہ ہو۔ اور انڈے اور رسی چرانے پر

اہل مذاہب متبوعہ میں سے کسی کے نزدیک بھی قطع ید نہیں آتا۔ اس لئے اس حدیث کا ماول کرنا واجب ہوا کہ اس کو ظاہر سے منصرف کیا جاوے۔ میں

بعض نے کہا کہ بیضہ سونے کا مراد ہے جس کی قیمت نصاب سے بھی زائد ہے اور بعض نے کہا کہ بیضہ سے مراد خود ہے۔ خود لوہے کی ٹوپی ہوتی ہے جس کو

سسر پڑھیں لیتے ہیں تاکہ تلوار اٹرنہ کرے۔ وہ اتنی قیمت کی ہو سکتی ہے جس پر قطع ید آوے۔ اسی طرح بعض نے جبل سے مراد جبل سفینہ لیا ہے کہ وہ اتنی

قیمت کی ہو سکتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اتنی حقیر چیز پر قطع ید ابتدائے اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ یہ سب بعید تاویل ہیں۔ ہمارے اتناؤنے جو تاویل

فرمائی ہے وہ جی کو لگتی ہے اور ظاہر حدیث سے کچھ بعید بھی نہیں۔ تو جب

تک کہ قباور معنی بن سکیں غیر قباور کی طرف کیوں جائیں۔

میرے استاد فرماتے ہیں کہ حدیث میں بیضہ اور جل کے وہی معنی مراد ہیں جو متعارف ہیں یعنی انڈا اور رسی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس سے معصیت کی عادت ہوتی ہے اور بڑی معصیتوں کا باب کھلتا ہے۔ جو چور بد معاش ہوتے ہیں وہ اول چوری پیسہ پیسہ سے شروع کرتے ہیں۔ جب وہ کھپ گیا آگے جرات ہوتی۔ پھر اور آگے چلے یہاں تک کہ ایک روز اس کی نوبت پہنچی کہ ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ یعنی کسی زمانہ میں انڈا یا رسی چرائی تھی آج یہاں تک نوبت پہنچی کہ اتنا مال چرایا کہ جس پر قطع ید کا حکم آ گیا یہ مطلب ہے اس حدیث کا۔

اسی وجہ سے مشائخ بعض کو روکا کرتے ہیں بعض مباحات سے اور مباحات

استعداد نفس اور نور فراست

کی تقلیل کراتے ہیں کہ کہیں نفس مباحات سے گزر کر آگے نہ چلنے لگے۔ گو بعض موقع پر توسع بھی کرتے ہیں۔ وہ تو طلبیب ہیں کہیں زیادہ وسعت کرنے سے تزکیہ ہوگا نفس کا ردائل سے اور کہیں تنگی کرنے سے۔ اس لئے جہاں وسعت کا موقع ہوتا ہے وہاں وسعت کرتے ہیں اور جہاں تنگی کا موقع ہوتا ہے، وہاں تنگی کرتے ہیں۔ وہ ماہر فن ہیں۔ باقی دو چار لفظ کے جاننے سے کہیں دین کا فن ٹھوڑا ہی آسکتا ہے۔ اس کا موقع ہر ایک کو نہیں معلوم ہو سکتا کہ کہاں وسعت کی حاجت ہے اور کہاں تنگی کی۔ مشائخ کی صحبت میں رہ کر خود اس کا مشاہدہ کرو گے اور ان کے یہاں مختلف واقعات دیکھو گے مثلاً کسی کو دیکھو گے کہ وسعت

دی جا رہی ہے اور دوسرے شخص کو دیکھو گے کہ اُس کو ممانعت کی جا رہی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ جو ان سے اصلاح کا طالب ہوتا ہے وہ اُس کے استغداد نفس کو سمجھتے ہیں۔ اُن کو خدا تعالیٰ نے اس کی ایسی فراست عطا فرمائی ہے کہ اس فراست میں اُن کا کوئی شریک نہیں۔ تمام عقلاء جمع ہو جائیں مگر وہ نور فراست کہاں سے لائیں گے جو اُن کو عطا ہوا ہے۔ اُن کو یہ فضیلت ہے اور وہ اسے جس کی وجہ سے وہ تجویز کرتے ہیں کہ اس کے لئے یہ مناسب ہے اور اُس کے لئے یہ۔

وسعت ایسی جگہ کرتے ہیں جیسے حکایت ہے کہ کسی چور نے ایک رنگ سے بیعت کی۔ اور چوری سے توبہ کر لی۔ اُن بزرگ نے اُس کو اجازت دے دی خانقاہ میں رہنے کی۔ مرید صاحب روز رات کو کیا کرتے کہ لوگوں کے جوتے لوٹ پوٹ کیا کرتے۔ کسی کا جوتنا کہیں رکھ دیتے اور کسی کا کہیں اب لوگ حیران کہ یہ کون جوتوں کو اول بدل کر جاتا ہے۔ آخر ایک روز اُن کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے دیکھ لیا اور پکڑ کر صبح کو شیخ کے سامنے لا حاضر کیا اور کہا کہ جوتوں کو الٹ پلٹ کرنے والے یہ مرید ہیں آپ کے۔ شیخ نے اُن سے کہا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ مرید صاحب نے کہا کہ بات یہ ہے کہ مجھ کو چوری کی عادت تھی۔ میں نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کر لی۔ جب رات آتی ہے تو طبیعت میں تقاضا ہوتا ہے کہ چوری کر دوں۔ بے خدا تقاضا ہوتا ہے۔ ہر چند چاہتا ہوں کہ جی سے بھلا دوں مگر نہیں جاتا۔ اور چوری سے کر چکا ہوں توبہ۔ اس لئے میں چوری کی نقل بنا کر جی کو پہلا دیتا ہوں کہ جوتے ادھر کے ادھر اور ادھر کے

ادھر کر دیتا ہوں اور کہا کہ لوگوں کو اس سے تکلیف تو ہوتی ہے مگر اس سے میرے دین کی حفاظت رہتی ہے۔ یہ اندیشہ ہے کہ اگر ایسا نہ کروں تو شاید پھر چوری کرنے لگوں۔ شیخ نے اُس کو اجازت دے دی کہ اچھا تم کر لیا کرو اگر کوئی دوسرا شخص اس حرکت کو کرنے لگے تو اُس کو روکا جائے گا۔

اسی واسطے شیخ کے ساتھ مزاحمت نہیں چاہئے۔ وہ ماہر اور تجربہ کار ہے جو بھی فیصلہ کرتا ہے بصیرت سے کرتا ہے۔ ہر شخص اُس کو سمجھ نہیں سکتا اُس سے الجھنا کہ یہاں ایسا کیوں کیا اور وہاں ایسا نہ کیا۔ یہ مناسب نہیں شیخ کہیں تنگی کرتا ہے اور کہیں وسعت اور وہی اُس کو سمجھتا ہے کہ یہاں موقع تنگی کا ہے اور یہاں وسعت کا۔ دوسرا شخص نہیں سمجھ سکتا۔

بہر حال اگر ثابت بھی ہو گیا کہ گورنمنٹ کے ذمہ ہمارا حق رہ گیا ہے جب بھی زیادہ اسباب نہ لے جانا چاہئے کیونکہ ایسا کرنے سے نفس کو اس کی عادت پڑتی ہے اور عادت ہونے سے اپنا حق وصول ہو جانے پر بھی نہیں چھوڑے گا۔ پس مقتضا معا لوجہ کا یہی ہے کہ گو ہمارے حقوق بھی گورنمنٹ کے ذمہ ہوں تب بھی ایسا نہ کریں۔

میرے پاس کثرت سے ایسے خطوط آتے ہیں کہ جن پر یا تو ڈاکخانہ کیپس کی مہر ہی نہیں ہوتی یا ہوتی بھی ہے تو ٹکٹ سے سچی ہوتی ہوتی ہے۔ اگر میری بڑی نیت ہو تو میں ان ٹکٹوں سے منتفع ہو سکتا ہوں کہ دوسرے خطوط پر لگا کر بھیج دوں مگر شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ کیونکہ جو دو پیسے لفافہ کے ویٹے گئے ہیں وہ اجرت کے طور پر ہیں اور وہ لفافہ کی شکل اصل

میں رسید ہے ان دو پیسے کی۔ پس جب ڈاک پہنچی تو وہ دو پیسے وصول ہو گئے۔
اب اس رسید سے دوسری بار وصول کرنا حرام ہے۔ پس میں ایسے ٹکٹوں کو
چاک کر کے پھینک دیتا ہوں۔ باوجودیکہ مجھ کو اس کی عادت ہو گئی ہے مگر پھر
بھی وسوسہ ہوتا ہے کہ شاید تقوے ظاہر کرنے کو ایسا نہ کرتا ہوں۔ حضرت نفس
کی کیفیت یہ ہے۔

نفس اثر راستا و کے مردہ است از غم بے آلتی افسردہ است

نفس کے کپڑے کبھی غافل نہ رہنا چاہئے۔ ہر وقت ہوشیار رہے۔
حضرت حاجی صاحبؒ اس قول کے کہ الخمر سود المظن یعنی ہوشیاری
یہ ہے کہ اپنے نفس سے بدگمان رہے عجیب معنی ارشاد فرماتے تھے کہ سودظن
سے مراد سودظن بنفسہ ہے یعنی یہ مطلب نہیں کہ دوسروں سے سودظن رکھے بلکہ
اپنے ساتھ تو یہ معاملہ ہو کہ ہر بات میں بدگمان رہے کہ کہیں اس میں نفس کی نثرات
نہ ہو اور دوسروں کے ساتھ یہ کہ ہر شخص کو اپنے سے اچھا سمجھے۔ باقی شیخ سعاری
علیہ الرحمۃ نے بوستان میں جو فرمایا ہے۔

نگہ داره دال شوخ در کبیدہ در کہ داند ہمہ خلق را کبیدہ بر

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سودظن پر آئادہ کر رہے ہیں بظاہر ان کا
کلام قرآن و حدیث کے معارض معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے ان بعض الظن
اشرا و حدیث میں ہے ظنوا المؤمنین خیراً اور پھر ان کے کلام کے بھی
معارض ہے کیونکہ گلستان میں فرماتے ہیں۔

ہر کہ را جامہ پارنا بینی پارسا وال و نیک مردنگار

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کا ظاہر اچھا ہو اس کو اچھا سمجھ اور بوستان
کے کلام سے یہ پایا جاتا ہے کہ سرب کو برا جانے۔ گلستان کی اور تعلیم اور بوستان
کی اور۔ یہ کیا بات ہے؟

جواب یہ ہے کہ شیخ کا مطلب یہ نہیں جو تم سمجھے۔ بدگمانی کے دو درجے
ہیں۔ ایک بدگمانی ہے اعتقاد کے درجہ میں کہ دوسرے کو برا سمجھے اور ایک بدگمانی
ہے عمل کے درجہ میں یعنی معاملہ ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی کرے جیسے بدگمانی
کی صورت میں کرتا تو ممانعت تو ہے بدگمانی کی باعتبار اعتقاد کے اور مشورہ ہے
بدگمانی کا باعتبار معاملہ کے۔ سو بوستان کے اس مصرعہ کے معنی کہ

واند ہمہ خلق را کیسہ بر

یہ ہیں کہ معاملہ سرب کے ساتھ ایسا ہی کرے جیسا کہ بدگمانی میں کیا کرتے ہیں

واند اعتقاد کی رو سے نہیں بلکہ معاملہ
کے اعتبار سے ہے۔ مثلاً ایک شخص

دروغ مصلحت آمیز کے معنی

سو روپیہ قرض لینے آیا مگر ہمیں تجربہ نہیں اس کا کہ یہ شخص معاملہ کا کیسا ہے تو میں
اس گمان کرنے میں کچھ حرج نہیں کہ نہ معلوم یہ شخص کیسا نہیں کیسا ہے۔ دین دار
ہے یا نادہندہ۔ اگر ہم جھوٹ بھی بول دیں کہ روپیہ ہمارے پاس نہیں ہے تو
بھی گناہ نہ ہوگا کیونکہ یہ شخص اپنے کو غرر سے بچا رہا ہے۔ دوسرے کو غرر نہیں
نہیں دے رہا۔ اس جھوٹ سے گناہ نہیں ہوتا۔ یقین مانتی ہیں۔

دروغ مصلحت آمیز باز راستی فتنہ انگیز

کے اور یہ عام نہیں ہے کہ ہر مصلحت میں جھوٹ بول دیا کرے۔ مصلحت سے

مطلق مصلحت مراد نہیں بلکہ جس دروغ میں دوسرے کا ضرر نہ ہو اور اپنا یا کسی اور کا اس سے ضرر دفع ہوتا ہو شیخ نے اس کو مصلحت سے تعبیر کیا ہے۔

مثلاً کوئی شخص کسی ظالم کے خوف سے چھپا ہوا ہے اور اس کو معلوم ہے اور وہ ظالم تلاش کرنے آیا اور اس سے پوچھا۔ اس نے کہہ دیا کہ مجھ کو خبر نہیں تو یہ جائز بلکہ واجب ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دوسروں سے بدگمانی معاملہ کے اعتبار سے ہونا اعتقاداً ہاں اپنے نفس سے ہر حالت میں بدگمان ہے۔

ہمارے حضرت فرماتے تھے کہ کوئی کتنا ہی شیخ کل کیوں نہ ہو جاوے مگر جب بھی مامون نہ رہے نفس پر۔ اس کی

نفس کی نگرانی

طرف سے ہمیشہ بدگمان ہی رہے۔ نفس کی حالت یہ ہے کہ نسبت راسخ ہو جانے کے بعد بھی وساوس گھیرتے ہیں اور وساوس کی مقاومت نہ کی جائے تو ان پر عمل ہو جاتا ہے۔ پس نفس کو وسعت ہرگز نہ دینی چاہئے۔ وسعت دینے سے عادت ہو جاتی ہے آگے بڑھنے کی۔ نفس کی روک تھام نہایت ضروری ہے اس لئے اگر پندرہ سیر سے زیادہ اسباب لے جانے میں گنجائش بھی ہو تو بھی اس مصلحت سے بچنا چاہئے کہ کہیں نفس کو عادت نہ ہو جاوے۔ عادت کے بعد نفس کو روکنا مشکل ہے۔ پھر اگر کہیں گنجائش نہ ہوگی تب بھی نفس نہ رے گا۔ یہ نفس پڑا ہی شریہ ہے۔ اس سے تو کبھی غافل ہونا ہی نہ چاہئے۔ اسی واسطے حضرات اہل اللہ باوجود نسبت راسخ ہو جانے کے بھی ہمیشہ نفس کی نگرانی کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے کون زیادہ ہو گا جن کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فی الجنة فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بالکل سچا

ہے۔ آپ سے سُن لینے کے بعد میں ظاہر ہے کہ اُن کو اس کی صحت کا یقین ہو گیا ہوگا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ اگر ہمارے لئے ایسی بشارت ہو تو ایسے بے فکر ہو جاویں کہ کوئی گناہ نہ چھوڑیں۔ سمجھیں کہ جنت کے مستحق ہو ہی گئے۔ بس خوب مزے اڑائیں اور خیال کریں کہ اب ڈر کس بات کا ہے۔ دوزخ سے بچ گئے جنت مل گئی۔ گناہوں سے ضرر ہی کیا ہے مگر اُن حضرات کی شان دیکھئے کہ باوجود ایسی قطعی بشارت کے سُن لینے کے اُن کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت عمرؓ نے مدح سے نفس میں ذرا سا تغیر دیکھا تو اُس کا علاج کرنے کے لئے پانی عوام کے گھروں میں بھرتے پھرتے تھے۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر عرض کیا کہ آپ نفس کو اتنی مشقت میں کیوں ڈالتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اُنج روم سے دو قاصد آئے تھے انہوں نے میری تعریفیں کیں کہ ہم نے آپ کے عدل کی بڑی شہرت سنی ہے۔ اس سے مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے نفس میں عجب نہ پیدا ہو جائے تو نفس کے علاج کے لئے میں پانی بھر کر پلا رہا ہوں۔ نفس مجھ پر ظلم کرتا ہے میں نے اُس کی یہ سزا تجویز کی تاکہ اترانے نہ پائے۔

اب حضرت علیؓ کا قصہ سنیئے۔ آپ نے ایک دفعہ کرتا پہنا۔ اُس کے پہننے سے نفس میں کچھ تغیر ہوا۔ منظر میں بھلا معلوم ہوا۔ بس قبلی منگا کر ادھی ادھی اسپینیں کاٹ ڈالیں۔ اُس کو بد شکل کر دیا۔ تاکہ نظروں میں پسندیدہ نہ رہے۔ ان حضرات کی نفس کی نگرانی میں یہ حالت تھی اور یہ احتیاط تھی کہ ذرا سا بھی تغیر پانے تھے تو بے چین ہو جاتے اور اُس کا علاج کرتے۔ یہاں تو وہ درود کا سامعہ ہے کہ جو اُوے کھپ جاوے۔ جیسے وہ درود میں نجاست کھپ جاتی ہے

خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کی تاویلین کر کے کفار کا مال حجاز کی لیتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں سہارنپور سے کانپور جاتا تھا۔ میں نے

سہارنپور سے پونڈے ساتھ لے جانے کو خریدے۔ وہ تھے وزن میں زیادہ

میں نے ان کو تلوانا چاہا تا کہ محصول دے کر لے جاؤں۔ بیل کے بابو نے کہا،

مخوڑے سے ہیں لے بھی جاؤ۔ میں نے کہا کہ یوں تو آپ کی اجازت معتبر

نہیں اور پھر یہ کہ اگر راستہ میں کوئی تو لے لگے۔ وہ بوسے کہ میں گارڈ سے کہہ دوں گا

میں نے کہا یہ گارڈ کہاں تک جائے گا۔ کہنے لگے کہ غازی آباد تک۔ میں نے

کہا کہ آگے کیا ہوگا۔ کہا کہ یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا اور وہ کلکتہ

تک جائے گا اور کانپور راستہ میں پڑے گا۔ میں نے کہا کہ کانپور کے بعد کیا

ہوگا۔ اس نے کہا کہ آگے تو آپ کو جانا نہیں۔ میں نے کہا کہ ابھی سفر ختم نہیں ہوا

آخرت کا سفر باقی ہے اگر وہاں پکڑ ہوئی تو کیا ہوگا۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ سے

کہہ دے تو خیر لے جاؤں۔ عرض میں محصول دے کر گنوں کو لے گیا۔

میں یہ واقعہ بیان نہ کرتا کبھی کوئی کہنے لگے کہ اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں

اپنی تعریف کرتے ہیں مگر میری عرض یہ ہے کہ واقعات کے سننے سے قلوب

میں اثر خوب ہوتا ہے۔ اس لئے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس کام کو کرنے

والا میں ہی نہیں۔ اللہ کے بندے بہت کثرت سے ایسے بھی موجود ہیں۔ میں تو

ادنیٰ سے بھی ادنیٰ شخص ہوں۔ مگر الحمد للہ مجھ کو اس کا خیال ہے۔ تو جو متقی اور

پرہیزگار ہیں وہ کیوں نہ خیال کریں۔

اہل علم کی بے احتیاطی اکثر کا یہ حال ہے کہ وہ بالکل ان امور میں احتیاط نہیں کرتے۔ عوام الناس تو عقلمند سے کہتے ہیں کہ ان کو خبر نہیں کہ یہ ناجائز ہیں اور اہل علم اس کو جائز کر کے کہتے ہیں۔ چنانچہ میں اس کا ایک قصہ سنا تا ہوں۔

وہ یہ ہے کہ میں اور ایک معقولی طالب علم ریل میں سفر کر رہے تھے۔ ایک شخص نے سنا کہ وہ اس ریل میں سوار ہیں۔ ہم تو درمیانہ درجہ میں تھے اور وہ تیسرے درجہ میں۔ یہ شخص محبت سے ہمارے پاس آ بیٹھے۔ دو ایک اسٹیشن تک بیٹھے رہے۔ اس کے بعد اتر کر اپنے درجہ میں جانے لگے۔ میں نے ان سے کہا کہ تم نے اتنی مسافت درمیانہ درجہ میں قطع کی ہے اور تمہارے پاس ٹکٹ ہے سو م کا۔ اتنی مقدار محصول کی تمہارے ذمہ دین ہے۔ تم اس کو ادا کر دینا اور آسان ترکیب بتلا دی کہ اتنی مسافت کا جس قدر محصول درمیانہ درجہ کا سوم سے زائد ہے اس کا ٹکٹ اسی لائن کا خرید کر چاک کر دینا۔ بس ادا ہو جائے گا۔ اس پر وہ معقولی طالب علم صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

فقہ اور اہل علم فقہ کا مسئلہ ہے کہ منافع غصب مضمون نہیں ہوتے مثلاً کوئی کسی کے گھوڑے سے پر زبردستی سوار ہو کر چل دے تو اس کا کر ایہ نہ دینا پڑے گا۔ ہاں اگر معصوب عین ہو اور اس کو تلف کر دے تو ضمان لازم آتا ہے۔

انہوں نے جو یہ بات کہی مجھ کو سن کر حیرت ہوئی کہ جب اہل علم ہی ایسے

فتوے دیں گے تو پھر عوام کی کیا حالت ہوگی۔ ایسے ہی لوگ بدنام کرتے ہیں فقہ کو۔ اب جو شخص فقہ ہی کا قائل نہ ہو اس سے تو ہماری گفتگو ہی نہیں اور جو فقہ کا قائل ہے تو وہ فقہ کی کتابیں کھول کر دیکھے کہ فقہا کا کیا مقصود ہے اصل یہ ہے کہ اس موقع پر دو مسئلے جُدا جُدا ہیں۔ ایک یہ کہ منافع منسوب کو تلف کرنے سے گناہ ہوگا یا نہیں۔ اور ایک یہ کہ اس پر ضمان لازم آئے گا یا نہیں۔ تو فقہاء گناہ کی نفی نہیں کرتے صرف ضمان کی نفی کرتے ہیں یعنی یہ نہیں کہتے کہ گناہ نہ ہوگا۔ گناہ ضرور ہوگا لیکن ضمان لازم نہیں آئے گا۔

فقہاء کے پاس اس کی دلیل موجود ہے جس کو اہل علم سمجھ سکتے ہیں۔ وہ یوں کہتے ہیں کہ عقد اجارہ ایک عقد ہے اور عقد کا عقلی مقتضایہ ہے کہ بدلین میں تناسب ہونا چاہئے۔ اگر کوئی چیز خریدیں تو اس چیز میں اور اس میں جو اس کے عوض میں دی گئی ہو تناسب ہو اور جہاں بدلین میں تناسب نہ ہو، تو قیاس کے مقتضی سے وہ مبادلہ صحیح نہ ہوگا۔

جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب سنئے کہ منافع کا مبادلہ ثمن سے قیاس کے بالکل خلاف ہے کیونکہ ایک طرف تو عین ہے یعنی ثمن اور ایک طرف عرض یعنی منافع کسی چیز کے اور اعیان و اعراض میں مماثل نہیں ہے۔ اس لئے ایک دوسرے کا بدل نہیں ہو سکتا۔ تو قیاس تو یہ چاہتا تھا کہ منافع کا مبادلہ ثمن سے کسی صورت میں بھی جائز نہ ہو مگر چونکہ عقد اجارہ میں اس مبادلہ کو لفظ جائز بتلا رہی ہے اس لئے فقہاء نے عقد اجارہ کے اندر قیاس کو چھوڑا اور حدیث کو اختیار کیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے سامنے

ہمارا قیاس کوئی چیز نہیں اور جہاں عقد نہ ہو جیسے کہ منافع کے غنڈب کی صورت میں اس کے اندر کوئی نقص نہیں ہے جو ازا کی جو قیاس کے چھوڑنے پر مجبور کئے یعنی بغیر عقد میں نقص ہی نہیں اس لئے وہاں بمقتضائے قیاس اس مبادلہ کی عدم صحت کے قائل ہوئے اور منافع منصوب کو مضمون نہ ٹھہرایا۔ یہ تحقیق ہے اس مسئلہ کی کہ منافع منصوب مضمون نہیں۔

ان مولوی صاحب نے اس مسئلہ سے کام لیا مگر اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ گناہ بھی نہ ہوگا۔ اس پر تو انہوں نے نظر کی کہ ضمان نہیں آتا اور اس پر نظر نہ کی کہ گناہ ہوتا ہے اور اس گناہ کی تلافی یہی ہے کہ اس کا بدلہ ادا کر دے کیونکہ یہ گناہ حقوق العباد سے ہے جو مال کے متعلق ہے۔ اسی واسطے علم ہر ایک کے لئے نافع نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ اس پر نظر کرتے ہیں کہ کسی کے واسطے علم مضر ہوگا۔ جس کو مضر ہوتا ہے اس کو درسیات سے محروم رکھتے ہیں زبانی تعلیم بقدر فرض عین کے اس کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ اسی کے بارہ میں تو مولانا فرماتے ہیں۔

بد گہرا علم و فن آموختن دادن تیغ سنت دست بہرن
یہ تو قاعدہ کلیہ فرمایا۔

اس کے بعد تفریح کے طور پر کہتے ہیں۔

چون قلم در دست غدارے قرار لاجرم منصور بردارے قرار
یعنی دیکھو، بد گہر کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک غدار کو جب حکومت

کے اختیارات ملے تو اُس نے منصور کو وار پر پڑھا ہی دیا۔ اس شعر میں مولانا نے صرف ایک شخص کو غدار کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سے علماء اہل فتوے مراد نہیں ہیں۔ ورنہ وہ تو متعدد علماء دیکھتے۔ اس لئے درود سنت غداراں کہنا چاہئے تھا۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں غدار سے مراد خاص ایک وزیر ہے کیونکہ منصور کو صرف اسی نے قتل کرایا تھا، علماء اُن کے قتل میں شریک نہ تھے۔

یہ تو ایک تاریخی بات ہے۔ کتب نوار تاریخ میں ان کی شہادت کا قصہ اسی طرح لکھا ہے کہ وزیر کو منصور سے عداوت تھی۔ چونکہ وہ بھی عالم تھا گو مقتدا نہ سمجھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے اُس نے اپنی عداوت نکالنے کے لئے اس طور پر استغناء تیار کیا کہ علماء کو قتل ہی کا فتویٰ دینا پڑا۔ مثلاً یہ کہ زید نے ایک کلمہ کفر کا کہا اور اُس کی کوئی عذر کی بھی حالت نہیں اور اُس پر مصر ہے تو اُس شخص کا کیا حکم ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا جواب یہی ہے کہ وہ مرتد ہے اور واجب القتل ہے۔ اس لئے علماء پر الزام نہیں۔ کیونکہ اُن سے تو جیسا سوال کیا جاوے گا اسی کے مطابق وہ جواب دیں گے۔ یہ تو سائل کے ذمہ ہے کہ سوال کے اندر کوئی بات واقعہ کے خلاف نہ لکھے تو چونکہ علماء بے قصور تھے اور منصور وار صرف وزیر تھا اس لئے غدار کہا۔

یہ میں نے اس لئے کہا تا کہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ مولانا علماء کی طرف سے بدگمان ہیں اور اُن کو غدار کہہ رہے ہیں۔ خوب سمجھ لو کہ مولانا وزیر کو غدار کہہ رہے ہیں علماء کو نہیں کہہ رہے۔

بہر حال میرا مقصود پہلا شعر ہے کہ بدگہر کو علم نہ سکھانا چاہئے کیونکہ اس سے بڑا ضرر پہنچتا ہے۔ اُن معقولی طالب علم صاحب ہی کو دیکھئے کہ فقہ پر طرہ کیا ہوں نے اس سے یہ انتفاع حاصل کیا کہ تمہارے ذمہ محصول نہیں چاہئے اور ضرورت نہیں کہ یہ دینے کی۔ میں نے کہا حفظت شیئا وغایت عندك اشياء تو مسئلہ یاد کر لیا کہ منافع مضمون نہیں ہوتے اتلاف سے اور دوسری بات یاد نہیں رہی کہ گناہ ہوتا ہے۔ آخر اس گناہ کا تدارک بھی ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو اس کا سواٹے اس کے اور کیا طریقہ ہے کہ گناہ دے کر صاحب حق کو راضی کیا جاوے۔ بس اس کو مٹن کر وہ چپکے رہ گئے حضرت جب اہل علم کی طرف سے یہ گنجائش ملے تو پھر عام لوگوں کی کیا شکایت ہے۔

زیاہہ تراہی گنجائشیں امراد کی خاطر نکالی جاتی ہیں اسی واسطے علماء اور امراء حدیث میں بڑی مذمت آئی ہے اس عالم کی جو امرادیں گھسا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تساہل ہو جاتا ہے مسائل کے اظہار سے جہاں پلاؤ فورم اور عمدہ مال کھانے کو ملے تو وہاں کیا پروارہ سکتی ہے دین کی۔ وہاں تو یہ ڈر ہوگا کہ اگر حق بات کہیں گے تو پلاؤ فورم سے جاتے رہیں گے۔ ایسی جگہ امید

نہ نیز یہ حکم کہ منافع منسوب مضمون نہیں ہوتے ہیں اس وقت ہے جب کہ وہ شے معدا الاستغال نہ ہو۔ اور اگر وہ شے معدا الاستغال ہو تو اس وقت ضمان لازم ہے۔

ہی نہیں ہے کہ صاف بات کہیں بلکہ یہ کیفیت ہوگی کہ اگر امراء ناجائز فعل کو چھین گے تو تاویل کر کے جائز بتلا دیں گے۔

چنانچہ امراء کے یہاں شطرنج کا مشغلہ عموماً ہوتا ہے۔ اب جو ان کے ہاں حاضر باش علماء ہیں وہ تاویل کر کے جائز بتلا دیتے ہیں۔ مثلاً یہی کہہ دیتے ہیں کہ شافعی کے نزدیک جائز ہے اور ان کے نزدیک بھی جو شرطیں ہیں ان کا نام تک نہیں لیتے۔ سو امراء کی مخالفت سے یہ حالت ہو جاتی ہے علماء کی اس واسطے حدیث میں ہے۔

العلماء اصحاء الدین عالمیخالطوا الامراء فاداخا لظوا

الامراء فہم لصوم الدین فاحذروہم۔

یعنی علماء امین ہیں دین کے جب تک کہ وہ امراء سے مخالفت

نہ کریں اور جب امراء میں گھسنے لگیں تو وہ دین کے ڈاکو ہیں۔ ان

سے لوگوں کو بچنا چاہئے۔

چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جو علماء امیروں سے مخالفت رکھتے ہیں ان کی کیسی

خراب حالت ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ طبائع میں عموماً طبع غالب ہے۔

اس لئے امراء سے جب مخالفت ہوتی ہے تو طبع مانع ہو جاتی ہے اظہار

حق سے۔ سو یہ ساری خرابی طبع کی ہے۔ اسی واسطے کہتے ہیں۔

چوں غرض آمد ہنسرو شیدہ شد۔ صد حجاب از دل بسوئے بدہ شد۔

اور علماء کو اس سے دنیوی ضرر بھی پہنچتا ہے کہ ان کی عظمت امراء کے

قلب میں بالکل نہیں رہتی۔ دل میں وہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہماری خاطر سے ایسا فتویٰ

دے رہے ہیں۔ بس وہ ایک اڑ بنا لیتے ہیں ان کو ورنہ حقیقت وہ بھی جانتے ہیں۔ سو جب حالت یہ ہے تو پھر کیا امید ہے ان علماء سے اصلاح کی۔

بہر حال لوگ مال کے بارہ میں زیادہ گنجائش نکالتے ہیں۔ عوام اپنے لئے اور علماء ان کے لئے اس میں بالکل احتیاط نہیں کرتے اور امور میں تو خیر کچھ احتیاط کیتے بھی ہیں جس میں احتیاط کرنے سے بظاہر کوئی ضرر نہیں ہوتا اور خالی مفت کرم داشتن ہے وہاں احتیاط سے کچھ کام لے لیتے ہیں بخلاف مال کے کہ اس میں احتیاط کرنے سے دس کے پانچ ہی رہ جاتے ہیں۔ یہاں احتیاط کرنا ذرا مشکل ہے اور نفس پر شاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے کم ہیں جو اس میں احتیاط کرتے ہوں ورنہ نفس تو گنجائش ہی کی طرف بلاتا ہے۔ اور عام طور پر ایسے ہی لوگ ہیں جو ان معاملات میں ذرا احتیاط نہیں کرتے۔ اس واسطے میں مطلع کرتا ہوں کہ مال کے بھی حقوق ہیں جن کی رعایت نہیں کی جاتی۔ چونکہ حقوق مالیر میں بے احتیاطی زیادہ کی جاتی ہے اس لئے میں اس وقت اس کا بیان کرتا ہوں۔

شروع میں جو میں نے آیت تلاوت کی ہے اس سے
مال کے حقوق پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے روزہ کا مسئلہ ارشاد فرمایا ہے

جس کا شروع یہاں سے ہے۔ احد لکم لیلة الصیام الوقت الی نسا لکم اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوگا کہ قرآن شریف کی اس آیت اور پہلی آیت میں ربط نہیں ہے کیونکہ اوپر کی آیت میں تو احکام روزہ کے بیان ہوئے ہیں۔ اور اس آیت میں فرماتے ہیں ولا تا کلوا اموالکم کہاں تو روزہ کا بیان اور

کہاں یہ کہ حرام مال سے بچو۔ اس میں جوڑ کیا ہے۔ لیکن اگر غور کیجئے تو آپس میں بڑا جوڑ ہے۔ روزہ میں فرماتے ہیں۔

وكلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الابيض من

الخيط الاسود من الفجر ط شرا تموا الصيام الى الليل۔

یعنی جب تک صبح صادق نہ ہو اُس وقت تک کھاؤ پیو۔ اور

جب صبح صادق نکل آوے تو اُس وقت کھانا پینا چھوڑ دو پھر

جب کہ سورج غروب ہو جائے اُس وقت روزہ کو ختم کر دو۔

سوروزہ تو موقت ہے کہ اس میں جو چیزیں چھڑانی گئی ہیں، وہ ایک وقت خاص

تک کے لئے چھڑانی گئی ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں خاص وقت سے خاص

وقت تک حرام کر دی گئیں۔ مگر حرام مال سے بچنے کا روزہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

گویا ایک روزہ کے ساتھ دوسرے روزہ کا ذکر فرمایا۔ خیال تو فرمائیے کہ

کتنا لطیف ربط ہے۔

عرض اس آیت میں حق تعالیٰ ہم کو نصیحت کرتے ہیں کہ آپس میں ایک

دوسرے کا مال ناحق مرت کھاؤ اور اس آیت میں خدا تعالیٰ نے لانا کھلو

اموالکم کہ اپنا مال مرت کھاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ لانا کھلو اموال اخوانکم

کہ اپنے بھائیوں کا مال مرت کھاؤ۔ حالانکہ مطلب یہی ہے۔ قرآن شریف

کی تعلیم بھی حکمت اور عقل پر اس قدر منطبق ہے کہ کسی کی تعلیم ہو ہی نہیں سکتی

اس کی تعلیم ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسے کا کلام ہے جو بڑا حکیم ہے اور

تشیقاً نہ کلام ہے نہ رضا بطلہ کا کلام نہیں۔ یہ ایسا ہی کلام ہے جیسے باپ

اپنے بیٹے کو خطاب کرتا ہے کہ اُس میں ہر پہلو سے شفقت کی رعایت ہوتی ہے اور ایک نصاب کا کلام ہوتا ہے جیسے کوئی منادی کرنے والا حاکم کی طرف سے اعلان کرتا ہے اُس میں نئے نئے الفاظ ہوتے ہیں۔ اُس میں اس کی کوشش نہیں ہوتی کہ مؤثر الفاظ ہوں اور بلیغ عنوان جو قلب پر اثر کریں۔ نصاب کی منادی میں اس کا اہتمام کہاں ہوتا ہے۔ اور شفیقانہ کلام میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کے سننے سے دشوار کام بھی آسان ہو جاوے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اسی طرح نصیحت فرمائی ہے جیسے باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے۔ اگر یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہ ہوتا تو یوں ہوتا دلاتا کلو اموال غیرکم۔ یہ کلام ہوتا تو درست مگر اس کا وہ اثر نہ ہوتا جو آیت کے الفاظ کا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اموالکم اس واسطے فرمایا کہ انسان کو اپنا مال زیادہ محبوب ہوتا ہے دوسرے کے مال سے۔ اگر اپنا مال زیادہ محبوب نہ ہوتا تو پرانے مال کو اپنا مال بنانے کی کیوں کوشش کرتا۔ تو چونکہ انسان کو غیر مال سے چننا محبت نہ تھی اس لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ ایسے عنوان سے کہا جاوے جو دائمی ہو حفاظت کا اور اُس کی حفاظت کا داعی بجز اس کے اور کوئی لفظ نہ تھا کہ اُس کو اموالکم سے تعبیر فرمائیں یعنی غیر کا مال بھی ایسا ہی سمجھو جیسے اپنا ہی ہے۔ اُس کی ایسی ہی حفاظت کرو جیسے اپنے مال کی کیا کرتے ہو۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ تو شاعری ہے کہ غیر کے مال کو اپنا سمجھو

غیر کے مال کو تو غیر ہی سمجھا جاوے گا۔ اُس کو اپنا کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ غیر کا مال تو غیر ہی کا ہے۔ واقعی
مکافاتِ عمل اپنا نہیں مگر لاتا حلوا امواکم فرمانے سے اشارہ

اس طرف ہے کہ جب کسی کا مال تلف کرو گے تو تمہارا مال تلف ہوگا۔ خواہ
 دنیا میں یا آخرت میں۔ اس معنی کو بھی دوسرے کا مال تلف کرنا اپنا ہی مال
 تلف کرنا ہے۔ اکثر تو یہ دنیا ہی میں ہو جاتا ہے کہ جو کوئی دوسرے کا مال
 تلف کرتا ہے تو اپنا بھی تلف ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا میں نہ ہوا تو آخرت
 میں تو ضرور ہی ہوگا۔ حضرت یہ تجربہ ہوا ہے کہ جو لوگ مال و جوہ باطلہ سے
 حاصل کرتے ہیں دنیا میں بھی اُن کا بھلا نہیں ہوتا۔

چنانچہ کانپور کا قصہ ہے کہ مسجد میں مدرسہ تھا۔ اُس کے لئے کچھ زمین
 کی ضرورت تھی۔ مسجد کے پاس ایک شخص رہتے تھے جو کہ چنداں مالدار تو نہ
 تھے مگر تھے خاندانی شخص۔ اُن کا بہت بڑا مکان تھا۔ اُن سے تھوڑی زمین
 مسجد کے لئے لینا چاہی۔ انہوں نے انکار کر دیا بلکہ کچھ اور مسجد کی زمین و بالی
 ایک مرتبہ وہاں ایک بزرگ تشریف لائے۔ اُن سے اس کا ذکر کیا گیا۔ تو
 انہوں نے فرمایا کہ وہ زمین اُن کی زمین کو لینے گئی ہے۔ اُن کی زمین کو اپنے
 ساتھ لے کر آوے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اُس شخص پر بہت عزت آگئی
 حتیٰ کہ اُس کو ساری زمین فروخت کر بی پڑی۔ جس کو مسجد والوں نے خرید لیا
 اور خرید کر مدرسہ بنا دیا۔

حضرت یہ کہیں نہیں ہے کہ آپ کسی کو نقصان پہنچائیں اور آپ کا

نقصان نہ ہو تو اس لئے بھی اموالکم فرمایا۔

اب وجوہ باطلہ کی کچھ مثالیں دیتے
سووی مال اور محقق کی حقیقت
 سو اس میں سے ایک سووی معاملہ

ہے جس کے بارہ میں ہے یحییٰ اللہ الربوا۔ سووی مال جمع ہوتا ہے اور ایک دن مرٹ کر رہتا ہے۔ اور حقیقتاً تو مٹنا ہی ہے مگر صورتاً بھی مٹتا ہے۔ ایک دن بے طرح مارے جاتے ہیں اور اگر اتفاقاً کبھی نہ بھی مٹے تب بھی اس سے کلام الہی پر اعتراض نہیں آتا۔ کیونکہ یحییٰ اللہ الربوا قضیہ مہملہ ہے جو فوت میں جزئیہ کے ہوتا ہے۔ اگر ایک دفعہ بھی مرٹ جائے تو وہ صادق آجائیکا معنی یہ ہیں کہ سو و والے اکثر مٹتے ہیں۔ اور اس کے بہت سے واقعات ہیں جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اگر کہیں ظاہراً نہ مٹے تو اور طریقہ سے مٹتا ہے۔

محقق کی قسمیں مختلف ہیں۔ ایک یہ ہے کہ مال جاتا رہے چوری وغیرہ ہو جائے۔ یہ تو ظاہری محقق ہے اور ایک محقق ہے معنوی۔ وہ یہ کہ سود والا مال سے خود منتفع نہیں ہوتا۔ فاقہ بھر بھر کر عمر ختم ہو جاتی ہے۔ سود لینے کا سبب بخل ہے۔ جتنا سود لیتا ہے اتنا ہی بخل پڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے تن پر بھی خرچ نہیں کرتا۔ یہ حالت ہوتی ہے۔

سختیاں زاموال برمی خوردند بخیلان غم سیم و زر می خوردند
 ایک ماسٹر تھے۔ سود و پیسے ان کی تنخواہ تھی۔ اور پانچ روپے ان کا
 خرچ تھا۔ لوگوں نے کہا، میاں تمہاری اتنی بڑی تنخواہ ہے، تم تکلیف کے

ساتھ کس لئے گزر کرتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ مجھ کو اس تصور میں کہ میرے پاس اتنا روپیہ ہے ایسا حفظ اتنا ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ وہ اسی میں مسرت تھے۔

غرض کہیں اس طرح بھی سود میں محنت ہوتا ہے کہ اپنے اوپر خرچ نہیں ہوتا تو یہ محنت برکت اور انتفاع کا ہوا۔

ایک وجہ باطلہ میں سے رشوت ہے کہ لوگ رشوت لے لے کر مال جمع کرتے ہیں۔ پھر دیکھتے

رشوت کا حشر

اس کا کیا حشر ہوتا ہے میرے ایک عزیز پولیس میں ملازم تھے۔ انہوں نے خوب رشوتیں لے لے کر روپیہ جمع کیا تھا۔ اتفاق سے سرکار کی طرف سے کسی معاملہ میں مقدمہ قائم ہو گیا تھا۔ جتنا کما یا تھا سب اس میں لگ گیا۔ حتیٰ کہ گھر کا زیور بھی نہ رہا۔ بالکل خالی رہ گئے۔ جب خدا خدا کر کے اس مقدمہ سے جان بچی۔ اس کے بعد پھر اسی طرح روپیہ جمع کیا اور اس روپیہ کے نوٹ خریدے اور ایک پرانے تکیہ میں ہی دبیٹے۔ اس خیال سے کہ اسے چور کیا لیں گے۔ ایک روز اتفاق سے وہ تحقیقات میں گئے تھے۔ ان کے مکان میں آگ لگ گئی۔ گھر والوں نے قیمتی اسباب اٹھا اٹھا کر گھر سے باہر پھینکا۔ اس تکیہ کا کسی نے خیال بھی نہ کیا۔ وہ جب تحقیقات کر کے آئے تو معلوم ہوا کہ گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ پوچھا کہ میرا تکیہ کہاں ہے گھر والوں نے کہا کہ جو قیمتی چیزیں تھیں وہ مشکل سے بچائی ہیں۔ وہ پرانا تکیہ بھی کوئی حفاظت کے قابل تھا۔ کہنے لگے میرے نوٹوں میں نوٹ تھے اور نوٹوں

کے غیر محتویات تھے نہیں اس لئے سب کمائی جاتی رہی اور اس میں سے کچھ
جاہل اور خریداری تھی۔ اس میں اس طرح کس کس کی کسی کا شکار پر تالش کی تھی اس
مقدمہ میں اس کا شکار نے ان حضرت کو قتل کر دیا۔

یہ انجام ہوتا ہے ایسے مال والوں کا۔ دن رات ایسے لوگ فکروں
میں مبتلا رہتے ہیں اور ایک شخص ہے جس کی یہ حالت ہے۔ شکے زیر و شکے
بالا۔ جس کی آمدنی بھی کم ہے بس معمولی سا کھاپہن لیتا ہے۔ اور مزے سے پاؤں
پھینکا کر رات کو سوتا ہے۔ وہ اچھا ہے یا ایسے لوگ اچھے ہیں۔ یہ رشوت
کے انجام ہیں۔

اسی طرح سے قمار ہے۔ نہ معلوم اس میں جیتنے والے کہاں جاتے ہیں
جس کو سونگے کہ ہار گئے۔ یہ کسی کو نہ سونگے کہ جیت گئے۔ اس کے متعلق کھلے
ہوئے واقعات ہیں۔ سینکڑوں کے اس میں گھر بار تباہ ہو گئے۔ ایسے مالوں
میں ذرا برکت نہیں ہوتی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ رشوت والے ہزاروں جمع کر
لیتے ہیں مگر ایک دو پشت کے بعد کچھ بھی نہیں رہتا بالکل محتاج ہو جاتے ہیں
آج ایک شخص نوکر تو بچپس روپیہ کا ہے مگر حرام مال خوب سمیٹتا ہے اور اس
کے یہاں اولاد بھی ہے۔ یہاں کبھی ہیں، دوست احباب بھی ہیں، تندرستی بھی
ہے مکان کی تعمیر بھی ہو رہی ہے۔ یہ اپنی حالت پر نہایت خوش ہیں۔ پھر
مخوڑے دنوں میں کچھ نہیں رہتا۔ یہ کیا بات ہے؟ اصل یہ ہے کہ ایسے
مالوں میں برکت نہیں ہوتی ہے۔

برکت کی حقیقت

لوگ برکت کی حقیقت پر سمجھتے ہیں کہ تھوڑا پورا
بہت سا ہو جائے۔ حالانکہ یہ اس کی حقیقت

نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ ہر چیز ایک خاص کام کے لئے موزوع ہوتی ہے
اُس کا اُس کام میں آنا تو برکت ہے اور اگر اُس کام میں نہ آئے تو بے برکتی

ہے۔

مثلاً روپیہ اس واسطے ہے کہ اُس کے ذریعہ سے کھائیں پینیں، دنیا کی
راحت حاصل کریں۔ تو اگر وہ کھانے پینے کے کام میں آئے اور اپنے تن
کو لگے تو برکت ہے اور اگر اس کام میں نہ لگے بلکہ فضول اڑ جائے تو بے
برکتی ہے۔ تو ایسے مال اکثر اپنے تن پر صرف نہیں ہوتے۔ کہیں عطاروں کے
یہاں جاتے ہیں کہیں ڈاکٹروں کی فیس میں خرچ ہوتے ہیں کہیں بار دوست
کھا جاتے ہیں۔ اپنے تن کو کچھ بھی نہیں لگتا۔

ایک شخص تھے اسی قسم کے، اُن کی بیوی ہمیشہ بیمار رہتی تھی۔ اُن کے
صاحبزادے پلنگ پر سوار تھے۔ صد ہا روپیہ دواؤں اور ڈاکٹروں اور طبیبوں
میں صرف ہوتا تھا۔ اور پھر لوگوں کو خوب کھاتے اڑاتے تھے۔ چاروں طرف
سے لوٹ ہو رہی تھی۔ یہ حالت تھی کہ ہمیشہ میں پانچ سو روپے آتے ہیں، وہ
تھوڑے اور ہزار آتے ہیں وہ تھوڑے۔ یہ اس قسم کے مال اتنی بڑی خوشی
کی چیز ہیں۔

دیکھئے ہر شخص کے لئے تعطیل راحت کی چیز ہے مگر اُن کے لئے مصیبت
ہے کیونکہ اُس روز لوٹ گھسٹ کرنے کی گنجائش نہیں ملتی۔ ایک رشتہ خور

نے فوٹو میں اپنی تصویر کھینچوائی تھی جس کی شکل یہ تھی کہ وہ ذی بھیسوں میں جھونپڑے
 کھڑا تھا۔ لوگوں نے جو اس تصویر کو دیکھا تو بہت تعریف کی کہ یہ ممکن اصل
 کے مطابق ہے۔ ایک گنوار نے وہ تصویر کھینچی اور کہا کہ یہ تصویر تو بالکل غلط
 ہے۔ لوگوں نے وہ سب دیکھی تو آپ فرماتے ہیں کہ تصویر میں ہاتھ اپنی جیب
 میں رکھائے گئے ہیں، حالانکہ ان کے ہاتھ تو دوسروں کی جیب میں پھرتے
 ہیں۔ وہ پھرتے کے لوگوں کا وہ فارغ بڑا عمدہ ہوتا ہے اسی واسطے بڑے
 بیسے علماء دینیہ جانتی ہوئے ہیں۔ انا ما شاء اللہ! کسی گہری بات کہی کہ ان کے
 ہاتھ تو برائی جیب میں پھرتے ہیں۔

مرد قسطیل کے دن برائی جیب ملتی نہیں اس لئے وہ ان کے لئے یوم
 ماتم ہے۔ انہیں انتظار لگا رہتا ہے کہ کب قسطیل کا دن ختم ہو۔ یہ کتنی بڑی
 نحوست ہے اس رشوت کی۔

رشوت کی خرابی

پھر اس میں ایک اور خرابی ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں
 بڑی چیز جاہ ہے حتیٰ کہ مال بھی ایسا عزیز نہیں ہے
 دیکھئے مال کو جاہ کے واسطے صرف کر دیتے ہیں اور جتنی فضول خرچیاں کرتے
 ہیں اکثر اسی کے واسطے کرتے ہیں۔ سب اخراجات کی توجہ بھی ہے اور مواقع
 جاہ میں خرچ کرنے کی کوئی حد ہی نہیں۔ عرض زیادہ حصہ مال کا تھا خرچ اور ناموری
 میں صرف ہوتا ہے۔ تو جاہ اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے مقابلہ میں مال کی بھی
 کچھ پروا نہیں کی جاتی اور وہ اس رشوت میں بڑی طرح برباد ہو جاتی ہے۔ سو
 اتنی بڑی نحوست عقلمند ہے اس رشوت میں۔ چنانچہ واللہ! آدمی رشوت

لیٹنے سے رشوت دینے والے کی نظر سے بالکل ہی گرجاتا ہے۔ وہ اُس کو ایسا سمجھنے لگتا ہے جیسے نما نسامہ اور پلہ وار کہ اب ہمارا سارا بوجھ ریٹھا بیگا پھر کیا وقعت ہوئی ایسے شخص کی بعض لوگ اٹھ آئے تک بھی نہیں چھوڑتے ایسے بد نیت ہوتے ہیں۔

ایک شخص ڈپٹی تھے اور قوم کے تھے برہمن۔ دورہ میں ایک زمیندار اُن کے پاس آیا اور نذر دینے کے لئے جیب میں لاکھ ڈالا۔ اُس کی جیب میں ایک روپیہ تھا اور ایک ادھنا۔ ڈپٹی صاحب چونکہ گھوڑے پر سوار ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے اُس نے جلدی سے لاکھ اونچا کر کے نذر پیش کر دی اور یہ دیکھا نہیں کہ میں کیا دے رہا ہوں۔ جب گھراٹے تو دیکھا کہ جیب میں روپیہ موجود ہے۔ اب یہ بڑے شرمندہ ہوئے کہ میں نے اُس کو ادھنا دیدیا وہ اپنے جیب میں کیا کہتا ہوگا۔ اب یہ دوسرے پڑاؤ پر پہنچا اور روپیہ پیش کیا اور عذر کیا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی میرا وہ ادھنا دے دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم برہمن ہیں ہمارا کام ایسا ہی ہے یہ کہہ کر ادھنا بھی رکھ لیا۔

یہ اوقات ہے ان لوگوں کی خیال فرمائیے۔ بعض لوگ تاویل کر دیتے ہیں کہ لوگ خوشی سے دے جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے بھی کبھی خوشی سے رشوت دی ہے۔ اپنے اوپر قیاس کر لیں اور اگر فرض کر لیا جاوے کہ خوشی ہی سے دیتے ہیں تو آخر ہمدردی بھی کوئی چیز ہے۔ اسی کی آؤ سے ایسی رشوت سے انکار کر دیا ہوتا۔

دیکھئے رعایت وہ چیز ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
حصنوز اور چندہ کی خدمت میں چندہ آتا تھا۔ آپ بعض مواقع پر واپس کر
 دیتے تھے۔ ہر ایک کا چندہ آپ نہ لیتے تھے۔ کسی چندہ جمع کرنے والے کو ایسا
 دیکھا ہے۔ حضرت اُج کل تو مال حرام تک واپس نہیں کرتے اور حصنوز کے واپس
 کرنے کی یہ وجہ ہوتی تھی کہ اُس شخص کو دینے کی گنجائش نہ ہوتی تھی۔ اس لئے
 وہاں اس بات کا اندیشہ ہوتا تھا کہ شاید اس شخص کو فی الحال گرانہ ہو یا بعد
 میں دینے سے بچھتاوے یا تکلیف اٹھاوے۔ اور حضرت ابو بکرؓ کا سارا
 گھر لے لیا کیونکہ وہ صدیق اکبر بھی تھے۔ وہاں نہ طبع پر ناگواری کا شائبہ تھا
 نہ تکلیف سے متاثر ہونے کا۔ اس لئے لے لیا۔ کیونکہ وہ تو آپ کے اند
 فنا ہو گئے تھے۔ غیرت بالکل اٹھ گئی تھی۔ پھر ان میں یہ احتمالات کس طرح
 ہو سکتے تھے۔

یہی راز ہے اس کا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر میرے
معاہد ابو بکرؓ و عمرؓ بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے۔ تو اس پر بظاہر ایسا شبہ
 ہوتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے بعد نبوت کا مستحق حضرت عمرؓ کو فرمایا حالانکہ حضرت
 ابو بکرؓ ان سے افضل تھے اس لئے ان کا استحقاق زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ تو
 اس کا راز ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ حضرت ابو بکرؓ
 تو حضورؐ کے اندر فنا ہو گئے تھے وہ من بعدی میں داخل ہی نہ تھے۔ وہ آپ
 کے غیر تھوڑا ہی تھے۔ وہ تو صین ہو گئے تھے۔ یہ وجہ ہے کہ آپ نے اپنے
 بعد ان کو مستحق نہیں کیا کیونکہ وہ تو معنی تھے ان کو من بعدی کیسے کہا جا سکتا

یہی راز ہے اس کا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہما حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اتنے پریشان نہیں ہوئے جتنے حضرت عمرؓ پریشان ہوئے۔ پریشانی تو بعد سے ہوتی ہے۔ جو فانی ہو چکنا ہے وہ بعید نہیں ہوتا۔ وہ تو ہر وقت مشاہدہ کر رہے تھے پھر کسی پریشانی۔ حضرت ابو بکرؓ کی تو بڑی شان ہے! دنیٰ اولیاء اللہ کی حکایات لکھی ہیں کہ ان کے اجراء کے انتقال پر بالکل رنج نہیں ہوا۔ چنانچہ ایک عورت تھیں ان کی چند اولاد کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ روئیں تک نہیں اور کہا کہ میں روؤں کیوں خودائے تعالیٰ کی قسم میں تو ان کو دیکھتی ہوں میرا دل خوش ہے پھر میں کس لئے روؤں۔

تو جیسے ان کو اپنے عزیز کا مشاہدہ تھا حضرت ابو بکرؓ کو اس سے بڑھ کر حضورؐ کا مشاہدہ تھا۔ گو ان کو ظاہراً بعد ہو گیا تھا مگر بعد باطنی نام کو نہ تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جزو کی مثل تھے۔

حاصل یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا سارا

چندہ میں لے اختیاطی

مال لے لیا کیونکہ وہ فانی ہو چکے تھے اور ایک عزیز شخص مال لایا تو آپ نے واپس کر دیا اور فرما دیا کہ جاؤ اپنا مال اٹھا لو۔ آج ایسے شخص کا چندہ فخر کے ساتھ لیا جاتا ہے جو یوں کہے کہ میں نے اپنے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ اور اس پر کہتے ہیں کہ ان میں ایسی حمیت تو ہے کہ سارا گھر لاکر رکھ دیا۔ ایسے اور ایسے ہیں۔

میں تو ایسے چندہ دینے والوں کو کہا کرتا ہوں کہ کام ہوش سے کرو۔

جوش سے مرت کر دے۔ جوش میں سارا گھرا دیا اور بعد میں جب ضرورت واقع ہوئی تو ہوتے پیشیاں) اگر جوش کو فضیلت ہوتی تو انبیاء علیہم السلام کا زیادہ حصہ مجذوب ہوتا۔ اُن میں عقل نہ ہوتی۔ حالانکہ وہ اس قدر ذی ہوش اور صاحب عقل تھے کہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جب یہ بات ہے کہ لوگ جوش میں آکر ایسا کہہ گزرتے ہیں تو اگر کوئی شخص بکچر دے یا وعظ کہے اور کسی کے پاس صرف دس ہی روپیہ ہیں اور اُس نے جوش میں آکر دس کے دس بھی دے دیئے تو اس کا چندہ لینا درست نہیں اُس کو ہوش ہونے دو۔ اُس کے بعد اُس سے کہو کہ تمہاری آمدنی ایک مہینہ کی دس روپے ہیں۔ ابھی ایک مہینہ پڑا ہے تمہارے اہل و عیال ہیں اُن کے خرچ کو چاہئے۔ وہ اس سے مقدم ہیں اگر بڑا ہی شوق ہے چندہ دینے کا تو ایک روپیہ مہینہ کر دو۔

عرض تمہارے ہی مذاق پر قومی ہمدردی بھی کوئی چیز ہے آج کل قومی ہمدردی کو ذبح کیا جاتا ہے۔ چکی پسنے والے تک چندہ سے نہیں چھوڑے جاتے۔ بعض نے سل بٹہ بیچ کر چندہ دیا۔ ایسی بے جا رقموں میں کیا برکت ہوگی نیز چندہ میں بعض ناجائز صورتیں تجارت کی کر رکھی ہیں جو شریعت میں حرام ہیں۔

مثلاً کسی غریب سے ترکیب ہی کی نیت سے کہا، ایک روپیہ چندہ میں دے دینا۔ جب اُس نے ایک روپیہ دیا اب اس روپیہ کی بولی بولی گئی کہ اس متبرک روپیہ کو جو کہ نہایت جوش و خلوص سے اپنی حیثیت سے زیادہ دیا گیا ہے اور اس لئے متبرک ہے کون خریدتا ہے۔ اب کسی نے اُس کے دل لگائے اور کسی نے سوا اور کسی نے ہزار۔ لوگ جوش میں آکر بڑی بڑی رقمیں

بیتے ہیں۔ تو یہ رہا ہونے کی وجہ سے بالکل حرام ہے۔

نیز اس لئے بھی کہ یہ پالیسی ہے۔ چندہ وصول کرنے والے کسی عزیب کو خود کھڑا کر دیتے ہیں اور اس پالیسی سے بڑی بڑی رقمیں وصول کیے جاتے ہیں۔ شریعت پالیسی کو جائز نہیں کہتی۔ شریعت گندہ سمجھتی ہے ان حرکتوں کو۔ وہاں تو دار و مدار صدق و خلوص و سادگی پر ہے کہ بات سچی ہو اور یہ چندہ خلوص سے نہیں دیا جاتا بلکہ محض نمائش و سازش سے دیا جاتا ہے۔ لوگ جوش میں آکر ایک روپیہ کو ہزار روپیہ سے خریدتے ہیں۔

خوب سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی خلوص سے دے رہا ہے تو وہ ایک روپیہ ہی برکت کا ہے۔ ایسی برکت کی چیز ہاتھ سے دے کر ہزار روپیہ لے لئے تو وہ اس کے مصداق ہیں۔ انستبد لون الذی هو ادنی بالذی هو اخیوط حسب حقائق پر نظر ہو تو اس کی برائیاں محسوس ہو سکتی ہیں۔ حضرت چندہ میں یہ بے احتیاطیاں ہو رہی ہیں۔ یاد رکھو کہ ایسے جوش کی حالت میں جس میں آدمی مغلوب العقل ہو جائے اور بعد میں پچھتاوے خود چندہ لینا ہی ناجائز ہے۔ جوش سے جب کوئی دے تو مدت نو۔ ماں جب ہوش درست ہو جاوے اس وقت نو۔

اسی طرح آج کل کے پیروں کی حالت دیکھو۔ تو عجیب ہے۔ ان کو تحصیل مال میں بالکل احتیاط

پیروں کی حالت

نہیں۔ تندرانیہ معین ہیں۔ تقاضے کر کے وصول کرتے ہیں خواہ کسی کے پاس بھی نہ ہو۔ اور دل تنگ ہو کر قرض ادا کر کے لایا ہو اور دل میں چاہے

کو شاہی ہو مگر انہیں لینے سے کام معمولی دعوت بھی منظور نہیں کرتے۔ دعوت میں کم از کم مرغ تو ہو بلکہ خود فرمائش کرتے ہیں۔ اگر کسی کو مٹی کی استغاثت ہو تو شاہ صاحب کے منہ میں نہ چلے۔ اس طرح خلق اللہ کے گلے گھونٹتے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ لا یجزل مال امرء مسلم الا بطیب نفس غیر من شاہ صاحب خریدین میں جا کر کچھ اور بن جاتے ہیں۔ انسان مکتوبہ ایسی رہتے ہیں۔ لوگ ان کو جوتا تک اٹھانے نہیں دیتے کیونکہ ان کے ہاتھوں کو اتنا متبرک سمجھتے ہیں کہ جوتے کا ان کے ہاتھوں کو مس ہوتا ان کی نشان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اگر یہی ہے تو پاؤں سے بھی نکال لینا چاہئے۔ کوئی جوتا ان کے پاؤں میں نہ چھوڑنا چاہئے یعنی جب جوتا بدل کر اوپر پاؤں میں سے نکال لینا چاہئے کیونکہ جیسے ہاتھ متبرک ہیں پاؤں بھی متبرک ہیں۔ لہذا جوتے کو ان کے پاؤں کے ساتھ بھی مس نہ ہونے دینا چاہئے۔

یہ ساری خیالی اس کی ہے کہ پیر اپنے کو ہریات میں ممتاز رکھتے ہیں جس کی وجہ سے عوام کا ان کے ساتھ ایسا خیال ہو گیا ہے۔ جب وہ ہر چیز میں اپنے کو ممتاز رکھتے ہیں۔ ان کا کھانا اور پہننا اور ہر چیز ممتاز ہے تو ان کی جنت بھی اور ہی ہونی چاہئے۔ اگر کہیں جولا ہے تیلی کے ساتھ جنت میں رہے تو قیامت ہی قائم ہو جائے گی۔ خود کرنے کی بات ہے کہ آج کل شاہ صاحبوں کی تو یہ حالت کہ سب سے ممتاز ہو کر رہتے ہیں۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت کہ اس
معاشرت رسول طرح رہتے تھے کہ پتہ بھی نہ پہناتا تھا کہ صدر کون

ہیں۔ چنانچہ باہر کے ناواقف لوگ آتے تو ان کو پوچھنے کی ضرورت ہوتی اور وہ پوچھتے من محمد فیکہ۔ صحابہ فرماتے۔ ہذا الابيض التکة کریم جو گورے چمٹے تکبیر کٹے بیٹھے ہیں یہ ہیں محمدؐ۔ صحابہؓ کے تیلانے سے پتہ چلتا ہے یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ویسے پتہ نہ چلتا تھا۔ بیٹھے ہیں تو آپ کی یہ حالت تھی۔

چلنے میں یہ حالت تھی کہ کچھ صحابہؓ آگے کر دیئے اور کچھ پیچھے کر دیئے کبھی کوئی آگے ہو گیا کبھی پیچھے ہو گیا۔ ملے جملے چلتے تھے۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں۔ سو آپ کی تو یہ حالت اور آج بزرگی کے یہ معنی ہو گئے کہ سب سے ممتاز ہو۔

پہر سال یہ ہماری ہمدردی اور یہ ہماری محبت ہے کہ ایک شخص نے ہمارے سامنے سارا گھر لاکر رکھ دیا اور ہم نے اس پر قبضہ کر لیا۔ کیا یہی ہمدردی ہے کہ سب سنگوا لو اور اس کو مفلس کر دو۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ جوش سے کام لو جوش سے مراد لو۔ چندہ دینے والے کو بھی نہ چاہئے کہ جوش میں آکر اپنے کو بالکل خالی کر دے اور چندہ لینے والوں کو بھی اس کا خیال چاہئے کہ ایسا چندہ نہ لیں۔ تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ جوش میں آکر ایسا کہہ گزرتے ہیں اور بعد کو پشیمان ہوتے ہیں۔ جوش میں اکثر عقل مغلوب ہوتی ہے اس لئے جلدی نہ کرے۔ جب جوش کا خاتمہ ہو جاوے اس وقت جو کام مناسب سمجھے کرے۔

عقل ایسی چیز ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
قابل قدر عقل نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اسے عمر خائن وقت کیا

حال ہوگا جب قبر میں رکھے جاؤ گے اور فرشتے کہہ سکتے ہوئے گرجتے ہوئے
 تمہارے پاس آویں گے اور تم سے پوچھیں گے من ربک ما دینک اس
 پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتلا دیجئے کہ
 عقل بھی اس وقت رہے گی یا نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عقل
 تو دنیا سے بھی زیادہ ہوگی۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم جب عقل ہمارے پاس ہوگی تو پھر کیا اندیشہ ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ
 عقل سے کام لیں گے اور جو اب صحیح ہیں گے۔

تو عقل اتنی بڑی نعمت ہے خدا تعالیٰ کی۔ آج کل لوگ عقل کے
 پیچھے لٹے پھرتے ہیں بے عقلی کی قدر کرتے ہیں۔ بزرگوں میں بھی لوگوں کو
 مجذوب ہی لپٹا ہے جس میں عقل نہ ہو۔ اور جو عقل سے کام لیتے ہیں ان کو
 بزرگ نہیں سمجھتے بلکہ ان کو عقل پرست کہتے ہیں۔ اسے صاحبِ عقل بڑی
 نعمت ہے خدا تعالیٰ کی۔ اسی وجہ سے تمام انبیاء عقل میں کامل ہوئے ہیں
 بتلائیے تو سہی انبیاء علیہم السلام میں کوئی مجذوب بھی ہوئے ہیں۔ اس لئے
 ضروری ہے کہ چندہ دینے والے بھی عقل سے کام لیں اور چندہ لینے والے بھی
 یہ انہماک جو چندہ میں ہونا ہے جس کے پیچھے عقل ہوش سے بھی گزر جاتے ہیں
 اس کا سبب یہ ہے کہ کام زیادہ پھیلا دیتے ہیں۔ سب سے پہلے اس کی
 اصلاح کرو یعنی کام جتنا ہو سکے اور جتنی وسعت ہو اتنا کریں۔ جو نہ ہو سکے

نہ کریں۔ بہر حال چندہ میں اس کی ضرورت احتیاط نہ رہی چاہئے کہ ناجائز طریقہ سے وصول نہ کیا جاوے

اہل چندہ مسجد اور مدرسہ کے لئے بھی تو اس کی احتیاط نہیں کرتے انہیں اس سے غرض ہوتی ہے کہ چندہ ملے۔ چاہے جس طرح بھی ملے۔ اگر ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح چندہ کرنا جائز نہیں۔ تو یوں کہتے ہیں کہ ہم اپنی ذات کے لئے محفوظ رہی کرتے ہیں۔ ہم تو خدا کے لئے کرتے ہیں۔ اور بعض چندہ وصول کرنے والوں کی یہاں تک نسبت پہنچ گئی ہے کہ انہوں نے غیرت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے اور اومیت سے بھی گزر گئے ہیں۔

چنانچہ جب علی گڑھ یونیورسٹی کا چندہ ہوا ہے۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں سے ایک برات قصیدہ چھپانا گئی تھی۔ ایک لیڈر صاحب چندہ وصول کرنے والے اس برات میں تھے۔ دستوریہ ہے کہ جب دلہن کو ڈولے میں سوار کرتے ہیں تو ڈولے پر بکھیر ہوتی ہے اور بھنگی اس کو لوٹتے ہیں اور عرفاً انہیں کا حق سمجھا جاتا ہے۔ جس وقت پیسوں کی بکھیر ہوتی تو لیڈر صاحب پیسے لوٹنے کے لئے بھنگیوں کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور تین آنے کے پیسے اکٹھے کئے۔ تعجب ہے کہ اگر کوئی مولوی ایسا کرے تو اس کو وحشی اور دون بہت شمار کریں۔ اور ان کا ہر فعل تمدن و ترقی سمجھا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ انہوں نے بھنگیوں کے ساتھ شامل ہو کر پیسے لوٹے۔ پر اس نے لوگوں کو ان کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی۔ اتفاق سے نماز کا وقت آ گیا۔ نماز کے لئے یہ مسجد میں گئے اور جماعت کے ساتھ کھڑے ہوئے۔ لگے جماعت میں ایک

ظریف بھی تھے۔ انہوں نے کہا کہ ذرا ہٹ کر کھڑے ہو۔ اس لئے کہ جس وقت آپ پیسے لوٹ رہے تھے تو بھنگیوں کا بدن آپ سے ملتا تھا اور پسینہ آپ کو بھی آ رہا تھا اور ان کو بھی یہ ہٹا لگ کھڑے ہو۔ یہ تو کیفیت تھی ان کی کہ لوگ اپنے پاس بھی کھڑا نہ ہونے دیتے تھے اور ان کو اس پر بڑا فخر تھا۔ اگر ایسی ہی بے حسی ہے تو ایسے موقع پر بھنگی ہی کیوں نہ بن جائے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے یہ افعال کون سے اصول پر مبنی ہیں۔ یہ ساری خرابیاں اس کی ہیں کہ علماء کی تقلید کو تو چھوڑ رکھا ہے اور دوسری قوموں کی تقلید کو رانہ اختیار کر لی ہے۔

کورانہ تقلید کورانہ تقلید پر مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک صوفی سیاح تھے۔ وہ کسی خانقاہ میں آکر ٹھہرے۔ وہاں اہل توکل اور اہل تاکل دونوں قسم کے لوگ تھے۔ ان شاہ صاحب کی سواری میں گدھا تھا۔ اس کو تھکان پر باندھ دیا۔ سائیس کو حفاظت کے لئے وہاں چھوڑ دیا اس پر جو نیند کا غلبہ ہوا تو وہ پڑ کر سو رہا۔ اہل خانقاہ نے کہا کیا کہ اس گدھے کو وہاں سے کھولا اور بازار میں لے جا کر بیچ ڈالا اور اس کی قیمت سے کھانا تیار کیا کھانے کے بعد سماع شروع ہوا اور سماع میں ان لوگوں نے یہ شرارت کی کہ حال لانا شروع کیا اور اس میں کہنے لگے۔

خر برفت و خربرفت و خربرفت

شاہ صاحب اس کا مطلب خاک نہ سمجھے اور ان کے دیکھا دیکھی آپ نے بھی یہی کہنا شروع کیا کہ خربرفت و خربرفت و خربرفت۔ اب سائیس کی

جو آنکھ کھلی تو دیکھتا کیا ہے کہ گدھا نڈارو۔ وہ گھبرا یا ہوا شاہ صاحب کو خبر کرنے
 دوڑا تو انہیں یہ کہتا ہوا پایا۔ خبر برفت و خبر برفت و خبر برفت۔ وہ سمجھا کہ انہیں
 گدھے کے چلے جانے کی پہلے ہی سے خبر ہے۔ وہ یہ سمجھ کر اپنی جگہ جا کر
 سو رہا۔ اب صبح کو جو شاہ صاحب نے تختان پر اپنا گدھا نہ پایا تو غل جچایا
 کہ میرا گدھا کہاں گیا۔ اہل خانقاہ نے کہا کہ ہم کو کیا خبر۔ شاہ صاحب بولے
 کہ مجھ کو کیا خبر تھی۔ پھر ساتیس یہ خشکی شروع کی کہ تو نے کس واسطے خبر نہیں کی اس
 نے کہا کہ میں تو خبر کرنے کے لئے آیا تھا۔ یہاں آکر دیکھا تو آپ خود ہی فرما
 رہے تھے کہ ج

خبر برفت و خبر برفت و خبر برفت

میں سمجھا کہ آپ کو پہلے ہی خبر ہو گئی۔ پھر میں کیا خبر کہتا۔ رونے لگے
 مجھ کو تو کچھ بھی خبر نہ تھی۔ سب کہہ رہے تھے میں بھی کہنے لگا۔
 بہر حال ایک تو کورانہ تقلید ہوتی ہے جس کے یہ نتائج ہیں اور ایک تقلید
 علماء کی ہے جس پر مدار ہے دین کا۔ تو ان لوگوں کو علماء کی تقلید سے تو عار آتی
 ہے اور دوسری قوموں کی تقلید کورانہ کرتے ہیں اور یہی بڑے تمام خرابیوں کی
 ہیں اس قسم کے لوگ جس طرح چندہ میں غیر قوموں کی تقلید کرتے ہیں، اسی طرح
 قومی ہمدردی میں بھی غیر قوم کے مقلد ہیں۔

جس زمانہ میں جنگ طرابلس اور اٹلی ہو رہی تھی ان حضرات نے طرابلس
 کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہی تو اس میں بھی غیر قوموں کے مقلد بنے غیر قوموں
 کا یہ طریقہ ہے کہ جب اپنے طرف دار کے ساتھ کوئی لڑتا ہے تو مخالف کا

مال جو ان کے ملک میں آتا ہو اس کو خریدنا موقوف کر دیتے ہیں تاکہ اس کو ضرر پہنچے تو انہوں نے بھی ایسا ہی کیا، کہ لڑکی کی ٹوپی جو اٹلی سے آتی تھی اس کی خریداری بند کر دی تاکہ اس کی تجارت میں کمی واقع ہو اور اس سے اس کو ضرر پہنچے اور جو ٹوپیاں پہلے کی خریداری ہوئی تھیں ان کو آگ میں جلا دیا مگر یہ خوب بات ہے کہ غصہ تو اٹلی پر اور اس میں ناس کریں اپنا نیران کی خریداری بند کر لینے سے اس کو کیا ضرر پہنچ سکتا ہے۔ یہ ہیں ہی کیا۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شور بہ۔

ہم میں اور ان غیر قوموں میں بڑا فرق ہے۔ اور قوموں میں اتفاق ہے۔ وہ جب خریداری چھوڑتے ہیں تو ایک دم سے سب چھوڑتے ہیں اور ہمارے اندر اتفاق نہیں ہم اگر خریداری چھوڑیں گے تو خاص ہی خاص لوگ ہوں گے جو اس میں ساتھ دیں۔ لہذا وہ قومیں جو ایسا کرتی ہیں تو ان کا فعل موثر ہے اور ہمارا فعل کچھ بھی موثر نہیں بلکہ ہمیں الٹا ضرر پہنچتا ہے۔ یہ لوگ عقل کے مدعی ہیں اور پھر ایسی حماقتیں کرتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ عقل کے کیا معنی ہیں۔ بس آج کل کی عقل دیکھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

ازمودم عقل دورانیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را
ایسے لوگوں نے چندہ میں بھی وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو غیر قوموں کا
ہے اور معاشرت میں بھی وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو غیر قوموں کا ہے۔ ہر
بات میں غیر قوموں کے متقلد ہیں۔ اب ایسے جوش کے چناہ کے متعلق ایک

مسئلہ سنو۔ خوب یاد رکھو کہ جو شخص جوش میں آکر اپنی حیثیت سے زیادہ چندہ دیتا ہے وہ مغلوب العقل کے حکم میں ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اس سے چندہ لینا اور اس کو سخاوی کر کے چھوڑ دینا دین کے تو خلاف ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔ کیوں کہ یہ اس کو فقیر کر دینا ہے۔

ناجاہز آمدنی | میں رشوت کے متعلق عرض کر رہا تھا۔ درمیان میں چندہ کا بھی ذکر آگیا۔ ذکر یہ تھا کہ رشوت ایسی ذلیل چیز ہے کہ اس سے آدمی نظر سے گر جاتا ہے۔ یہ نحوست عقلی ہے اس میں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ قومی ہمدردی کے بھی بالکل خلاف ہے۔ اگر شریعت کے حکم کو نہ دیکھا جائے تو خود عقل بھی اس کو ناجاہز بتلاتی ہے۔ اور یہ بالکل غلط بات ہے کہ لوگ خوشی سے دیتے ہیں۔ جو لوگ رشوت دیتے ہیں تو نقصان پہنچنے کے خیال سے دیتے ہیں خوشی سے کوئی نہیں دیتا۔ جو دیتا ہے جبور ہو کر دیتا ہے۔ اس لئے یہ ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔

اسی طرح بیرسٹری کی آمدنی ہے کہ قطع نظر اس کے کہ شریعت کے نزدیک یہ کیسی ہے خود ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔ اس کی تو یہاں تک کیفیت ہو گئی ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی دکانداری ہو گئی۔ کسی پر مقدمہ ہو جاوے اور وہ اُن کو وکیل بنانا چاہے تو کہتے ہیں کہ ہر پیشی پر پہلے اتنا لے لوں گا جب کام کروں گا۔ اس کا مطلق خیال ہی نہیں ہوتا کہ اس بیچارے کو اتنی مقدار دینے کی گنجائش بھی ہے یا نہیں بلکہ اگر وہ کہتا ہے کہ کچھ کم لے

لیجئے۔ تو پیرسٹر صاحب کہتے ہیں کہ نرخ بگڑتا ہے۔ یہ تو ہمدردی ہے۔ پھر مذہبی حالت ان حضرات کی قابل دید ہے۔

میرٹھ کا واقعہ ہے کہ ایک پیرسٹر صاحب کے پاس کچھ لوگ عید کے دن ملنے گئے تو آپ کہتے ہیں کہ ویل آج آپ لوگوں کا عید ہے مطلب یہ ہے ہماری عید نہیں۔ ہم اسلام ہی میں داخل نہیں۔ یہ ان لوگوں کی مذہبی حالت ہے۔

پھر مقدمہ کی پیردی پر تو لیتے ہی ہیں اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ڈراہٹے دے دی اور پانچ سو روپیہ لے لئے۔ شریعت میں رائے پر محنت نہ لینا جائز بھی نہیں۔ یہ رشوت محض ہے۔ اس بارہ میں میرا ایک رسالہ بھی ہے اس کا خلاصہ عرض کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ شریعت نے جس چیز کو متقوم نہیں قرار دیا اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں۔ مثلاً آپ کا حق شفعہ تھا۔ آپ نے سو روپیہ لے کر اس کو چھوڑ دیا تو یہ سو روپیہ واجب الرد ہیں اور حق شفعہ بھی نہیں رہا۔ کیونکہ شریعت نے شفعہ کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی یا مثلاً کسی نے حاکم سے سفارش کر دی اور پچاس روپیہ لے لئے۔ یہ پچاس روپیہ حرام ہیں۔ اکثر لوگ رشوت بمقدار مات میں کچھ لینے کو کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب بھی رشوت میں داخل ہیں۔ حاکم سے سفارش کرنا بھی ایسا ہی فعل ہے کہ شریعت نے اس کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی۔ اور اگر یہ سب متقوم ہیں تو ان پیر کا مذاق بھی معتبر ہونا چاہئے جن کا قندہ عرض کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ میں بنگالہ میں تھا۔ وہاں ایک شاہ صاحب کی دعوت کی گئی اور کھانے کے بعد اُن کو پچاس روپے دیئے گئے۔ وہ اس پر راضی نہ ہوئے آخر مشکل سے دو سو روپیہ پر صلح ہوئی۔ بس دعوت کھانا بھی ایسی محنت و مشقت کا کام ہے جس کے کھلانے والوں کو اجرت دینی پڑتی ہے۔

ایک شخص تھے وہ مولود شریف پرٹھا کرتے تھے اور پانچ روپیہ اُن کا نذرانہ تھا۔ ایک مرتبہ کہیں مولود شریف پڑھنے گئے اور کرتہ اُن کا بہت پرانا ہو گیا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ کسی طرح نیا کرتہ لینا چاہئے۔ بس انہوں نے یہ ترکیب کی کہ ایک شعر پڑھا اور اُس پر حال طاری کیا اور پھر سے اپنا کرتہ پھاڑ ڈالا۔ میراں کو شرم معلوم ہوئی کہ بلا کرتے کے رخصت کیسے۔ اس لئے اُن کو نیا کرتہ بنا کر دینا پڑا۔ اُن حضرت نے پانچ روپے ڈالک لئے اور کرتہ الگ لیا۔ نقصان اپنا اس لئے کیا تھا کہ آمدنی ہو جائے گی۔ بجائے پرانے کرتے کے نیا مل جائے گا۔ یہ ترکیب ہے وصول کرنے کی۔

تو جیسے انہوں نے کرتہ پھاڑنے کا عوض لیا۔ اسی طرح اُن شاہ صاحب نے دعوت کھانے کا عوض لیا۔ خوب سمجھ لو کہ ایسے اعمال کی قیمت لینا رشتہ میں داخل ہے۔

اسی طرح سے رائے دینا بھی ہے کہ اُس کی قیمت لینا جائز نہیں۔ اگر رائے کی قیمت ہے

رائے اور مسئلہ کی قیمت

تو جو بھی کوئی رائے دے دے قیمت لے لیا کرے۔ اگر کہو کہ اوروں کی رائے میں اور ہماری رائے میں فرق ہے کہ ہم قانون وان ہیں۔ ہماری رائے

سے لوگوں کا کام چلتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر کسی کو کوئی رائے دے دی تو اس میں کون سی محنت پڑی اور اگر کہو کہ اس میں محنت یہ ہے کہ سوچنا پڑتا ہے۔ یہ دماغ خرچ کرنے کی قیمت ہے تو میں کہوں گا کہ اگر محنت اس کا نام ہے تو پھر رومال میں روپے باندھنے پڑیں گے اور پھر گھر تک لائے پڑینگے، پھر ان کو صندوق میں رکھنا پڑے گا۔ ان سب باتوں کی بھی قیمت ہونی چاہیے کیونکہ ایسی محنت ان کے اندر بھی ہے۔ بس اس کا سارا گھر لے لو۔

اسی طرح مسئلہ بتلانے کی قیمت لینا جائز نہیں کیونکہ اس میں دین فروشی ہے اور وہ حرام ہے۔ البتہ تعلیم دین بطرز تدریس پر اجرت لینا جائز ہے کیونکہ اس میں مشقت ہے لیکن مسئلہ بتلانے کی کیا اجرت۔ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ پانچ روپے لاؤ سب مسئلہ بتلائیں گے۔ یہ جائز نہیں۔ ایک شخص نے تو کہا ہی کہ دیا کہ ایک فتویٰ دیا اور ہزار روپیہ لے لیا۔ فتوے میں عجیب تماشایہ کیا کہ پھر پھار کے ایسی صورت نکالی کہ ساس سے نکاح کرنا جائز کر دیا۔

قصہ یہ تھا کہ ایک شخص ساس پر فریفتہ ہو گیا تھا اور وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر اس سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ ایسی مشہور بات تھی کہ عامی تک جانتا ہے کہ ساس سے نکاح حرام ہے۔ اس لئے اس کی جرات نہ ہوئی۔ وہ شخص ایک دکاندار مولوی کے پاس جو کہ اتفاق سے غیر مقلد بھی تھے پہنچا۔ اور ان سے کہا کہ کوئی ترکیب ایسی بتلائیے کہ ساس حلال ہو جاوے اور ایک ہزار روپیہ سامنے رکھ دیا۔ شیطان تو بڑا اُستاد ہے اپنے فن کا بڑا عالم ہے۔ اس نے ایک ترکیب سجھائی۔ آپ نے فتوے لکھا کہ ساس وہ ہوتی ہے جو منکوحہ

کی ماں ہو تو اس کی بیٹی اگر منکوحہ ہو تو یہ سانس ہوگی ورنہ سانس نہ ہوگی لیکن اکثر جاہل عورتیں بعض اوقات کلمات کفریہ بکے دیا کرتی ہیں۔ اسی طرح اس کی بیوی نے بھی نکاح سے پہلے کلمات کفریہ ضرور کہے ہوں گے۔ اور نکاح کے وقت تجدید ایمان کرائی نہ تھی پس اس عورت کا نکاح صحیح نہیں ہوا، اس لئے یہ منکوحہ نہیں ہوتی۔ جب یہ منکوحہ نہیں ہوتی تو وہ سانس نہ ہوتی۔ پس نکاح جائزہ یہی یہ بات کہ زنا اور مس بالمشہوت سے حرمت مصاہرت تو ثابت ہو جاتی ہے۔ تو یہ صرف حضرت ابو حنیفہ کی رائے ہے جس کو ہم نہیں مانتے۔ کیا ترکیب ہے۔ واللہ! یہود نے بھی ایسی شریفہ نہ کی ہوگی۔

یہ ہے دین فروشی۔ رشوت بھی لی تو کتنے بڑے طریقہ سے سچا مسئلہ بتلا کر بھی رشوت لینا جائز نہیں ہے۔ چاہے دین میں شریف کر کے۔ ماں کتابت کی اُجرت لینا جیسے فرائض لکھنے میں، یہ جائز ہے۔ مگر اس کے اثر پر بھی اگر نظر کیجئے تو یہ بھی بُرائی سے خالی نہیں۔ وہ اثر یہ ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ لوگ مفتی سے فرائض کرتے ہیں کہ مولانا فلاں وارث کا نام نہ لکھئے گا۔ ایسی فرائض اس لئے کرتے ہیں کہ کچھ دیتے ہیں ورنہ کیوں ہمت ہو۔

ایک شخص نے میرے سامنے فرائض پیش کی اور یہ کہا کہ جلدی مل جائے اور ایک روپیہ دوڑے میرے سامنے پھینکا اور کہا کہ یہ اس کا حق المہنت ہے۔ میں نے کہا کہ اپنا کاغذ اٹھا لیجئے اور جابیئے۔ وہ جلدی اس لئے مچا رہے تھے کہ ایک روپیہ بھی دیا تھا ورنہ کیوں جلدی مچاتے۔ مجھ کو ان کے جلدی مچانے پر رنج نہیں ہوا بلکہ اپنے بھائیوں پر رنج ہوا کہ نہ وہ لیتے نہ

لوگوں کو ایسی جرأت ہوتی۔

ایک صاحب رئیس بطور مہمان میرے یہاں تشریف لائے۔ انہوں نے ایسی حماقت کی کہ مجھ کو حیرت ہو گئی۔ جب معمولی بات کی بھی سمجھ نہیں، تو زیاست کیا کرتے ہوں گے۔ تو ان حضرت نے حرکت یہ کی کہ جب کھانا کھا چکے تو کھانے کے بعد ایک روپیہ نکال کر میری طرف پھینکا کہ لیجئے۔ جیسے بھٹیارے کے یہاں پھینک دیتے ہیں۔ اس وقت ایک بزرگ مولوی صاحب بھی مہمان تھے۔ ان کو اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں میں ہی منٹ لوں گا۔ آپ خاموش رہئے میں نے وہ روپیہ ان ہی پر پھینچ مارا اور میں نے کہا کہ جناب تہذیب سیکھئے۔ آپ کو اتنی تمیز نہیں۔ مجھے ان سے زیادہ اپنے ہم طبقہ لوگوں پر افسوس ہوا کہ ان کے لینے ہی کی وجہ سے یہاں تک نوبت پہنچی ہے۔

مشاریح کی حالت | آج کل کے مشائخ نے ناس کر رکھا ہے۔ چالیت ہے کہ ایک درویش میرے یہاں آئے۔ ان کے

ایک خلیفہ بھی ان کے ساتھ تھے جو کہ اہل علم میں سے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ پر قرضہ ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کیسے ہو گیا۔ وہ بولے کہ مرید کھا گئے۔ دو دو مہینے بڑے رہے اور وصول ان سے کچھ ہوا نہیں۔ میں نے اس توقع پر قرض لے کر کھلا دیا کہ نذرانہ دیں گے۔ نذرانہ دیا نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے یہ بھی سوچا تھا کہ دوں گا کہاں سے۔ کہنے لگے کہ نذرانے کی امید پڑا یا کہ تار کا۔ اس کے بعد کہا کہ آپ پریڈیٹنسٹ بہاؤ پورہ کو سفارشی خط

لکھ دیجئے کہ وہ مجھ کو چھ ہزار روپیہ قرض دے دیں۔ میں نے کہا کہ آپ اولاً کہاں سے کریں گے۔ کہنے لگے کہ مریدوں سے جو ملے گا اُس سے اور اگر وہ نہیں دے گا تو میں نے کہا کہ اللہ! اچھی آپ مریدوں کو نہیں بھولے۔ اُن کی وجہ سے تو یہ نوبت پہنچی۔ پھر جب انہوں نے میرے عذر کرنے پر بھی اصرار کیا تو میں نے اُن کی وجہ ہرت کی وجہ سے خط لکھ دیا اور اُن کو دے دیا۔ پھر میں نے دوسرا خط نذر علیہ ڈاک پر پینڈنٹ کے پاس بھیج دیا کہ ایسا ایسا خط لے کہ ایک صاحب آپ کی خدمت میں آئیں گے۔ اس پر عمل نہ کیجئے گا بلکہ جیسی آپ کی مصلحت ہو ویسا کیجئے گا۔ چنانچہ اُن کے پاس سے میرے ہاں جواب آگیا کہ آپ اطمینان رکھیں جو مناسب ہو گا وہی کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں مشارخ کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ مجھے ایک بزرگ کا قول پسند آیا۔ ایک شخص اُن کے پاس روپیہ لایا اور کہا یہ میرے بھائی کے بھتیجے ہے اور رسید لینے کو لکھا ہے سو رسید دے دیجئے۔ اور بات یہ تھی کہ بھتیجے والے کو اپنے بھائی پر اعتماد نہ تھا۔ اُن بزرگ نے کہا کہ لو اپنا روپیہ۔ کہیں رشتہ کی بھی رسید ہوتی ہے۔

جیسے لوگ سررشتہ دار کو دیتے ہیں کہ کچھ کر دیں گے ایسے ہی ہمیں سمجھا ہے کہ اگر انہیں دیں گے تو یہ اللہ تعالیٰ سے کچھ کہہ دیں گے۔ ہے تو یہ ایک نکتہ مگر ایک نتیجہ خیز بات ہے۔ سو نذرانہ کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ بعض لوگ اس خیال سے دیتے ہیں کہ پیروں کہیں گے کہ کیسا مرید ہے نذرانہ ہی نہیں دیا۔ اب تو پیروں کے ہینہ اور فضلانے اور کشمکش ہی معین ہیں۔

بڑے ثقہ لوگ کہتے ہیں کہ پیر کے یہاں خالی جاوے خالی آوے۔ یہ ایک جملہ بنایا ہے۔ معنی تو اس کے صحیح تھنے مگر بے محل اس کا استعمال کرتے ہیں۔ صحیح معنی اس کے یہ ہیں کہ جو خالی جاوے غلوں سے تو وہ خالی آوے گا فیوض سے اور یہ معنی نہیں کہ جو خالی جاوے فلوس سے۔ بلکہ ایسا قصداً کرنا چاہئے کہ شیخ کو کبھی دوا دے کبھی نہ دے۔ اگر ایسا کرے تو ان کی نسبت بھی نہ بگڑے گی۔ ورنہ یہ حالت ہوتی ہے کہ مرید کی صورت دیکھی اور خیال ہوا کہ اب کچھ دینا مرید کے ذمہ بھی یہ امر ضروری ہے کہ ایسا کام نہ کرے جس سے شیخ کے اخلاق خراب ہوں۔ اگر پیر میں حرم پیدا ہو گئی مرید کے عمل سے تو اس نے پیر کا تاس کر دیا۔

پھر تو وہ ایسی پیری مریدی ہو گی جیسے کسی مرید نے اپنے پیر سے کہا تھا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں تو شہر میں بھری ہوئی ہیں اور میری نجاست سے پیر نے کہا کہ تم تم ہی ہو اور ہم ہم ہی ہیں مرید نے کہا کہ ابھی خواب شتم نہیں ہوا اگے چلی تو سینے۔ پھر میں نے یہ دیکھا کہ آپ میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں اور میں آپ کی چاٹ رہا ہوں۔ اس پیر صاحب بہت بگڑے اور مرید کو بہت بُرا بھلا کہا۔ مرید نے کہا کہ حضرت آپ بُرا مائیں یا بھلا مگر دیکھا تو اسی طرح ہے۔

اب اس میں دو احتمال ہیں یا تو دل لگی کے طور پر اس نے یہ بات گھڑی تھی یا واقعی خواب تھا اگر خواب تھا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ مرید نے تو پیر سے دین کے لئے تعلق رکھا تھا اور پیر نے مرید سے دنیا کی عرض سے تعلق رکھا

تھا اور اگر یہ خواب گھڑا ہوا ہے تو یہ ایک تمثیل ہے، ایسے شخص اور سرید کے تعلق کی۔ اور تمثیل بھی نہایت غضب کی ہے۔ واقعی نذرانہ کی پیری سریدی کی بالکل یہی حالت ہوتی ہے۔ ایسے پیروں سے بڑا ضرر پہنچتا ہے سرید نذرانہ دے کر دین سے بالکل سبکدوش ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بس ہم نے سب حق ادا کر دیا۔ یہ لوگ ڈاکو ہیں دین کے اور اس دین کے ڈاکو سے وہ ڈاکو اچھے ہیں جو جراثیم کے بذوق و تلوار سے لوٹ مار کرتے ہیں کیونکہ وہ لوگ اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہیں اور یہ اپنے کو بے جرم جانتے ہیں اور وہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیتے ہیں اور یہ بالکل بے خطر ہوتے ہیں اس لئے وہ اچھے ہوں گے اور شاید قیامت میں ایسا ہی معاملہ ہو تو کچھ بعید نہیں جیسا کہ سماجی کا ارشاد ہے۔

گنہ آمرزہ نذرانہ قدح خوار بطاعت گیر پیران دیا کار
مخلصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں آمدنی کے یہ ابواب ہیں جن کو میں نے
بیان کیا اور یہ بے احتیاطیاں ہو رہی ہیں۔

اموال کے حاصل کرنے میں حرام و حلال کی
حلال و حرام کی تمیز بالکل تمیز نہیں رہی یہی وجہ ہے کہ قلب میں
نور نہیں ہوتا۔ نماز پڑھتے ہوئے مدتیں ہو گئیں مگر قلب میں نورانیت نہیں۔
ان میں سے بعض کو یہ غلطی واقع ہو گئی ہے اور ان کے ذہن میں یہ بات جم
گئی ہے کہ حلال دنیا میں مضبوط ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ حلال کی فکر ہی نہیں
کرتے۔ شیطان نے ان کو یہ پٹی پڑھائی ہے اور اپنے نزدیک بڑے مستحق

ہیں کہ کسی چیز کو حلال ہی نہیں سمجھتے۔ مگر اس کا انجام یہ ہے کہ پھر ایسے لوگ بالکل احتیاط نہ کریں گے۔ جو چیزیں حرام ہیں ان سے بھی پرہیز نہ کریں گے سمجھیں گے کہ حلال کا تو وجود ہی نہیں اور حرام حرام سب برابر۔ اس لئے کسی چیز کو بھی نہ چھوڑیں گے۔ بقولیکہ ع

چو آب از سرگزشت چو یک نیرہ چو یک پست

شیطان کی مٹی پڑھانے کا یہ نتیجہ ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ محض غلط ہے کہ حلال کا وجود دنیا میں نہیں اور یہ صرف شیطان دھوکا ہے کہ وہ اس طریقہ سے حرام میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ میں حرام و حلال کا معیار بتلاتا ہوں۔ اس کو سمجھ لینا چاہئے۔ معیار یہ ہے کہ فتویٰ فقہی جس چیز کو کہہ دے کہ یہ حلال ہے تو وہ حلال ہے اور جسے کہے کہ یہ حرام ہے تو وہ حرام۔ یہ وہ وقت ہے کہ آج کل مشتبہ چیز کو بھی حلال کہا جاتا ہے نہ کہ حلال کو بھی اس میں شبہات نکال کر حرام کر دیا جائے۔ میں یہ معیار یاد رکھو کہ جس کو فتویٰ فقہی حلال کہہ دے اس میں وہ حلال ہے۔ اصل میں بعض واعظین نے ایسی ایسی حکایات بیان کر کے لوگوں کو دھوکے میں ڈالا ہے۔

ایک حکایت یہ بیان کیا کرتے ہیں کہ ایک بزرگ تھے۔ ان کا کھیت تھا۔ اتفاق سے ان کا بیل دوسرے کے کھیت میں گھس گیا اور اس کے کھریں اس کھیت کی مٹی لگ گئی۔ پھر وہ ان کے کھیت میں آ گیا اور وہ مٹی ان کے کھیت میں مل گئی۔ تو انہوں نے اس کھیت کا غلہ کھانا

پھوڑ دیا۔

بس لوگ اس قسم کی حکایت کو سن کر سمجھ لیتے ہیں کہ جب یہ حالت ہے تو حلال کا وجود ہی نہیں نہ ہم سے ایسا ہو سکے گا نہ حلال نصیب ہوگا پھر خوب حرام پر ٹانجہ مارتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ حکایت صحیح نہیں اور اگر صحیح بھی ہو تو وہ بزرگ مغلوب الحال تھے اور مغلوب الحال مجنون کے حکم میں ہوتا ہے۔ اس کا فعل قابل تعلیل نہیں ہوتا۔

میں اس بات کا دعویٰ کرتا ہوں کہ شریعت کے برابر **دین میں غلو** کسی قانون میں وسعت نہیں دیکھئے، شریعت دین میں

غلو کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ ارشاد ہے یا اهل الکتاب تغلوا فی دینکم اور ارشاد ہے لاخر مو اطیبات ما احل اللہ لکم اور دیکھئے حدیث میں ہے کہ تین شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت خانہ پر حاضر ہوئے اور بعض ازواج مطہرات سے حضور کے مصیبات دریافت کئے اور جب انہیں بتلائے گئے تو انہوں نے اس کو کم سمجھا اور کہا کہ ہم اپنے کو حضور پر کیسے قیاس کر سکتے ہیں۔ حضور کے تو اگلے پچھلے سب زلات معاف ہو چکے ہیں۔ ہمیں یہ بات کب نصیب ہے۔ اس لئے ہم کو بہت زیادہ مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ پس ایک نے ان میں سے کہا کہ میں اتنی عبادت کروں گا کہ سوؤں گا نہیں۔ ایک نے کہا میں نکاح ہی نہ کروں گا۔ ایک نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ ہی سے رہوں گا افطار نہ کروں گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مکان پر تشریف لائے تو آپ

کو ان تینوں کی باتیں معلوم ہوئیں۔ آپ کو ناگوار ہوا اور فرمایا، یاد رکھو میں سوتا بھی ہوں، جاگتا بھی ہوں، نکاح بھی کرتا ہوں، کھاتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں خوب سمجھ لو۔ یہ میرا طریقہ ہے اور جو شخص میرے طریقہ کو چھوڑے گا اُس سے مجھے کوئی علاقہ نہیں۔

دیکھئے ان لوگوں پر آپ نے غلو فی الدین کی وجہ سے کتنا بڑا تشدد فرمایا کہ ایسے شخص کا مجھ سے کوئی علاقہ نہیں۔
ایسا ہی ایک اور واقعہ ہے کہ آپ ایک دفعہ مسجد میں تشریف لائے دیکھا کہ دو ستونوں کے درمیان میں ایک رسی بندھی ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ رسی کیسی ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ رسی زنیبؓ نے باندھی ہے جس وقت اُن کو نوافل پڑھتے پڑھتے نیند ستماتی ہے تو رکسل رفع کرنے کے لئے، اس پر سہارا لگالیتی ہیں۔ آپ نے یہ سن کر فوراً اُس کو توڑ ڈالا اور فرمایا کہ نفس پر اتنا تشدد نہ سچا ہے اور فرمایا کہ جب نیند آئے سو رہو۔ جب رکسل رفع ہو جاوے پھر مشغول ہو جاؤ۔ شریعت تو یہ ہے۔

ان آیتوں اور احادیث کو فقہار نے خوب سمجھا ہے۔ ان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تقویٰ طہارت اختیار کرتے ہو بلکہ تقویٰ طہارت میں تو خوب کوشش کرو مگر حد سے آگے مت بڑھو۔ اہل ادب نے تو یہاں تک کیا ہے کہ بعض افعال کو اس لئے نہیں کیا تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات کا دعویٰ نہ ہو جائے۔ مگر ہر شخص اس کو نہیں جان سکتا کہ کس بات سے مساوات ہوتی ہے اور کس بات سے نہیں ہوتی۔ یہ کام علماء باطن کا ہے اس

کو وہی سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت شیخ بہاؤ الدین نقشبندیؒ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کی نظر سے یہ حدیث گزری کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جھلی نہ تھی اٹا چھاننا نہ جانا تھا۔ پس یہ کرتے تھے کہ جو کھا اٹا پیسا اور پھونک ماری، بھوسی اڑ گئی اور روٹی پکالی۔ یہ طریقہ تھا۔ آپ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے خدام سے فرمایا کہ اب سے اس سنت کے موافق عمل درآمد ہونا چاہئے کہ اٹا پوکا ہو اور چھاننا نہ جانا چاہئے ایسا ہی کیا گیا اور روٹی پکائی گئی اور سب نے کھائی۔ اس کے کھانے سے سب کے پیٹ میں درد ہوا۔ سوئیاں ہی چبھنے لگیں۔ حضرت کے پیٹ میں بھی درد ہوا۔ اگر ہمیں یہ صورت پیش آتی، تو یوں کہتے کہ سنت پر عمل کیا تھا اس سے یہ ہوا۔ اگر ادب کی وجہ سے ہوتے ہیں تو دل میں تو یہی خیال ہونا اور یہی کہتے کہ اب کبھی سنت کا اتباع نہ کریں گے مگر اہل ادب کے قلب میں نورانیت ہوتی ہے۔ ان حضرات کا ادب دیکھئے آپ نے فرمایا کہ ہم نے بے ادبی کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات کا دعویٰ کیا۔ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ کو کیسے پہنچ سکتے ہیں ہم ضعیف کمزور ناقواں ہیں۔ آپ سے نچلے ہی درجہ میں رہنا چاہئے پھر خدام سے فرمایا کہ کھائیں گے تو جو مگر چھان کر۔ ادب دیکھئے کہ سنت میں کوئی نقص نہیں نکالا بلکہ اپنے کو سنت کے قابل نہ سمجھا۔

اب میں اس مسئلہ کا حل عقلی طور سے کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ

شرعیات میں چیزوں کی اقسام

شریعت میں دو قسم کی چیزیں ہیں۔ ایک تو وہ چیزیں ہیں جو مقصود ہیں اور ایک وہ ہیں جو مقصود نہیں ہیں زائد ہیں مگر محمود ہیں لیکن یہاں مجتہد کی ضرورت ہوگی کہ وہ تمیز کرے کہ کون مقصود ہے اور کون مقصود نہیں۔ یہ ہر شخص کا کام نہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ طبیب نے ایک مریض کو اجازت دی کہ شلجم کھاؤ اس نے مع پتوں کے پکا کر کھائے اور اس کو نفع ہوا۔ اب اس کا فیصلہ کرنا کہ قتلوں سے نفع ہوا یا پتوں سے یا دونوں کے مجموعہ سے۔ یہ طبیب کا کام ہے۔ یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک قتلے اور ایک پتے۔ ممکن ہے کہ مقصود قتلے ہوں اور مریض پتوں کو مقصود سمجھ لے یا مقصود پتے ہوں اور مریض قتلوں کو مقصود سمجھ لے۔ اس لئے اس میں فیصلہ کرنا مریض کا کام نہیں بلکہ یہ کام طبیب کا ہے۔

اسی طرح سنن میں امتیاز کرنا کہ شارع کے نزدیک مقصود کون ہے اور غیر مقصود کون ہے۔ یہ کام مجتہدین کا ہے۔ ہر شخص کا کام نہیں۔ اور کبھی اجتہاد میں اختلاف بھی ہوتا ہے۔

پہننا نچہ صحابہ علی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں رفع یدین ثابت ہے اور عدم رفع بھی ثابت ہے۔ اب یہاں مجتہدین کا اختلاف ہوا۔ ایک مجتہد سمجھے کہ رفع مقصود ہے اور ترک رفع جو فرمایا تو بیان جواز کے لئے ہے مقصود نہیں۔ اور ایک مجتہد عدم رفع کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نماز میں سکون چاہئے پہننا نچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور نے صحابہ سے فرمایا کہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نماز میں ہاتھ اٹھاتے ہو یعنی سلام کے وقت، نماز میں سکون اختیار کرو پس

مقصود عدم رفع ہے اور رفع بیان جواز کے لئے فرمایا۔ اب جنہوں نے رفع کو مقصود سمجھا ہے تو وہ اس میں یوں کہتے ہیں کہ یہ رفع جس سے منع فرمایا یہ نہیں ہے جو رکوع میں جانے اور اس سے اٹھنے کے وقت کیا جاتا ہے بلکہ یہ وہ رفع ہے جو کہ سلام پھیرتے وقت کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ بعض حدیثوں میں اس کی تصریح ہے کہ صحابہ جب نماز کا سلام پھیرتے تو اٹھا اٹھا کر کہتے السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یہ ممانعت حضور نے اس پر فرمائی۔ ہم اس بارہ میں یوں کہتے ہیں کہ مانا اس سے وہی رفع مراد ہے مگر اس سے ایک بات تضرع نکلی کہ اصل مطلوب نماز میں سکون ہے اور رفع اس کے خلاف ہے۔ پس مواقع مختلف فیہا میں بھی رفع مقصود نہ ہوگا کیونکہ وہ نماز کی حالت اصلی یعنی سکون کے خلاف ہے اور عدم رفع چونکہ سکون کے موافق ہے، اس لئے وہ مقصود ہوگا۔

اسی طرح اور جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے اسی وجہ سے ہوا ہے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور ایک نے دوسری چیز کو۔ مثلاً آئین کہنا، ایک مجتہد کی رائے یہ ہے کہ مقصود آئین پکار کہ کہنا ہے اور اخفاء جو ہوا ہے تو وہ بیان جواز کے لئے۔ اور ایک مجتہد کی رائے ہے کہ مقصود اخفاء ہے کیونکہ یہ دعا ہے اور دعائیں اخفاء مقصود ہے۔ اگر پکار کہ کبھی کہہ دیا ہے تو وہ اس لئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپ آئین بھی کہا کرتے ہیں۔ اگر کبھی پکار کرتے کہتے تو خبر نہ ہوتی کہ آئین بھی آپ کہا کرتے ہیں۔ جیسے کبھی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکمت کے لئے سری نماز

میں ایک آیت پکار کر پڑھ دی ہے تعلیم کی غرض سے۔
 ایک مجتہد کی رائے یہ ہے اور ایک کی وہ رائے۔ یہ اختلاف کا ہے
 سے ہوا۔ اسی وجہ سے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور دوسرے نے
 دوسری چیز کو۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو آپس میں لڑائی جھگڑے ہی
 کا خاتمہ ہو جائے۔ پس یہ راز ہے اختلاف مجتہدین کا۔ اسی بنا پر تمام افعال
 میں اختلاف ہوا ہے۔

یہ بیان انتظار ادا ہو گیا۔ عرض یہ کہ رہا تھا کہ شریعت میں دو چیزیں ہیں
 مقصود اور غیر مقصود اور یہ مجتہد کا کام ہے کہ وہ یہ بتلائے کہ مقصود کیا ہے
 اور غیر مقصود کیا ہے۔

پس سمجھ لیجئے کہ جو کی روٹی کھانا مقصود نہیں ہے۔ کوئی
 شرعی مصلحت اس کے ساتھ وابستہ نہیں۔ ہاں بعض مواقع
 پر متین ہوتی ہے مقصود میں۔ اس لئے جہاں ایسا موقع ہوتا ہے وہاں بتلائی
 جاتی ہے اور بعض طبارع ہیں ضعیف، وہ اس کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے
 انہیں یہ عقیدہ نہیں ہوتی بلکہ مقصود میں مشغول ہونے سے مانع ہو جاتی ہے ایسے
 مواقع پر اس سے منع کیا جاتا ہے۔

مثلاً ہم نے جو کی روٹی کھائی اور کھا کر پیٹ میں ہوا اور وہ تو جو ہم کو
 محبت تھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشن سے وہ اس حالت میں
 باقی نہ رہے گی بلکہ وحشت ہوگی اور خطرہ آئے گا کہ اچھا سنت پر عمل کیا کہ
 پیٹ میں درد ہو گیا۔ آج متشددین ہی کی بدولت شریعت سے لوگوں کو نفرت

ہو گئی۔ لیکن مشائخ ہر شخص کی قابلیت دیکھ کر اس کے مناسب تعلیم کرتے ہیں چنانچہ ایسے مقام پر کہتے ہیں کہ جو کی روٹی مرت کھاؤ۔ اور پہلے چور کی حکایت ایسی ہی گزر چکی ہے کہ شیخ نے اس کو خاتقاہ کے جوئے الٹ پلٹ کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے مناسب حال وہی بات تھی۔ دوسرے شخص کو اس کی اجازت مٹوڑا ہی دی جائے گی۔

ایک ریش تھے۔ انہوں نے میرے پاس آنے اور قیام کرنے کا ارادہ کیا اور یہ بھی لکھا کہ میرا جی گاڑھے کے کپڑے پہننے کو چاہتا ہے۔ اس لئے میرے واسطے وہ بھی تجویز کے مساجد میں۔ میں نے ان کو لکھا کہ آپ کو عرض ہونے کی حیثیت سے حق نہیں فرمائش کا۔ میں جس طرح چلاؤں ویسے چلنا پڑے گا۔ اور اس میں ایک راز تھا۔ وہ یہ کہ شریعت میں یہ اصلی مقصود تو ہے نہیں پھر ان ریش کے گاڑھے کے کپڑے پہننے سے ایک بڑا ضرر ہوتا۔ وہ یہ کہ اگر ایسا شخص گاڑھے کے کپڑے پہنے گا تو دل میں عجب پیدا ہوگا کہ ہم کتنے متواضع ہیں کہ ریش ہو کر ایسے کپڑے پہنتے ہیں۔ ہم ایسے اچھے ہیں۔ ہم میں ایسی مسکنت ہے اور مقصود ہے عجب کا ازالہ اور یہاں وہ پیدا ہوگا۔ اس لئے ایسے موقع پر گاڑھے کے کپڑے پہننے کی ہرگز اجازت نہ ہوگی۔ یہ ہے حقیقت اس کی۔

ایسے شخص سے زیب و زینت چھڑانی جائے گی جو زیب و زینت میں مشغول رہتا ہو اور کام نہ کرتا ہو۔ بناؤ سنگار میں وقت گزارتا ہو۔ اس سے کہا جائے گا کہ لوگ جہاں راستہ چلتے ہوں وہاں جا کر جھاڑو دیا کرو تاکہ کپڑوں پر اور جسم پر گرے اور زیب و زینت کو چھوڑے اور کام میں لگے تو ایسے

شخص سے اس طرح زیب و زینت چھڑا دی جاتی ہے۔
 غرض سادے کپڑے اور سوج کی روٹی یا اس کی مثل سنن عادیہ میں سے ہیں
 اگر کہیں ان کی وجہ سے مقصود فوت ہونے لگتا ہے تو ان کو چھڑا دیا جاتا ہے
 کیونکہ سنن عادیہ کوئی مقصود نہیں ہیں بلکہ بعض موقع پر سنن عبادت تک چھڑا دی جاتی
 ہیں اگر ان سے ضرر ہوتا ہو۔

مثلاً یہ سنت ہے کہ تہجد کی آٹھ رکعت پڑھے۔ اب کسی کو نیند زیادہ
 آتی ہے اور وہ تہجد کے واسطے زیادہ دیر جاگا اور پھر ایسا سو یا کہ صبح کی جماعت
 فوت ہو گئی تو اس سے کہا جائے گا کہ تم دو رکعت پڑھ کر جلد سو رہو تاکہ
 صبح کی جماعت نہ جاٹے۔ اگرچہ آٹھ رکعت سنن عبادت میں سے ہیں مگر جب
 اس سے بڑھ کر مقصود فوت ہوتا ہے تو اس کو چھڑا دیں گے۔ غرض یہ کام مجتہدین
 کا ہے کہ وہ مقصود اور غیر مقصود کو جان سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ترجمہ قرآن کا دیکھ کر اس
 مشکوٰۃ پڑھ کر اجتہاد کرنے لگیں۔

نہ ہر کہ آئینہ دار و سکندری داند نہ ہر کہ سپرہ برافروخت لبر می داند
 سو یہ راز ہے اس حکایت میں کہ جب شیخ نے دیکھا کہ جو کا آٹا بے چھنا
 کھانے سے سب کے پیٹ میں درد ہوا تو فوراً اس سے منع کر دیا اس خیال
 سے کہ یہ کوئی سنن عبادت تو ہے نہیں اور اس سے اندیشہ ہے دینی ضرر کا کہ
 کہیں سنت سے وحشت نہ ہو جائے اس لئے ہمارے لئے اس کا ترک
 ہی مناسب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص کی بابت اس کے مجموعی حالات سے ثابت

ہو جاوے کہ حج کے راستہ میں اس سے نماز کی پابندی نہ ہو سکے گی تو اس کو حج نفل سے منع کیا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کو ایک نماز کے بھی قضا ہونے کا گمان غالب ہو تو اس کو حج نفل کرنا جائز نہیں۔ اسی کے بارہ میں عارف مسعود بک کہتے ہیں۔

اے قوم سچ رفتہ کجا بید کجا بید
معتشوق درینجا سرت بیاید بیاید

یعنی تم کہاں چلے حج کرنے تمہارا محبوب یعنی اللہ میاں تو یہاں ہیں۔

اس شعر میں مطلق حج مراد نہیں جس سے شہر پڑے کہ حج سے روک دیا ہے بلکہ حج نفل جس سے کوئی فرض چھوٹتا ہو وہ مراد ہے۔ جنہوں نے اس کو مطلق سمجھ لیا وہ اعتراض کرنے لگے کہ لو حج ہی سے منع کرتے ہیں، جو ایک بڑی عبادت ہے۔ تو سمجھ لو کہ وہ ان لوگوں کو کہہ رہے ہیں جنہیں حج سے دین پر ضرر پہنچتا ہے کہ نفل کو تو ادا کرتے ہیں اور فرض کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ سو ظاہر ہے کہ ایسوں کو حج سے قرب نہیں بڑھتا بلکہ اور بُعاہ ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے کہتے ہیں۔

اے قوم سچ رفتہ کجا بید کجا بید
معتشوق درینجا سرت بیاید بیاید

یعنی تم کہاں چلے تمہارا محبوب تو نہیں ہے۔ تمہیں محبوب کا قرب پہنچ

رہ کر حاصل ہو سکتا ہے وہاں نہیں حاصل ہوگا۔ عرض یہ کہ سنن عادیہ اور سنن عبادت ایسے شخص کے واسطے ناجائز ہیں جس کا یہ نتیجہ ہو کہ کوئی دینی ضرر پہنچ جائے۔ اسی واسطے حضرات مشائخ کسی کو کچھ بتاتے ہیں اور کسی کو کچھ بتاتے ہیں

جو جس کے مناسب ہوتا ہے اس کو وہی بتلاتے ہیں۔ یہ کام ہر شخص کا نہیں اس کام کے وہی حضرات ہیں۔ مطلب میرا یہ ہے کہ لوگوں کو ایسی حکایات دجیسے بیل کے کھڑے میں مٹی لگ جانے کی حکایت سابق میں گزری، نہ سنانی چاہئیں۔

بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ شریعت میں وسعت ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر کسی

شریعت میں وسعت

مسئلہ میں مجتہدین کا اختلاف بھی ہو مگر آج کل کے مجتہدین کا اختلاف نہیں اور اس میں ابتلا عام ہو تو اس کو بھی جائز کہنا چاہئے۔

وجہ یہ ہے کہ معاملات بہت گندے ہو رہے ہیں۔ اگر مختلف فیہ

امور کو حرام بتلایا جاوے گا تو اگر اس پر کوئی کرے گا تو اس کو تنگی ہوگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شریعت کو تنگ سمجھنے لگے گا۔ اور اگر عمل نہ کرے گا تو وہ

ان کو اور محرمات اجماعیہ کو برا سمجھے گا۔ اور دونوں میں مبتلا ہو جائے گا اس لئے غلو نہیں چاہئے تنگی میں بلکہ وسعت کرنی چاہئے۔ فائدہ اس کا یہ ہوگا

کہ وسعت ہونے سے اعتقاد درست ہوگا کہ شریعت کیسی اچھی چیز ہے اور کیسی رحمت ہے۔ لوگوں کا تو گمان یہ ہو گیا ہے کہ شریعت میں تو سوائے

لایحوز کے اور کچھ ہے ہی نہیں حالانکہ شریعت میں لایحوز بہت کم ہے، یحوز کثرت سے ہے۔ جو فقر سے واقف ہے وہ اس کو خوب جانتا ہے

غرض یہ کہ وسعت دینے میں ایک تو شریعت سے محبت ہوگی دوسرے جو اس سے منتفع ہوگا، آرام سے رہے گا۔ اس سے حق تعالیٰ کی محبت

حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ عاشقِ احسانی ہیں ہم لوگوں کو جو خدا تعالیٰ سے محبت ہے وہ احسانات کی وجہ سے ہمارے واسطے ہمارے حضرت کا مسلک یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے آرام سے رہو مگر حد سے نہ نکلو۔ ساری دنیا کے مشائخ گھٹی دودھ چھڑاتے ہیں اور حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ نفس کو خوب کھلاؤ پلاؤ اور اس سے کام لو۔ وہ اس صورت میں خوب کام کرے گا۔ ع

کہ مزدورِ خوش دل کند کارِ ریش

ورنہ کہے گا کہ میاں کس برتہ پر کام کریں۔

حضرت حاجی صاحب ایک دفعہ میرا نام لے کر فرمانے لگے کہ میاں اشرف علی پانی خوب ٹھنڈا پیا کرو۔ ٹھنڈا پانی پیو گے تو ہر بن مؤمن اللہ سے نکلے گا اور اگر گرم پیو گے تو اللہ اللہ دل سے نہ نکلے گا بلکہ زبان ہی تک رہے گا۔

میں تو حضرت کے یہاں دو رات دیکھتا تھا کہ حضرت کا قصدا یہی تھا کہ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن سے حق تعالیٰ کی محبت بڑھے اس واسطے کہ بعض کو جب خوف غالب ہوتا ہے تو طاعت کم ہوتی ہے۔ خوف کی صورت میں صرف ضابطہ کی طاعت ہوتی ہے۔ اسی کو تو عرفانی کہتے ہیں۔

صنارہ قلندر مسزاد ابن نمائی کہ دراز و دور دیدم رہ رسم پارسائی

رہ قلندر محبت کی راہ ہے اور رہ و رسم پارسائی ضابطہ کی طاعت ہے

محبت ایسی چیز ہے کہ اس میں آدمی ہر قسم کی تکلیف برداشت کر لیتا ہے
چنانچہ کہتے ہیں ۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من
محبت کی روح کو راحت ہوتی ہے گو جسم کو تکلیف ہو۔ اور یہ حالت
ہوتی ہے جیسے ایک عارف کہتے ہیں ۔

زندہ کنی عطائے تو در بکشتی فدائے تو

جاں شدہ بتلائے تو ہر چہ کنی رعنائے تو

جب محبت ہوتی ہے تو پھر کوئی چیز گریاں نہیں ہوتی۔ بعض لوگ رات
بھر تو جاگتے ہیں اور محنتیں اٹھاتے ہیں اور پھر بے شائش بے شائش رہتے ہیں۔ تو کیا
بات ہے؟ یہی محبت ہے اس کی کچھ گرائی نہیں ہوتی۔ میں تو کہتا ہوں کہ
کہ جس کو محبت کامل ہوگی اس سے معاصی ہرگز نہ ہوں گے۔ بس جب کسی کو
دودھ گھی پیسیر ہو تو خوب کھاٹے پئے بشرطیکہ معاصی کی حد تک نہ پہنچے۔ حد
کے اندر رہ کر جتنی چاہے وسعت کرے۔ اس سے محبت بڑھے گی، تو
معاصی آپ ہی چھوٹ جائیں گے۔

اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ فتویٰ میں تنگی نہ کرنی چاہئے۔ جائز تک
رکھے تو عقیدت ہے۔ اولیٰ پر تو کہاں پابندی ہو سکتی ہے۔ اختلافی مسئلہ
میں اگر ابتلائے عام ہو تو اس کو بھی جائز ہی بتلائیے۔ مگر یہ معاملات میں
ہے نہ کہ شطرنج وغیرہ میں۔ کیونکہ معاملات میں تنگی کرنے سے تو نکالینے ہوتی
ہے اور شطرنج وغیرہ سے روکنے میں کیا تکلیف ہے۔ اس تقریر سے معلوم

ہو گیا ہو گا کہ حلال کے ابواب کثرت سے موجود ہیں۔

مگر افراط تفریط نہ کرنی چاہئے۔ مشکل یہ ہے
اہل خصوصیت کا تقویٰ کہ لوگ افراط تفریط کرنے لگتے ہیں۔ اہل

حالی کی حکایات دیکھ کر اپنے کو اُن پر قیاس منت کرو۔ وہ ہوتے ہیں مصائبین
 اُن سے ذرا سی بات میں گرفت ہو جاتی ہے۔ اور ہم لوگ ایسے ہیں، جیسے
 ریشیوں کے کاشتکار۔ مصاحب اگر دربار میں بلند آواز سے بھی بولے تو آنکھیں
 نکال لی جاویں اور کاشتکار اگر باہم گالیاں بھی بکریں، تو چشم پوشی کی جاتی ہے
 ہر ایک کا معاملہ جدا ہے۔ اہل خصوصیت کی باتیں ہی الگ ہیں۔ اُن کا تقویٰ
 بھی جدا ہے۔

ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک طالب علم تھے۔ وہ کہیں پڑھتے تھے۔ اُن
 کے والد اُن سے ملنے آئے۔ بیٹے تو اُس وقت موجود نہ تھے، ایک اور طالب
 علم تھے جو اُس حجرہ میں اُن کے بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ اُن سے دریافت
 کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ یہ وہاں بیٹھ گئے۔ اتفاق سے حجرہ
 میں بازار کی روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جو دیکھا کہ بازار کی روٹیاں رکھی
 ہیں تو بہت ہی برہم ہوئے۔ اتنے میں وہ طالب علم بھی آگئے اور اپنے والد
 کو سلام کیا۔ انہوں نے منہ پھیر لیا اور کہا کہ تم بازار کی روٹی کھاتے ہو۔ علم دین
 کا نور اور اُس کی برکت تمہیں کیسے حاصل ہوگی۔ بازار کی روٹی منظر عام پر رکھی
 جاتی ہے اور ہر قسم کے لوگ اُس کو دیکھتے ہیں۔ اُن میں ایسے لوگ بھی ہوتے
 ہیں جن کی یہ حالت ہوتی ہے۔

کہ بازار چست دیکھو آگندہ تر تھی درست را دل پراگندہ تر
 روٹی کو دیکھو دیکھو کہ ان کا دل لچا تا ہے اور پاس کچھ ہوتا نہیں۔ اس
 لئے پریشان ہوتے ہیں اور بعض فحط زدہ ہوتے ہیں کہ ان کا دل روٹی کو دیکھ
 کہ لوٹ پوٹ ہوتا ہے اور خالی ہاتھ ہونے سے کھا نہیں سکتے بس دل
 ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ تو یہ بازار کی روٹی سبب ہے بعض مسلمانوں
 کے دل پریشان ہونے کا اور اس سے مسلمانوں کا دل دکھا ہے۔ وہی روٹی
 جس نے دل دکھا یا ہے مسلمانوں کا ان کو تم کھاتے ہو۔ اس طالب علم نے
 عرض کیا کہ یہ روٹیاں میری نہیں ہیں بلکہ میرے شریک حجرہ کی ہیں۔ اس پر
 ان کے والد نے کہا کہ تم ایسے حجرہ میں کیوں رہتے ہو جس میں بازار کی
 روٹیاں کھانے والا رہتا ہو۔

دیکھئے، یہ ہے اہل خصوصیت کا تقویٰ۔ آج کل بٹا بیٹے ایسا کون ہے
 جو بازار کی روٹی نہ کھاتا ہو۔ جس سے مسلمانوں کا دل دکھا ہوتا ہے ہرگز
 قوم کے اصل میں یہ حضرات ہیں۔ آج جو ہمدرد قوم کہلاتے ہیں اب ان
 کی حالت دیکھئے۔ ان کو ہمدرد کیا ہمہ درد کہنا چاہئے۔
 ایک جٹلمین صاحب کا قصہ ہے کہ انہوں نے اسباب اٹھانے کے
 لئے اسٹیشن پر ایک تلی کیا اور مزدوری میں ان کو دینی دی۔ وہ تلی کھوٹی۔
 تلی نے کہا کہ اس کو بدل دیجئے نہیں چلے گی۔ انہوں نے کہا کہ چلے گی کیوں
 نہیں۔ ان نے کہا کہ صاحب کیسے چلے گی۔ یہ تو بہت کھوٹی ہے۔ اس کا
 انہوں نے کیسا ظالمانہ جواب دیا کہ جیسے ہم نے چلا دی تم بھی چلا دینا

تم نے تو ظلم اور زبردستی سے چلا دی اسے کون سا شخص ایسا ملے گا جس پر ظلم اور زبردستی کر سکے۔ بس وہ روتا ہوا چلا گیا اور یہ فرعون کی طرح بیٹھے پروا بھی نہیں کی۔ خدا جانے یہ کیسی ہمدردی ہے۔ بس ان لوگوں میں ہمدردی کے الفاظ الفاظ ہی ہیں۔ ظاہر کچھ ہے باطن کچھ ہے۔

وجایزۃ دعوی المحبۃ فی الہوی
ولکن لا یحقی کلام المنافع

یہ لوگ تقلید کرتے ہیں یورپ کی مگر اہل یورپ اتنے بے درد نہیں ہیں جیسے یہ لوگ ہیں۔ ایک عادت ان کی یہ بھی ہے کہ یہ لوگ عموماً ہر بات کے اندر مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر اقوام کے طریقہ کو ترجیح دے کر ان کی تقلید کرتے ہیں مگر فضول باتوں میں۔ جیسے کوٹ پتلون پہننے ہیں۔ حضرت جو اہل کمال ہیں وہ ان فیشنوں کے مقید ٹھوڑا ہی ہیں اور جن لوگوں کے اندر کچھ کمال نہیں وہ ظاہر کی لیب پوت کرتے ہیں۔

عزمن بازار کی روٹی کھانے کا قصہ تھا کہ ان طالب علم کے والد صاحب نے ایسے حجرہ میں رہنے کی بھی تو اجازت نہیں دی جس میں بازار کی روٹی کھائی جاتی تھی۔ یہ بھی ایسی ہی حکایت ہے جیسے پہلے گزری۔ مگر یہ خوب سمجھ لیجئے کہ ہم اس حکایت کے مخاطب نہیں ہیں۔

ہمارا تقویٰ ہمارا تقویٰ ہے۔ فتوے پر عمل کر لیں میں یہی ہمارا تقویٰ ہے۔ فتوے سے جو چیز حلال ہو اس کو حلال سمجھو۔ لیکن اتنی وسوست بھی نہیں کہ ہر چیز جائز ہو نہ سود کی پروا ہو نہ رشوت کی

پروا ہو۔

مال کے متعلق ایک امر پر اور مطلع کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ لوگ میراث میں بہت زیادہ بے احتیاطی کرتے ہیں کیونکہ خود مالک تو اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا نہیں اس لئے بے تک قبضہ میں آتا ہے۔ مرنے والا تو مر گیا اب جس کی لالچی اس کی بھینس۔ بس جس کے ہاتھ میں کبھی ہوئی وہ مالک بن بیٹھا۔ مال میراث میں لوگوں کو ذرا احتیاط نہیں۔ اکثر تو محض کر لیتے ہیں دوسرے وارثوں کو پتہ بھی نہیں دیتے۔ اکثر زبردست ہونے کی وجہ سے قابض ہو جاتے ہیں اور زیادہ بے فکری وٹاں ہوتی ہے کہ جہاں قانون سے بھی انہیں کو ملتا ہے۔ جیسے کہ ادھر میں قانون ہے کہ میراث کا مالک فرزند اکبر ہے اور دوسرے و خلیفہ خوار۔

خوب سمجھ لو کہ یہ مطلق حرام ہے۔ شریعت نے میراث کے احکام خود مقرر کئے ہیں۔ کوئی قانون شریعت کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ شریعت نے جس جس کا حق رکھا ہے اس کو پہنچانا واجب ہے۔ دوسرے کے حق سے خود منتفع ہونا یا کسی اور کو دینا حلال نہیں ہے۔ بلف کو دیکھئے ایسے اموال میں کتنی احتیاط کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ آپ چراغ کی روشنی میں مال وقف کا حساب لکھ رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے ان کو آتے ہوئے دیکھ کر آپ نے چراغ گل کر دیا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ اس میں کیا مصلحت تھی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ چراغ بیت المال کے

تیل کا ہے۔ اگر روشن رہنے دیتا اور آپ سے باتیں کرتا تو باتوں میں اس کا صرف کتنا درست نہ تھا اور اگر آپ سے باتیں نہ کرتا تو مروت کے خلاف تھا۔

اسی طرح میراث میں سلف سخت احتیاط کرتے تھے۔ ایک بزرگ ایک دوست کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں گئے تو اُن کو نزع کی حالت میں پایا۔ چنانچہ کھوڑی دیر میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ وہاں چراغ جل رہا تھا۔ آپ نے فوراً اُسے گل کر دیا اور اپنے پاس سے پیسے دے کر تیل منگوا یا اور اُس سے چراغ روشن کیا اور فرمایا کہ وہ تیل مرحوم کی ملک اسی وقت تک تھا جب تک کہ وہ زندہ تھے اور انتقال کرنے ہی تمام ورثاء کی ملک ہو گیا۔ جس میں بعض ورثاء یتیم ہیں بعض غائب ہیں۔ اس لئے اس کا استعمال جائز نہیں۔

سو یہ تھی اُن حضرات کی احتیاط۔ اب تو تیل کیا یا تھی کے ماحقی نکل جائیں اور خبر نہ ہو۔ زیادہ افسوس یہ ہے کہ اہل علم بھی اس کی پروا نہیں کرتے۔ مدارس تک میں اس کی احتیاط نہیں۔ مدارس میں قیمتی قیمتی اسباب اس قسم کے ہوتے ہیں مجھ کو یاد نہیں کوئی شخص کسی مدرسہ کی طرف سے اس مضمون کا گیا ہو کہ یہ اسباب جو بھیجا ہے تو سب ورثاء کی اجازت سے بھیجا ہے یا نہیں یا اگر کوئی بچہ میت کا نابالغ ہے تو اُس کا حصہ نکالا ہے یا نہیں۔ اس میں یہ حال ہے کہ مال آیا اور رکھ لیا۔

سو جب خواص کی یہ حالت ہے تو عوام الناس کو کیا کہا جائے۔

عوام الناس سے کہو بھی تو کہتے ہیں کہ جب اہل علم ایسا کرتے ہیں تو بھلا ہم کس شمار میں ہیں۔ اہل مدارس دل کو یوں سمجھا لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے دینے میں کون انکار کرنا ہے۔ اس لئے سب ورثاء کی طرف سے اجازت ہی ہے اور اگر کوئی نابالغ بھی ہے تو وہ پھر بڑا ہو کر معاف کر دے گا۔ بعض کی بلکہ اکثر کی یہ حالت ہے کہ میت کی فاتحہ اور کھانا وغیرہ مشترک مال سے کرتے ہیں جس کے اندر نابالغ بچوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ جو شخص اس منصوب مال کو کھائے گا وہ معصوب ہوگا۔ جی کو یوں سمجھا لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیتے ہیں پھر اس میں ہم پر الزام کیا ہے۔ بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ کوئی شخص مر گیا۔ بس سارا مال بیوہ کو دے دیا جی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا۔ اب وہ مالک الملک ہے۔ یتیم بچوں کا مال خوب ٹٹا رہی ہے کہیں شادی میں کہیں بیوٹہ میں۔

بیوٹہ کے مفاسد | اول تو بیوٹہ کی رسم ایک رسم ہے یہود وہ اس میں اگر خالص اپنا مال ہوتے بھی نہ لگانا چاہئے اور پھر یہ تو مشترک مال ہے اگر کوئی کہے کہ صاحب بیوٹہ تو نہایت عمدہ رسم ہے

لہ رسم بیوٹہ کبھی پہلے بطریق ہمدردی و امداد برادرانہ تھی اب وہ عام طور سے بصورت قرضہ ہو گیا ہے۔ دور کا کیا ذکر فریبی تعلقات اور واسطہ داریوں میں بھی اسی نیت سے اس کا لین دین ہے کہ آج ہم ان کے دیں گے تو کل کسی تقریب میں ہمارے یہاں واپس آجائے گا۔ اور خصوصاً تقویات ریقیہ حاشیہ بر ص ۱۵۲

مختوراً مختوراً اورینے میں شادی والے کا کام ہو جاتا ہے اور دینے والوں میں سے کسی پر بار نہیں ہوتا، تو مستحسن کو قلع کیسے کہہ دیا۔ عزیز کو دیا اس کی شادی ہو گئی۔ یہ مختور ہی بات ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں نے ایک فائدہ کو تو دیکھ لیا اور دوسرے مفاسد جو اس کے اندر ہیں ان کو چھوڑ دیا۔ اس میں اگر ایک فائدہ ہے، تو مفاسد کتنے ہیں۔ ان مفاسد کو بھی تو دیکھنا چاہئے۔ اور اول تو جو فائدہ اس میں سوچا گیا ہے وہ بھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ آج کل کی شادیوں میں خرچ اتنا کیا جاتا ہے کہ نبوتہ اس کے لئے کافی نہیں ہوتا اور مفاسد اس کے اندر بہت ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک مفسدہ یہ ہے کہ جب لوگ کسی کے

رفیقہ حاشیہ از ص ۱۵۱) میں قصداً وہی لوگ نہ جو کئے جاتے ہیں کہ جن کے ذمہ اپنا نبوتہ واجب ہے، کسی تقریب کا تخمینہ خرچ کرتے ہوئے یہ بھی اندازہ کیا جاتا ہے کہ اتنا روپیہ اپنے نبوتہ کا بھی اُجائے گا اور پھر جب دوسری جانب سے وصول میں توقف و تساہل ہوتا ہے تو بر ملا دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ اور اظہار کیا جاتا ہے کہ فلاں کے ذمہ اتنا نبوتہ چاہئے تھا نہ تو خود اُسے نہ ہمارے نبوتہ کا روپیہ بھیجا۔ اور بعض جگہ تو اُسندہ تقریب تک انتظار بھی نہیں کرتے درمیان میں ہی پیام اُجاتا ہے کہ ہمارے نبوتہ والے روپے بھیج دو ہمیں ضرورت نہیں ہیں ایسے صریح و مسلمہ قرضہ کی حالت میں انتظام ادائیگی قطعی نہیں۔ اکثر جگہ تو مالک خانہ کی زبانی

رفیقہ حاشیہ بر ص ۱۵۳

یہاں نبوتہ دیتے ہیں تو نبوتہ لینے والا اتنے لوگوں کا مقروض بنتا ہے۔ حدیث میں صاف موجود ہے کہ مقروض جنت میں نہ جائے گا۔ تا وقتیکہ اہل حق کا حق ادا نہ ہو جائے۔

دوسرا مفسدہ تو بالکل لاعلاج ہی ہے۔ اس کا علاج ہی نہیں سوائے اس کے کہ اس رسم کو چھوڑا جائے اور وہ میراث کے ایک مسئلہ پر متفرع ہے۔ اسے اس طرح سمجھئے کہ ایک شخص مرا۔ اس نے دو بیٹے چھوڑے اور اس نے مثلاً پانچ روپے نبوتہ میں دیئے تھے تو پانچ روپے بھی مردہ کی میراث میں جب وصول ہوں گے تو ان کا ورثا پر تقسیم کرنا واجب ہوگا۔ اب وہ آئیں گے کس طریقہ سے۔ اس کی صورت یہی ہے کہ جب ان کے یہاں

رہقیہ حاشیہ از ص ۱۵۲) یادداشت پر حساب کتاب ہے۔ خود کو بھی سہو ممکن ہے اور پھر اپنے بعد اپنے ورثا کو اس کی بابت کوئی ہدایت یا وصیت نہیں۔ پیمانندگان میں سے جس کسی کو جس قدر یاد آیا یا دوسری جانب سے ان پر تقاضا ہوا تو خیر کچھ ادائیگی ہوگئی اور اگر دوسری جانب بھی اصل نبوتہ کا انتقال ہو گیا اور اس کے چند وارث ہیں تو ایسی صورت میں اول تو خبرے نباشد اور اگر دیا بھی تو کسی ایک وارث کو دے کر باقی ورثا کا مطالبہ یا حق بالکل سوخت۔ نہ ان کی تلاش کہ وہ کہاں کہاں ہیں اور ہر ایک کا کیا حصہ ہوا۔ جہاں کہیں اس نبوتہ کا انتظام تحریری ہے وہ بھی لینے کے واسطے ہے دینے کے واسطے کبھی اس کی میزان بھی نہیں دینے کسی ساہوکار (بقیہ حاشیہ پر ص ۱۵۲)

کوئی شادی ہوگی تو وہ بطور نیوتہ کے دیئے جائیں گے۔ اب ایک بیٹے کی شادی ہوئی اور وہ پانچ روپے آٹے تو وہ پورے پانچ روپے اس کے نہیں بلکہ صرف اڑھائی روپے کا مستحق ہے اور باقی اڑھائی روپے دوسرے بھائی کا حصہ ہے لہذا وہ اس کو دینے لازم ہیں مگر وہ اس کو نہیں دیئے جاتے۔ اس لئے دینے والے کے ذمہ سے پانچوں روپیہ ادا نہ ہوئے بلکہ صرف اڑھائی روپے ادا ہوئے اور دوسرے بیٹے کے اڑھائی روپے رہ گئے۔ پھر وہ مر گیا۔ تو اب ان اڑھائی روپے کی میراث چلے گئے۔ اسی طرح آگے اولاد ہوگی اور یہی سلسلہ چلے گا۔ تو اس اڑھائی روپیہ کے ہزاروں آدمی مستحق ہو گئے۔ قیامت میں اس شخص کی جان پر بنے گی۔ اس لئے ایک ایک پیسہ اور کوڑی

بقیہ حاشیہ از ص ۱۵۳، ہا جن کا یا کسی دوسری قسم کا قرضہ ہوگا تو اس کا شمار بھی کریں گے کہ ہم کو اس قدر دینا ہے لیکن اس کے ذیل میں کبھی نیوتہ کا قرضہ نہیں گنا جاتا۔ ایسی حالت میں اس نیوتہ کا لینا دینا مذموم اور باعث ہلاکت ہے کہ ایک زمانہ اس میں مبتلا ہے۔ اور مقروض اور پھر بے فکر اور حساب آخرت سے نڈر۔ اگر لیتے دیتے وقت قرض حسنہ کا اظہار و اقرار ہو، تو بھی اس کا عمل درآمد چند خواص تک محدود ہوگا۔ عوام میں اس کا اہتمام نادر و سبب ہیں بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس رسم کو قطعی بند کر دیا جائے اور جس کے ذمہ جس کسی کا اب تک یا فقی ہے اپنی حیات میں بلا انتظار کسی تقریب کے ادا کر دیا جائے۔ ورنہ نہ فرصت بے خبر وہ ہر سچ یا شی زود باش۔ نیوتہ میں

(بقیہ حاشیہ بر ص ۱۵۵)

کا دعویٰ ہوگا۔ آخر اس کا علاج کیا سوچا ہے؟ اس بیوٹہ سے تو نا بیوٹہ اچھا۔ یہ مفاسد ہیں اس بیوٹہ خدیت میں۔ مگر چونکہ لوگوں کو شریعت کا علم نہیں، اس واسطے ان خرابیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

غرض یہ کہ میراث میں بڑی خرابی ہو رہی ہے

میراث کی خرابیاں

بیوہ کو اگر سارا مال مل جاتا ہے تو وہ اس کو اس طرح لٹاتی ہے اور یتیم بچوں کا بھی حصہ نہیں چھوڑتی ہے۔ اور اگر کسی اور کا قبضہ ہو جاتا ہے تو وہ مالک بن بیٹھتا ہے۔ دوسرے وارثوں کو نہیں دیتا۔ رہیں مگر کے برتنے کی چیزیں سو وہ تو مشترک ہی رہتی ہیں۔ کبھی تقسیم ہی

دقیقہ حاشیہ از ص ۱۵۴) نقد روپیہ کے علاوہ پارچہ کا بھی لین دین ہے اور یہ اس نقد سے بدتر ہے۔ بیشتر یہ باعث بے لطفی جانین ہوتا ہے کہ ہماری بڑی کا کیسا اچھا تھا اور ہمیں کیسا ذلیل دیا۔ اس حجت کی بنا پر بعض گھروں میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس بڑی آنے والی کو بدستور رکھ چھوڑتے ہیں اور جب دینے والے کی کوئی تقریب ہوتی ہے خواہ کسی مدت میں ہو وہی بڑی پوشیدہ رکھی ہوتی دیتے ہیں۔ اس صورت میں یہ بڑی جانین میں سے کسی کے مصروف کی نہ ہوتی اور رکھے رکھے بیکار ہو گئی۔ کیسا افسوس اور نازیبا عمل ہے۔ اس کو بھی بالکل مسدود کیا جاوے اور جس کسی کی چاہتی ہو فوراً اسے دی جاوے۔ فقط ۱۲۔ جامع۔

نہیں کی جائیں۔ یہ گڑبڑ ہو رہی ہے میراث میں۔

بس ان سے بچنے کی اُسان صورت یہ ہے کہ جب کسی کا انتقال ہو جائے تو جتنا مال اور اسباب ہو سب تقسیم کر لو اور ویرہ بالکل نہ کرو۔ ویرہ کرنے میں بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بطور نمونہ کے چند واقعات سناتا ہوں۔

میرے والد صاحب کے پاس ایک قلمدان تھا۔ بعد اُن کے انتقال کے میں نے لے لیا۔ کیونکہ سارے ورثا بالغ تھے اور میرے لینے سے سب خوش تھے۔ مگر پھر مجھے کھٹکا ہوا کہ میرے فعل سے دوسروں کو سزا ہو گی بس میں نے قیمت کر کے ورثا کو تقسیم کی اور میں نے کہہ دیا کہ چاہے قلمدان لے لو چاہے پیسے لے لو اور وجہ یہ تھی کہ مجھے اس کو مفت لینے ہوئے غیرت آئی کہ کیوں ورثاء کی منت لوں کہ ان سے معاف کراؤں۔

ہر کہ نان از عمل خویش خورد منتِ حاکم طائی نہ برد
دوسرے مجھے سبق سکھانا تھا کہ یوں کیا کرتے ہیں۔

میرے والد کے اسباب میں چکن کے دو چوٹے تھے جو لکھنؤ سے لائے تھے۔ ایک میرے لئے اور ایک بھائی کے لئے۔ مگر وینے نہ پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اگر میں لے لیتا تو الحمد للہ! کوئی ان کا مطالبہ کرنے والا نہ تھا اور ان کے کس کام کے تھے۔ خوشی سے سب مجھ کو دے دیتے مگر میں نے کہا کہ ان میں بھی میراث جاری ہوگی۔ یہ میں نے اس وجہ سے کہا کہ اس سے اولوں کو سبق ملے گا۔ برتن وغیرہ سب کی تقسیم شرع کے موافق کی گئی اور تھوڑی ہی دیر میں تمام ترکہ تقسیم ہو گیا اور ذرا نزاع نہیں ہوا۔ اس لئے میری رائے

ہے کہ ترکہ مرتے ہی تقسیم ہو جاوے۔ بعد میں بڑے قصبے پھیلتے ہیں۔ اسباب
نسیم برسوں کے بعد ہوتی ہے۔ بڑی خرابیاں پڑتی ہیں۔ بس خدا سے ڈرنا چاہئے
بران معاملات کو درست کرنا چاہئے۔

خلاصہ یہ کہ لوگوں نے آمد مال کے ابواب
مد و خرچ کے معاملات میں سخت بے احتیاطیاں کر رکھی ہیں۔ یہ

مجھے ہیں کہ بس شریعت کا تعلق صرف نماز روزہ سے ہے۔ حالانکہ شریعت
معاملات اور اموالوں سے بھی پورا تعلق ہے۔ قنات کے روز ایک
گاہ کے عوض میں سات سو مقبول نمازیں لے جائیں گے۔ پھر حضرت اگر ایسا
یا تو تیل ایٹھے ہمارے پاس کیا بیچے گا۔ خدا کے لئے معاملات درست کرو
جائز آمدنی کو چھوڑو۔ رشوت بھی حقوق عباد سے ہے۔ سود بھی حق عباد ہے
سب سے احتیاط رکھو اور حقوق الہی کا بھی خیال رکھو۔

رشوت کے بارہ میں یہ کہنا کہ اس نے تو خوشی سے دیا، یہ محض غلط ہے
ن اپنا مال خوشی سے نہیں دیتا۔ اپنے اوپر قیاس کر کے دیکھئے کہ اگر آپ کو کبھی
خاق پڑے تو کیا آپ خوشی سے دیں گے؟ ہرگز نہیں بلکہ اگر معلوم ہو جائے
کام ویسے ہی ہو جائے گا تو کبھی نہ دیں۔

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا وہ تحصیل مال کے متعلق تھا جس کو میں نے
حصیل سے عرض کر دیا۔ اب دوسری شق مال کے خرچ کرنے کی باقی رہ گئی

لے غالباً ایک دانگ تین پیسے کا ہوتا ہے۔

کہ اس میں بھی لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں۔ اور مال میں وہی تصرف ہے ایک
 اس کا حاصل کرنا دوسرے اس کا صرف کرنا۔ ایک جزو کا تو بیان ہو چکا۔ اب
 دوسرے جزو کو بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ خرچ میں بے احتیاطی دو قسم کی ہوتی
 ہے۔ ایک تو یہ کہ کھلے معاصی میں مال خرچ کیا جائے۔ دوسری صورت
 یہ ہے کہ کھلی معصیت میں تو مال خرچ نہیں کیا مگر خرچ حد سے زیادہ کیا۔
 شہوات میں منہمک ہو گئے۔ تنعم اور تفاخر میں اڑانا شروع کر دیا۔
 خوب سمجھ لو کہ تنعم اور تفاخر کا انجام ذلت ہے۔ کیونکہ اموال غیر منجاری
 تو ہیں نہیں کہ کتنا ہی خرچ کرو اور وہ کم نہ ہوں۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ مکان تک
 بکنے کی نوبت آجاتی ہے۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ مسجد کا ستواہ بھرا کرتے تھے اور لوگ
 ان کو نواب کہہ کر پکارتے تھے۔ میں نے کہا، یہ نواب کیسے ہیں معلوم ہوا
 کہ واقعی نواب تھے۔ اپنے آپ کو تباہ کر کے اس اوقات پر آگئے ہیں
 نے کہا، شاباش! یہ انجام ہے مسلمانوں کا۔ صدقات اور دوسرا فضول خرچہ
 کی بدولت تباہ ہو رہے ہیں۔ جائیدادیں ہندوؤں کے قبضہ میں جا رہی ہیں۔
 کانپور میں ایک رئیس کا انتقال ہوا۔ ساری جائیداد ان کے بیٹے کے
 ہاتھ آئی۔ اس نے اڑانا شروع کی۔ اس کے والد کے ایک دوست نصیر
 کرنے کے لئے آئے اور اس کو بھٹا کر بہت دیر تک سمجھایا۔ وہ چپکے
 گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت خوش ہوئے
 کہ اس پر میری نصیحت کارگر ہوئی۔ جب یہ سمجھا چکے تو اس نے کہا کہ میرا

آپ کہہ چکے یا ابھی کچھ اور کہنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بس جو مجھے کہنا تھا وہ کہہ چکا۔ وہ اٹھا اور طاق میں سے ایک لنگوٹی اٹھا لایا اور کہا کہ سنئے فضول خرچی کا زیادہ سے زیادہ انجام یہ ہے۔ میں نے جس روز سے فضول خرچی شروع کی اسی روز سے میں اس کے لئے آمادہ ہو گیا ہوں اور یہ بنا کر رکھ چھوڑی ہے وہ بیچارے اس کا منہ دیکھتے رہ گئے کہ کم بخت نے بیکار ہی میرا دماغ خالی کر دیا۔

غرض یہ کہ بعض فضول خرچ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ لنگوٹی سے اُگے تو اور کچھ نہیں۔ لنگوٹی باندھ لیں گے۔ سو ایسے باہمت لوگ بھی ہیں۔

مسلما نوں کی تباہی کا راز | میں یہ سچ کہتا ہوں کہ مسلمان دوسری قوم کے ہاتھ سے کبھی تباہ نہیں ہوتے۔ جب

تباہ ہوتے ہیں اپنے ہاتھ سے ہوتے ہیں۔ اسلام ایک قلعہ ہے۔ آہنی دیوار ہے۔ اس میں مسلمانوں کو بسایا ہے۔ اس دیوار کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ اس کا کیا علاج کہ کوئی خود ہی دشمن کے لئے پھاٹک کھول دے۔ اگر یہ طریقہ سے رہیں تو کسی سے مغلوب ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ تو حزب اللہ ہیں جن کے بارہ میں ہے فان حزب اللہ هم الغالبون۔ یہ تو غالب ہی رہیں گے مگر خود ہی اپنا ناس کہیں تو اور بات ہے۔ مسلمانوں پر جب تباہی آئی ہے اپنے ہاتھوں آئی ہے۔ کسی دوسرے کے ہاتھوں نہیں آئی۔ چنانچہ رؤساء کی عموماً یہ حالت ہے کہ چانڈا اور گانچہ اور عیاشی میں اپنی جائیدادوں کو ختم کر دیتے ہیں اور پھر فقیر ہو جاتے ہیں۔

ہمارے یہاں ایک لواب تھے۔ کسی ملک کے لواب نہیں تھے بلکہ فضول خرچی سے لواب مشہور تھے۔ یہ حالت تھی فضول خرچی کی کہ نوچندی کا میلہ ہے اور مصاحبوں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا کہ ہمارے پاس کچھ ہوتا تو ہم بھی جاتے۔ بس یہ سن کر سو سو روپیہ سب کو دے دیا۔ اور یہ کیفیت تھی کہ جلیبیاں منگالی ہیں۔ مصاحبین میں سے کسی نے کہہ دیا کہ تیل کی ہیں بس بیلوں کو ڈلوادیں۔ وہ جلیبیاں بیل کھا رہے ہیں۔ اور صندھیا قسم کی فضولیات ان کے یہاں رہتی تھیں۔

انجام یہ ہوا کہ مجلس فلاح ہو گئے۔ ایک حالت تو وہ تھی پھر دوسری حالت فاقہ کی ہوئی۔ اس میں یہ کیفیت تھی کہ میرے پاس، تمہارے پاس پہنچتے ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ اٹھ آنے پیسے دے دیجئے۔ بہت ضرورت ہے۔ جو لوگ پردیس سے آئے ان کے پاس پہنچ جاتے میرے والد کے پاس بھی اکثر آئے۔ میں اس زمانہ میں پڑھا کرتا تھا۔ میں ان کی یہ حالت دیکھتا۔ مگر لوگ کہاں تک دیں۔ انہوں نے تو پیشہ ہی یہ کہ لیا تھا انہیں انکار کر دیتے۔

جس وقت ان کے پاس جاؤ اور لہجی اس وقت اگر کوئی ان کو نصیحت کرتا کہ اس طرح فضول خرچیاں مت کرو۔ جاؤ اور کوچ بیچ کر مدت اڑائے ڈالو۔ دیکھو تمہارے باپ نے کس طرح یہ جاؤ اور خریدی تھی لواب فرماتے ہمارے باپ پر تو فٹ تھے کہ چاندی دے کر مٹی لیتے تھے یعنی روپیہ دے کر زمین خریدتے تھے، ہم مٹی دے رہے ہیں اور چاندی خرید رہے

ہیں یعنی زمین بیچ رہے ہیں اور روپیہ لے رہے ہیں۔ مگر انہوں نے اپنی حالت سے یہ نہ سمجھا کہ مٹی تو چاندی کی بھی ماں ہے۔ جس کے پاس زمین ہے اس کے پاس سب کچھ ہے۔

حضرت صلوات اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس جائداد ہو اور اس کو کسی مصلحت سے بیچ دے تو فوراً دوسری خرید لے کیونکہ روپیہ میں برکت نہیں ہوتی (یعنی وہ رہنے والی چیز نہیں) اور واقعی ہے بھی یہی کہ روپیہ رہتا نہیں۔ سو اس حدیث میں تو جائداد کی حفاظت کی رغبت دلائی جا رہی ہے اور ایک اور حدیث ہے اس میں جائداد خریدنے سے حضرت عائشہ کو مانعت فرمائی ہے۔ وہ پیغمبر ایک جگہ رغبت دلا رہے ہیں جائداد رکھنے کی اور وہی حضرت عائشہ سے فرما رہے ہیں کہ اے عائشہ جائداد امت خریدنا۔ تو مطلب یہ ہے کہ نہ ہو تو لومت اور ہو تو دومت۔ بجز نبی کے کوئی پیشوا ایسا ہے جس کی ایسی تعلیم ہو۔ بس دوسرے پیشوا وقتم کے ہیں یا تو دنیا کو چھڑائیں گے یا اس میں مبتلا کر دیں گے اور یہاں یہ کیفیت ہے

یہ کتب جام شریعت برکت سندلین

ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باخون

اور خاص اس تعلیم میں ایک راز ہے وہ یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو ذلت سے بچاتے ہیں اور یہ امر شاہد ہے کہ جس کے پاس جائداد ہو اس کی عزت تو جائداد سے ہوتی ہے۔ وہ اگر جائداد بیچ دے گا تو اس کی وہ عزت ہرگز نہ رہے گی۔ اس لئے اس کو رکھنے کے

واسطے فرمایا۔ یہاں تک کہ اگر کسی مصلحت سے فروخت کرے تو پھر دوسری
 فوراً لے لے اور جس کے پاس جائیداد نہ ہو تو اس کی جو عزت ہوگی وہ ویسے ہی
 ہوگی۔ پھر جائیداد خرید کر کے کیوں جھگڑے میں پڑے۔ یہ خوبی ہے اس
 قانون میں۔ کوئی قانون ہے شریعت کے سوا سٹے جو عقل سلیم اور فطرت صحیحہ
 کے موافق ہو۔

خلاصہ یہ کہ جائیداد ایسی چیز ہے کہ حضورؐ اس کے بیچنے سے منع فرما
 رہے ہیں۔ دیکھا آپ نے زمین کتنی قدر کی چیز ہے۔ اس سے عزت اور
 جاہ کی حفاظت ہوتی ہے۔ اور اس کی برکت دیکھئے کہ جس کے پاس یہ
 ہے اس کے پاس سب کچھ ہے اور خوبی یہ کہ آمدنی کھاتے رہو اور ویسی
 کی ویسی بنی رہتی ہے۔ اس میں سے کچھ کم نہیں ہوتا۔

تو ایسی چیز کے لئے ان خرچیلے لو اب نے کہا کہ مٹی دے کر ہم جائیداد
 خریدتے ہیں۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ اب میں اس کی تائید میں ایک
 حدیث کی شرح کرنا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ زمین کیسی چیز
 ہے۔

زمین کی حقیقت

وہ حدیث یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ زمین
 میں سب سے پہلی غذا زمین کی روٹی ہوگی۔ جو
 تعالیٰ زمین کی روٹی بنا کر جنت والوں کو کھلاوے گا۔ ظاہراً اس حدیث پر
 کوئی ہنسے گا کہ اچھے جنت میں گئے کہ ڈھیلے اور پتھر کھانے کو ملے اس سے
 تو دنیا ہی میں اچھے تھے۔ وہاں تو روٹی کھاتے تھے اور یہاں ڈھیلے

پتھر نصیب ہوئے۔ کسی کے حصہ میں کوہ منصور کی کا پتھر اور کسی کے حصہ میں کوہ شملہ کا۔ اچھے جنت میں آئے کہ ایسی چیزیں کھانی پڑیں۔ اس حدیث کی شرح بجز اہل ابرار اور اہل اللہ کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کی شرح سن کر آپ کو اہل اللہ کی قدر معلوم ہوگی کہ حق تعالیٰ نے ان کو کیسا فہم دیا ہے۔ حقیقت میں ظل اللہ فی الارض کا لقب پورا ان ہی حضرات پر صادق ہے۔ سو وہ حضرات پول کہتے ہیں کہ دنیا میں جتنی چیزیں اچھی سے اچھی کھا رہے ہیں اور اچھے سے اچھے کپڑے پہن رہے ہیں۔ یہ کہاں سے آئے۔ زمین ہی سے تو نکلے ہیں۔ اگر اونی کپڑے ہیں تو اُون ہوتی ہے حیوانات سے اور حیوانات نے زمین ہی کے تو اجزا کھائے ہیں جن سے وہ اُون پیدا ہوتی ہے۔ عرض جس چیز کو بھی جیسے گا اجزائے زمین ہی اس کی حقیقت نکلے گی۔ زمین میں پانچ سیر گیہوں ڈالے تھے اور پیدا ہوئے پانچ من۔ تو وہ پانچ سیر سے زیادہ جو پیدا ہوئے وہ زمین ہی کے تو اجزا ہیں۔ انہی کی تو صورت بدل گئی ہے۔ یا آم کا درخت نکلا اور اس میں ہزاروں آم پیدا ہوئے یا غلہ پیدا ہوا یا کسی قسم کا پھل اترا سب زمین ہی کے تو اجزا ہیں، عناصر سے مرکب ہو کر جس میں جزو غالب ارضی ہے، اس شکل سے نمودار ہو گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے اندر سب چیز موجود ہے۔ پس یہ کہنا غلط ہو گیا کہ زمین میں بس ڈھیلے اور پتھر ہی ہیں۔ زمین میں انا بھی ہیں، آم بھی ہیں، انگور بھی ہیں، کھٹائی بھی مٹھائی بھی۔ سب چیزیں زمین کے اندر موجود ہیں۔ ہر طرح کا مادہ اس میں رکھا ہوا ہے۔ یہ وہی مادہ ہے جو ان رنگ رنگ صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے

ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ زمین کے اندر سب کچھ ہے۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب کوئی کسی کے یہاں مہمان ہو کر جاتا ہے تو اس کو بے چھنا آٹا تک نہیں کھلاتے۔ اور لوگ جہاں گئے خدا کے مہمان ہو کر۔ تو اللہ تعالیٰ پر یہ گمان کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ زمین کو بے چھانے کھلا دینگے پس وہ اپنی قدرت کی مشین سے شملہ اور منصور کی پتھر سے جو فضلہ ہے وہ انکس کر دیں گے اور ان میں جو اجزا قابل کھانے کے ہیں وہ رہنے دینگے۔

اب اس تقریر سے کچھ بھی شبہ نہیں رہتا وہیں کہتا ہوں کہ زمین کی روٹی کے برابر کوئی چیز مزیدار ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ دنیا میں جتنے بھی منرے ہیں، سب زمین ہی کا طفیل ہے۔ خوشبو میں جس قدر بھی ہیں زمین ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس سے جو روٹی تیار ہوگی ظاہر ہے کہ اس میں ہزاروں قسم کے تو منرے اور ہزاروں قسم کی خوشبو میں ہوں گی۔ لہذا اس کی روٹی سے کون سی چیز مزیدار ہو سکتی ہے۔ جامع

اب ایک بات اور رہ گئی۔ وہ یہ ہے کہ اس تکلف کی ضرورت کیا تھی کہ اس زمین کی روٹی بناٹی جائے۔ یہ جنت کی نعمتوں کے برابر تو ہو گی نہیں پھر جنت ہی کی چیز کھلا دیتے۔

اس کا راز بھی حضرات اہل اللہ ہی نے بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ اہل اللہ میں سے بعض ایسے ہوئے ہیں کہ انہوں نے دنیا کی لذت چکھی تک نہیں یا تو قصداً یا عیسر نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ موازنہ نہ کر سکتے تھے جنت اور دنیا کی نعمت میں۔ اور جب کہ دونوں کا تفاوت معلوم نہ ہوتا تو جنت کی نعمتوں کی قدر بھی

پوری نہ ہوتی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے پہلے دنیا کی چیز کو کھلا دیا کہ سب سے زیادہ لطیف غذا دنیا کی یہ ہے اب ہمارے یہاں کی غذا کھاؤ۔
اگر کوئی کہے کہ پھر ایسے ہی لوگوں کو کھلا دیا ہوتا جن کو دنیا کی لذت نہیں ملیں۔ سب کو کیوں کھلایا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کہیم کی یہ عادت نہیں ہوتی کہ بعض کو کھلائیں اور بعض کو محروم رکھیں۔ اس لئے ہم سوا بیوں کو بھی ان کے ساتھ شامل کر دیا یہ راز ہے اس حدیث کا۔ اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ زمین کیا چیز ہے کھانے اس میں، پیوے اس میں، کپڑے اس میں، سب چیزیں زمین ہی میں ہیں۔ اس لئے یہ بڑی قدر کی چیز ہے۔

اگر کسی مسلمان کی زمین کسی کافر کے پاس دیکھتا ہوں تو میرا دل بہت دکھتا ہے۔ کسی کے اچھے مکان کو دیکھتا ہوں تو بوجھتا ہوں کہ کس کا ہے۔ اگر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کا ہے تو خوش ہوتا ہوں۔ اگر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کا نہیں تو قلق ہوتا ہے۔
میں ایک ضرورت سے نظام آباد گیا تھا۔ وہاں سے حیدرآباد قریب تھا۔ میں نے سنا تھا کہ وہاں مسلمانوں کو بہت ثروت ہے۔ غیر قوموں سے بھی ثروت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں وہاں سے حیدرآباد بھی گیا تاکہ مسلمانوں کو عزت کی حالت میں دیکھوں۔

میں گو مسلمانوں کے لئے فی نفسہ مالدار ہونا پسند نہیں کرتا مگر اور مل کے مقابلہ میں اس کو پسند کرتا ہوں۔ بشرطیکہ وہ احتیاط کریں۔ اسی لئے جن کو بھی

مال اڑاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو یوں کہتا ہوں کہ اس کو کیا ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کی نعمت کی قدر نہیں کرتا۔ بلکہ میں تو حلاوتِ معصیت ہونے کے دنیا کی مصلحت سے بھی اسراف کو پسند نہیں کرتا۔ دنیا کے مصالح بھی تو اسی میں ہیں کہ اس کو بے جا صرف نہ کیا جائے۔

میں سفیان ثوریؒ کا قول عرض کرتا ہوں جو انہوں نے مال کے بارہ میں فرمایا ہے۔ اور یہ بزرگ وہ ہیں جو دنیا اور دنیا داروں سے انتہا و رہبر کی لغزت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ مارون رشید تخت پر بیٹھے تو ان کی تخت نشینی کا جلسہ ہوا جس میں علماء اور فقراء کو بہت کچھ ہدایا دیئے گئے مگر آپ ملنے کو بھی نہیں گئے۔ حالانکہ آپ کی مارون رشید کے ساتھ بچپن کی دوستی تھی۔ دونوں ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے۔ اگر ہم سوال ہوتے تو پوچھتے کہ اس میں ضرر کیا ہے۔ مارون رشید ایسے نہیں ہیں کہ ان سے ملنے نہ سچائیں، دینار بادشاہ ہیں۔ مگر وہ جا کہ بھی نہ پھرے۔

مارون رشید جب تخت نشینی کے قصوں سے فارغ ہوئے تو سفیان ثوریؒ کی خدمت میں بڑے ادب سے خط لکھا کہ بھائی سفیان کو یاد ہو گا جو مجھ میں اور تم میں علاقہ تھا۔ تم میرے بھائی ہو۔ میری تخت نشینی سے تمہارا جی خوش ہونا چاہئے تھا مگر تم ملنے بھی نہیں آئے۔ تم آئے تو مجھے خدمت کرنے کا بھی موقع ملا۔ عرض انہوں نے بڑے ادب سے خط لکھا۔ مگر جس وقت سفیان ثوریؒ کے پاس خط گیا ہے تو انہوں نے اس کو کھنڈ بھی نہیں لگایا بلکہ اس کو ایک لکڑی سے ٹھوٹا اور اسی کی پشت پر جواب لکھوا دیا۔ جس کے شروع میں

یہ مضمون تھا کہ ظالم ہارون رشید کو واضح ہو جس نے مسلمانوں کے حق پر قبضہ کیا۔ جس وقت قاصد نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ بادشاہ کے خط کی ان کے یہاں یہ قدر ہے تو اس پر بے حد اثر ہوا اور وہ دربار میں پہنچا اور خط ہارون رشید کے سامنے ڈال دیا اور کہا کہ میرا استغفار منظور ہو۔ ہارون رشید اس خط کو دیکھ کر رو پڑے اور کہا کہ افسوس پیام لے جانے والا تو کامیاب ہو گیا اور پیام بھیجنے والا محروم رہ گیا۔

سو جن کو اتنی بڑی نفرت تھی دنیا اور اہل دنیا سے، وہ کہتے ہیں کہ جس کے پاس پیسہ ہو تو اسے چاہئے کہ اس کی قدر کیے اڑائے نہیں۔ یہ حضرات مرتبی تھے۔ حدود کے سمجھنے والے تھے۔ آپ فرماتے ہیں الحلال لا یجوز السوف یعنی مال حلال میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ اس کو فضول خرچ کیا جاوے۔ اور آپ اس کی مصلحت بھی بیان کرتے ہیں۔ لولا ہدۃ الدراہم لتمتدک بناھولاء الامراء۔ یعنی اگر ذرا ہم نہ ہوتے، تو یہ حکام ہم کو دشمال اور پامال کر دیتے۔ واقعی جس کے پاس مال ہونا ہے اس پر حکام دست اندازی نہیں کر سکتے۔ مال والا ان بان کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی وہ عزت ہوتی ہے جو بے پیسے والے کی نہیں ہو سکتی۔ اس کو سر نیچا کرنا نہیں پڑتا۔ بھائی اسی واسطے مال بڑی قدر کی چیز ہے۔ سو آپ نے یہ اس کی حکمت بیان فرمائی۔

اب آپ کو معلوم ہوا کہ مال کیسی چیز ہے۔ کیا یہ نعمت نہیں خدا تعالیٰ کی کہ جیسے غریب سفقہ بہشتی وغیرہ پر امرار دست اندازی کر سکتے ہیں، مال

والے پر نہیں کر سکتے۔ متول ہی تو اس کا سبب ہے۔ پس ایسی چیز کو برباد کرنا
کتنی بڑی حماقت ہے۔ اسی واسطے فرماتے ہیں۔

اے بسا امساک کر انفاق بہ مال حق را جز بامر حق مدہ
خوب سمجھ لو کہ یہ مال تمہارا نہیں ہے خدا تعالیٰ کا ہے۔ پس ان کا مال جب
وہ ان کی اجازت سے دو جب تک کہ ان کی اجازت نہ ہو ہرگز نہ دے
نہ کسی مصاحب کو نہ اور کسی کو۔ اگر فضول خرچ کرنے سے تباہی آگئی تو کیا اس
وقت کوئی تمہارا ساتھ دے گا۔ جو آج حضور حضور کرتے ہیں، وہی اس وقت
گالیاں دیں گے۔ پس اس کو بہت حفاظت سے رکھنا چاہئے۔ ماں جو
واقعی موقع ہو خرچ کرنے کا وہاں خرچ بھی کرنا چاہئے۔

حضرت حاجی صاحب کے پاس کہیں سے چھ ہزار روپیہ آیا تھا آپ
کو ایک شریف آدمی کے متعلق معلوم تھا کہ ان کو حاجت ہے پس آپ
نے ان کو بلا کر چیکے سے تمام روپیہ حوالے کر دیا۔

حضرت مولانا گنگوہی کے پاس ڈیڑھ سو روپیہ کا ایک پونٹین ایک جگہ
سے آیا۔ ایک نواب آپ کے یہاں آئے ہوئے تھے۔ آپ نے ان کو
دے دیا اور فرمایا کہ یہ پونٹین میرے کام کا تو ہے نہیں کیونکہ پونٹین ایسا قیمتی
ہو تو باقی لباس بھی ویسا ہی ہونا چاہئے اور آپ کے کام آجائے گا۔ کیونکہ
آپ کا سارا لباس ایسا ہی ہوتا ہے۔

مولانا اس طرح نہ رہتے تھے کہ کسی نواب یا امیر سے گروں بھی کر لی پر
بلکہ ایسا بڑا ڈاکو کرتے تھے کہ اوروں ہی کو گروں بھی کر لی پڑتی تھی اور جب

کبھی آپ عمدہ قسم کا لباس پہنتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی والی ملک اور نواب ہیں۔ بے محل ہزاروں روپیہ بھی نہ لیتے تھے اور ویسے روپیہ دو روپیہ بھی قبول فرمایا کرتے۔

ایک بادشاہ نے ایک دفعہ شاید دس ہزار روپے بھیجے۔ آپ نے واپس کر دیئے اور فرمایا کہ ضرورت کے لائق میرے پاس روپیہ بہت کچھ موجود ہے۔ میں اس قدر روپیہ لے کر کیا کروں گا۔ سو امیروں کے ساتھ یہ پتاؤ تھا اور غریبوں سے ایک دو روپیہ بھی لے لیتے تھے۔ ہم خود تو ایسے نہیں ہیں مگر الحمد للہ ایسوں کو پسند تو کرتے ہیں۔

میں ایک اپنا قصہ بیان کرتا ہوں۔ ایک رئیس نے میرے پاس دو سو روپے درسمہ کے لئے بھیجے اور لکھا کہ میرا ارادہ ہے کہ آپ کے یہاں بلانے کی تحریک کروں۔ اگر یہ جملہ نہ ہوتا تو میں لے لیتا۔ میں نے لکھ دیا کہ روپوں کے ساتھ بلانے کی درخواست کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روپے بھیجنے سے آپ کا مقصود یہ ہے کہ میں ان سے متاثر ہو کر آپ کی درخواست کو منظور کر لوں۔ اس لئے میں نے وہ روپے نہیں لئے۔ ڈاک خانہ میں جمع کرادیئے ہیں۔ اگر آپ کے جواب سے یہ شہرہ رفع ہو گیا تو لے لوں گا ورنہ واپس کر دوں گا۔ آخر ان کا خط آیا کہ مجھ سے بے تمیزی ہوئی۔ اب میں آپ سے

لے یہ حضرت کی تواضع ہے ورنہ حضرت اس امر میں تمام مشائخ زمانہ سے بڑے ہوئے ہیں۔ کاتب

یہ درخواست نہیں کرتا۔

سو میرا بلوں جی چاہتا ہے کہ کسی کا احسان رکھ کر نہ لیا جاوے ہمارے
بزرگوں کا مذہب یہ ہے کہ اپنی کسی بات سے دین کی عزت میں ذرہ برابر
فقور نہ آوے۔ جو بات کی جاتی ہے اس میں نیت یہ ہوتی ہے کہ دین کی
عزت ہر طرح محفوظ رہے۔

ایک قابل عمل بات

ایک بات یہ بھی قابل عمل ہے کہ اگر مسلمانوں
کے ساتھ احسان کرنا ہو تو اس کی یہ صورت

نہیں کہ دسترخوان بڑا وسیع ہو۔ آج بریانی پک رہی ہے۔ آج پلاؤ اور قورمہ تیار
ہو رہے ہیں۔ ذرا سے کھانے میں ایک بڑی رقم لگ گئی۔ اس سے تو چار
غریب مسلمانوں کا بھلا ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ کیا کہ بے حاجت قورمہ بریانی
پکائے جا رہے ہیں۔ اپنے عزیزوں کے ساتھ احسان کرنا ہو تو بس روپیہ
نقد دے دیا۔ یہ نہیں کہ جوڑے عمدہ عمدہ دو۔

ایک ڈپٹی صاحب تھے۔ تین سو روپیہ ان کی تنخواہ تھی مگر وہ ان کو
کافی نہ ہوتی تھی۔ ان کے یہاں یہ کیفیت تھی کہ کوئی عزیز دو مہینے سے
پڑا ہے۔ پھر تنخواہ کس طرح سے کفایت کرتی۔ مجھے اس کی اطلاع ہوئی۔
میں نے ان سے کہا کہ تم نے یہ کیا بکھیرا کر رکھا ہے۔ ان سب کو ترک کرو
اگر ایسا ہی عزیزوں کے ساتھ احسان کرنا ہے تو سب کی تنخواہ کرو۔ ان
کے بعض عزیز چولہے میں شامل تھے۔ میں نے کہا سب کے چولہے لگ کر
سوائے میاں بی بی کے۔ اور میں نے یہ کہہ دیا کہ دیکھو میرا نام مرث ظاہر کرنا

کہ یہ اس کی رائے ہے۔ مگر اس پر عزیزوں نے اُن کا بہت پیچھا کیا۔ آخر
مجبور ہو کر انہوں نے میرا نام لے دیا کہ یہ میں نے اُن کی رائے سے کیا
ہے۔ تب کہیں وہ لوگ چُپ ہوئے۔

خلاصہ یہ کہ اپنے اعزہ کے ساتھ سلوک کرنا چاہے تو نقد سے
کھانے وغیرہ کا قصہ نہ پھیلائے۔ اس میں بڑی خرابیاں پیش آتی ہیں۔

ایک دوست نے مجھے لکھا، تمہیں روپے میری تنخواہ ہے اور مہمان
بکثرت آتے ہیں۔ تنخواہ میں خرچ پورا نہیں ہوتا۔ میں بہت پریشان ہوں
میں نے لکھا کہ عرف کو تو طاق میں رکھو جو تمہارا کھانا ہے وہ سب کے
سامنے رکھ دیا گیا اور کہہ دیا کہ بس یہی کھانا ہے سب مل کے کھا لو۔ انہوں
نے ایسا ہی کیا۔ بس سب نے اُٹنا چھوڑ دیا۔ اور میں نے لکھا کہ اہل اللہ کا
مذہب رکھو۔ وضع دار لوگوں کا مہرٹ رکھو۔ اُن کی تو یہ حالت ہوتی ہے
نہیہ بارندہ درختاں کہ ثمر بارندہ اے خوشامسرو کہ از بند عم آزاد آمد

اہل اللہ بالکل آزاد ہیں۔ رسم و رواج کے ذرا منقید نہیں۔ اُن کا بڑا اچھا
مشرب ہے۔ ہر ادا اُن کی محبوب ہے۔ بس میں نے لکھ دیا
کہ اپنا کھانا سب کے سامنے رکھ دیا، پیٹ بھرے چاہے نہ بھرے۔
آدمی ارادہ کر لے تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اس پر عمل کیا اور
اس کے بعد لکھا کہ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے بڑی اچھی تدبیر
بتلائی۔ میرا پیچھا چھوٹ گیا۔

ہم تو یہی تعلیم کریں گے کہ بلا ضرورت مفروض مت ہو۔ گو رسم و رواج

کے خلاف کرنا پڑے۔ مفروض ہوتے سے بڑی پریشانی ہوتی ہے جس کا انجام بہت بُرا ہے۔ اہل اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس میں بڑی راحت ہے۔ ہر مسلمان کو وہی مذہب رکھنا چاہئے جو اہل اللہ کا ہے۔

امراء کو ایک بات یہ چاہئے جس سے امراء سے نجات ہو اور انتظام درست ہو کہ سب سے اول اپنے اسباب کا انتخاب کریں کہ کون سا ضروری ہے اور کون سا فضول ہے۔ امراء میں یہ آفت ہے کہ جو چیز پسند آئی خرید لی۔ اس سے بحث نہیں کہ اس کی حاجت بھی ہے یا نہیں؟ ہر چیز کے خریدار ہو جاتے ہیں۔ جب کسی دکان پر جاتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور خریدتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ عار کی بات ہے کہ کوئی یوں کہے کہ دکان پر آئے اور لیا کچھ بھی نہیں۔ گھر میں بہت سی چیزیں ہوتی ہیں کہ بیکار رکھی رہتی ہیں۔ عمر بھر بھی کسی کام میں نہیں آئیں کسی نے خوب کہا ہے۔

حرم فانی نیست صاحب ثروتہ اسباب معاش

انچہ ماور کار وارحم اکثرے دیکار نیست

پس سب سے پہلے انتخاب گھر کا کرو۔ حلتی چیزیں کام میں آتی ہوں کہ وہ اور حلتی کام میں نہ آئیں خارج کرو یا مساکین کو دے دو۔ نفی صدقہ دینے کی ہمت نہ ہو تو زکوٰۃ ہی میں دے دو۔

ہیں ایک اور مضید ترکیب بتلاتا ہوں فضول خریدی نہ ہونے کی۔ وہ یہ کہ گھر کا معائنہ کیا کرو۔ گھر میں بہت سی چیزیں ایسی دیکھو گے جو سڑ رہی ہیں کسی کو دیکھ لگ رہی ہے۔ پس ایسی چیزوں کو اپنی ملک سے الگ کرو۔

تاکہ گھر میں رونق ہو۔ ایک دفعہ ایسا کہ گڑ روگے تو آئندہ ایسی چیزیں کبھی نہ خریدو گے۔

ایک بات یہ ہے کہ روزِ مہرہ کی معاشرت میں یہ مفتر کر لو کہ جو کام کرو سوچ کر کرو، بے نائل مرت کر ڈالو۔ اور ایک بات یہ کہ کسی کے کہنے سے کوئی کام مرت کر دو۔ بس اپنی رائے پر عمل کرو میرے ایک مامول صاحب تھے۔ انہوں نے نظم گل بکاؤلی میں یہ شعر پسند کیا تھا۔

سن لاکھ کوئی تجھے سناوے کچھ وہی جو سمجھ میں آوے

قرآن اور جمہوری نظام | قرآن شریف میں مشورہ کی تاکید ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کرنا وہی جو اپنی

سمجھ میں آ جاوے۔ حضرت قرآن شریف میں سب کچھ ہے۔ اس کی شان ہے تبیاناً محل شعی۔ کوئی ضروری بات ایسی نہیں ہے جو اس کے اندر نہ ہو۔ چنانچہ دیکھئے قرآن شریف میں مشورہ کا بھی امر ہے و شاورہم فی الامر کہ آپ مشورہ کیجئے اور آگے یہ بھی ہے۔ فاذا عزمتم فتوحا حل علی اللہ یعنی جب خود آپ کا قصد ہو جائے تو آپ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس کام کو کر ڈالئے۔ یہ نہیں فرمایا فاذا عزموا کہ وہ جب عزم کریں یا فلا عزم الاثریہ کہ ان میں سے اکثر عزم کریں۔ مطلب یہ ہے کہ مشورہ تو ان سے کیجئے اور عزم اپنا ہو کہ مشورہ کے بعد جس بات پر آپ کی رائے قرار پائے وہ کیجئے۔

یہاں سے سلطنت جمہوری کا قلع قمع ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہیں

کہ بعد صحر کثرت رائے ہو اس جانب کو لیا جاوے۔ سو قرآن شریف کی تعلیم اس کے خلاف ہے ورنہ یوں ہوتا فاذا عزم اکثرہمہ لکن یہ نہیں فرمایا بلکہ فاذا عزمتم فرمایا کہ جب آپ کا عزم ہو تب کیجئے۔ خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ مشورہ تو سب کا ہو اور عزم آپ کا ہو مشورہ کے بعد جو آپ کی رائے ہو وہ کیجئے۔ دوسروں کی رائے پر عمل کرنا آپ کو لازم نہیں ہے اگرچہ وہ اہل ہی ہوں اور آج کل کے تو اہل الرائے ماشاء اللہ اہل بھی نہیں ہوتے۔

کانپور میں ایک صاحب نے ایک مہاجن سے کہا کہ فلاں بات کی ہم کمیٹی میں تحریک کریں گے تم اس کی تائید کرنا۔ اس نے کہا کہ میں کیسے تائید کروں گا۔ مجھ کو تو تائید کرنی اتنی ہی نہیں۔ اس نے کہا کہ جب میں کہہ چکوں تو بس تم کھڑے ہو کر اتنا کہہ دینا کہ میں تائید کرتا ہوں۔ اس کا خوب سبق یاد کر لیا۔ کمیٹی میں پہنچے تو مہاجن صاحب کو سہم چڑھا۔ ان لفظوں کو بچا رہا دل ہی دل میں گھونٹ رہا تھا کہ کہیں بھول نہ جاؤں۔ عرض ان صاحب نے تحریک کی۔ اس کے بعد مہاجن صاحب کھڑے ہوئے۔ گھبراہٹ میں وہ لفظ یاد دلا رہا نہیں۔ آپ کہتے لگے، صاحبو! میں بھی تائید کرتا ہوں۔ ان صاحب نے ان کی طرف دیکھا، تو آپ کہتے ہیں کہ میں تائید کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے آہستہ سے بتلایا کہ یوں کہو میں تائید کرتا ہوں۔ تو آپ کہتے ہیں، صاحبو! میں تاکید کرتا ہوں۔ آج کل ایسے ایسے اہل الرائے ہوتے ہیں کمیٹیوں میں۔ ایسا ہی ایک اور قصہ ہے کہ ایک جاہل مجسٹریٹ ہو گیا اسے کچھ

جاتا خاک نہ تھا۔ اس لئے آپ کو فکر ہوئی کہ میں فیصلہ کس طرح کروں گا۔ آخر آپ فیصلہ دیکھنے کے لئے ایک اور مجسٹریٹ کے اجلاس میں پہنچے جو کہ ان کے برابر کا تھا۔ اتنے میں دو شخصوں نے عرضیاں پیش کیں۔ اتفاق سے اس نے ایک کو منظور کر کے دائیں طرف دے دیا اور ایک کو نامنتظر کر کے بائیں طرف دے دیا۔ اُنہوں نے دل میں یہ کہا کہ بس فیصلہ اسی طرح ہوتا ہے یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ میں بھی اسی طرح فیصلہ کر دیا کروں گا۔ پس آپ بھی فیصلہ کرنے کے لئے اجلاس پر جا بیٹھے۔ اب جو عرضیاں پیش ہوتی ہیں، تو آپ طاق نمبر میں تو کہہ دیتے ہیں منجور اور دائیں طرف رکھ دیتے ہیں۔ اور جفت میں نامنجور اور بائیں طرف رکھ دیتے ہیں۔ بس ایک کو منجور اور ایک کو نامنجور۔ عرضی پیش کرنے والوں کی کم بختی آئی۔

سو ایسی ایسی بیاقت کے لوگ پر بیڈنٹس ہوئے ہیں۔ نعرین کے قابل ہیں ایسے لوگ۔ کمیٹیوں میں ایسے ایسے ممبر ہوتے ہیں جن کو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہوتی۔ واقعات بتلا رہے ہیں کہ آج کل کی کثرت رائے تو بالکل ہی ہل ہے اور اُس میں اتنا غلو ہوا ہے کہ اب تو امراد کے یہاں کھانا بھی مکھی ہو کہ کھایا جاتا ہے۔ جب کھانا آتا ہے اور بھوک نہیں ہوتی تو مصاحبین سے پوچھتے ہیں کہ اس وقت کھانا چاہئے یا نہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ حضور حضور! سا تو کھا لیجئے۔ بالکل نہ کھائیے گا تو ضعف ہو جائے گا۔ اور ان کی عرض یہ ہوتی ہے کہ اگر یہ کھائیں گے تو ہمیں بھی مل جائے گا۔ بس وہ دوسروں کے ہاتھ میں پھنس گئے ہیں جیسے بچے ہوتے ہیں۔

مصاحبین کی یہ حالت ہے کہ ہر بات میں بجا اور درست کے سوا کچھ کہتے ہی نہیں خواہ بے جا ہی ہو۔ حتیٰ کہ اگر امیر صاحب کا وضو ٹوٹتا ہے جس کو محاذہ میں وضو ٹوٹنا کہتے ہیں۔ تو اس پر بھی مبارک باد دی جاتی ہے۔ جہاں ایسے مصاحب ہوں پھر عقل کیسے ٹھکانے رہ سکتی ہے۔ بس سب سے منظم کام یہ ہے کہ ایسے مصاحبوں کو بالکل حذف کر دو۔

شیطان کا علم میں صرف امراء کو ہی نہیں کہتا بلکہ یہی حالت مشائخ اور علماء کے یہاں بھی ہو رہی ہے۔ پیروں کی عقل تو مریدوں نے لی۔ اور علماء کی عقل شاگردوں نے۔ پیر صاحب بلا مریدوں کے کوئی کام نہیں کر سکتے اور مریدوں کی یہ حالت ہے کہ پیر صاحب کسی کی غیبت کرتے ہیں تو وہ آئنا و صدقہ کے سوا کچھ نہیں کہتے۔ مصاحبین نے پیروں کو تواب کر رکھا ہے۔ امراء کی ہم کیا شکایت کریں، پیروں اور علماء کے یہاں بھی ایسے ہی مصاحب ہوتے ہیں۔ بعض خدام کو اپنا مقرب بنا لیتے ہیں۔ پھر وہ مزاج میں ایسے و خیل ہو جاتے ہیں کہ جس سے جاہل راضی کرادیں اور جس سے جاہل ناراض کرادیں۔ بس پیر صاحب بالکل ان کے قبضہ میں ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس تقریب کا نتیجہ خود ان مقربین کے لئے یہ ہوتا ہے کہ اور لوگ ان سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ مقرب ہو کر کیا کرتے ہیں کسی کی تعریف کر دی۔ کسی کی بُرائی کر دی۔ اور پیر صاحب ایسے بھولے بھالے ہیں کہ جو انہوں نے کہہ دیا اسی کو مان لیا۔

خوب سمجھ لو کہ بزرگوں میں زیادہ کاٹل وہ ہے جس کی حالت نبیؐ کے

زیادہ مشابہ ہو۔ سو نبی کوئی بھولا نہیں ہوا۔ جتنے نبی ہوئے ہیں سب نہایت شیار اور بیدار مغز تھے۔ پس زیادہ کامل وہی ہوگا جو نہایت ہو شیار اور دقیق ہو بھولا ہونا کوئی کمال نہیں۔ بھولا آدمی بھی سمجھے گا کسی کے مکر کو۔ جب انسان ہی کے مکر کو نہ سمجھے گا تو شیطان کے مکر کو کیا خاک سمجھے گا۔ کیونکہ شیطان کا مکر تو انسان کے مکر سے زیادہ سخت ہے۔ یوں وظیفہ پڑھنا اور بات ہے۔ باقی تربیت جس کا نام ہے یہ بھولے شخص سے نہیں ہو سکتی۔ تربیت اور اصلاح دوسروں کی وہی کر سکتا ہے جو نہایت ہو شیار اور بیدار مغز ہو۔ لہذا بیعت بھی انتخاب کیے ایسے ہی شخص سے کرنی چاہئے۔

بعض لوگ بھولے پن سے ہر شخص کا نذرانہ قبول کر لیتے ہیں۔ ان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس میں کیا خرابی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نذرانہ خلوص سے نہیں دیا جاتا بلکہ اس میں دینے والے کی کوئی غرض فاسد ہوتی ہے، اس لئے بلاتامل ہر شخص کا نذرانہ نہ لینا چاہئے۔

ایک شخص بیدار میرے پاس آئے۔ انہوں نے مجھ کو پچیس روپے دیئے ہیں۔ ان میں سے دس روپے تولے لئے۔ باقی واپس کر دیئے۔ وہ تو چلے گئے اور بعض لوگ ان کے ساتھ آئے تھے وہ رہ گئے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب آپ نے دس روپے قبول کئے اور عجیب بات ہے کہ دس ہی روپے اول انہوں نے تجویز بھی کئے تھے مگر پھر کہنے لگے کہ اتنے روپے نہ میری شان کے لائق ہیں اور نہ ان کی شان کے۔ اس لئے پندرہ اور نکلے بس دس روپے تو انہوں نے خلوص سے نکالے تھے اور پندرہ وضع داری سے۔ اور

خدا تعالیٰ کی قدرت کہ جتنے انہوں نے خلوص سے نکالے تھے اتنے ہی میرے لئے۔

اس کی ظاہری وجہ یہ ہوئی کہ میں نے اس روز دس روپیہ کی ٹکڑیاں لے لی تھیں اور خدا تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ ان کو ادا کر دیجئے۔ میرے ذہن میں ان کے دینے کے وقت یہ بات آئی کہ تو نے دس روپے کے لئے دعا کی تھی اس کا بندوبست خدا تعالیٰ نے کر دیا۔ اس سے کم لینا ناشکری ہے اس خیال سے میں نے دس لئے باقی واپس کر دیئے۔ اس میں یہ بات بھی نکل آئی کہ دس ہی انہوں نے خلوص سے دیئے بھی تھے۔

عرض نذرانہ قبول کرنے میں بہت ہوش سے کام لینا چاہئے اس وقت جو میں نے دس روپے لئے تھے اور باقی واپس کر دیئے تھے اس کی زیادہ وجہ تو وہ تھی جس کو میں نے بیان کیا باقی میرا مذاق بھی یہی ہے کہ زیادہ نذرانہ قبول کیا جاوے۔ چنانچہ میرا اکثر معمول ہے کہ ایک مہینہ کی آمدنی میں سے ایک روز کی پیش کرے تو خوشی سے لے لینا ہوں اور پھر دوسری بار اگر نذرانہ دینے لگے تو اس کے لئے یہ شرط ہے کہ دونوں کے درمیان کم از کم ایک ماہ کا فصل ہو۔ یہ ہے میرا مذاق۔

مجھے امراء پر بہت رحم آتا ہے کیونکہ ان کے اخراجات ایسے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں

اہل اللہ کی معاشرت

ہیں کہ ان کی آمدنی اس کے لئے کافی نہیں ہوتی پھر ان پر یہ مصیبت ہے دعوت بھی کریں گے تو ایسی کہ بدون قرض لئے نہ ہو سکے۔ بھلا گھر کا معمول

کھانا کس طرح کھلا دیں تا وقتیکہ رنگ برنگ کے کھانے دسترخوانوں پر نہ ہوں دعوت ہی نہیں کرتے۔ حالانکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ مختلف رنگ کے کھانوں سے ساداکھانا زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ مختلف رنگ کے کھانے عادت کے خلاف ہوتے ہیں۔ دوسرے متعدد کھانے طبیعت کو مشوش کر دیتے ہیں۔

موجز میں صراحت لکھا ہے کہ کثرة الالوان صحیح للطبیعة یعنی کئی قسم کے کھانوں سے طبیعت کو حیرت ہوتی ہے۔ ہضم میں طبیعت حیران ہوتی ہے کہ پہلے کس میں عمل کروں۔ یہ حیرت تو کھانے کے بعد ہوتی ہے اور ایک حیرت کھانے سے قبل بھی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہر کھانا کہتا ہے کہ اول مجھے کھاؤ۔ اس میں سوچنا پڑتا ہے اجتہاد کیو کہ متعین کرنا پڑتا ہے کہ کس کو پہلے کھائیں اور کسے بعد میں۔ بعض کھانوں میں بلبعات ترتیب ہوتی ہے اور ہر شخص اس سے واقف نہیں ہوتا۔ اس لئے ترتیب کے خلاف کھائے جاتے ہیں۔ جو کہ مضر ہوتا ہے پس سب سے اچھی دعوت یہ ہے کہ جو گھر میں ہوا وہ کھلا دیا۔

اہل اللہ کی معاشرت دیکھئے۔ مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی کا قصہ ہے کہ آپ دہلی میں ایک مدرسہ میں صدر مدرس تھے۔ ان سے مولانا مظفر حسین صاحب کا ندھلوی نے فرمایا کہ مولانا آپ دہلی سے جب وطن جایا کریں تو راستہ میں مجھ سے مل کر جایا کریں کیونکہ کا ندھلہ راستہ ہی میں پڑتا ہے، انہوں نے منظور کیا مگر شرط یہ لگائی کہ میری منزل میں حرج نہ ہو۔ مولانا مظفر حسین صاحب نے اس کو منظور فرمایا۔ مولانا مملوک علی صاحب جب دہلی سے شریف پور لائے

تو مولانا منظر حسین صاحب سے راستہ میں ضرور ملتے اور مل کر سواری ہو جاتے۔ ایک مرتبہ کا قعدہ ہے کہ مولانا مملوک علی صاحب دہلی سے آ رہے تھے جب کا ندھلہ پہنچے تو مولانا منظر حسین صاحب سے ملتے کہ لے سواری ٹھہری اور سواری وہیں چھوڑ کر مولانا سے ملتے گئے۔ مولانا منظر حسین صاحب کا ندھلہ گھر کے ریش تھے۔ مگر آپ کی ساڑھی دیکھے کہ آپ نے پوچھا کہ کھانا کھا چکے ہو یا کھاؤ گے۔ مولانا مملوک علی صاحب نے کہا، کھائیں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ تازہ تیار کراؤں یا جو رکھا ہوا ہے وہی لے آؤں۔ مولانا مملوک علی صاحب نے فرمایا کہ جو موجود ہو وہی لے آئیے۔ پس آپ مٹی کی رکابی میں کھڑی کی کھڑک لے آئے اور کھا رکھا ہوا تو یہ ہے۔ وہ بھی ایسے ہی تھے۔ پس انہوں نے انہی کو کھالیا اور پانی پی کر رخصت ہو گئے۔ یہ حالت تھی ان حضرات کی کہ جو ہوا وہ سامنے رکھ دیا۔

ایک دفعہ مولانا منظر حسین صاحب لنگوہ نشریف لے گئے۔ مولانا گنگوہی کے مہمان ہوئے۔ صبح جب رخصت ہونے لگے تو مولانا گنگوہی نے کھانے کے لئے عرض کیا۔ مولانا منظر حسین صاحب رام پور جانے والے تھے۔ فرمایا کہ میری منزل کھوٹی ہوگی کیونکہ کھانا تیار ہونے میں دیر لگے گی۔ ہاں اگر رات کا رکھا ہوا ہو تو لا دو۔ مولانا نے ماش کی وال اور باسی روٹی لا دی۔ آپ نے رکابی کی وال روٹی پر الٹ کر بتے ہیں ہاندھلی اور رخصت ہو گئے۔ حالانکہ آپ ریش تھے۔ جب رام پور پہنچے تو حکیم ضیاء الدین صاحب سے کہا کہ مولانا رشید احمد بڑے اچھے آدمی ہیں۔ حکیم صاحب نے کہا کہ ہاں واقعی بڑے بزرگ

ہیں۔ آپ فرمانے لگے کہ میں تو کہہ رہا ہوں کہ بڑے اچھے آدمی ہیں اور آپ کہتے ہیں بڑے بزرگ ہیں۔ میں ان کے بزرگ ہونے کی تعریف نہیں کر رہا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ اگر خود نہیں سمجھتے تو پوچھ ہی لو۔ انہوں نے کہا کہ اچھا حضرت فرمائیے۔ آپ نے کہا کہ دیکھو کیسے اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھے کھانے کے لئے کہا۔ پھر میرے کہنے سے جو کھانا رکھا ہوا تھا بے تکلف لا دیا میں اس واسطے کہہ رہا ہوں کہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔

افسوس ہے کہ آج ان افعال کو ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ صاحبزادے اگر وقت پر یا سی روٹی مل جاوے تو وہ پلاؤ اور زدہ اور قومہ سے اچھی ہے اکثر ہمارے قصبات کے رئیسوں میں بھی ساوگی ہے۔ چائے تک کے حادثی نہیں۔ بعض جگہ تو اس قدر تکلف ہے کہ ایک جگہ دعوت ہوئی۔ صبح کو چائے پلائی اس میں اس قدر تکلف کیا کہ بیس روپے تک گئے۔ پھر کھانے میں اتنا بکھیرا کیا کہ عصر کے وقت کھانا ملا۔ بھلا کیا نفع ان باتوں سے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ وہاں کے چھوڑنے سے دنیا کی بھی تکلیف ہوتی ہے اور عقل بھی مسخ ہو جاتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ خدا سے تو بڑا کھاؤ بڑا پہنو۔ میں اچھا کھاؤ اچھا پہنو مگر حد کے اندر رہو۔ حضرت اسب تو ہر

بڑے چہرے میں لٹا کر

پتھر میں لٹا کر ہے۔ کپڑا لٹا کر کے لٹے بیٹے ہیں۔ کھانا۔ ہے تو لٹا کر کے لٹے مکان ہے لٹا کر کے واسطے۔ بعض نئے فیشن کے شیدائی ہیں۔ ان کو کپڑے بھی نوکر ہی پہناتا ہے۔ بٹن تک اپنے ہاتھ سے نہیں لگتے۔ روزمرہ ان کے قیمتی وقت کا ایک بڑا حصہ فیشن ہی میں گزرتا ہے۔

ایک شخص ہر وقت جوڑے ہی بدلا کرتے تھے۔ ہر وقت کے لئے ایک جوڑا لنگ کر رکھا تھا۔ سواری کے وقت کا جوڑا اور دو سنتوں سے ملنے کا اور حتیٰ کہ پاخانہ میں جانے کا جوڑہ اور تھا۔ ایک مرتبہ میں بھائی کے پاس گیا اتفاق سے وہ بھی وہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں انہیں ہر وقت اسی مشغلہ میں لگا ہوا دیکھتا۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ بیچا کرتا اور اس کے نیچے جانگیا پرے ہوئے پاخانہ میں جا رہے ہیں اور گھٹنے اور رانیں سب کھلی ہوئی ہیں۔ حالانکہ ویسے مہذب شخص تھے۔ ایک روز مجھ سے بھی ملنے آئے اور عذر کرنے لگے کہ مجھ کو فرصت نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے آپ سے نہ مل سکا میں نے کہا جی ہاں میں خود دیکھتا ہوں کہ آپ ہر وقت کام میں لگے رہتے ہیں۔ اس پر بہت فخر مندا ہوئے۔

آج کل یہ حالت ہے کہ لباس بھی دوسری قوم کا، کھانا بھی دوسرے ہی لوگوں کا۔ ہر بات میں دوسری قوموں کی تقلید کرتے ہیں۔ اے مسلمانو! آپ کے گھر میں سب کچھ ہے۔ دوسرے کے گھر سے لینے کی آپ کو مطلق ضرورت نہیں ہماری یہ حالت ہو رہی ہے۔

ایک سبد پیرناں تڑا برفرق سر تو ہمیں جوئی لب ناناں دیدار

ایک اور نیا طرز نکلا ہے جو امرامیں بہت شائع ہو گیا کہ خالی برتن سامنے رکھ دیئے اور ایک ڈونگے میں کھانا لاکر بیچ میں رکھ دیا۔ اب وہ ایک ڈونگا ساری مجلس میں گھوم رہا ہے۔ جن کا یہ اصل میں طرز ہے ان کے یہاں خود کھانا پہنچانے ہیں۔ یہاں یہ بے تمیزی کہ جو مانگے اُسے دے دو اور جو نہ مانگے

اسے مت دو۔ اس میں یہ تو جیبہ گھڑی ہے کہ کھانا خراب نہیں جاتا۔ جس کو جتنی ضرورت ہوتی ہے لے لیتا ہے۔ جو کھا کھانا نہیں بچتا۔ حالانکہ یہ تو جیبہ بالکل لغو ہے کیونکہ اس کا دوسرا طریق ممکن ہے کہ ٹھوڑا ٹھوڑا کھانا رکھو اور جس کے سامنے نہ رہے اور دے دو۔ اسی طرح لباس میں تو جیہات گھڑی ہیں۔ چھری کانٹے میں یہ وہ گھڑی ہے کہ انسان کے ناخن میں زہر ہوتا ہے اس لئے ہاتھ سے نہیں کھاتے۔

یورپ کی اندھی تقلید

میں کہتا ہوں کہ تا وہیں کیوں کی جاتی ہیں سیدھی بات کیوں نہیں کہتے کہ اہل یورپ کا جو طرز ہے وہ پسند ہے۔ اسی کے منقلد ہیں۔ اگر آج اہل یورپ اس طرز کو بدلیں تو یہ بھی فوراً بدل دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جو فیشن وہ اختیار کرتے ہیں اسی کو یہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں تک نوبت پہن گئی ہے کہ اگر کسی فیشن کا کوٹ وغیرہ سلوایا اور اچھی پہنا نہیں کہ فیشن بدل گیا تو وہ کوٹ بیکار ہو گیا اب دوسرے فیشن کا تیار کیا کے پہنا جائے گا۔ جوتے ہیں تو وہ چھ چھ جوتے دارٹھی صاف کرانے کا نشا اہل یورپ ہی کی تقلید ہے۔ اگر آج وہاں دارٹھی رکھ لی جائے تو یہ بھی اپنے طرز کو بدل دیں۔

ایک مرتبہ یہ نمبر سنی گئی تھی کہ دارٹھی منڈانے کے نقصانات دیکھ کر اب اہل یورپ کی یہ راستے ہو رہی ہے کہ دارٹھی رکھ لینا چاہتے ہیں۔ ایک وعظ میں کہا کہ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ دارٹھی جلد رکھ لیں۔ کیونکہ لندن سے دارٹھی رکھنے کا فتوے آنے والا ہے۔ اگر بعد میں رکھی تو طعن ہو گا کہ

خدا رسول کے فتوے کو تو نہ مانا اور اہل یورپ کے فتوے پر عمل کیا۔ اس سے پہلے ہی رکھ لو تا کہ کسی کو طعن کی گنجائش نہ ملے۔

میں تو کہتا ہوں کہ غیر قوم کا طرز اختیار کرنے میں قطع نظر اس سے کہ کفار کے ساتھ تشبہ ہے جو حرام ہے دنیا کا بھی کتنا بڑا نقصان ہے۔ اس فیشن کی بدولت حالت یہ ہو رہی ہے کہ دوسو کی آمدنی ہو وہ خرچ کو کافی نہیں پائے گی کی آمدنی ہو وہ کافی نہیں۔ اس فیشن میں بے طرح روپیہ برباد ہوتا ہے۔ کسب صرف نہیں ہے۔ ہم نے بہت سے لوگ دیکھے کہ پانسو کے ملازم ہیں۔ مگر اس فیشن کی وجہ سے مفروض ہیں۔

ایک جٹلمین صاحب تھے۔ وہ ہمیشہ بی بی کے بے طور سر رہتے کہ تم کپڑوں میں اتنا صرف کرتی ہو اور یورپ میں اتنا صرف کرتی ہو۔ تمہارے خرچ کیوں سے آمدنی کا پتہ ہی نہیں لگتا۔ بی بی کو سنتے ہوئے تڑت ہو گئی۔ کہاں تک سننے۔ مکھی کو بھی پتا ہوتا ہے۔ آخر ایک روز اس کو بھی غصہ آ گیا۔ اور اس نے خوب لتاڑا کہ تم ہمیشہ میرے پیچھے نوپڑے رہتے ہو کہ یہ فضول خرچی کرتی ہے اور یوں کرتی ہے۔ ذرا اپنے گم بیان میں تو منہ ڈال کر دیکھو کہ فیشن میں کتنا صرف ہوتا ہے۔ چھ جوڑے جو تھے ولایتی کتنے کے ہوتے ہیں۔ کوٹ تیلوں میں کیا لگتا ہے۔ مکان کی سجاوٹ کا انگریزی سا مان کتنی قیمت میں آتا ہے۔ ایک ایک چیز اس نے ان حضرت کو گناہی۔ چونکہ جو اب معقول تھا ان کو خاموش ہونا پڑا۔ جب کہیں اس بیچاری کا پیچھا چھوٹا۔

بس ان کے مقتدا تو اہل یورپ ہیں۔ انہی کی تقلید میں انہوں نے اپنے

دین کا بھی نام کیا ہے اور دنیا کا بھی۔

بعض عورتوں نے سایہ پہننا شروع کیا ہے۔ میم صاحب بنتا چاہتی ہیں۔ ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں، کان ننگے، اُن میں بالیاں تک نہیں۔ جو طرز میموں کا ہے وہ اختیار کیا ہے۔ یہ نیا فیشن نکلا ہے عورتوں میں۔

میں کہتا ہوں کہ قطع نظر اس کے کہ تشبہ ناجائز ہے اخلاق پر اس کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ وہ یہ کہ اس سے تکبر پیدا ہوتا ہے۔ جو سبب ہو تکبر کا اور بھی ناجائز ہوگا۔ اور اس تشبہ میں کبر کی یہاں تک خاصیت ہے کہ حضرت پلنگ اور کرسی پر بیٹھنے تک میں تفاوت ہے۔ جو وہ جان سے مد رک ہے۔

ایک ڈاکٹر کہتے تھے کہ جب ہم سماجی صاحب کی خدمت میں رہ کر واپس ہوئے تو اپنے دل میں ایک نور لے کر آئے تھے منظر نگہ جب آئے تو ایک شخص فٹن لے کر آئے کہ ہمارے سرین کو سہل کر دیکھ لیجئے۔ انہوں نے فٹن میں بیٹھنے سے بہت انکار کیا مگر اس کے اصرار کرنے پر آخر بیٹھنا پڑا۔ کہتے تھے کہ جس وقت فٹن میں قدم رکھا ہے تو یہ معلوم ہوا کہ وہ اور سلب ہو گیا۔ وہ جس کی یہ ہے کہ ان چیزوں کو نسبت ہے دوسری قوم سے۔ اس لئے ایسا ہوا۔ یہ دوسری قوم کی وضع سمجھی جاتی ہے، اس لئے اس میں بیٹھنے سے وہ اور سلب ہو گیا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ غیر قوم کی ہر چیز ناجائز ہے بلکہ وہ ناجائز ہے جس کو خصوصیت ہے دوسری قوم کے ساتھ۔ اور جس کو خصوصیت نہیں دوسری قوم کے ساتھ وہ جائز ہے۔ موندھے کرسی میں اقتیازی شکل نہیں رہی۔ وہ کسی

خاص قوم کی وضع نہیں سمجھی جاتی اس لئے جائز ہے اور سایہ وغیرہ میں انبیاء کی شکل باقی ہے اس لئے ناجائز ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر دیکھ کر طبیعت کھٹک جائے کہ یہ تو فلاں قوم کا طرز ہے تو تشبہ ہے ورنہ تشبہ نہیں چنانچہ سایہ وغیرہ دیکھ کر فوراً دیکھنے والے کا ذہن منتقل ہوتا ہے کہ یہ تو میموں کا طرز ہے اور کسی موٹھے میں ایسا نہیں ہے۔ اسی پر دوسری چیزوں کو قیاس کر لو۔

انگریزی طرزِ اخلاق | غرض یہ ہے کہ یہ طرزِ اخلاق کے اعتبار سے بھی جائز نہیں۔ کیونکہ اس کا اخلاق پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو پڑا اور دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ خاص کر ملائوں کو، ان کو تو ان لوگوں نے نیم و حشی کا خطاب دے رکھا ہے۔ حاصل یہ کہ یہ طرزِ اخلاقی لحاظ سے بھی اچھا نہیں مگر پھر بھی اس میں مصالح گھڑی جاتی ہیں۔

ایک شخص ریل میں تھے اور آپ کی وضع یہ تھی کہ کوٹ، تپلون پہنے ہوئے اور کتا بغل میں۔ اسی گاڑی میں بقول ان کے ایک نیم و حشی بھی آکر سوار ہوئے مگر انہوں نے ان کو سلام نہیں کیا تو آپ کہتے ہیں مسلمان کو کم از کم سلام تو کر لینا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کو مسلمان ہی نہ سمجھا تھا، اس لئے سلام نہ کیا۔ خٹلمین صاحب نے کہا کہ میرے اندر ایسی کون سی بات ہے جو آپ مجھ کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ انہوں نے کہا کہ تم نے ساری وضع تو کافروں کی ہی بنا رکھی ہے پھر میں تمہیں مسلمان کیسے سمجھتا۔ انہوں نے کہا کہ کیا قیاس سے مسلمان

ہوتا ہے۔ اس لباس میں تو مصلحت ہے اس لئے ہم نے اس کو اختیار کیا ہے وہ یہ کہ ڈھیلے پاجامہ میں گر پڑنے کا خوف ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اس میں تو یہ مصلحت ہے اور کتاب لغز کے اندر لینے میں کیا مصلحت ہے۔ ^{ختمین} صاحب کہتے لگے کہ اس میں بڑی مصلحت ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں فرشتہ نہیں آتا۔ اس لئے ہم کتے کو ساتھ رکھتے ہیں تاکہ عزرائیل سے بچے رہیں۔ اُن صاحب نے اس کا خوب ہی جواب دیا۔ کہا کہ اگر کوئی کتے کی جان بھی تو قبض کرتا ہوگا، وہی آپ کی قبض کرے گا۔ اس پر بڑے جھلائے۔

میں لباس کے بارہ میں ایک فتویٰ عجیب نقل کرتا ہوں۔ حضرت **رسم پستی** ابو حنیفہؒ وغیرہ کا فتویٰ نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ ابو حنیفہؒ کا فتویٰ کا ہے کو ماننے لگے ہیں جب کہ اللہ ورسول کا فتوے نہیں مانتے بلکہ وائسرائے کا فتویٰ نقل کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ایک صاحب وائسرائے سے ملنے گئے اور گئے اپنے ہی وضع میں۔ وائسرائے نے اٹنائے گفتگو کہا کہ مولوی صاحب اس لباس میں آپ شاہزادہ معلوم ہوتے ہیں۔ ہم اپنی قومی وضع سے مجبور ہیں۔ اس لئے ایسا لباس نہیں پہن سکتے ورنہ ہم بھی اسی کو پہنتے۔ خوش نما بھی ہے اور راحت بھی اس میں ہے۔ لیجئے جناب اب تو وائسرائے کا فتوے بھی ہو گیا اللہ رسول کا فتویٰ نہ مانو تو وائسرائے ہی کا مان لو۔

ایک اور عجیب بات ہے کہ یہ لوگ لباس وغیرہ میں تو غیر قوم کی تقلید کرتے ہیں اور بعض باتیں جو غیر قوموں میں خوبی کی ہیں اُن سے کوسوں

دوہریں۔ مثلاً ہمدردی قوم کی یا خروج کا ایک حادثے یا ہیر نہ ہونا، معاملہ کا صاف ہونا۔ اس کے پاس بھی نہیں جانتے۔ بس آج فخر اس پر ہوتا ہے کہ ایک شخص کہتے تھے کہ چار روپیہ کا ٹو کوٹ کا کپڑا ہے اور سولہ روپیہ اس کی سلامتی دی۔ ایک یورپین نے اس کو سیاہ ہے۔ خواہ تکلیف ہو اور سراسر مالی کا نقصان ہو مگر انہیں نقل سے کام۔

ایک مولوی صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے۔ اتفاق سے اس گاڑی میں ایک جڈنمیں صاحب بھی تھے اور چلے کے جاڑے کا موسم تھا۔ ایک انگریز نے برف ڈال کر سوڑے کا پانی پیا۔ اس کی ریس میں آکر آپ نے بھی پیا۔ اور کوئی گرم کپڑا آپ کے پاس تھا نہیں کیونکہ یہ بھی فیشن ہے کہ سفر میں مسٹر بچھونا ساتھ نہ لے جائیں اور وہ کپڑے بھی کچھ گرم نہ پہننے ہوتے تھے گبروں کے کپڑے پہننے ہوتے تھے جو کچھ ایسے گرم نہیں ہوتے۔ بس پیتے ہی کانپنے لگے۔ بڑی سہالت ہوئی۔ مولوی صاحب کو رحم آیا اور اپنی رزائی ان کو دی اور کہا کہ سردی کے اندر رہئے۔ دوسروں کی ریس نہ کیجئے۔

وہی مثل ہے کہ کو اچھا تھا، سٹس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ ریس تو کہیں اہل یورپ کی اور مزاج اور قوت ویسی ہے نہیں۔ مگر کچھ بھی ہو، انہیں نقل سے کام وہ لوگ غذائیں بھی ایسی کھاتے ہیں کہ ان پر ایسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ اور پھر شراب پیتے ہیں اور پھر ان میں قوت اور ان کے مزاج بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ایک قصہ اور سیٹھے۔ ایک مولوی صاحب ریل میں سوار تھے۔ ایک

جنتلمین صاحب بھی اسی درجہ میں تھے۔ مولوی صاحب کے پاس مٹی کی صراحی تھی۔ اس میں پانی تھا۔ جنتلمین صاحب بولے کہ یہ کیا بھنگیوں کا سا برتن رکھ چھوڑا ہے۔ مولوی صاحب نے اس وقت کوئی جواب نہ دیا اس خیال سے کہ موقع پر جواب دوں گا۔ اگے چل کر ان جنتلمین صاحب کو پیاس لگی۔ اتفاق سے اسٹیشن پر بھی پانی نہیں ملا۔ اب پیاس بڑھی۔ مولوی صاحب نے قرآن سے معلوم کر لیا کہ پیاس کا غلبہ ہے۔ چونکہ ان حضرات پر نشان کرم غالب ہوتی ہے اس لئے انہیں ان پر ترس آیا اور یہ چاہا کہ کسی طرح یہ پانی پی لیں۔ انہوں نے یہ تدبیر کی کہ اپنے آپ کو سوٹا بنا لیا۔ جنتلمین صاحب اوپر تختہ پر تھے اب ان کا عروج سے نرول ہوا اور مولوی صاحب کو جھک کر دیکھا کہ انکھیں کھلی ہیں یا بند ہیں۔ انہوں نے قصداً بند کر رکھی تھیں۔ جب خوب اطمینان ہو گیا کہ سوراہے میں تو صراحی منہ سے لگالی۔ یہ کچھ بولے نہیں اس خیال سے کہ پی لیتے دو پیاسے نہ رہیں۔ جب صراحی رکھنے لگے تو فوراً ہاتھ بیکر لیا اور کہا کہ آپ نے بھنگیوں کے برتن میں کیوں پانی پیا اور پھر خوب تھارٹا۔

میں ایک دفعہ ریل میں تھا۔ ایک جنتلمین صاحب کا ساتھ ہو گیا میرے پاس لوٹا تھا میں نے اس میں پانی لے لیا۔ یہ لوگ تو اپنے ساتھ کچھ لیتے ہی نہیں۔ یہ بھی فیشن ہے۔ جب اسٹیشن قریب آیا تو آپ بولے کیا میں اس بوتلے کو لے سکتا ہوں؟ میں نے کہا کہ لے سکتے ہیں۔ آپ نے اسی وقت اس کو اٹھا کر اس کا پانی پھینک دیا۔ اس پر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے دل میں کہا کہ پانی نہ لے تو خوب تھارٹا ہو۔ اتفاق سے پانی کہیں نہیں ملا تو آپ کہتے ہیں

کہ بڑی غلطی ہوئی جو میں نے پائی گرا دیا۔

بس ان لوگوں میں رسم پرستی ہے اور کچھ نہیں۔ غیر قوم کی تقلید میں ان لوگوں کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ اگر وہ ناک کھڑانے لگیں تو یہ بھی کھڑا دیں گے۔ دارِ طہی بھی غیر قوم کی تقلید میں ہی صاف کراتے ہیں حالانکہ دارِ طہی ایسی چیز ہے کہ جن کی تقلید میں یہ منڈاتے ہیں خود وہ اس کو پسند کرتے ہیں۔

ایک کوچوان کو ایک انگریز چار روپیہ ماہوار صرف دارِ طہی کے دیتا تھا کہ اس کو خوب بناؤ سنوارو۔ دارِ طہی بہت لمبی تھی، جب ہوا میں اڑتی، تو وہ انگریز دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔

مولانا سمیع اللہ شہید سے ایک دہری شخص نے کہا کہ دارِ طہی رکھنا فطرت کے خلاف ہے کیونکہ پیدائش کے وقت نہیں ہوتی۔ اگر فطرت کے موافق ہوتی تو پیدائشی ہوتی۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر یہی ہے تو دانت بھی نکلا دینے چاہئیں۔ وہ بھی تو پیدائشی نہیں ہیں۔ مولانا عبدالحی صاحب اس کو سن کر فرمانے لگے۔ واہ مولانا خوب دندان شکن جواب دیا۔

ایک صاحب کہنے لگے کہ دارِ طہی رکھنے میں کیا حکمت ہے۔ میں نے کہا کہ ہمیں عقلی حکمت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ و رسول کا حکم ہے۔ ہمارا مذہب تو یہ ہے۔

زبان تازہ کر دن باقرار تو بیگیختن عدت از کار تو!

ایک حکمت انگریزی لباس سے منع کرنے میں یہ ہے کہ اس کو پہن کر جیوں چاہتا ہے کہ دوسروں کو دکھائیں۔ اگر عورتیں ایسا لباس پہنیں گی تو

لازمی بات ہے کہ پردہ کم ہو جاوے گا۔ کیونکہ وہ چاہیں گی کہ دوسروں کو دکھائیں اور عورتوں کو دکھا کر ان کے حفظ ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ عیب سمجھتی ہیں، اس لئے لامحالہ سرووں کو دکھانا چاہیں گی اور بے پردگی اختیار کریں گی۔ یہ ساری خرابیاں تفاخر اور فضول خرچی سے پیدا ہوئی ہیں۔ پس تفاخر اور فضول خرچی کے چھوڑ دینے سے ساری خرابیوں کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

میں اسراف کا بیان کر رہا تھا کہ مسلمان سمجھے ہوئے ہیں کہ آمد و خرچ کے متعلق کوئی قانون نہیں۔ خوب سمجھ لو جیسے نماز روزہ کا قانون ہے اسی طرح اس کا بھی قانون ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اسی مسئلہ کو حق تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دوسرے کا مال آپس میں مت کھاؤ۔ اس سے حرام آمدنی کو روکتے ہیں۔

اعتدال کی ضرورت | آگے فرماتے ہیں کہ مت لے جاؤ حکومت کی طرف یعنی مقدمات مت کرو۔ آج کل اس کی بھی بڑی کثرت ہے۔ ذرا سی کوئی بات ہوئی اور مقدمہ دائر۔ خوب سمجھ لو کہ اگر حاکم کسی کو دوسرے کا حق ثبوت ظاہری ہونے سے دلا بھی دے تو واقع میں وہ اس کا حق نہیں ہو جاتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر میں کسی کا حق کسی کو دلا دوں تو وہ خوب سمجھ لے کہ میں اس کو آگ کی چنگاری دلاتا ہوں۔ پس سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی حاکم کسی کا حق دوسرے کو دلا دے تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہو جائے گا۔ ملک ہونے نہ ہونے کی یہاں بحث نہیں دلاتا کلو اموالکم

بیشکم بالباطل ہیں تا جائز آمدنی کو روکا جائے یہاں خرچ کا ذکر نہیں ہے۔ مگر یہ بھی نہیں ہے سمجھ میں آتا ہے۔ کیونکہ تا جائز طور پر جو مال حاصل کیا جاتا ہے اکثر اُس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ خرچ اس قدر بڑھا جیتے ہیں کہ حلال آمدنی اس کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ پس جب کہ تا جائز طور پر مال حاصل کرنے سے روکا تو جو اُس کا باعث ہے یعنی اسراف اُس کی بھی ممانعت ہوگی۔ پس اس آیت سے تو یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے اور دوسری آیات و احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔

حدیث میں ہے کہ بندہ کو حق تعالیٰ کھڑا کر کے دریافت فرمائیں گے کہ جو مال کا ہے میں خرچ کی اور مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ اور راز اس کا یہ ہے کہ مال اپنا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا مال ہے۔ کسی نوکر کو اگر آپ خزانہ سپرد کر دیں تو کیا وہ مالک اور خود مختار ہو گیا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے اپنا مال آپ کو بطور خزانہ سونپی کے دیا ہے۔ پس جب تک کہ اجازت شرعی نہ ہو آپ کو دینے کا اختیار نہیں۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے مال دیا ہے تو اس کی فہرست بھی دی ہے کہ اس موقع پر خرچ کرنے کی اجازت ہے اور اس موقع پر نہیں اور غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اصل حق ہمارا تو صرف اتنا تھا کہ ہم کو بقدر ضرورت ملتا۔ اب جو ضرورت سے زیادہ مل رہا ہے تو وہ حق اور وہ کا ہے اور لوگوں کو پہنچانا منظور ہے۔ مگر وہ قواعد کے موافق ہونا چاہئے۔ یہ نہیں کہ جس کو چاہا دے دیا اور جہاں چاہا خرچ کر دیا۔ حد سے زیادہ خرچ کا کچھ اختیار نہیں۔ اس لئے ضرور ہے کہ ادنیٰ اپنا خرچ شرح کے موافق منضبط

کرے۔

اشراجات کی حدود | شادی بیاہ میں لوگ آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ کچھ اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اس موقع پر خرچ

کیا چاہئے ہے یا نہیں۔ سو سمجھ لو کہ خرچ کرنے کے بھی حدود ہیں، جیسے نماز روزہ کے حدود ہیں۔ اگر کوئی نماز بجائے چار رکعت کے چھ پڑھنے لگے یا کوئی روزہ عشاء تک رکھنے لگے تو گنہگار ہوگا۔ اسی طرح مال کو حد سے زیادہ خرچ کرنے سے بھی گنہگار ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے حدود مقرر کئے ہیں پس حدود کو معلوم کرنا چاہئے۔ علماء سے پوچھو۔۔۔ ایک بات تو یہ یاد رکھو۔

دوسرے یہ یاد رکھو کہ جو کام کرو سو خرچ کر کرو۔ اگر ان دونوں باتوں پر عمل کرو گے تو حقوق ضائع نہ ہوں گے اور جس میں لوگوں سے زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں وہ حقوق مالی ہیں اس کا بڑا خیال رکھنا چاہئے۔

ایک خرابی مسلمانوں میں یہ ہے کہ قرض لے کر ادا نہیں کرتے۔ قرض ادا کرنے کی بالکل عادت ہی نہیں۔ اس لئے ان کا اعتبار نہیں رہا۔ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ ہر ایک سے قرض مانگتے ہیں اور کوئی نہیں دیتا۔ حالانکہ قرض دینے کا بڑا ثواب ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے جنت کے دروازہ پر لکھا دیکھا کہ صدقہ دینے سے دس نیکیاں ملتی ہیں اور قرض دینے سے اٹھارہ۔ آپ نے حضرت جبرائیل سے وجہ پوچھی تو انہوں

نے فرمایا کہ قرض وہی مانگتا ہے جسے سخت حاجت ہوتی ہے (کیونکہ اسے پھر واپس کرنا پڑتا ہے) بخلاف صدقہ کے۔ تو قرض دینے کا اتنا بڑا ثواب ہے۔

مگر جب کوئی لے کر ادا ہی نہ کرے تو پھر کون دے۔ حالت یہ ہو گئی ہے کہ قرض دے کر وصول نہیں ہوتا حتیٰ کہ قرض دار سامنے آنا تک چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی واسطے مولانا سبائی فرماتے ہیں۔

وہ شان قرض و مستان نصح حبه فان القرض مقراض المحبة

ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ سی مقدمہ میں مظفرنگر آئے۔ اتفاق سے جتنا روپیہ پاس تھا سب ختم ہو گیا۔ اب بہت پریشان۔ آخر وہیں کے ایک صاحب کے پاس گئے اور اپنی پریشانی بیان کی اور کہا کہ دس روپیہ قرض دے دیجئے میں گھر پہنچتے ہی بھیج دوں گا۔ انہوں نے ترس کھا کر دے دیئے انہوں نے گھر پہنچ کر خبر بھی نہ دی۔ کچھ دنوں کے بعد پھر کہیں ان سے ملاقات ہو گئی تو انہوں نے تقاضا کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں ابھی دو ایک روز میں ادا کروں گا اسی طرح مدتوں تک ٹال مٹول کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سال بھر گزر گیا۔ پھر جو تقاضا کیا تو کہتے ہیں کہ کیا آپ کے پاس کوئی رقعہ ہے۔ یہ حالت ہے مسلمانوں کی۔ اس کو ہلکی بات سمجھتے ہیں۔ اسی لئے اس میں بہت ہی تساہل ہو رہا ہے۔

ایک مانگی ہوئی چیز میں بڑا تساہل ہے۔ یہ حالت ہے کہ چیز منگانی اور کام بھی ہو گیا مگر یہ توفیق نہیں ہوتی کہ واپس کر دیں۔ جب دینے والا

خود طلب کرتا ہے تب دیتے ہیں اور اگر خود بھی دیں گے تو مدت کے بعد اس میں بہت چیزیں گم بھی ہو جاتی ہیں۔ خراب بھی ہو جاتی ہیں، بعض جگہ چینی گزر جاتے ہیں واپس ہی نہیں ہوتیں۔ اگر کسی نے طلب کیا تو دسے دی، ورنہ پیر و ابھی نہیں ہوتی۔ نیت مارنے کی نہ ہو مگر تساہل اس قدر ہے کہ حد سے زیادہ۔

ایک اس بارہ میں سبے احتیاطی ہے کہ کھانے کے ساتھ جو برتن چلے جلتے ہیں انہیں واپس کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی۔ بس اپنے یہاں ان کا استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح مدت ہو جاتی ہے۔ جب خود منگاتے ہیں، تب ملتے ہیں۔ خود میرے گھر میں تساہل ہے۔ حالانکہ شرح نے اس میں اتنی احتیاط کی ہے کہ فقہاء لکھتے ہیں کہ کھانا کوئی بھینچے تو اس برتن میں کھانا مہرام ہے۔ اپنے برتن میں اٹھ لو تب کھاؤ۔ ہاں ایک صورت میں جائز ہے کہ وہ کھانا ایسا ہو جو برتن بدلنے سے خراب ہو جاتا ہو یا اس کی آب جاتی رہے۔ تو اگر ایسا کھانا ہو تب اس برتن میں کھانا جائز ہے، ورنہ نہیں۔ ہاں اگر مالک استعمال کی اجازت دے دے تو جائز ہے۔

دلیل فقہاء کے اس قول کی یہ حدیث ہے کہ لا یجد مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منہ۔ کھانا بھینچنے والوں کو اس برتنوں کا استعمال ناگوار ہوتا ہے اور جب کہ کھانا ایسا ہو جو برتن بدلنے سے خراب ہوتا ہو یا اس کی آب جاتی رہتی ہو تو وہاں دلالت اذن ہے، اس برتن میں کھانے کا۔ پس خلاصہ فقہاء کے کلام کا یہ ہوا کہ جہاں اجازت ہو قرآن سے تو جائز اور اگر

قرآن سے اجازت نہ ہو تو جائز نہیں۔

عرض لوگ! اموال کے بارے میں بڑی بے احتیاطی کرتے ہیں۔ قرآن شریف میں کتنی سخت وعید ہے اس پر۔ میں پھر اصل مسئلہ کا اعادہ کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ناجائز آمدنی سے استرازا کریں اور خرچ گھٹائیں۔ امرائے اس میں بالکل احتیاط نہیں کرتے۔ اس پر عمل ہو گا تو زندگی بڑے عیش و آرام سے کٹے گی۔

روساہ شادی و عیترہ میں بڑی بے احتیاطی
 نام اور کام کی اہمیت

کرتے ہیں۔ دیوبند میں ایک رئیس تھے انہوں نے شادی کی اور بے انتہا خرچ کیا۔ مولانا محمد قاسم صاحب ان کے یہاں آئے اور کہا کہ ماشاء اللہ! آپ نے بہت ہی خرچ کیا۔ آپ کی عالی حوصلگی میں کچھ شبہ نہیں۔ مگر صرف اتنی کسر ہے کہ آپ نے اتنا خرچ کر کے ایسی چیز خریدی کہ اگر حاجت کے وقت اس کو فروخت کرنے لگیں تو اسے کوئی پھوٹی کوڑی کو بھی نہ لے۔ وہ کیا نام! باقی ویسے بڑا کام کیا بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جتنی نام کی کوشش کرتے ہیں اتنی ہی بدنامی ہوتی ہے۔

ایک مہاجن نے بڑی دھوم دھام سے شادی کی۔ بہت خرچ کیا مگر اس کے یہ بھی کیا کہ براتیوں کوئی کس ایک اشرفی بھی دی۔ جب برات واپس ہوئی تو آپ کو یہ خیال ہوا کہ ہر گاڑی میں میرا ہی تذکرہ اور تعریف ہو رہی ہوگی۔ اس کو کسی جیلہ سے سننا چاہئے۔ چنانچہ وہ ایک موقع پر پوشیدہ کھڑے ہو گئے۔ برات وہیں کو گزری مگر کسی پہلی میں اپنا تذکرہ نہ پایا۔ آخر ایک پہلی میں انہوں نے دیکھا کہ دو شخص میرا تذکرہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے بڑے

شوق سے کان لگائے۔ ایک نے کہا کہ دیکھو تو کیسے نام کا کام کیا کہ ایک ایک اشرفی سب کو دی۔ یہ کام کسی نے نہیں کیا۔ دوسرے نے کہا کھڑے نے ایک ایک دی کون سا کمال گیا۔ اگر دو دو دیتا تو کیا مریجاتا۔

عرض یہ کہ نام کے لئے مال برباد کرتے ہیں مگر وہ بھی میسر نہیں ہوتا اور جن کے واسطے خرچ کرتے ہیں جس وقت مصیبت آتی ہے ان میں سے کوئی پاس بھی کھڑا نہیں ہوتا بلکہ تباہی ہونے پر یوں کہہ دیتے ہیں کہ مال برباد کرنے کو جس نے کہا تھا۔ اپنے ہاتھوں برباد ہوئے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ آسودگی میں یہ کہتے تھے کہ جہاں تمہارا پسینہ گرے وہاں ہم خون گرانے کو تیار ہیں۔ جس وقت تباہی آتی ہے ان میں سے ایک بھی پاس کھڑا نہیں ہوتا۔ سب آنکھیں بدل جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے سال پر بڑا افسوس ہے کہ وہ کچھ آگے پیچھے کا خیال نہیں کرتے۔ بے طرح فضول خرچی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ تباہ ہو جاتے ہیں یعنی ان کے ٹکڑی بندھ جاتی ہے۔ یہ مسالمت مسلمانوں کی اسی وجہ سے ہوئی کہ انہی قلم (اسلام) کا پھاٹک خود کھول دیا ورنہ اسلامی اصولوں پر چلنے سے کبھی ذلت نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ حقوق مالیہ کی حفاظت نہایت ضروری ہے اور شرع نے اس سے بھی تعرض کیا ہے۔ اور اس کی تاکید کی ہے حفاظت نہ کرنے پر مواخذہ ہوگا۔

اب وقت بھی بہت جا چکا ہے اور بفضلہ تعالیٰ بیان بھی بقدر

ضرورت کافی طور سے ہو گیا۔ دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق عمل کی مرحمت فرماوے
آمین یا رب العالمین!

اشرف علی!

احکام الحجاء

حجاء کے منافع و مضار کے متعلق یہ وعظ ۱۵ رجب ۱۳۳۷ھ کو
 بارہ بنکی میں کر سی پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔ پونے چار گھنٹہ میں ختم ہوا
 تینینا ایک ہزار کی حاضری تھی۔ حکیم محمد یوسف صاحب بنوری
 نے قلمبند فرمایا

خطبة ما توره

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به و
نتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن
سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن
يضلله فلا هادي له وشهد ان لا اله الا الله
وحده لا شريك له وشهد ان محمدا عبده ورسوله
صلى الله تعالى عليه وعلى آله واصحابه وبارك وسلم
انا بعد فقد قال النبي صلى الله عليه وسلم الاكلكم
راع وكلكم مستول عن رعيتكم.

تہذیب

یہ ایک بڑی حدیث کا تذکرہ ہے جس میں ایک ضروری مضمون مذکور ہوا ہے جس کی ہر وقت ہر شخص کو کم و بیش ضرورت ہے۔ اول تو اس وجہ سے یہ مضمون ضروری ہے کہ ارشاد فرمودہ ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس کی ہر فرد اور ہر فرد کا ہر جزو ضروری ہے۔ پھر حضور کے فرمودہ مضامین میں بھی بعض وجوہ سے باہم تفاوت ہوتا ہے پھر اوقات مختلفہ کے لحاظ سے بھی بعض مضامین کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ کسی وقت کسی مضمون کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور کسی وقت کسی مضمون کی غرض ضرورت کے اسباب مختلف ہیں۔ اور جیسے اسباب ضرورت میں سے کسی مضمون کے منافع کا زیادہ ہونا یا مضرت سے زیادہ محافظ ہونا ہے ایسے ہی اسباب ضرورت میں سے ایک تو ہی سبب غفلت بھی ہے یعنی کوئی مضمون واقع میں تو ضروری ہے مگر پھر بھی اس سے غفلت ہے

اس سے بھی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں یہ وجہ بھی موجود ہے۔
 اس وقت اس عارض کی وجہ سے بھی اس مضمون کو اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ
 ظاہر ہے کہ جو مضمون اس مقام پر اس حدیث کا مدلول ہے وہ ایسا ہی ہے
 کہ باوجود ضروری ہونے کے ہم لوگوں کو اس کی طرف التفات نہیں اس وجہ
 سے بھی اس کا بیان کرنا زیادہ ضروری ہو گیا۔ یہ تو ضرورت کے اصل اسباب
 ہیں۔

باقی اس وقت ایک اتفاقی نکتہ اور لطیفہ بھی ہو
 گیا۔ وہ لطیفہ یہ ہوا کہ اس سے قبل جو لکھنؤ میں بیان
 ہوا تھا اُس میں نے حقوق مالکہ کو بیان کیا تھا یعنی یہ بتلایا تھا کہ مال کے
 حقوق کیا ہیں اور اس کے متعلق ضرورت کے موافق بیان ہو گیا تھا جس کا
 حاصل یہ تھا کہ آج کل مسلمانوں کو مال کے حقوق سے اس حیثیت سے
 غفلت ہے کہ مال کہاں سے حاصل کرنا چاہئے اور کہاں استعمال کرنا
 چاہئے۔

علماء سے اگر احکام پوچھے جاتے ہیں تو نماز روزہ کے پوچھے جاتے
 ہیں۔ یہ نہیں پوچھا جاتا کہ ہماری آمدنی کا یہ ذریعہ ہے آیا یہ حلال ہے یا
 حرام۔ یا میں نوکری کرتا ہوں اور میرا فرض منصبی یہ ہے اور منصب کے علاوہ
 میں فلاں فلاں کام منافع حاصل کرنے کے لئے کرتا ہوں۔ یہ وسائل آمدنی کے
 ہیں آیا یہ حلال ہیں یا حرام۔ یا میں زراعت کرتا ہوں اور زمیندار سے یہ معاہدہ
 کرنا پڑتا ہے آیا یہ جائز ہے یا ناجائز۔ یا میں زمیندار کی کرتا ہوں اور میرا

کاشتکاروں سے یہ معاملہ ہے۔ فلاں فلاں صورتیں پیش آتی ہیں، آیا یہ صورتیں جائز ہیں یا ناجائز۔ ان امور کی طرف کسی کو التفات نہیں الا ماشاء اللہ! بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو دنیا کی کارروائی ہے، اس میں شریعت سے کیا واسطہ؟ شریعت نے تو صرف نماز روزہ سکھلایا ہے اور بعض لوگوں کا یہ اعتقاد تو نہیں کہ شریعت کو ان امور سے تعلق نہیں مگر وہ یہ گمان پکائے ہوئے ہیں کہ پوچھنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ حکم تو ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہے کہ لایجوز کا فتویٰ ملے گا۔ (مطلب یہ ہے کہ اگر ہم علماء سے پوچھیں گے بھی تو وہ بھی بتلائیں گے کہ جائز نہیں۔ پھر پوچھنے سے کیا نتیجہ۔ یہ تو ہم پہلے ہی سے جانتے ہیں۔)

خیال تو فرمائیے کہ یہ کتنا بڑا غلط گمان ہے اور لوگوں نے شریعت کو کیسا دشوار سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ شریعت بہت آسان ہے۔ وہ تو سرتاسر رحمت ہی رحمت ہے خدا تعالیٰ کی۔

چنانچہ ایک بزرگ نے لکھا ہے کہ یہ آیتیں
یعنی یا ایہا الذین امنوا اذا نذرتکم بدیناً

جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہیں، یہ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو ظاہر کرتی ہیں۔ جن کا حاصل یہ ہے کہ معاملہ کبھی نقداً نقدی ہوتا ہے کہ اس کا نقد دیا اور اس کا نقد لیا۔ اور کبھی تداین کے طور پر ہوتا ہے کہ نقد دادم نہیں دیئے جاتے یا قرض لیا جاتا ہے۔ تو اس آیت میں دونوں کو ظاہر فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں واشهدوا اذا تبایعتم کہ نقداً نقدی معاملہ میں گواہ

ضرور کر لیا کرو۔ کیونکہ اگر کسی وقت نماز عورت واقع ہو تو چار آدمی فیصلہ کر لیں اور جو معاملہ دین کا ہو تو مزید ارشاد یہ ہے کہ اس کو نکلے بھی لیا کر و تاکہ غلطی سے امن ہو۔ خیال تو فرمائیے کہ جب حق تعالیٰ نے ایک پیسہ اور ایک روپیہ کا ضرر دنیوی اپنے بندوں کے لئے گوارا نہیں فرمایا حالانکہ ساری دنیا پھر کے پیر کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتی تو اپنے بندوں کے لئے بڑے بڑے ضرر ان کو کیسے گوارا ہوں گے۔ پھر یہ کیا تھوڑی دلیل ہے رحمت کی۔

بات یہ ہے کہ لوگوں نے حق تعالیٰ کے احکام دیکھے ہی نہیں جو معلوم ہوتا کہ ان میں کتنی سہولت اور کس قدر مصالح ہیں۔ ابواب فقہ کو نہیں دیکھا قرآن و حدیث کو نہیں دیکھا۔ قرآن شریف کا ترجمہ علماء سے پڑھئے تو معلوم ہو کہ احکام میں کس قدر سہولت ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ صاف صاف ارشاد فرماتے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَجِدُ

کہ حق تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی

چاہتے ہیں اور تنگی کرنا نہیں چاہتے

بِکُمُ الْعُسْرَ۔

اور فرماتے ہیں۔

کہ اللہ نے دین میں تم پر کوئی

تنگی نہیں کی۔

مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ

حُجْرٍ

اور حدیث میں ہے۔ الدین یسیر کہ دین آسان ہے۔ اجمالاً یہ نصوص کافی ہیں۔ باقی اگر تفصیل کی ضرورت ہو تو تھوڑا سا وقت اس کی تحقیق میں صرف کیجئے۔ مگر آپ تو راست دن دنیا کی تحصیل میں مشہک ہیں۔ آپ کو اس طرف

تو جبر ہی نہیں۔ اور تو جہ اس واسطے نہیں کہ اس کے لئے آپ کو ایک دوسرے
 مجمع میں آنا پڑے گا۔ یعنی مجمع علماء میں۔ ایسوں کے پاس اس کے لئے آپ
 کو جانا ہو گا جن سے آپ کو وحشت ہے جس کے اسباب مختلف ہیں۔

چنانچہ بعض کو تو علماء سے اس لئے وحشت ہے
 علماء سے وحشت کہ شاید کچھ چندہ مانگتے لگیں۔ اور بعض کو اس لئے

کہ ہمارے اوپر کفر کا فتویٰ لگا دیں گے۔ اس لئے وہ اپنے گھر ہی میں بیٹھتے
 ہیں یا اپنی جماعت کے ساتھ رہتے ہیں۔ بعض کو اس لئے وحشت ہوتی
 ہے کہ وہ زراعت و تجارت حرام طریقہ سے کرتے ہیں۔ اس لئے کسی عالم
 کے پاس نہیں سباتے کہ وہ اس کو حرام بتلائے گا۔

صاحبو! میں کہتا ہوں کہ علماء کے ساتھ جو آپ کو بدگمانی ہے تو دیکھنا
 یہ ہے کہ علماء مسائل کو نقل کرتے ہیں یا اختراع کرتے ہیں (یعنی گھڑتے
 ہیں) اختراع کا گمان تو غلط ہے کیونکہ ان کے پاس ہر فتویٰ کی دلیل شرعی
 موجود ہے۔ اور اگر یہ گمان نہیں تو پھر ان کی طرف سختی کا گمان کیسا۔ یہ
 گمان تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے کیونکہ احکام تو حضور
 کے بیان فرمائے ہوئے ہیں نہ کہ علماء کے، اور حضور کی طرف اس گمان
 کا غلط ہونا صاف ظاہر ہے۔ آپ کا تو لقب رحمة العالمین ہے۔ آپ
 تو رحمت مجسم بنا کر بھیجے گئے ہیں تمام جہان کے واسطے۔ پھر یہ کیا غضب
 ہے کہ خدا تعالیٰ تو آپ کو رحمت فرمائیں اور یہ شخص آپ کو رحمت سمجھے
 حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لقد من الله على المؤمنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم
 يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة
 حق سبحانه تعالیٰ اس آیت میں احسان جتلاتے ہیں کہ ہم نے تمہاری
 طرف ایک رسول بھیجا جن کی یہ شان ہے کہ وہ اللہ کی آیتیں
 سناتے ہیں اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور تم کو پاکیزہ
 بناتے ہیں۔

پس اگر معاذ اللہ آپ کے احکام موجب زحمت ہیں۔ جیسا بعض
 لوگوں کا خیال ہے تو پھر حضور کے ارسال میں کیا منت ہوئی جو عن اللہ
 میں مذکور ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں حق تعالیٰ۔

يحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث ويضع عنهم
 اصرهم۔

کہ ہم نے ایسا نبی بھیجا ہے جس کی شان یہ ہے کہ طیبیات کو
 حلال اور خبائث کو حرام کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ آپ گندی اور مضر چیزوں کو حرام کرنے آئے ہیں اور
 سختیوں کو موقوف کرتے ہیں۔ جب آپ کی یہ شان ہے تو پھر آپ
 پر سختی کا گمان کیسا؟

اس غلطی کے رفع ہونے کی سہل تدبیر یہ ہے کہ کسی شجر عالم سے قرآن
 و حدیث پڑھئے۔ زیادہ نہیں تو ان سے اردو ہی کے رسالے دیکھ لیجئے
 مگر یہ سمجھ لیجئے کہ اس کام کے لئے آپ کو ایسوں کے پاس جانا پڑے گا۔

جن سے آپ کو وحشت ہے لیکن اگر اپنے دین کی حفاظت چاہتے ہو تو ایسے لوگوں کے پاس جاؤ، خواہ تھوڑے ہی زمانے کے لئے جاؤ پھر یہ حالت ہوگی کہ تمام عمر وہاں سے کسی اور جگہ جانا پسند نہ کرو گے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

خواب را بگذار امشب ار لیسر یک شبے در کوٹے بیخواباں گزرد
ایک رات کے لئے ذرا سونا چھوڑ دو اور اللہ والوں کے پاس جا کر رہو تو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ رات کو کیا کرتے ہیں۔ ان کی شب بیداری کا لطف دیکھ کر اپنی نیند کا لطف بھول جاؤ گے اور عقلمندی بھی خواب ہی کے حکم میں ہے اور اعتقاد سے نہ آؤ تو امتحاناً ہی آکر دیکھ لو ان حضرات کی صحبت میں رہ کر معلوم ہوگا کہ کتنی وسعت ہے شریعت میں۔

باقی آج کل جو بعض لوگوں کو شریعت میں تنگی کا گمان ہے۔ اس کا بھی ایک

شریعت میں تنگی کا گمان

منشا ہے۔ وہ یہ کہ اکثر لوگوں کو یہ بات پیش آتی ہے کہ وہ مولانا کے پاس مسئلہ پوچھنے گئے۔ مولانا نے جواب دیا کہ یہ جائز نہیں۔ کوئی تجارت یا زراعت کی صورت پیش کی تو انہوں نے لایجوز کہہ دیا۔ کسی نے چار مسئلے پوچھے تو انہوں نے ہر دفعہ لایجوز ہی فرمایا۔ اس سے انہوں نے سمجھا کہ بس شریعت میں لایجوز ہی ہے اور کچھ نہیں۔

اس واقعہ کی تکذیب کوئی نہیں کر سکتا مگر اس کی حقیقت سمجھنا چاہئے کہ مولوی صاحب نے آپ کے سوالات کے جوابات میں جو لایجوز کہا

ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟ آیا اس کا سبب شریعت کی تنگی ہے یا
 آپ کے طرز معاشرت کی خرابی اور آپ کی آزادی و وارستگی ہے۔ سو
 تحقیق یہ ہے کہ آپ کے معاملات اکثر فاسد ہو گئے ہیں۔ آپ ایسے
 حال میں پھنسے ہوئے ہیں جس کو کوئی عاقل بھی پسند نہیں کر سکتا۔ اب شریعت
 ظاہر کو ناجائز نہ کہے تو کیا کرے۔ اب فرمائیے تنگی آپ کے اندر ہے
 یا شریعت میں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بیمار حکیم کے پاس آیا اور حکیم سے
 کہا کہ مجھے کھانے کو بتلا دیجئے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ بکری کا گوشت
 کھاؤ۔ مریض نے کہا کہ وہ تو ہمارے گاؤں میں ہوتا نہیں۔ حکیم نے کہا کہ
 کبوتر کھاؤ، فاختہ کھاؤ، کدو لکڑی کھاؤ، پالک کھاؤ۔ غرض جو چیز حکیم بتلاتا
 رہا اس کے جواب میں مریض کہتا رہا کہ یہ چیز ہمارے گاؤں میں نہیں ہوتی
 اور ہمارے یہاں تو بینگن ہوتے ہیں، آلو ہوتے ہیں، جینس کا گوشت ہوتا
 ہے۔ غرض تمام مضر چیزیں گنا ڈالیں۔ حکیم صاحب نے ان سب کے
 جواب میں بھی یہی کہا کہ تو ان چیزوں کے پاس تک نہ جانا۔ اب اگر یہ
 مریض یوں کہنے لگے کہ طب یونانی اس قدر تنگ ہے کہ اس میں میرے
 واسطے ایک غذا بھی جائز نہیں۔ اس میں تو لایجوز ہی ہے۔ ہم تو اب
 ڈاکٹری علاج کریں گے۔ تو کیا اس کا یہ کہنا درست ہوگا۔ ہرگز نہیں! کیونکہ
 منشاء اس کا قواعد طبیہ کی تنگی نہیں بلکہ اس کے گاؤں کی پیداوار کی تنگی ہے۔
 یقیناً اس شخص سے یوں ہی کہا جائے گا کہ قواعد طبیہ میں تو تنگی نہیں، اس میں

تو صدقہ قسم کی جائزہ فحاشی موجود ہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اس ظالم کے گاؤں میں تمام مضر ہی مضر چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ تنگی کا الزام طب پر جب ہو سکتا ہے جب کہ طب کی کتابوں میں دیکھو کہ کوئی نڈا اس کے مزاج کے موافق ملے ہی نہیں۔ جب یہ نہیں تو تنگی کا شبہ طب پر نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح شریعت کا قانون تنگ نہیں۔ کتابیں دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شریعت نے معاملات کی کتنی صدقہ صورتیں جائز کی ہیں اور کتنی سے چند چیزوں کو ناجائز کہا ہے۔ فقہ کی کتابوں میں معاملات کو دیکھئے۔ کتاب البیع دیکھئے۔ خیبار شرط ملاحظہ کیجئے۔ کتاب الشرف پر نظر ڈالئے۔ کتاب الدعویٰ دیکھئے۔ کتاب المساقات مطالعہ کیجئے۔ ان سب کی تحقیق کر کے پھر شمار کیجئے کہ کتنے واقعات میں بجز ہے اور کتنے میں لایجوز۔ یقین کیجئے اگر آپ سو معاملات دیکھیں گے تو ساٹھ میں بجز اور چالیس میں لایجوز نکلے گا۔ اگر ہم کتابوں سے دکھائیں کہ شریعت نے اتنے ذرائع آمدنی کے جائز کئے ہیں اور چند کو ناجائز کیا ہے، تو پھر شریعت پر تنگی کا الزام کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آپ کی معاشرت ہی خراب ہے۔ آپ نے حلال طریقہ چھوڑ کر زیادہ تر حرام ہی ذرائع آمدنی کے اختیار کر رکھے ہیں۔ تو یقیناً شریعت یہی کہے گی کہ اگر کوئی کسی پر ظلم کرے، کسی کا مال زبردستی چھینے، سوولے، رشوت لے، تو یہ حرام ہے۔ ناجائز ہے۔ مگر اس حالت میں یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ شریعت میں تنگی ہے بلکہ یہ تنگی تو ہماری طرف سے ہے۔ وہ یہ کہ سب نے مل کر آمدنی کے وسائل وہی اختیار کئے ہیں

جو کسی طرح جائز نہیں ہو سکتے ہم نے ان کو اپنی طرز معاشرت کا جزو بنا رکھا ہے۔ اب جب اس کے خلاف شریعت میں نکلتا ہے تو کہتے ہیں کہ شریعت میں بڑی تنگی ہے۔ انصاف سے بتلائیے کہ تنگی کدھر سے ہوئی۔ افسوس ہے کہ تنگی ہمارے افعال بے جا سے ہوئی اور الزام ہے شریعت پر۔

ہماری وہ حالت ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

حملہ بر خود مے کنی لے سادہ ہر ہچو اں شیر نے کہ بر خود حملہ کرد

مولانا نے فتویٰ میں ایک حکایت لکھی ہے کہ کسی جنگل میں ایک شیر آگیا تھا اور اُس نے

خزگوں کی واثالی

پنجیروں کو یعنی شکار کے جانوروں کو پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ جانور یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ اور جمع ہو کر اُس کے پاس پہنچے اور کہا کہ حضور کو تکلیف کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔ یہیں حضور کے واسطے ہم میں سے ایک جانور روزانہ بلا ناغہ نمبر وار آجایا کرے گا۔ چنانچہ معاہدہ ہو گیا اور ایک جانور روزانہ اتار لیا۔ ایک دن خزگوں کی نوبت آئی۔ یہ جاتا نہ تھا۔ دوسرے جانوروں نے کہا کہ خدا کے لئے تو چلا جا کہیں معاہدہ کے خلاف کر کے سب پر آفت نہ آجائے۔ بالآخر جبراً و قہراً چل چل کر گیا چونکہ جانے میں بہت دیر ہو گئی تھی، شیر بھوک کے مارے غصہ ہو رہا تھا۔ اُس کو دیکھتے ہی کہنے لگا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ تم سے عہد پورا نہ ہو سکے گا۔ اب میں سب کو خوب ٹھیک کروں گا۔

خزگوں پہلے ہی سے شیر کی ہلاکت کی تدبیر سوچ کر گیا تھا۔ بولا حضور

پہلے قصہ تو سن لیجئے۔ آپ اپنے نخرہ ہی میں تل رہے ہیں۔ آپ کو نخرہ ہی نہیں کہ یہاں کیا سے کیا ہو گیا۔ آج ایک بڑا زبردست واقعہ ہو گیا ہے میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں۔ اسی واسطے دیر بھی ہو گئی۔ چلا تو تھا میں وقت ہی پر مگر اس جنگل میں ایک دوسرا شیر آ گیا ہے۔ آج ہم حضور کے واسطے دو بھائی اٹے تھے۔ راستہ میں حملہ کر کے اُس نے ایک کو تو پکڑ لیا اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آپ تک پہنچا ہوں۔ میں نے حضور کا نام لے کر اُس کو ڈرایا بھی دھمکایا بھی مگر اُس نے ذرا پروا نہ کی اور کہا کل سے ہمیں راتب دیا کرو اُس کو نہ دیا کرو۔ بس پہلے آپ اُس کا انتظام کیجئے ورنہ کل سے آپ کا روزینہ بند ہے۔ وہ راستہ ہی میں آپ کا راتب چھین لیا کرے گا۔

شیر نے غصہ میں آ کر کہا کہ اُس کو ہمیں بتلاؤ۔ نخر گوش راستہ میں ایک کنواں دیکھ کر گیا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ وہاں لے گیا اور کہا، حضور! وہ شیر اس میں رہتا ہے۔ مجھ کو تو خوف معلوم ہوتا ہے۔ آپ مجھ کو اپنی آغوش میں لے لیں۔ تو میں اُس کو دکھا دوں۔ چنانچہ شیر نے ایسا ہی کیا۔ نخر گوش نے کہا کہ کنوئیں میں جھانک کر دیکھئے۔ اُس نخر گوش کو آغوش میں لے ہوئے وہ کھڑا ہے۔ کنوئیں میں شیر نے جو جھانکا تو اُس کا عکس پڑا۔ دیکھا کہ ایک شیر نخر گوش کو آغوش میں لے ہوئے ہے۔ شیر شجاع تو ہوتا ہی ہے اُس کو پھینک کنوئیں میں کود پڑا۔ جب نخر گوش نے دیکھا کہ اُس کا کام تمام ہو گیا ہے تو آپ کہتے ہیں تسلیات، آداب، عرض ہے شیر پانی میں ڈوب

کر مر گیا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

حملہ پر خود سے کئی اے ساوہرہ ہم چو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد
شیر نے اپنے نزدیک دوسرے پر حملہ کیا تھا مگر حقیقت میں وہ
حملہ اپنے اوپر تھا۔

ہماری کم فہمی اور بے عقلی | جیسے ایک حبشی کی حکایت ہے کہ راستہ
میں چلا جا رہا تھا۔ ایک آئینہ پڑا ہوا اعلان

اُسے اٹھا کر دیکھا تو اس میں اپنی شکل نظر آئی۔ سیاہ رنگ، موٹے موٹے ہونٹ
آپ اپنی شکل کی زیادت سے تمام عمر میں اسی وقت مشرف ہوئے تھے
خفا ہو کر آئینہ کو پتھر پر دے مارا اور کہا کہ کم بخت! جب تو ایسا بد شکل تھا
جب ہی تو تجھ کو راستہ میں کوئی پھینک گیا۔

اسی طرح ایک اجمن کی حکایت ہے کہ اُس کا لڑکا ہاتھ میں روٹی
کا ٹکڑا لے رہا تھا۔ اتفاق سے وہ ٹکڑا اُس کے ہاتھ سے لوٹے میں گر
پڑا جس میں پانی بھی تھا۔ اُس نے جھانک کر دیکھا تو اُس کو اپنی شکل نظر
پڑی تو وہ کہتا ہے ابا ابا، اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا۔ باپ نے جو اُس
میں جھانک کر دیکھا تو اُس کو اپنی شکل نظر پڑی۔ دیکھا کہ ایک شخص ہے
بڑی سی واڑھی والا۔ آپ کہتے ہیں کہ اتنی بڑی واڑھی لگا کر بچے کا ٹکڑا چھینتے
ہوئے شرم تو نہ آئی۔

ایک اور حکایت ایسی ہی یاد آگئی۔ متعدد مثالوں سے مضمون خوب
واضح ہو جاتا ہے۔ اس لئے بیان کی جاتی ہیں۔ وہ یہ کہ ایک دفعہ لوگ سناؤ

دیکھ رہے تھے اور اس وقت ایک عورت بچہ کو پاخانہ کرا رہی تھی۔ جلدی جلدی اُس سے فارغ ہو کر بچہ کو پونچھ پانچھ کر وہ بھی چاند دیکھنے لگی۔ اتفاق سے اُس کی انگلی میں پاخانہ لگا رہ گیا تھا۔ خود تو اس کی عادت ہوتی ہے کہ ناک پر انگلی رکھ کر بات کرتی ہیں۔ تو وہ عورت چاند دیکھتے ہوئے ناک پر انگلی رکھ کر کہتی ہے، اے ہے! آج ایسا سڑا ہوا چاند کیوں نکلا۔ یہ خبر نہیں کہ وہ خود ہی سڑی ہوئی تھی۔

صاحبو! اسی طرح شریعت میں جسے تنگی نظر آتی ہے وہ خود تنگ ہے پھر میں اخیر بات کہتا ہوں کہ اگر فرض کر لو شریعت میں تنگی ہوتی بھی تو سوال یہ ہے کہ آپ کو اس صورت میں کیا کرنا چاہئے تھا۔ میں کہتا ہوں کہ ہم لوگ جس گورنمنٹ کی عملداری میں رہتے ہیں اگر وہ گورنمنٹ کوئی سمحت قانون مقرر کر دے تو آپ کیا کریں گے۔ اس صورت میں تین شکلیں ہیں یا تو اس قانون کو تسلیم کر لیا جائے اور سب سے لڑو یا اس کا ملک چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ تینوں شکلوں میں سلامتی کی بات یہ ہے کہ تسلیم کر لو۔

اسی طرح خدا تعالیٰ کے احکام اگر کسی کو سمحت یا تنگ نظر آتے ہیں تو یا تو حق تعالیٰ سے لڑے یا خدا کا ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاوے۔ مگر یہ بتلاؤ کہ لڑو تو کیسے لڑو اور وہ کون سا ملک سے جہاں چلے جاؤ گے۔ تو یہ دونوں شکلیں یہاں محال ہیں۔ بس تیسری ہی شکل رہ گئی کہ تسلیم کر لو۔ باقی آپ نے جو تجویز کر رکھا ہے کہ جو قانون سمجھ میں نہ آیا اُسے چھوڑ دیا۔ یہ تو بالکل ہی بے عقلی ہے۔

آج کل بعض لوگوں نے کہا ہے کہ انگریزی کے
 آج کل کے محققین | بی اے، ایم اے ہو کر شریعت مقدسہ کے محقق

ہتے ہیں۔ ان لوگوں کو اتنی بھی عقل نہیں کہ جس نے چھ برس دین کی خدمت
 میں صرف کر دیئے ہوں اور چراغ کا دھواں سیروں اُس کے دماغ میں سما گیا ہو
 تو وہ محقق نہ ہو اور یہ حضرت لٹوڑی سی انگریزی پڑھ کر محقق ہو گئے۔

آج کل کے محققین اور محققین کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص گلستان
 دیکھ کر اُس کا محقق ہو گیا تھا۔ اتفاق سے دو شخصوں میں لڑائی ہو گئی۔ ایک
 اُن میں سے ان حضرت کے دوست تھے۔ وہ پٹ بھی رہے تھے اور
 پیٹ بھی رہے تھے۔ آپ نے یہ دیکھ کر دوست کے دونوں ہاتھ
 پکڑ لئے۔ انجام یہ ہوا کہ اُن کے دوست صاحب خوب پٹے اور آپ
 اپنی اس حرکت پر بڑے خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے گلستان میں جو
 پڑھا تھا

دوست اُن باشند کہ گیر دست دوست
 وہ پریشاں حالی و درماندگی

آج اُس پر عمل کرنے کا اچھا موقع ملا اور اپنے نزدیک دوست کا پورا
 حق ادا کر دیا۔ تو جیسے وہ گلستان کے محقق تھے، ایسے ہی یہ لوگ آج کل قرآن
 و حدیث کے محقق ہیں۔

ان ہی میں سے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ انہوں نے امام مقیم کے سامنے
 نماز پڑھی۔ جب امام دو رکعت پڑھ چکا آپ دونوں طرف سلام پھیر کر بیٹھ
 گئے۔ امام نماز میں ہے اور مقتدی پہلے ہی فارغ ہو گیا۔ میں دیکھ کر سمجھا تو

سے کوئی عذر ہوگا جو بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں مگر میں نے دیکھا ہر رکن میں بیٹھ ہی نظر آتے ہیں۔ اب میں سمجھا کہ آپ نے امام مقیم کے ساتھ بھی قصر کیا ہے نماز سے قانع ہو کر میں نے ان سے کہا کہ آپ نے پوری نماز کیوں نہیں پڑھی تو آپ فرماتے ہیں کہ میں مسافر تھا۔ آج کل کے ایسے محققین ہیں جنہیں اتنی بھی خبر نہیں کہ اگر امام مقیم ہو تو مقتدی مسافر کو بھی امام کے ساتھ چار ہی رکعت پڑھنی چاہئیں۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ہے ایک بڑے لیڈر کا۔ مگر آج کل کے لیڈر کیا ہیں، گیدڑ ہیں۔ وہ سفر میں تھے، پانی ملا نہیں۔ تیمم کا ارادہ کیا مگر کبھی تیمم کونے ہوئے کسی کو دیکھا تھا نہیں۔ اجتہاد شروع کیا۔ تقدم تو اس جماعت کے لوازم سے ہے۔ ہر بات میں سب سے پہلے ٹانگ اڑاتے ہیں۔ آپ نے کیا کیا کہ مٹی لے کر پہلے ہاتھ کو ملی۔ پھر چلو میں مٹی لے کر منہ میں دی۔ عرض و منو کی طرح تیمم کیا۔ وہ اب بھی زندہ ہیں سلمہ اللہ تعالیٰ۔ اور مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ان کا اقتدا کرنے کو تیار ہیں۔

افسوس ان لوگوں کو دین کی تو خبر نہیں اور پھر لیڈران قوم بنے ہوئے ہیں۔ ایسوں ہی پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

اذا كان الغراب دليل قوم
سيهد يهد طولق الها لكينا

اور دین سے واقفیت کا ذریعہ صرف یہی تھا کہ علماء سے سبق حاصل کیا جائے مگر اس سے ان کو عار ہے۔

تعلق باللہ | میں عرض کر رہا تھا کہ جب کوئی قانون نافذ ہوتا ہے، تو تین سالتیں ہوتی ہیں۔ جیسا اوپر بیان ہوا۔ تینوں میں سلامتی

کی بات یہی ہے کہ اس کو تسلیم کر لو۔ خاص کر جب کہ حاکم سے دوسرا تعلق بھی ہو۔ اور ہمیں اثنا عشر تعلق ہے خدا تعالیٰ کے ساتھ کہ اگر وہ منکشف ہو جائے تو خدا کی قسم کھاتا ہوں اور پھر قسم کھاتا ہوں اور پھر قسم کھاتا ہوں کہ ہم احکام الہیہ سے ایسے منصف اور رنگین ہو جاویں کہ دوسرا رنگ ہی نہ رہے۔

وہ تعلق کون سا ہے۔ وہ تعلق محبت اور محبوبیت کا ہے۔ کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ آپ کو محبت کی تا لازم نہیں؟ کوئی مسلمان ہے جو یہ کہہ سکتا ہو کہ ہاں لازم نہیں ہے۔ اگر کسی کو ایسی ہمت ہو تو میں کہتا ہوں کہ اُس کو دنیا میں کسی سے بھی محبت ہے یا نہیں۔ بی بی سے، بچوں سے، مکان سے، معشوق سے، عورت سے، لڑکے سے، یقیناً کسی ایک چیز سے تو محبت ضرور ہوگی۔

اب یہ سوچو کہ بناد کیا ہے اس محبت کی جو بنیاد محبت کی کبھی فضل و کمال ہوتا ہے جیسے امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ میں فضل و کمال کی شان ہے کہ وہ ان سے محبت کا باعث ہوا ہے۔ اسی طرح حضرات شیخین سے محبت ہے یا اہل بیت سے محبت ہے۔ تو ان کے ساتھ بھی فضل و کمال کی وجہ سے محبت ہے۔ کبھی محبت ہوتی ہے عطا و نوال کی وجہ سے۔ جیسے محسن سے محبت ہوتی ہے۔ کبھی حسن و جمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے۔

جیسے کسی لڑکے یا عورت سے محبت ہو اور ایسی محبت ہوتی ہے کہ عشق کے مرتبہ کو پہنچ جائے۔ بس یہ اسباب ہیں محبت کے۔

ایک فضل و کمال — ایک عطا و نوال — ایک حسن و جمال
اب اگر کہیں یہ تینوں اسباب جمع ہوں تو پھر محبت نہ ہونے کے
کیا معنی؟ اب بتلا بیٹے اللہ تعالیٰ میں کس چیز کی کسر ہے۔ کیا ان میں فضل و
کمال نہیں یا عطا و نوال نہیں یا حسن و جمال نہیں۔ ان میں تو سب چیزیں موجود
ہیں۔ عطا کی تو یہ کیفیت ہے کہ آپ کو دل دیا، عقل دی، زبان دی، آنکھ ناک
دی۔ اگر خدا تعالیٰ قلوب نہ دیں، زبان نہ دیں تو کوئی آپ کو یہ چیزیں کیونکر
دے سکتا ہے۔ معطلی حقیقت میں وہی ہیں۔ اگر کسی میں فضل و کمال علم کا ہے
تو وہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے۔ انہی کا دیا ہوا حسن و جمال بھی ہے جب ان کے
بنائے ہوئے ایسے ہیں تو وہ خود کیسے ہوں گے۔ ان کی تو یہ نشان ہے۔

حسن خویش از رشتے خوباں آشکار کردہ

پس بہ چشم عاشقان خود را تماشا کردہ

واقع میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے آفتاب نکلا اور دیوار پر دھونڈی
مگر ایک احمق کو آفتاب کی خبر نہیں۔ اس کی نظر دیوار پر ہی ہے اور اس کو
دیکھ دیکھ خوش ہو رہا ہے۔ شیخی بگھار رہا ہے کہ میرے گھر کی دیوار کسی جھک
رہی ہے۔ مگر شام ہونا لگتی کہ دھوپ سمٹنا شروع ہوتی ہے اور آفتاب اپنے
ساتھ اس کو لے جاتا ہے تو دیوار تار یک کی تار یک رہ جاتی ہے۔ نور
صفت اصلی آفتاب کی ہے دیوار کی نہیں۔ اگر وہ حسن و جمال دیوار کی اصلی صفت

احکام الجاہ

ہوتی تو اس سے زائل کیوں ہوتی۔ ایسی ہی چیزوں کے بارہ میں کہ جن کا ذکر
و جمال ان کی اصلی صفت نہیں مولانا فرماتے ہیں۔

عشق با مردہ نباشد پایدار
عشق را با حی و با قیوم دار
عاشقی با مردگان پائندہ نیست
زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست
عشق ہائے کو پستے رنگ بود
عشق نبود عاقبت ننگ بود
آگے فرماتے ہیں۔

عزق عشقے شو کہ فرق سرت اندری
عشق ہائے اولین و آخرین
پس عشق حق تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ ان سے ہی عشق کرنا چاہئے۔ مگر اس
میں بعض اوقات یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ محب و محبوب میں مناسبت ہونی
چاہئے اور ہم میں اور حق تعالیٰ میں مناسبت ہی کیا۔ پھر وہاں تک ہماری رسائی
کیونکر ہوگی۔ مولانا آگے اسی شبہ کو رفع فرماتے ہیں۔

تو گو مارا بدایا شہ بار نیست
بر کہ یہاں کار ما دشوار نیست
یعنی یہ مرت سمجھ کہ اس شاہنشاہ کی بارگاہ میں تیرا کیونکر دخل ہوگا۔ اس لئے کہ
بر کہ یہاں کار ما دشوار نیست

یعنی کریموں پر یہ کام دشوار نہیں۔ جو اب کا حاصل یہ ہوا کہ رسائی کی
دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ تم خود وہاں پہنچو اور ایک یہ کہ وہ تم کو پہنچادیں
سو کہتے ہیں کہ گو تم خود وہاں تک نہیں پہنچ سکتے مگر انہیں تو پہنچانا مشکل نہیں
ہے۔ جب یہ ہے تو پھر مایوسی کیسی؟

تقرب الی اللہ

چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔ من تقرب الی
شبرا تقرب الیہ ذرا عا و من تقربت الی

ذراعاً تقربت الیہ باعاً۔ الخ کہ جو میری طرف ایک بالشت آتا
ہے میں اس کی طرف ایک ذراع جاتا ہوں اور جو میری طرف ایک ذراع
آتا ہے میں اس کی طرف ایک باع آتا ہوں اور جو میری طرف آہستہ چل
کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ راستہ تو غیر
قناعی ہے کہ کسی کے قطع کرنے سے قطع ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

نگر و قطع ہرگز جاوہ عشق از وید نہا

کہ می بالہ بخود این راہ چون تا ک زبرد نہا

یہ ہمارے چلنے سے قطع نہیں ہوتا بلکہ اُدھر ہی سے عنایت ہوتی ہے

تو قطع ہوتا ہے۔ اسی کی نسبت حدیث میں بشارت ہے من تقرب
الی شبرا۔ الخ کہ جو ایک ذراع ہماری طرف آتا ہے ہم اس کی طرف
ایک باع جاتے ہیں۔ خیال تو فرمائیے کیسی عنایت ہے کیسا کرم ہے؟
مگر طلب شرط ہے۔ جس کی خاصیت مولانا فرماتے ہیں۔

آب کم جو تشنگی آورد بدست تا بجوشد آبت از بالا و پست

مطلب یہ کہ بدون پیاس پانی نہیں ملتا۔ پیاسے بنو تو پانی تم تک خود

ہی آجائے گا۔ راز اس کا کیا ہے۔ راز یہ ہے۔

تشنگاں گر آب جو نید از جہاں آب ہم جوید بہ عالم تشنگاں

یعنی پیاسا و صونڈتا پھر تا ہے پانی کو۔ اسی طرح پانی بھی صونڈتا

ہے پیار سے کو۔

یعنی حق تعالیٰ خود تم کو اپنی طرف بلا تے ہیں اور بلا نے کے ساتھ نہیں
 بھی ہیں۔ کوئی محبوب ایسا ہے کہ محب کو خود بلائے اور خود پہنچائے۔ غرض
 کیجئے کہ عاشق کو محبوب خود بلا رہے ہیں۔ یہ عنایت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ
 عنایت پر شہرہ ہی نہیں ہو سکتا کہ ہماری رسائی خدا تک کیسے ہوگی۔
 ایک بزرگ تھے۔ اُن کو بادشاہ نے کچھ دریافت کرنے کی غرض
 سے بلانا چاہا۔ بادشاہ محل کے اوپر تھے اور یہ نیچے سے گزر رہے تھے۔ بادشاہ
 نے اوپر سے کند پھینک دی۔ اُس کے ذریعہ سے محل پر پہنچ گئے۔ بادشاہ نے
 پوچھا کہ بندہ کی رسائی خدا تک کیسے ہو سکتی ہے۔ کہاں خدا کہاں بندہ۔ انہوں
 نے برحسبہ فرمایا کہ ایسے ہو سکتی ہے جیسے میری رسائی آپ تک ہو گئی۔ اگر
 میں دروازہ سے آتا تو کتنے مرحلے طے کرنے پڑتے۔ کہیں دروازوں سے
 واسطہ پڑتا۔ کہیں مصاحبین سے کہنا ہوتا۔ کتنے درجے طے کرنے پڑتے۔ اس
 کے بعد کہیں آپ تک رسائی ہوتی اور شاید نہ بھی ہوتی اگر دربان روک دیتا۔
 غرض ایک صورت تو آپ تک پہنچنے کی یہ تھی کہ میں آپ کو تلاش کرتا اور
 سو وقتیں اٹھا کر کہیں آپ تک پہنچتا۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ خود آپ
 نے مجھے پہنچ لیا پس جیسا اس وقت آپ نے کیا اسی طرح خدا تک رسائی
 ہو سکتی ہے۔

شرط طلب و تقاضا

مگر طلب شرط ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کھینچتے اسی
 کو ہیں جو کھینچنا چاہے اور جو اعراض کرتا ہے

ان سے وہ بھی اعراض کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

انلزمکم وھاوانتم لھا
کارھون
یعنی تم کو راہت کرو تو ہمیں کیا
غرض پڑی ہے جو خواہ مخواہ

اپنی رحمت کو تم پر لا دیں۔

ن اگر کوئی طلب کرے تو اس کی طرف نہایت توجہ اور رحمت فرماتے

اس کی ایسی مثال ہے، جیسے بچہ ماں کی آغوش میں دوڑ کر آنا چاہتا ہے
گھٹنوں سے چلا نہیں جاتا۔ وہ ہمت کر کے کھڑا ہوا اور گر پڑا۔ اس کا
ہاتھ کہ ماں نے دوڑ کر خود اٹھا لیا۔ بس اس کا کام تو اتنا ہی ہے کہ اپنی
مت کے موافق چلے اور گر پڑے۔ جب وہ اپنا کام کر چکتا ہے تو فوراً
ان آغوش میں اٹھا لیا جاتا ہے۔ اگر بچہ ایسا نہ کرے تو اس کی طرف ماں
ایسا تقاضا نہیں ہوتا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ رختہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف ار می باید دوید

تانا گرید طفل کے جو شد لبین
تانا گرید ابر کے خند و چین

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زینما مکان میں لے گئیں تو سات
قل سات دروازوں میں ڈال دیئے تھے تاکہ نکلنے نہ پائیں۔ جب انہوں
نے یہ کیفیت دیکھی تو سوچا کہ اپنا کام مجھے کرنا چاہئے پھر حق تعالیٰ اپنا
کام کریں گے۔ دروازہ کھلنا نہ کھلنا میرا کام نہیں۔ بس خدا پر توکل کر کے
دروازہ کی طرف بھاگے۔ دروازہ کے پاس پہنچنے نہ پائے تھے کہ سب

دروازے کھلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ساتوں دروازوں سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ گو بھاگنے کا راستہ تو نہیں ہے لیکن بھاگنا تو بہتر قبضہ میں ہے۔ چنانچہ اس قصد سے بھاگے اور ان کا اثر یہ ہوا کہ باہر نکل گئے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ رختہ نیست عالم را پدید
خبرہ یوسف داری باید وید
غرض یہ تو مسلم ہے کہ انسان کی کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہوتا وہ ہے جو منظور خدا ہوتا ہے مگر پھر بھی کوشش شرط ہے۔ جیسے وضو نماز کے لئے شرط ہے گو تنہا وضو سے کچھ نہیں ہوتا جب تک نماز نہ پڑھے۔ لیکن بدو ان وضو کے نماز بھی نہیں ہوتی۔ ایسے ہی خدا تعالیٰ محض اس کی کوشش سے نہیں ملتے وہ اپنی مرضی سے ملتے ہیں۔ مگر کوشش شرط ہے۔

ان ہی دو مثالوں کو بیان کر کے میں کہتا ہوں کہ قرآن میں اسی لئے اشارہ فرمایا ہے۔

جزاء بھاگنا و اعلمون اور جزاء
بھاگنا و اعلمون۔
کہ عمل کرنے والے اپنے عمل کا
بدلہ ویسے جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عمل ضروری ہے اور یہ جو حدیث میں ہے کہ بدو ان رحمت کے کوئی جنت میں نہ جائے گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل علت تامہ نہیں ہے مگر شرط ہے۔ اس کے بعد میں قرآن شریف ہی سے یہ مسئلہ ثابت کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ تک رسائی ممکن ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ان رحمت اللہ قریب من
کہ اللہ کی رحمت محسنین سے

المحسین

قریب ہے۔

پس اتنی طلب تو چاہئے کہ عمل میں مشغول ہو جائے اور خلوص کے ساتھ مشغول ہو جاوے۔ جس سے محسین کا مصداق ہو جائے۔ اس کے بعد یہ مشاہدہ ہو جائے گا۔

باکریاں کارٹا دشوار نیست

تمہارے عمل کرنے پر خدا تعالیٰ کی رحمت منورہ ہوگی۔ بس کامیاب ہو جاؤ گے۔ اب تو معلوم ہو گیا کہ خدا تعالیٰ تک رسائی ممکن ہے جسب رسائی ممکن ہے تو پھر خدا تعالیٰ سے کیوں نہ محبت کی جائے بلکہ ان سے محبت کرنا واجب اور فرض ہے اور میں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی محبوب ہے ہی نہیں۔ تعجب ہے کہ عشق مجازی کو دین و ایمان سمجھا جائے اور خدا تعالیٰ کے عشق کی طرف ذرا دھیان بھی نہ ہو۔

تعلق بالمشق | بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو خدا سے پوری محبت ہی نہیں۔ اس لئے اس کے احکام کے تسلیم کرنے میں تاثر ہوتا ہے۔ جو خدا کا عاشق ہوگا وہ تو ہر حکم کو سراور آنکھوں پر رکھے گا۔ اور جو حالت بھی اس کو خدا کی طرف سے پیش آئے گی اس میں خوش ہوگا۔ اس کی تو یہ کیفیت ہوگی۔

زندہ گئی عطائے تو درستی فدائے تو
دل شدہ بتلائے تو لہر چہ کنی رضائے تو

اور اس کا یہ مذہب ہوگا۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من
دل فدائے پار دل رنجان من

بلکہ یہ حالت ہوگی ۔

بجبرم عشق تو ام می کشند و غوغائیت
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش نماشائیت

یہ ہوتا ہے اثر تعلق عشق کا مگر افسوس ہے ہمارے سماں پر کہ محبت کا اثر دعویٰ اور اتنا بھی تعلق نہیں کہ اگر احکام سخت نازل ہوں تو ان کو دل سے مار لیا جائے۔ معلوم ہوا کہ برائے نام ہی محبت ہے۔ پھر اگر ہم یہ دیکھتے کہ آپ سخت احکام کے نہ ماننے میں ایسے پختہ ہیں کہ دنیا میں کسی کے ہی سخت احکام نہیں ماننے، تو ہم بھی سمجھتے کہ یہ لوگ اصول کے بڑے پابند ہیں۔ اس لئے ان پر الزام نہیں مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ مخلوق کے تعلق ہی میں یہ لوگ ان اصول کو ٹوڑ دیتے ہیں۔

چنانچہ طبیب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نبض دیکھ کر نسخہ لکھ دیجئے اُس نے ایسا کر ڈوا نسخہ لکھا کہ جس کا منہ تک جانا بھی دشوار ہے تو اس سے یہ نہیں کہتے کہ ایسا کر ڈوا نسخہ کیوں لکھا۔ علیٰ ہذا۔ کتنا ہی قیمتی لکھا ہو، یہ کبھی نہیں کہتے کہ اتنا قیمتی کس واسطے لکھا ہے بلکہ بعض اوقات اُس سے فرمائش ہوتی ہے کہ اچھا نسخہ لکھئے گا۔ قیمت کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ اور باوجود ان سارے قصوں کے پھر بھی تندرستی کے بعد کہتے ہیں کہ آپ کا بڑا احسان ہوا جس کا ہم شکر یاد کرتے ہیں۔ اور کر ڈوے نسخہ کو عنٹ عنٹ پی جاتے ہیں۔ سب طرح کی مشقت گوارا کرتے ہیں۔ اگر حکیم کہے کہ عصر کے وقت کچھ پی کھانا تو اسی کو خوشی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ عرض وہ جو بھی بتلائے خواہ نفس پر کیسا ہی گراں ہو، سب

بول کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس وقت آپ کے یہ اصول کہ سخت احکام
 و نہ مانا جائے وغیرہ وغیرہ کہاں گئے۔ طیب کے ساتھ یہ معاملہ نہ کیا، جو خدا
 کے ساتھ کرتے ہو۔ معلوم ہوا کہ صرف بہانہ ہے نفس کا اور کچھ نہیں۔ بس آپ کا
 مذہب یہ ہے کہ جس طرح دنیا کا کام بنا اسی طرح کر لیا۔ اصول کے اختیار کرنے
 سے کام چلا یوں کر لیا اور جو اصول کے چھوڑنے سے کام چلا تو ایسے کر لیا۔ یہ
 نہیں سوچتے کہ اس بے ڈھنگے پن کا انجام کیا ہوگا۔

بہر حال اول تو احکام شرعیہ سخت نہیں اور اگر سخت ہوئے بھی تو ان کو
 برداشت کیجئے۔ آپ کا فرض ہے کہ ان کو بجلائیں جیسے دنیا کے احکام
 اور آقاؤں کے سخت احکام برداشت کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح احکام
 خداوندی کے ساتھ معاملہ کیجئے۔ پس اگر شریعت میں حقوق مالیہ سخت بھی
 ہوں تب بھی ان پر عمل کرنا چاہئے مگر اس کی طرف کسی کو التفات ہی نہیں۔
 نماز روزہ کے مسائل تو کبھی پوچھ بھی لیتے ہیں حقوق مالیہ کو کوئی پوچھتا ہی نہیں
 کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ اس سے پہلے بیان میں ان حقوق مالیہ کا بیان
 بقدر ضرورت ہوا تھا۔ دیکھئے اس پر عمل ہوتا ہے یا نہیں۔

ابہ اسی کے ساتھ اس کا ایک قرین ہے جس کا نام
انزو جاہت جاہ ہے یا انزو جاہت۔ اور یہ اس کا قرین اس لئے
 ہے کہ جیسے مال حوائج کے پورا ہونے کا ذریعہ ہے اسی طرح جاہ بھی حوائج
 کے پورا ہونے کا ذریعہ ہے اور اصل غرض حوائج کا پورا ہونا ہے اور چونکہ
 یہ دونوں چیزیں اس کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے لوگ رات دن انہی کی طلب

۲۶
 میں سرگرم رہتے ہیں۔ غرض یہ کہ حوائج کے پورا ہونے میں مال و جاہ دونوں کے دخل ہے۔ بعض کام مال سے چلتے ہیں اور بعض جاہ سے اور بعض اعتبار سے بلکہ غور کیا جائے تو جاہ اثر میں مال سے بھی بڑھی ہوئی ہے کیونکہ بعض اوقات جاہ سے بلا مال کے ہی کام چل جاتا ہے۔ بعض کام جاہ کی وجہ سے ایسے ہو جاتے ہیں جو مال سے ہو ہی نہیں سکتے۔ بعض لوگوں کی مالی حیثیت زیادہ بہتر ہوتی مگر ان کی جاہ زیادہ ہوتی ہے۔

قصبات میں بعض رئیس ہوتے ہیں کہ ان کا قصبہ میں اثر ہوتا ہے کہ چار پائی چڑھ چیتے ہیں، سقہ سامنے رکھا ہے، تکیہ لگاٹے ہوئے ہیں۔ کسی شخص کو دوسرے بلانا ہے۔ مزدور بھیجنے میں پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ بس کوئی ان کے سامنے سے سر پور گٹھڑی لٹے ہوئے نکلا۔ اس کو کہا گٹھڑی کو تو یہاں رکھ دے اور فلانے کو بلا لا۔ اگر مزدور بھیجنے تو دوانے خرچ ہوتے۔ بس ان کا کام مفت میں ہی چل گیا۔ تو یہ کیا ہے، جاہ کا اثر ہے کہ اس سے بدون پیسہ خرچ کئے ہوئے کام چل رہا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ مثلاً اہل کماں ہوتے ہیں۔ لوگ ان کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کو عیش و آرام ہوتا ہے۔ لوگوں کو ان پر حسد بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کے پاس مال کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تو یہ کیا ہے جاہ ہی کا تو اثر ہے ان حضرات کی جاہ پہلے عند اللہ ہوتی ہے اور پھر عندا خلق ہوتی ہے۔

مجھ کو اس وقت اس سے بحث نہیں کہ جاہ کسی چیز ہے اور اس کا کیا حکم ہے بلکہ یہ بیان کرنا ہے کہ جاہ ہی ایک ذریعہ ہے حوائج کے پورا

ہونے کا جیسے مال ایک ذریعہ ہے اور حوائج دو قسم ہیں جلب منفعت و دفع مضرت اور مال کے یہ دونوں اثر ہیں اسی طرح جاہ کے بھی یہ دونوں اثر ہیں گو غالب اور زیادہ مال میں جلب منفعت ہے اور جاہ میں دفع مضرت۔ مگر ایک امر مشترک تو دونوں میں ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ مال و جاہ دونوں میں تعارض ہے۔

چونکہ پہلے مال کے متعلق بیان ہو چکا ہے تو جی یوں چاہا کہ اس کی قرین کا ذکر بھی ہو جائے تاکہ اس مضمون کی تکمیل ہو جائے۔ اس جلسہ میں بعض لوگ تو وہ ہیں جو پہلے بیان کو سن چکے ہیں۔ اس لئے ان کے نوافذان میں دونوں مضمونوں کا اقتراں اسی وقت ہو جائے گا۔ اور جو لوگ ایسے نہیں تب بھی چونکہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، دونوں ہاشاعت کے بعد دیکھتے وقت ان کا اقتراں ہو جائے گا۔ اور چونکہ یہ حدیث (جو شروع و عظیم پڑھی گئی ہے) اس کے لئے کافی تھی اس لئے اس حدیث کو اس وقت اختیار کیا گیا۔

سو سینٹے! جاہ کے معنی ہیں قدر و منزلت (کافی القاموس) جس کا حاصل اور لازم ہے اثر۔ چونکہ صاحب جاہ کا قلوب میں اثر ہوتا ہے اسی لئے عربیہ نے اس کی حقیقت ملک القلوب بتائی ہے۔ چونکہ اثر کا لفظ مشہور ہے، اس لئے جاہ کو لفظ اثر سے تعبیر کرنا سمجھنے کے لئے زیادہ سہل اور مناسب ہو گا۔ پس میں کہتا ہوں کہ اس حدیث میں اسی اثر مذکور کے متعلق بحث ہے۔ تو اب سمجھ لیجئے کہ مال کے جیسے دو حق ہیں ایک مال کا حاصل کرنا، ایک مال کا صرف کرنا، اور شریعت میں دونوں کے جدا جدا احکام ہیں۔ بعض احکام تحصیل

مال کے متعلق ہیں اور بعض استعمال مال کے متعلق ہیں، اسی طرح اس اثر کے متعلق دو چیزیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اثر کے حاصل کرنے کا کیا حکم ہے۔ ایک یہ کہ اس کے استعمال کا کیا حکم ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ اس کے متعلق بھی احکام میں پھر بھی آج کل اکثر دیکھا جاتا ہے کہ لوگوں میں اس جاہ کے احکام سے زیادہ غفلت ہے۔ بلکہ عجب نہیں کہ بعض لوگ جو شریعت کو صرف نماز روزہ ہی میں منحصر سمجھ رہے ہیں، دل میں یوں کہتے ہوں گے کہ کیا شریعت میں اس کے بھی کچھ احکام ہیں۔

تذقی کی حقیقت | صاحبو! مصیبت یہ ہے کہ ہمارے گھوٹے سب کچھ ہے مگر ہمیں خبر نہیں۔ اس لئے کثرت سے

احکام کی خبر نہیں۔ اسی باب میں ہماری وہ مثال ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں۔ ایک سبد بڑیاں تیار فریق سر تو ہی جوئی لبتاں در بدر ایک شخص روٹیوں کا ٹوکرا سر پر رکھے ہوئے ہے اور در بدر یوں کہتا پھرتا ہے کہ خدا کے واسطے ایک ٹکڑا دے دو۔ میں بھوکا ہوں حالانکہ ٹوکری میں اتنی روٹیاں ہیں کہ اگر یہ شخص سارے محلہ میں تقسیم کر دے جب بھی مکی نہ پڑنے مگر اس کو خبر نہیں۔

یہ ایسی ہماری حالت ہے کہ ہمارے قانون شرع میں سب ہی کچھ موجود ہے یعنی ضروریات دیں مگر ہمیں خبر نہیں۔ اور یہ قید ضروریات کی اس لئے لگائی کہ شاید سب ہی کچھ کا لفظ سن کر کسی کو یہ خیال ہو کہ پھر شریعت کے علم سے ہم کو ریل چلاتا بھی آجاتے گا۔ اس میں اس کی ترکیب بھی لکھی ہوگی کہ

اس طرح اوزار ڈھالو اور ایسے انجن بناؤ، گاڑیاں تیار کرو۔ اس قید سے یہ چیزیں خارج ہو گئیں و مطالب یہ کہ دین کے متعلق جتنی باتیں ہیں وہ شریعت میں سب موجود ہیں، باقی یہ گمان جو بعض لوگوں کا ہے کہ شریعت میں تجارت کے طریقے بتلائے گئے ہیں کہ اس طرح کھاؤ، کارخانے جاری کرو، محض غلط ہے۔

چنانچہ اس مذاق کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن شریف نے دنیا کمانے کے متعلق بھی سب کچھ سکھایا ہے۔ ان میں ایک قوم وہ بھی ہے جس کو قرآن شریف میں صرف یہی حکم پسند آیا ہے احل اللہ البیع کہ اللہ نے بیع یعنی تجارت کو حلال کیا ہے جس میں سب ذرائع تجارت کے آگئے۔ کھلے بانسوں نے یہ نہ دیکھا کہ جیسے احل اللہ البیع فرمایا اسی طرح و حرم الربوا بھی تو قرآن ہی میں موجود ہے اور اسی جگہ موجود ہے۔

ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک سرلیں سے کسی نے پوچھا تھا کہ بھائی تمہیں قرآن شریف میں کون سا حکم پسند ہے تو اُس نے کہا کھلوا و شجروا کہ کھاؤ اور پیو۔ پھر پوچھا کہ دُعا کون سی پسند ہے تو کہا، ربنا انزل علینا مائدة من السماء کہ اے ہمارے رب ہمارے اوپر آسمان سے خوان نازل فرما۔

تو جیسے اس سرلیں کو تمام احکام میں سے کھانے اور پینے ہی کا حکم پسند آیا تھا اور تمام دعاؤں میں سے کھانے پینے ہی کی دُعا پسند آئی تھی اسی طرح اُن کو صرف احل اللہ البیع ہی پسند آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں ترقی کی

اجازت دی ہے۔ یہ ساشیہ پڑھایا ہے قرآن شریف پر۔ اور ترقی کے معنی
 بھی وہ لئے جو انہوں نے خود ہی سمجھے ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ شریف
 نے ترقی کی اجازت دی ہے مگر سوال یہ ہے کہ ترقی کے معنی کیا ہیں۔ آیا وہ
 جو انہوں نے سمجھے ہیں یا کچھ اور۔ اگر ترقی کے صحیح معنی بیان کئے جائیں گے
 تو ہم تسلیم کریں گے کہ شریعت نے اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن کسی چیز
 کا نام ترقی رکھ لینے سے اس کی حقیقت ٹھوڑا ہی پائی جائے گی۔ کوئی شراب
 کا نام شراب الصالحین رکھ لے تو اس سے وہ حلال ٹھوڑا ہی ہو جائے گی۔ کئی
 گل جس چیز کا نام ترقی رکھا گیا ہے اس کی حقیقت ہے حرم طول امل، خود غرضی
 اور قطع نظر شریعت سے یہ چیزیں تو عقلاً بھی ناجائز ہیں۔ مگر لوگوں نے حرم وغیرہ
 کا ایک خوبصورت نام ترقی رکھ لیا مگر صرف نام رکھ لینے سے کیا ہوتا ہے
 اس سے حقیقت تو نہ بدلے گی۔

میں اس کو مفصل بیان کرتا مگر یہ جلسہ اس کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے
 خاص طور پر مستقل جلسہ کی ضرورت ہے لیکن میں اجمالاً ایک مختصر بات کہتا ہوں
 وہ یہ کہ عقلاً و اول اس کا فیصلہ کر لیں کہ ترقی کی حقیقت کیا ہے۔ پس خوب سمجھ لو
 کہ ترقی کی حقیقت وہی ہے جس کی قرآن شریف اجازت دیتا ہے یعنی حلال
 طریقہ سے بڑھنا کیونکہ دو حال سے خالی نہیں کہ جائز ترقی محدود ہے یا غیر محدود
 ہے۔ اگر محدود ہے تو اس کی حدود بیان کیجئے اور انشاء اللہ شریعت سے
 بہتر اس کی حدود کوئی بھی نہ بیان کر سکے گا۔ اور اگر غیر محدود ہے یعنی اس میں کوئی
 قید نہیں ہے۔ اگر اس میں مضرتیں بھی ہوں تو اس کی بھی اجازت دی جاوے

تو کیا خدا تعالیٰ سے جو کہ بوجہ علیم وخبیر ورحیم و حکیم ہونے کے سبب سے زیادہ
 نصائح عباد کی رعایت فرماتے ہیں اس ترقی غیر محدود کی اباحت کی توقع رکھ سکتے
 ہو حالانکہ گورنمنٹ سے بھی جس کی نظر نصائح کو اس قدر محیط نہیں تم اس کی توقع
 نہیں کر سکتے۔ دنیا کی ہر گورنمنٹ صرف محدود ترقی کی اجازت دیتی ہے اور
 آپ کو مفید بناتی ہے ترقی غیر محدود کی کوئی گورنمنٹ اجازت نہیں دے سکتی
 تو خدا تعالیٰ کو یہ حق نہیں کہ وہ آپ کو مفید کریں اور اگر کوئی عدم اساطہ واقعات
 کے سبب یہ کہے کہ گورنمنٹ تو غیر محدود ترقی کی اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ
 بہت سے ذرائع غیر مشروع کی قانون میں اجازت ہے تو چاہے آج سے ڈکیتی
 کیجئے، دوسروں کے مال چھین چھین کر خوب اپنا مال بڑھا لیجئے۔ اس کے بعد اگر
 آپ عدالت میں پکڑے ہوئے جاویں تو صاف کہہ دیں کہ ہم ترقی کرتے
 ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا عدالت اس کو قبول کرے گی۔ اگر نہیں قبول کرے گی، تو
 پھر ثابت ہو گیا کہ گورنمنٹ نے ترقی کی یہ حد قائم کی ہے کہ ڈکیتی نہ ہو پتوری
 نہ ہو غصب نہ ہو۔

پس جب گورنمنٹ ترقی کے لئے حدود قائم کر سکتی ہے تو کیا خدا تعالیٰ
 حدود قائم نہیں کر سکتے۔ افسوس ہے کہ گورنمنٹ سے تو غیر محدود ترقی کی امید نہ
 رکھیں اور حق تعالیٰ کی طرف سے یہ امید ہو کہ ترقی غیر محدود کی اجازت دیں اور اگر
 ترقی غیر محدود مطلوب ہے تو اجازت دیجئے کہ میں آپ کا کرتہ اتار لوں اور
 آپ کا مکان اور جاڑا چھین لوں۔ کیونکہ آپ کے نزدیک ترقی کے لئے
 کوئی حد تو ہے ہی نہیں۔ اگر آپ کو یہ گوارا ہو تو میں ادب سے عرض کروں گا

کہ آپ میرے خطاب کے قابل نہیں، ایسا شخص تو مجنون ہے جس کو ڈاکٹر سے جنرل
 ڈاکٹر ٹیفیکس لینا چاہئے۔ عرض یہ کہ ترقی اور تمدن کی حقیقت اتنی ہی ہے
 جتنی شریعت نے اجازت دی ہے۔ اور اس میں شریعت نے تنگی نہیں
 شریعت نے اجازت دی ہے ترقی کی مگر اس کے حدود ہیں۔

قرآن فہمی

میں اس کو عرض کر رہا تھا کہ شریعت میں ضروریات دین
 مذکور ہیں۔ ان ضروریات میں خصوصاً جاہ کے متعلق بھی
 تھا۔ اس کے لئے بھی شریعت کے احکام ہیں۔ اس پر ایک سوال کے جواب
 میں کہ کیا جاہ کے متعلق بھی احکام ہیں، یہ گفتگو درمیان میں آگئی تھی کہ ہاں احکام
 سب چیزوں کے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ ہمیں خبر نہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے
 قرآن شریف کو ہم نے اس نظر سے دیکھا ہی نہیں کہ اس میں کس کس چیز کی تعلیم
 ہے۔ پس اس میں سرسری نظر سے یہی دیکھ لیا کہ نماز روزہ ہے۔ چہرہ دوزخ
 کا بیان ہے۔ لوگوں نے ساری شریعت کا یہی حاصل سمجھ لیا اور یہی خلاصہ نکال
 لیا۔ حالانکہ قرآن میں ضروریات میں سے سب کچھ موجود ہے مگر قرآن کا سمجھنا
 ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

نہ ہر کہ آئینہ دار و سکندری داند نہ ہر کہ چہرہ برافروخت لبری داند
 یہ کافی نہیں کہ ترجمہ دیکھ لیا اور قرآن کو سمجھ لیا۔ قرآن کا سمجھنا خاص درجہ
 کے علماء کا کام ہے۔ وہ درجہ حاصل کرے تو معلوم ہو کہ اس میں سب کچھ ہے
 مگر فہم کی ضرورت ہے ورنہ بد فہم لوگوں نے محض ترجمہ دیکھ کر تو بہت سی باتیں
 کا مدلول غلط سمجھ لیا ہے۔

مثلاً ایک آیت ہے۔

فلیضحکوا قليلاً وليبکوا كثيراً
کہ ہنسنا کم چاہئے اور رونا بہت
چاہئے۔

اس سے ہنسنے اور رونے کا حکم ثابت کیا ہے کہ رونا افضل ہے ہنسنے سے
حالانکہ اس آیت کا یہ مدلول نہیں۔ یہ آیت منافقین کے بارہ میں ہے۔ انہی کے
متعلق پہلے سے بیان چلا آ رہا ہے۔ فلیضحکوا میں ہمد کی ضمیر منافقین کی طرف
ہے اور یہ خبر ہے بصورت انشاء اور حاصل ترجمہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں ٹھوڑے
دونوں ہنسنے رہیں۔ پھر قیامت میں زیادہ روتیں گے۔ اس آیت میں منافقین کی
آخری حالت بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ دنیا میں کچھ دنوں کو ہنس لیں پھر آخرت
میں رونا ہی رونا ہے۔ یہ مطلب تھا آیت کا، نہ یہ کہ رونے کی فضیلت اور
ہنسنے کی مذمت۔ جیسا آج کل کے مدعی سمجھتے ہیں اور قلیلاً سے دنیا کی زندگی
مراد ہے اور اس کے مقابل کثیراً سے آخرت کی زندگی مراد ہے مطلب یہ
ہے کہ آخرت میں خوب دل کھول کر روؤ گے اور ہنسنا کبھی نصیب نہ ہوگا جزاء
بہ اکالوا لعلون خود اس کا قرینہ ہے۔ عزمین یہ آیت آخرت کے متعلق ہے
فلیضحکوا وليبکوا امر ہے لفظاً اور خبر ہے مستثنیٰ۔

مگر مصیبت تو یہ ہے کہ لوگوں نے ذرا سی آیت دیکھ لی اور نتیجہ نکالنا
شروع کر دیا۔ نہ ماقبل کی خبر ہے نہ مابعد کی۔ اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ قرآن
کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔

اسی طرح ایک اور آیت ہے ولن يجعل الله للحا فرین علی المؤمنین

سبب سے۔ بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ کافر مسلمانوں پر کبھی غالب نہیں آئیں گے۔ پھر اس پر بڑا اشکال کہ قرآن شریف میں تو یہ ہے اور واقعہ اس کے خلاف ہے۔ وہ یہ کہ کفار کو بہت دفعہ دنیا میں مسلمانوں پر غلبہ ہوا ہے جس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ مشاہدہ کا کیا انکار۔ مگر حقیقت میں آیت کا یہ مطلب ہی نہیں جو سمجھا گیا ہے۔ یہ آیت دنیا کے متعلق ہے ہی نہیں، یہ تو آخرت کے متعلق ہے۔ کیونکہ اوپر ذکر منافقین کا ہے۔ ان کا ذکر کر کے فرماتے ہیں۔ فاللہ یحکم بینکم یوم القیمۃ طویل یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیل۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت میں فیصلہ کے وقت ڈگری مؤمنین کی ہوگی اور منافقین کی نہیں گے خود فاللہ یحکم بینکم یوم القیمۃ طبت لہا ما ہے کہ یہ حکم آخرت کے متعلق ہے یعنی قیامت میں جب مقدمہ پیش ہوگا تو اس میں مسلمان مغلوب نہ ہوں گے۔ اب کوئی اشکال نہیں۔

اب میں اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ شریعت میں جاہ کی حدود

جاہ یعنی جاہ کا حاصل کرنا اور ایک بذل جاہ یعنی اس کا صرف کرنا۔ جیسے مال میں دو درجے تھے۔ ایک اس کا حاصل کرنا اور ایک اس کا صرف کرنا اور اس کا جامع فیصلہ یہ ہے کہ جاہ کے چند مراتب ہیں۔

ایک مرتبہ یہ ہے کہ جاہ بدو ن حاصل کیے حاصل ہو گئی ہے وہ تو خالص نصرت ہے خدا تعالیٰ کی۔ جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کی جاہ ہوتی ہے کہ وہ خود گرتے چلے جاتے ہیں اور اپنی اختیار کرتے ہیں مگر وہ جتنے گرتے

ہیں اُتے ہی بلند ہوتے ہیں۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے۔
 من تواضع لله رفعه الله۔ کہ جو شخص اللہ کے واسطے تواضع

اختیار کرے گا، اللہ اُس کو بلند کرے گا۔

اس کو جو جاہ ملی ہے اُس نے خود حاصل نہیں کی بلکہ اللہ کی طرف سے
 ملی ہے۔ اس جاہ کے مخالف نعمت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔
 ایک یہ صورت ہے کہ جاہ اُس نے تو حاصل کی نہیں یعنی اس کے اسباب
 کا استعمال خود اُس نے نہیں کیا مگر دوسروں نے کیا ہے اور اُس سے اس کو
 جاہ حاصل ہو گئی۔ مثلاً سچا آدمیوں نے مل کر اس کو بادشاہ بنا دیا۔ اب یہاں
 جاہ تو حاصل ہوئی اسباب سے مگر اُس نے وہ اسباب جمع نہیں کئے بلکہ اور
 لوگوں نے اسباب جمع کر کے اس کو بادشاہ بنا دیا ہے۔

پہلی صورت اور اس صورت میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں تو اسباب
 ظاہری جمع ہی نہیں کئے گئے نہ اس کی طرف سے نہ اوروں کی طرف سے
 بلکہ محض وہی طور سے جاہ مل گئی۔ اور یہاں گو اُس نے اسباب کو جمع نہیں کیا
 مگر دوسروں نے تو جمع کیا ہے

دوسرا فرق یہ ہے کہ اس صورت میں صاحب جاہ انکار کرنے سے جاہ
 سے بچ سکتا ہے بخلاف پہلی صورت کے کہ وہاں بچ نہیں سکتا کیونکہ وہ غیر
 اختیاری ہے اور یہاں قبول کرنا نہ کرنا اختیار میں ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ
 اس کو اس جاہ سے متمتع ہونا جائز ہے مگر وہ باتوں کا دیکھ لینا ضروری ہے۔
 ایک تو یہ کہ دوسروں کو راحت پہنچا سکے گا یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنا دین تو

کسی سال میں برباد اور تباہ نہ ہوگا۔ ان دونوں باتوں پر نظر کر کے اس جاہ کا قبول کرنا اور اس سے تقنع ہونا جائز ہے۔ اور اگر یہ شرطیں نہ پائی جاویں تو قبول کرنا حرام ہے۔

تیسری قسم جاہ کی یہ ہے کہ نہ کسی نے بادشاہ بنا یا ہے نہ قدرتی طور پر جاہ لی ہے بلکہ خود کوشش کرتا ہے جاہ کے حاصل ہونے کی جیسے عالمگیر نے حصول سلطنت کی کوشش کی تھی۔ اس کا حکم یہ ہے کہ بجز خاص خاص حالات کے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

بلکہ اصل قانون تو یہ ہے کہ اپنے لئے خود حکومت اور شریعت کوئی منصب تجویز کرنا اور اس کی خواہش

کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی میں سب عہدے حکومت کے داخل ہیں در حالیکہ وہ فی نفسہ شرفاً جائز بھی ہوں۔ سو جائز ہونے کی صورت میں بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی خواہش کی جائے کیونکہ حکومت کی درخواست اور خواہش کرنا جائز نہیں ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو حکومت کی درخواست کرے ہم اس کو کبھی حکومت نہ دیں گے۔ راز اس میں یہ ہے کہ حکومت بڑی ذمہ داری کی چیز ہے اور بڑا بوجھ اٹھانا ہے۔ اگر دس پر حاکم ہے تو دس کا بوجھ اٹھانا اور پچاس پر حاکم ہے تو پچاس کا بوجھ اٹھانا اور ایک پر حاکم ہے تو ایک کا بوجھ اٹھانا ہے اور یہ بوجھ اٹھانا اور ان کی راحت کی فکر کرنا نہایت دشوار کام ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ ایک مقام پر پہنچے۔ آپ کو ایک خیمہ جنگل میں نظر آیا
 آپ اس خیمہ کے باہر کھڑے ہو گئے۔ دیکھا کہ اُس میں بچوں کے رونے کی
 آواز آ رہی ہے۔ اور گو یہ تحسین تھا مگر امام وقت کو تفتیش اور تحسین جائز ہے۔
 دوسرے کو جائز نہیں۔ عرض آپ کو معلوم ہوا کہ ایک خاندان باہر سے آکر
 ٹھہرا ہے۔ اُن کے بچے بھوک سے چلا رہے ہیں۔ کھانے کو کچھ نہیں ہے۔
 بی بی نے ایک خالی دیگی پڑھا رکھی ہے اور بچوں سے کہہ رہی ہے کہ سو جاؤ
 کچھ دیر میں کھانا پکا کر تمہیں اٹھالیں گے۔

اس حالت کو دیکھ کر آپ بے حد دلگیر ہوئے۔ پھر آپ اُن کے سامنے
 کھڑے ہو گئے۔ وہاں کوئی فنیشن تو تھا نہیں جس سے شناخت ہوتی معمولی وضع
 سے جو کھڑے ہوئے تو کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کون ہیں۔ آپ نے اُن سے
 خود فرمایا کہ عمر کے پاس جا کر اپنے حال کی اطلاع کرو۔ وہ تمہیں کھانے پینے کا
 سامان دیں گے۔ تو وہ عورت کہتی ہے سبحان اللہ! یہ ہمارے ذمہ ہے یا
 اُن کے ذمہ ہے کہ وہ خود ہماری خبر رکھیں۔ اُنہوں نے خلافت کیوں اختیار کی
 ہے جب اُن سے انتظام نہیں ہو سکتا۔ آپ نے کہا کہ عمر غیب دان نہیں
 ہے۔ ایک شخص تمام باتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اُس عورت نے کہا کہ پھر کیوں
 خلافت کا منصب اختیار کیا ہے چھوڑ دیا ہوتا۔ بس یہ سن کر آپ واپس ہوئے
 اور رات ہی کو بیت المال کا فضل کھولا۔ اور کچھ اٹھا اور تحسین اپنے
 ساتھ لیا۔ غلام نے کہا کہ یہ سامان میرے حوالے کیجئے۔ میں لے چلوں گا۔ تو
 آپ فرمائے ہیں۔

لائزر وزارت ذرا خسی فرمایا یہاں کا بوجھ اٹھانا سہل ہے آخرت کا بوجھ اٹھانے سے۔

آپ نے کہہ میں پہنچے اور ان سے کہا کہ اس کو کھا ڈیو۔

میں نے ایک تاریخ میں دیکھا ہے کہ اسی طرح آپ شب کے وقت ایک بار گشت کرتے پھر رہے تھے۔ ایک خیمہ دیکھا اور اس میں سے درونگ آواز سنی۔ تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ ایک عورت کے دروازہ پر آپ نے کہا کہ تم نے کسی وایہ کو نہیں بلایا۔ وہ لوگ بولے ہم پر ویسی ہیں ہمارے پاس کون ہے بلا نے والا۔ میں آپ فوراً اپنے گھر گئے اور اپنی بیوی کو وہاں لائے اور ان سے کہہ دیا کہ یہ ظاہر نہ کرنا کہ میں خلیفہ کی بیوی ہوں۔ اس کے جملانے کی ضرورت نہیں ہے۔ غرض یہ کہ بچہ پیدا ہوا اور ان کے منہ سے بے اختیار یہ کلمہ نکل گیا۔

ابشعریا امیر المؤمنین بشارت ہو آپ کو یا امیر المؤمنین!

اس سے ان لوگوں کو پتہ چل گیا کہ یہ امیر المؤمنین ہیں۔ خیال تو فرمائیے کہ یہ خلیفہ کی بیگم ہیں۔

میں حاکم ہونے کا اس کو حق ہے جو دوسرے کی راحت رسائی کی اپنی ذمہ داری کر سکے۔ مذہب کہ نام لکھا لیا اور حاکم ہو گئے۔ حاکم پر بڑی ذمہ داری ہے اور بڑی مشقت ہے جس کو کوئی شخص خوشی سے اپنے لئے گوارا نہیں کر سکتا پھر باوجود اس کے جو شخص در خواست کر رہا ہے حکومت کی تو ظاہر ہے کہ اس کی غرض جلب مال اور جلب جاہ وغیرہ ہے۔ راحت رسائی خلق مقصود

نہیں۔

مثلاً ایک ریٹس ہیں جو تحصیلدار بنے ہوئے ہیں۔ حالت ان کی یہ ہے کہ کسی کو جیل خانے بھیج دیا، کسی پر جرمانہ کر دیا، کسی کے بید لگا دیئے۔ باوجودیکہ اپنے گھر کی آمدنی پانچ سو اور ہزار ماہوار کی ہے مگر پھر درخواست ہے تحصیلدار اور ڈپٹی کلکٹری کی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جلب جاہ یا جلب مال مقصود ہے اور کچھ بھی نہیں اور اکثر عریا کو حکومت سے جلب مال مقصود ہوتا ہے اور امراد کو جلب جاہ۔ اور حکومت کے حقوق سینے۔

حضرت عمرؓ نے انتظام کیا تھا کہ میری خلافت میں بنی عدی میں سے کوئی حاکم نہ بنایا جائے (بنی عدی حضرت عمرؓ کا قبیلہ اور خاندان ہے) کیونکہ وہ میرے اثر سے دوسروں کو شناسکتا ہے مگر ایک شخص کو بیعت کی وجہ سے حاکم بنا دیا تھا۔ اُس نے کچھ اشعار کہے تھے جس میں اپنی بیوی کو خطاب تھا کہ واماں میں گے اور عیش و عشرت کریں گے۔ وہ اشعار آپ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے اُس کی حاضری کا حکم دیا اور پوچھا کہ یہ تمہارے اشعار ہیں۔ اُس نے کہا ہاں آپ نے فرمایا کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نیت یہ ہے کہ خوب عیش اڑائیں گے۔ اُس نے کہا کہ حضرت یہ تو نہ بانی شاعری تھی۔ دل سے کوئی واقعی مضمون نہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ زبان پر کسی بات کا تذکرہ اُس وقت تک نہیں آسکتا جب تک دل میں نہ ہو۔ تم قابل حکومت نہیں ہو اور معزول کر دیا۔ اسی واسطے قانون ہے تشریعت کا کہ صاحب عزلین کو حکومت نہ دی جائیگی کیونکہ ایسے شخص کی عرض جلب مال اور جلب جاہ ہوگی۔ راحت رسائی خلق مقصود

نہ ہوگی۔ تو جو مقصود ہے حکومت سے وہ حاصل نہ ہوگا۔

اب لوگ اپنے اپنے دلوں میں سٹول گردیکھ لیں کہ عہدوں کی ذمہ داری
 کرنے سے کیا عرض ہوتی ہے۔ آیا یہ مقصود ہوتا ہے کہ مال و جاہ حاصل ہو
 یہ کہ خلق کو آرام پہنچے۔ اگر یہ ہوتا تو اس کے آثار بھی تو ہوتے۔ جب آثار نہیں
 تو یقیناً مطلوب جاہ و مال ہے اور کچھ نہیں۔ اور اگر سو میں ایک ایسا ہو بھی گیا
 تو وہ کس شمار میں ہے۔ اگر یہ پاست ہوتی یعنی جاہ مقصود نہ ہوتی بلکہ خدمت خلق
 اور ان کی حفاظت اور راحت رسانی مقصود ہوتی تو جو شخص تحصیل داری کر رہا ہے
 اور اس کی وہی ڈپٹی کلکٹری کی جگہ ہوتی تو وہ اس جگہ پر رہتا کیونکہ اس کی عرض
 تحصیل داری میں بھی حاصل ہو رہی ہے (وہ کیا ہے خدمت خلق) بلکہ سب اسپیکر
 میں تحصیل داری سے بھی زیادہ حفاظت کر سکتے ہیں۔ اگر خدمت مد نظر ہے
 تو اسی کو اختیار کرتے کیونکہ مقصود اس میں زیادہ حاصل ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں
 کرتے۔ تو یہ علامت اس کی ہے کہ مقصود خدمت خلق نہیں بلکہ مقصود جاہ
 ہے اور جو تحقیق میں نے ڈپٹی کلکٹری وغیرہ کے متعلق بیان کی، کچھ اسی میں منحصر
 نہیں ہے۔

بادشاہت اور جمہوریت

میں دینی متا سبت والوں کو مشا و اعظمین

کو بھی کہتا ہوں کہ اس میں بھی وہی تفصیل

ہوگی جو اسباب جاہ میں مذکور ہوئی۔ وہ یہ کہ کبھی تو خود و اعظ بنے گا اور کبھی لوگ

بنائیں گے اور اس کے متعلق بھی احکام کی وہی تحقیق ہے جو اوپر آجکی مشا اپنے

طور پر تو خود و اعظ بننا جائز نہیں اور اگر بنا دیا جائے تو جائز ہے۔ حدیث نے

یہی فریضہ کیا ہے۔ حدیث میں ہے لا یقض الا امیرا و مامورا و مختلفا۔ یعنی
 واعظ کون بنے گا ایک امیر یعنی امام المسلمین، ایک اُس کا مامور یعنی جس کو امام المسلمین
 نے اس کام کے لئے تجویز کیا ہو، ایک مختلف یعنی متکبر۔ ریا کار جو یوں سمجھتا ہے کہ ہم
 بڑے ہیں یا بڑا بنتا چاہتے ہیں۔ یہ حدیث دلیل ہے میرے دعوے کی۔ اب آج
 کل کے واعظین سوچ لیں کہ آیا آپ کو کسی نے واعظ بنا یا ہے یا خود بنے ہیں۔ اگر
 کسی نے بنا یا ہے تو مامور میں داخل ہیں اور اگر نہیں بنا یا تو مختلف ہیں۔ کیونکہ امیر نہ
 ہونا تو ظاہر ہے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ تم بھی تو اسی میں داخل ہو تمہیں کس نے واعظ بنا یا ہے؟
 اس لئے تم بھی مختلف ہوئے اور اگر یہی ہے تو کوئی بھی ہندوستان میں واعظ نہ کہے،
 کیونکہ یہاں نہ تو کوئی امیر ہے نہ مامور ہے۔ بس تیسری شق رہ گئی لہذا سب کے
 سب مختلف ہوئے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اول حدیث کی حقیقت سمجھنا چاہئے۔ اُس سے
 جواب معلوم ہو جائے گا۔ سو اس کے لئے ایک مقدمہ سمجھئے۔ وہ یہ کہ بادشاہ کے
 جو اختیار تھے اُس کی حقیقت کیا ہے۔ اُس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ میزان کل
 ہے تمام رعایا کے اختیار کی یعنی فراوی فراوی جو اختیار تھے رعایا کو تھے
 سب کی میزان بادشاہ کو سپرد کر دی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ بادشاہ کے اختیار
 مستفاد ہوتے ہیں رعایا سے یعنی عوام الناس اختیار دیتے ہیں بادشاہ کو۔ اب
 چونکہ تمام عوام الناس کا اجتماع تو عادتہً محال ہے اس لئے اُن کے قائم مقام
 اہل حل و عقد ہوں گے۔ نئی اصطلاح میں اس کو پارلیمنٹ کہتے ہیں اور اس میں یہ

ضرور نہیں کہ عوام الناس زبان سے کہیں کہ یہ لوگ ہمارے قائم مقام ہیں۔ بلکہ عوام الناس ان کے ساتھ برتاؤ ایسا کرتے ہیں جس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان کو اپنا پیشوا اور دستور سمجھتے ہیں۔ یہ برتاؤ شہادت اس کی ہے کہ عوام الناس نے ان خواص کو اپنی طرف سے اختیارات دے دیئے ہیں۔ وہ گویا وکیل ہیں عوام الناس کے۔ بس وہ مل کر بادشاہ کو بادشاہ بناتے ہیں اور ان کا بنانا سب کا بنانا ہے۔ بس اہل حل و عقد کی جماعت سب کی قائم مقام ہے۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ خود اختیارات میں مستفید ہے عوام سے اور بادشاہ کے بنانے والے بھی عوام ہی ہیں بواسطہ اہل حل و عقد کے۔ تو بس اہل حل و عقد ہی سب کچھ ہوتے۔ جیسا وہ کریں گے وہی سب کی طرف سے سمجھا جائے گا۔ پس یہاں اگرچہ امام المسلمین کا وجود نہیں ہے، مگر اہل حل و عقد تو موجود ہیں یعنی علماء و صلحاء۔ اس لئے صلحا کا تسلیم کیا ہوا واعظ صحیح سے سے واعظ ہوگا گویا اس کو بادشاہ ہی نے واعظ بنایا ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ اگر بواسطہ ایک فعل صحیح ہے تو بلا واسطہ بدرجہ اولیٰ صحیح ہوگا مطلب یہ ہے کہ جو واعظ بادشاہ کے واسطہ سے بنایا گیا ہے جب وہ صحیح ہے تو اہل حل و عقد کا بلا واسطہ بادشاہ کے کسی کو واعظ بنا دینا بدرجہ اولیٰ درست ہوا۔ بس فیصلہ یہ ہوا کہ جس کو صلحاء و اتقیا و وعظ کے لئے تجویز کریں وہ مامور میں داخل ہو جائے گا اور اس کو وعظ کہنا جائز ہوگا اور جس کو یہ جماعت تجویز نہ کرے اس کو وعظ کہنا جائز نہیں ہوگا۔ اگر اس میں عیب نظر ہو تو جو گمراہی پھیل رہی ہے قوم میں وہ سبب جاتی رہے۔ مگر آج کل تو کوئی معیار ہی نہ رہا۔ ہر شخص

واعظ ہے مقتدا ہے۔

دیوبند میں ایک نابینا صاحب تشریف لائے۔ آنکھوں

جاہل واعظ

کے تو اندھے تھے ہی دل کے بھی اندھے تھے۔ سورہ جمعہ

میں جو ان کسبہ تعلمون ہے اس کا آپ نے عجیب ترجمہ کیا۔ وہ یہ ہے کہ اے لوگو! بہتر ہے تمہارے لئے کہ تم لا لگا کر جمعہ کی نماز کو چلے جایا کرو آپ نے تعلمون کو تالا موند سمجھا۔ اس کا یہ ترجمہ کیا۔ میں بھی اس جلسہ میں موجود تھا اور مولانا رفیع الدین صاحب بھی موجود تھے۔ مولانا نے دھمکا کر واعظ کہنے سے منع فرمایا۔

ایک اور حکایت ہے کانپور کی کہ مدرسہ جامع العلوم میں ایک واعظ صاحب تشریف لائے اور سورہ الرحمن کے تیسرے رکوع کا واعظ شروع کیا جتنا لو تو جنتن پڑھا اور یہ ترجمہ کیا کہ جنت میں ایک ایک تخت کا پاپا ہزار ہزار کوس کا ہوگا۔ کوس بڑے شین سے فرمایا پھر اس کی تفسیر بھی فرمائی۔ کہ ایک کوس ہوتا ہے چھوٹے شین سے، وہ چھوٹا ہوتا اور ایک کوش ہوتا ہے بڑے شین سے وہ بڑا ہوتا ہے۔ اور بھی بہت واہی تباہی روایات غلط بیان کیں۔ بے چارے کو اس واعظ میں ایک آہ ملا۔

میرے چھوٹے ماموں صاحب حکایت بیان کرتے تھے کہ ایک جامع مسجد میں ایک جاہل پہنچا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں واعظ بھی ہوا کرتا ہے معلوم ہوا کہ نہیں ہوتا۔ تو بعد نماز کے خود ہی پکارا کہ صاحبو! اس وقت وارج (واعظ) ہوگا اور نماز کے بعد واعظ کے لئے منبر پر جا بیٹھے۔ تو آپ نے شین کو شین پڑھا۔ یہاں تک بھی

تعمیرت تھا۔ ترجمہ کیا تو نور علی نور۔ ترجمہ یہ کہ اے محمد اے محمد! اگر تو نہ ہوتا تو آسمان وزمین کچھ نہ ہوتا۔ یہ ترجمہ لیسین کا کیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ بھائیو تھکے ماندے ہیں اس لئے ادھا و عظ آج کہا ہے ادھا کل ہوگا۔ اس جلسہ میں ایک نابینا عالم بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا ذرا ان واعظ صاحب کو میرے پاس لانا۔ جب وہ آئے تو ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر فرمایا کہ آپ کی تحصیل کہاں تک ہے تو ان کہتے ہیں کہ ہمارا ہی تحصیل ہے لا پور۔ اتنے بڑے عالم تھے اور وعظ فرماتے تھے وہ بولے کہ مولانا میں حکومت کی تحصیل کو نہیں پوچھتا بلکہ یہ پوچھتا ہوں آپ نے پڑھا کیا کیا ہے۔ تو آپ فرماتے ہیں ہم نے سب کچھ پڑھا ہے وفات نامہ ساپن نامہ، ہرنی نامہ اور اس کے بعد کہا اور تو کیا جانے اندھے۔ حالت تو ان کی یہ گھنٹی اور بڑے خوش تھے کہ ہم واعظ ہیں۔

حضرت یہ واعظین کی آج کل کیفیت ہے۔ بعض لوگ لفاظ ہوتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھے لکھے ہیں۔ ان کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کون سی بات صحیح ہے کون سی غلط۔ بس روپے سیرھے کرنے کے لئے وعظ کہتے ہیں شہر نے اس کا بھی فیصلہ کیا ہے کہ واعظ کون ہو سکتا ہے۔ جس کی تفصیل میں نے عرض کر دی ہے۔

کنزہ ناتراش پیر | اسی طرح پیر بن جانا بھی ہے اس میں یہی شرط ہے کہ مامور ہو یعنی کسی شیخ کامل نے اس کو اجازت نہ ہو بیعت کرنے کی۔ مگر آج کل تو یہ حالت ہے پیری مریدی کی۔ زبان سے واہی تباہی کہتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ فقیری کے راز بیان ہو رہے ہیں۔

داراشکوہ کا قصہ سنا ہے کہ اُس نے ایک شاہ صاحب سے پوچھا کہ جناب کی عمر کتنی ہے۔ کہا کہ جب تمہارے دادا صاحب کی لڑائی محمد صاحب سے ہوئی تھی تو فقیر کی اتنی عمر تھی۔ سعد اللہ خاں وزیر نے کہا، ماشاء اللہ آپ مورخ بھی بہت بڑے ہیں۔ داراشکوہ بولے، ایسا نہ کہو، بزرگوں کے اسرار ہوتے ہیں یا اور کسی کا قصہ ہو۔

کاندھلہ میں ایک شاہ صاحب اُسٹے۔ مولانا مظفر حسین صاحب، اُن سے ملنے گئے۔ شاہ صاحب کہنے لگے کہ مولوی صاحب! تنہائی میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھوں گا۔ مولوی صاحب نے دل میں کہا کہ خدایا جانے نصرت کا کون سا وقت مسئلہ پوچھیں گے۔ اب سینے شاہ صاحب کیا مسئلہ پوچھتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ محمد صاحب کی جو اتنی شہرت مشرق و مغرب میں ہوئی ہے وہ کس کے مرید تھے۔ کیا پڑے پیر صاحب سے آپ نے بیعت، کر لی تھی۔ مولوی صاحب نے کہا، کم نجرت! فقیر بنا پھرتا ہے۔ لوگوں کو بہکاتا پھرتا ہے۔ ملعون تو کیسا مسلمان ہے؟ تجھ کو اتنی شہرت بھی نہیں کہ بڑے پیر صاحب تو حضورؐ کی اولاد ہیں اور آپ کے اُمّتی ہیں۔ عرض قصہ سے نکلوا دیا۔

ایک صاحب قنوج میں تشریف لائے۔ لوگوں کو مرید کرنا شروع کر دیا اور سب کو یہ تعلیم کی کہ نماز میں قرأت زبان سے مرت پڑھو۔ دل میں خیال کر لیا اور ساتھ ہی یہ بھی تاکید تھی کہ کسی سے کہنا نہیں۔ عرض لوگوں کی نمازیں خوب تباہ کیں! آخر کسی طرح وہاں کے رؤساء کو خبر ہو گئی تب اُس کو نکلوا دیا۔

عرض پیری مریدی کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ اس کا کوئی صحیح معیار ہی نہیں

رہا۔ صرف معیار یہ رہ گیا ہے کہ جس طرف مخلوق جا رہی ہے اسی طرف ہولٹے۔

اشعوب طماع کا قصہ ہے کہ لڑکے اُن کو بہت چھیڑا کرتے تھے۔ جب

زیادہ پریشان ہو جاتے کہہ دیتے کہ یہاں کیا رکھا ہے فلاں امیر کے گھر مٹھائی

تقسیم ہو رہی ہے یا کھانا بٹ رہا ہے وہاں جاؤ۔ لڑکے یہ سن کر امیر کے گھر

کی طرف دوڑتے تو کچھ دیر میں آپ بھی اسی طرف کو دوڑتے۔ کوئی کہتا کہ میرا

تم کیوں چلے۔ تو کہتے کہ شاید مٹھائی تقسیم ہی ہو رہی ہو کیونکہ لڑکے بھاگے جا

رہے ہیں۔ حالانکہ آپ ہی نے اُن کو بھگا یا تھا۔

یہی حال یہاں ہے کہ عوام الناس کہہ دیتے ہیں کہ جب اتنے آدمی اُس

کے پاس جاتے ہیں تو پیر میں کچھ تو ہوگا اور پیر صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ جب اتنے

آدمی میرے معتقد ہیں تو میں بھی کچھ ہوں گا۔ حالانکہ خود ہی اُن کو دھوکا دیا ہے۔

مگر خود بھی اپنے دھوکا میں آگئے۔ آج کل بزدلی کا معیار اکثر تو یہ رہ گیا ہے کہ

بڑے بڑے لوگ جس کے مرید ہوں تو بس وہ پیر ہے یا جس کو کشف ہوتا ہو وہ

پیر ہے۔ اگر کشف ہی پر دار و مدار ہے تو شیطان کو ایسا کشف ہوتا ہے کہ بڑوں

بڑوں کو بھی نہیں ہوتا۔

دیکھتے بدر میں بڑے بڑے صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے

شیطان بھی کفار کے لشکر میں تھا اور اُن سے آکر کہا کہ میں تمہارا حامی ہوں۔ لوگ

کوئی سرور سمجھے۔

فلما تراءت الفتنان نكص على عقبيه وقال انى برى

منكم انى ادى مال لترون۔

کہ جب دونوں جماعتیں مقابل ہوئیں اور فرشتوں کا نزول ہوا تو شیطان صاحب گھبرا گئے اور کہا کہ مجھے ایسی ایسی چیزیں نظر آتی ہیں کہ تمہیں نظر نہیں آتیں۔ یہ حالت دیکھ کر شیطان تو بھاگ گیا اور بہت سے کفار کے بھی قدم اکھڑ گئے۔ اب دیکھ لیجئے کہ بہت سے صحابہ تو فرشتوں کو نہ دیکھ سکے اور شیطان نے دیکھ لیا۔

قبر میں جب عذاب ہوتا ہے تو جانوروں کو معلوم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتوں اور بلیوں کو کشف قبور ہوتا ہے۔ مگر آج کل پیری کی یہ خاص علامت ہے۔ بھلا جو چیز حیوانات تک میں مشترک ہو وہ کیسے انسانی کمال ہو سکتی ہے انہیں یہ لوگ اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے۔

بعضوں نے بزرگی کا معیار یہ مقرر کیا ہے کہ تصرف کر کے لوگوں کو لوٹ پوٹ کر دے پس وہ بزرگ ہے۔ اگر یہی معیار ہے تو ایسا تو جوگی بھی کر دیتے ہیں جو کافر محض ہیں بمسمریزم والے کیا کیا نہیں کرتے۔ عجیب عجیب کام کر کے دکھلا دیتے ہیں۔ تو چاہئے یہ سب بھی بزرگ ہو جائیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس سے خرق عادت صادر ہو وہ بزرگ ہے اگر یہی حال ہے تو خرق عادت وصال سے زیادہ کسی سے بھی صادر نہ ہو گی۔ زمین کے خزانے تک نکل کر اس کے ساتھ ساتھ چلیں گے۔ ایک صالح شخص اس کی خدائی کا انکار کرے گا۔ پس وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔ پھر اس کو زندہ کرے گا۔ وہ پھر انکار کرے گا۔ مگر وہ پھر اس پر قادر نہ ہو گا۔ اگر تصرفات اور خوارق دلیل بزرگی کی ہیں تو وصال بڑا بزرگ ہونا چاہئے۔ پس یہ سب معیار تو غلط ہیں۔

شیخ کامل کا معیار

شیخ کامل کے معیار کی چند صفات ہیں۔ ان صفات کو سب سے پہلے دیکھنا چاہئے۔

ایک یہ کہ بقادر ضرورت اس کو علم دین حاصل ہو۔ جاہل محض نہ ہو۔
 دوسرے اس کو علماء سے موانست ہو نفرت نہ ہو۔ اگر پیر جاہل ہے
 اور اس کو علماء سے نفرت ہے تو جب اُسے مسائل کی ضرورت ہوگی، تو اپنی
 رائے پر عمل کرے گا اور گمراہ ہوگا۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ عاقل ہو شریعت پر تتبع سنت ہو، شریعت
 کے خلاف عدوانہ کرنا ہو کیونکہ جو شخص گویا تعلیم پر قادر ہو خود عمل نہ کرتا ہو تو اس
 کی تعلیم میں برکت نہ ہوگی۔

چوتھے یہ کہ کسی شیخ مسلم عند العلماء سے مجازہ بھی ہو۔
 پانچویں یہ کہ اس کی صحبت میں یہ اثر ہو کہ روز بروز دنیا سے دل افسردہ
 ہوتا جاتا ہو اور آخرت کی رغبت بڑھتی جاتی ہو۔

مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔
 کارِ مرداں روشنی و گمراہی ست کارِ دونان حیلہ و بے شرمی ست
 اور مکار پیروں کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

اے بسا ابلہیں آدم روئے سہت پس پیر دستے نباید داد دست
 تو یہ منصب بھی بہت بڑا ہے اس میں بھی وہی تفصیل ہے کہ کسی شیخ کی
 طرف سے مقرر کیا گیا ہو۔ اب تو پیری بھی ایک رسم ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ کسی خاندان
 میں کوئی ان کے بڑے پیر ہو گئے۔ پس ان کی نسل میں پیری چل پڑی۔ جب ان

کسی کو صاحب سجادہ بناتے ہیں تو سب لوگ جمع ہو کر ان کے سر پر پگڑی
 باندھتے ہیں۔ گویا یہ مرید لوگ پیر کو پیر بناتے ہیں کیونکہ پیر کی نسل تو خود پیر ہوتی
 ہے۔ پھر ان کے سر پر پیری کی پگڑی باندھی تو اور زیادہ پیر ہو گئے، پھر ان میں
 اہل ہوتے ہیں وہ تو کسی شیخ کامل کی طرف بغرض اصلاح رجوع کر لیتے ہیں رنہ
 ہندار تو ہیں ہی۔

چنانچہ گنگوہ میں ایک پیر زادہ تھے۔ انہوں نے اپنی بی بی کو مجھ سے بیعت
 لیا۔ کسی نے ان سے کہا کہ تم تو خود پیر ہو خود کیوں نہ بیعت کر لیا۔ انہوں نے
 بیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ ہم تو اس کے پیر ہیں (یعنی کھانے کمانے کے پیر ہیں)
 ہم کہاں سے پیر ہوئے تھے تو بعضے ایسے منصف مزاج بھی ہیں مگر شاذ۔

عزمن حضرت یہ بہت ہی بڑا منصب تھا مگر اس منصب کی اب یہ
 درگت ہو رہی ہے کہ عوام الناس اس کی دستار بندی کرتے ہیں۔ جب دستار بندی
 ہو گئی اور بڑے ہو گئے مگر ہیں جاہل، تو اب ان کو تعلیم حاصل کرنے اور کسی کامل
 کی طرف رجوع کرنے سے عار آتی ہے۔ کیونکہ بڑا ہو کر چھوٹا نہیں ہوا جاتا۔ ایسے
 پیر قابل اس کے ہیں کہ ان کو خیر خواہی سے یہ خطاب کیا جاوے۔

ایسے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی

تارہا ہیں نہ بانٹی کے راہبر شوی

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق

ہاں اے پسر بکوش کہ رونے سے پدر شوی

باقی بدون شرائط کے محض اپنی رائے سے پیر بن جانا خود رانی ہے اور

سلوک میں خود راہی وہ چیز ہے جس کی بابت کہتے ہیں کہ

فکر خود و رائے خود و عالم رندی نیست

کفرست و دین مذہب خود بینی و خود راہی

دیکھئے عارف شیرازی ایسے لوگوں کو کافر کہتے ہیں یعنی کافر طریقت۔

ایسے مشائخ جو حقیقت میں خود راہے ہیں وہ خود و پیر میں حقیقی پیر نہیں۔ ایسے پیر

کی علمی تحقیقات دیکھئے تو قابل دید ہیں۔

ایک ایسے ہی پیر و لفظی کی تفسیر بیان کر رہے تھے و لفظی و اللیل

الے نفس تیری ہی سجاد سزا، ایک مسئلہ وحدۃ الوجود کا ان کو مشن کے لئے مل گیا۔

اس کا وہ ناس مارا ہے کہ خدا کی پناہ۔ وحدۃ الوجود جو حق کے موافق ہے اس

تو کلام نہیں۔ باقی یہ لوگ جو اس کے متعلق تحقیقات بیان کرتے ہیں باطل ہو

کے ساتھ مصدکہ آمیز بھی ہیں۔

ایک ایسے ہی پیر کہتے ہیں کہ وحدۃ الوجود قل یا سے ثابت ہے کہ

نے کہا کہ قل یا سے کیسے ثابت ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ دیکھو قل یا

ایہا الکافرون لا اعبدا ما تعبدون۔ اس میں لا ذائد ہے یعنی اعبدا ما تعبد

ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے کافرو! میں بھی اسی چیز کی عبادت کرتا ہوں تو وہ

کے معبود یعنی بت اور خدا تعالیٰ تعوذ باللہ ایک ہوئے۔ اب ان سے کوئی

کہ دلیل کیا ہے لا کے زائد ہونے کی۔ سو وہ دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؑ نے

وقعہ نماز میں قل یا طہی مٹی تو لا چھوڑ گئے تھے مٹیوں نے اس تبرک سے تو

اس بات کو ظاہر کر دیا کہ لا زائد ہے۔ پھر اس پر یہ شبہ ہوتا تھا کہ وہ تو حالت

س ترک ہو گیا تھا۔ اس کا جواب یہ عطا ہوا تھا کہ برائے نام شراب پی لی تھی تاکہ
حکام مولویوں کے فتویٰ سے بچ جاؤں اور سکر وغیرہ کچھ نہ تھا۔ خدا کی پناہ پھر
ان خرافات کو فقیری کے نکات سمجھتے ہیں۔

نکات پر یاد آیا۔ ہمارے یہاں ایک رئیس تھے قاضی امیر احمد وہ کہتے
تھے کہ میں ایک دفعہ پیران کلیر میں موجود تھا ان کو دو درویشوں نے پکارا، اور
دھرا۔ ان کو خیال بھی نہ ہوا کہ مجھ کو کوئی پکارتا ہوگا۔ پھر پکارا، اور مرے ادھر آ
اس پر انہوں نے پیچھے پھر کر دیکھا کہ آخر یہ کس کو کہہ رہے ہیں تو وہ کہنے لگے کہ
ابے ہم تجھ ہی کو تو بلا رہے ہیں۔ ان کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر کے تماشا دیکھنے
چلے گئے کہ دیکھوں کیا بات ہے جب ان کے پاس پہنچے تو کہا بیٹھ جا، دیکھ
مرشد کا نکتہ سن۔ کہنے لگے کہ جب خدا نے بندوں سے احکام کا اقرار لیا تھا
تو درویش تھے اگلی صف میں اور مولوی تھے پیچھے کی صف میں۔ خدا نے رنعود باللہ
بھنگ بوزہ کا حکم فرمایا تھا۔ چونکہ مولوی دور تھے بھنگ بوزہ کا نماز روزہ سن
لیا اور درویشوں نے بھنگ بوزہ ہی سنا۔ اس لئے ہم اس میں مشغول ہو گئے اور وہ
اس میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد کہا کہ جا مرشدوں کا یہ نکتہ یاد رکھنا، بھولنا مرنے
ایک اور قصہ ہے۔ ایک درویش نے مولوی فیض الحسن صاحب سے کہا کہ
مولوی تبتلا چار مہیم کون سے ہیں۔ وہ اس پہل بات کو سن کر غاموش ہو گئے۔ بقول
شخصیکہ ع جواب جاہلاں باسٹ۔ نموشی

درویش نے کہا کہ نہیں تبتلاتا تو پو غہ مولوی بیت کا اتار کر رکھ اور اس کو فقیر
سے سن کہ چار مہیم کون سے ہیں۔ مولا، محمد، مکہ، مدینہ۔ یہ ہیں چار مہیم اور اس نکتہ کو

یا در کھ۔ بھولیو مرت!

ہمارے ماموں صاحب کہتے تھے کہ ایک فقیر نے ان سے کہا، تمہارے
 کا مرتبہ بڑا ہے یا رزق کا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ
 سے بڑھا ہوا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ بے پیر معلوم ہوتا ہے اور سونٹا
 گھما کر جیسے ان لوگوں کی عادت ہے، کہنے لگا دیکھ، اذان میں سے اشہد ان
 محمد رسول اللہ۔ اس میں ان پہلے ہے اور محمد بعد میں۔ ان رزق کو کہتے ہیں
 لئے رزق کا مرتبہ بڑا ہے۔

یہ تصوف کے محققین ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے ناس کی رکھا ہے لوگوں
 بس یہ عوام الناس کا دیا ہوا منصب ہے کہ چند جاہل باہم جمع ہو گئے اور کسی
 پیر بنا لیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے تو ایسے ہی جاہل پیر پیدا ہوں گے۔ تحقیقی پیر
 طرح ٹھوڑا ہی بنتا ہے۔ میں اسی کو کہہ رہا تھا کہ واعظ اور پیر خود بننا جائز نہیں
 بلکہ کسی محقق کے امر و اذن کے بعد اس منصب کو قبول کرنا جائز ہے

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ حکومت کی خواہش
 در خواست کرنا جائز نہیں۔ بلکہ اسلام

طلب منصب کی صورت

قانون تو یہ ہے کہ طالب التولینہ لایولی۔ جو خود حکومت کی درخواست کرے
 کو حاکم نہ بنایا جائے۔

اس پر اگر کوئی کہے کہ جب اصل قانون یہ ہے کہ خود حکومت کی درخواست
 کرنا درست نہیں اور ہر شخص اس پر عمل کر کے کوئی بھی درخواست نہ کرے اور
 جو درخواست کرے وہ حاکم نہ بنایا جاوے اور دوسروں کو اس کی اہلیت

صلاحیت کی اطلاع نہ ہو تو پھر دنیا کا انتظام کس طرح ہو۔
 اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک استثناء ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی کام
 ضروری ہو اور کوئی اہل موجود نہ ہو اور ظاہراً یہ شخص اس کا اہل ہے اور اس کو امید
 ہے کہ میں کام کر سکتا ہوں۔ ایسے شخص کو درخواست کرنا درست ہے۔ دلیل
 اس کی حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہے کہ جب بادشاہ نے اُن سے کہا
 تھا کہ اتنا بڑا کام یعنی قحط عام کا انتظام کون سر و سرے تو انہوں نے فرمایا کہ میں
 کر سکتا ہوں۔ چنانچہ اُن کا مقولہ یہ ہے کہ

اجعلنی علی خزائن الارض یعنی مجھ کو ملک کے خزانے کے

انی حفیظ علیم خزانوں پر مقرر کر دیجئے۔ میں اس

کی خوب نگرانی کروں گا۔ میں اس کے طریقوں کو جانتا ہوں۔

تو گو اس موقع پر یوسف علیہ السلام اپنی تعریف خود کر رہے ہیں کہ میں ایسا
 ہوں اور ایسا ہوں۔ لاؤ حکومت مجھ کو دے دو مگر آپ کو یہ یقینی طور سے معلوم
 تھا کہ یہ کام ضروری اور عظیم الشان ہے اور انتظام کا اہل کوئی ہے نہیں۔ اس لئے
 آپ نے اس موقع پر تواضع سے کام نہیں لیا اور نہ ساری مخلوق تباہ ہو جاتی۔ بلکہ
 آپ نے اظہار نعمت کے طور پر اپنے واقعی اوصاف بیان فرما دیئے تاکہ بادشاہ
 کو پورا اطمینان ہو جاوے کہ میں یہ کام آپ خوب کر سکتے ہیں۔ آپ کو بھروسہ
 تھا کہ میں اس کام کو بخوبی کر سکتا ہوں۔ اس لئے آپ نے خود درخواست کی
 پس اگر کسی زمانہ میں کسی شخص کو اپنی نسبت یہ معلوم ہو کہ میں اپنے بھائیوں کو راحت
 پہنچا سکتا ہوں۔ اور مخلوق اگر کسی دوسرے کے قبضہ میں پہنچے گی تو راحت نہیں

مل سکتی اور اس کو بھروسہ ہو کہ میں آرام پہنچا سکتا ہوں اور شریعت کے موافق حکومت و انتظام کر سکتا ہوں۔ اور اس کو مال و جاہ کی بالکل پروا نہ ہو۔ تو ایسے شخص کو اب بھی حکومت کی درخواست کرنا جائز بلکہ مستحسن ہے، اور ہمارے نزدیک عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کا اپنی سلطنت کیلئے سعی کرنا بھی اسی وجہ سے صحابہ کی صورت ہو کہ کوئی حاکم نہ ہو تو غیر قوم سے ہو جائے گا اور اس صورت میں مسلمانوں کی برکت گت بتائی جائے گی۔ تو درخواست کرنا حکومت کی اس صورت میں بھی جائز ہے۔ مگر اس میں بھی دو شرطیں ہیں۔

ایک یہ کہ مال مقصود نہ ہو۔

دوسرے جاہ مقصود نہ ہو۔

یہ اور بات ہے کہ مال و جاہ از خود حاصل ہو جاوے مگر مقصود نہیں لیکن اب تو یہ کیفیت ہے کہ مال و جاہ ہی مقصود ہو گئے ہیں۔ حق و ناحق سے بھی کچھ بحث نہیں رہی، نہ اہلیت و عدم اہلیت سے۔

چنانچہ ایک حکایت ہے کہ ایک جاہل بدلیاقت اتریری مجسٹریٹ ہو گئے تھے بوجہ عدم لیاقت کے حیران تھے کہ فیصلے کیسے کروں گا۔ فیصلہ کا طریقہ دیکھنے کسی حاکم کے اجلاس میں پہنچے اور اتفاقاً اس حاکم کے پاس دو شخصوں نے اپنی اپنی عرضیاں پیش کیں۔ حاکم نے ایک کو کہہ دیا منظور اور دوسری کو کہا نا منظور۔ آپ نے اپنے دل میں کہا کہ یہ تو بڑا آسان کام ہے۔ جب یہ اپنے اجلاس میں بیٹھے بہت سی عرضیاں پیش ہوئیں۔ آپ نے کیا کیا کہ ایک کو منظور اور ایک کو نا منظور کرنا شروع کر دیا۔ طاق سلسلہ میں تو منظور اور حجت میں نا منظور بعض لوگ

یامی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ جیسے بعضے مدرس کیا کرتے ہیں۔ کسی طالب علم کا خطا چھا دیکھ لیا۔ بس اور باتوں میں بھی اس کو پاس کر دیا۔ اس میں بڑی خیانت ہوتی ہے۔ حضرت ساری خرابی اس کی ہے کہ کام نا اہلوں کو سونپ دیا گیا ہے۔ اگر کوئی کام کسی کے سپرد کیا جاوے تو اس کی لیاقت اس کو ہونا چاہئے۔

حکومت میں بڑی مشقت اور دلسوزی کرنی پڑتی ہے۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ حاکم اگر فقہ کی

حضور کی بدنی قوت

خلوق کی نفع رسانی کا تو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کے تمام کاموں میں مدد ہوتی ہے مگر دلسوزی کی ضرورت ہے۔ میں تجربہ کی بناء پر کہتا ہوں مشائخ کو بھی، اطباء کو بھی، ماہدہ داروں کو بھی کہ دوسروں کو وہی شخص راحت پہنچا سکتا ہے جو اپنے اوپر تکلیف اٹھائے اور جو شخص خود آرام طلب ہوگا، وہ شخص دوسروں کو آرام نہیں پہنچا سکتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون محبوب ہوگا۔ آپ کے ساتھ صحابہ کی یہ جان تھاری تھی کہ جہاں آپ کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کو تیار تھے۔ آپ کی ذرا سی تکلیف بھی ان کو گوارا نہ تھی مگر باایں ہمہ آپ کو دوسروں کی راحت رسانی کی کتنی فکر رہتی تھی۔ اس کو احادیث سے معلوم کرو۔

ایک دفعہ سفر میں اونٹ کم تھے۔ آپ نے فرمایا کہ سب باری باری اترنے پڑھتے چلو اور سب سے پہلے اس قانون پر حضور نے عمل کیا۔ ہر چہ صحابہ نے عرض کیا کہ آپ نہ اتریں مگر حضور نے نہ مانا اور فرمایا کہ تم مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو اور میں تم سے زیادہ ثواب سے مستغنی نہیں۔ ثواب کی

حاجت مجھ کو بھی ہے۔ کہ پیادہ چلوں اور ثواب ملے، اور میں کچھ کمزور
کہ چل نہ سکوں۔

آپ کے قومی ظاہری بھی سب سے اچھے تھے۔ آپ میں تو
ہی کمال کی صفیں تھیں۔ آپ کی تو شان یہ تھی۔

حسین یوسف و عیسیٰ ید بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ ارشد تو تنہا داری
حضرت کی جسمانی قوت کا یہ حال تھا کہ عرب میں ایک پہلوان تھا کہ
جو کہ ایک ہزار آدمیوں کا مقابل سمجھا جاتا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے اس کو
کی دعوت دی۔ اس نے کہا میں ایک شرط سے مسلمان ہوتا ہوں کہ آپ مجھ
کشتی میں بچھا دیں۔ بھلا کہاں حضور اور کہاں کشتی! آپ نے کشتی کی کہاں تعلیم
تھی۔ مگر آپ نے فرمایا، اچھا۔ چنانچہ کشتی ہوئی اور آپ اس پر غالب آئے
اس نے کہا، ایک دفعہ نہیں بلکہ دوبارہ پھر کشتی ہو۔ اگر یہ بچھاؤ نا اتفاقاً ہونا،
حضور دوبارہ ہرگز منظور نہ فرماتے۔ مگر دوبارہ پھر کشتی ہوئی اور حضور اس دفعہ
بھی اس پر غالب آئے۔ وہ مسلمان ہو گئے اور سمجھ گئے کہ واقعی آپ
من اللہ ہیں۔

عرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں بدنی قوت بھی بہت تھی۔ اس لیے
آپ نے فرمایا میں کمزور نہیں پیادہ چلوں گا۔ عرض آپ دوسروں کی راحہ
کے لئے خود تکلیف برداشت فرماتے تھے۔ آپ کی وراثت میں ایسی
حضرات صحابہ کا تھا۔

دیکھئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ شریف پہنچے

تو آپ جس وقت مجلس میں تشریف فرما تھے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی خدمت میں حاضر تھے۔ لوگ زیارت کو آتے تھے۔ چونکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ذرا زیادہ بوردھے معلوم ہوتے تھے، لوگوں کو حضرت صدیق کی صورت دیکھ کر یہ گمان ہوا کہ حضورؐ یہ ہوں گے۔ اس لئے ان سے مصافحہ کرنے سے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی یہ نہیں کہا کہ مجھ سے نہیں بلکہ حضورؐ سے مصافحہ کرو۔ کیونکہ اس سے حضورؐ کی راحت میں خلل پڑتا۔ جب ذرا آفتاب بلند ہوا اور دھوپ آئی تو صدیق اکبرؓ پاؤں تان کر آپ پر سایہ کرنے کی غرض سے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت لوگوں نے دیکھا کہ حضورؐ آپ ہیں۔ دیکھے ابو بکرؓ نے آپ کو مصافحہ کی بھی تکلیف نہیں ہونے دی مصافحہ کی تکلیف کو خود گوارا کر لیا۔ یہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا نیت ادب تھا کہ آپ وقایہ ہو گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ تکلیف نہ پہنچے۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی خود پیدل چلے اور فرمایا کہ میں تو تم میں سے نہیں۔ پھر کیوں نہ پیادہ چلوں کہ تو اب اس لئے غور کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کو اتنا محتاج بنا کر چاہتے ہیں خدا تعالیٰ کا کہ ذرا ذرا سے تو اب کے طالب ہیں، مگر بعض لوگوں کی آج کل یہ حالت ہے کہ آپ کو خدائی کے رتبہ تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ آپ کے لئے وہ اوصاف ثابت کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے خاص اوصاف ہیں۔ مثلاً علم غیب عیب کو آپ کے لئے ثابت کرتے ہیں،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق نہیں دیکھتے کہ میں خدا

تعالیٰ کا محتاج رہوں اور مجھے تو اب ملے کیسے

حضور کا اصلی مذاق

حضرت عاشق کی شان یہی ہوتی ہے کہ اس کو کسی حالت پر بس نہیں ہوتی۔ اس کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔

دل آرام و دلیر و آرام جوئے لب از تشنگی شکست بر طرف جوئے
 نگویم کہ بر آب قادر نیستد کہ بر ساحل نیل مستسقی اند
 اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ حضورؐ ثواب کے طالب ہوئے خدا کے طالب نہ ہوئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جس چیز کو مطلوب قرار دے دیں گے، عاشق کو اس کی بھی طلب ہوگی اور وہ خود ہی کی طلب ہے اور اس لئے اس کو ان چیزوں کی رغبت کرنا بھی لازم ہے چنانچہ ارشاد ہے *و فی ذلک فلیتناھن المتناھنون*۔ عاشق کا یہی مذہب ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

چوں طمع خواہد ز من سلطان دین خاک بر فرق قناعت بعد ازین
 پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ثواب حاصل کرنے کے لئے پیدل چلے ہیں تو اب کون شخص ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہو۔ مگر آج کل لوگ اپنے کو بڑا بنا نا چاہتے ہیں اور یہی دلیل ہے کہ بڑے بننے کے لائق نہیں اور اگر پر متضرع ہوتا ہے کہ منصب حکومت ہر شخص کے مناسب نہیں بلکہ اس شخص کو لئے جائز ہے کہ اپنے کو تکلیف اور دوسروں کو راحت دینا چاہتا ہو۔

جاہ طلبی | بہر حال جاہ کی دو قسمیں ہوں۔ ایک یہ کہ دوسرے کی جانب حاصل ہو خواہ من جانب المخلوق ہو یا من جانب المخلوق۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اپنی جانب سے ہو پس جو اپنی جانب سے ہو اس

اُس کے ذرائع خود بہم پہنچائے جائیں وہ بجز خاص حالات کے ناجائز ہے
 آج یہ کیفیت ہے کہ عوام الناس سے مہربانی وغیرہ کی درخواست کی جاتی
 ہے کہ ہمارے واسطے پرچہ دینا۔ پرچوں کے واسطے نیری میری خوشامد کرتے
 رہتے ہیں۔ بعض لوگ اس کے لئے مال بھی خرچ کرتے ہیں۔ رشتوں دیتے ہیں
 ب سمجھ لو کہ اس میں برکت نہیں ہوتی اور خدا کی مدد بھی نہیں ہوتی۔ البتہ اگر
 کو بلا طلب کوئی عہدہ مل جائے تو اُس کو خدا کی مدد ہوتی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کو قضا کا عہدہ ملتا تھا مگر آپ نے قبول نہیں کیا۔ حتیٰ کہ جیل
 میں بھیجے گئے۔ دیکھے آپ کو اس قدر نفرت تھی قضا سے اور عجیب لطیفہ یہ
 کہ خلیفہ صفیر بن منصور نے اس جبر حاکمانہ کے ساتھ آپ سے عالمانہ مباحثہ
 کیا۔ اس طرح سے کہ جب آپ سے منصب قضا قبول کرنے کے لئے
 کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں اس لائق نہیں ہوں۔ بادشاہ نے کہا کہ آپ جھوٹ
 تے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر میں جھوٹ کہتا ہوں تو جھوٹ بولنے والا
 حکومت کے لائق نہیں ہوتا۔ تمام دربار میں اس جواب سے سناٹا ہو گیا
 کسی سے جواب نہ بن پڑا۔

صاحبو! ہمارے سلف تو اتنا ڈرتے تھے قضا اور حکومت سے، مگر
 آج اس کی درخواست کی جاتی ہے اور اس کے لئے ذرائع پیدا کئے جاتے ہیں
 میں سفارش کرائی جاتی ہے۔ کہیں دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ سو ان ذرائع کا استعمال
 اُنہیں ہاں اگر منجانب اللہ مل جاوے تو خیر مگر بے عزتی کیوں اختیار کی جائے
 وہ یہ کہ لوگوں کی خوشامد کی جاوے اور مال خرچ کیا جاوے۔ سو بکھیرے گئے

جاویں) اس وقت تو یہ حالت ہو رہی ہے کہ ایک شخص کا نمبر بھی مقدم اور وہ غریب حاجت مند بھی ہے مگر پھر بھی دوسرا شخص اس کے مقابلہ کے لئے درخواست کرتا ہے۔ حالانکہ یہ قابلیت میں بھی اس کے برابر اور نہ غریب محتاج ہے مگر پھر ملتا ہے کہ عہدہ ہم کو ہی ملنا چاہئے ہم زمیندار ہیں اور اس کے پاس کچھ بھی نہیں حالانکہ یہی دوسرے کے لئے اور اس کے عدم استحقاق کی تھی۔

بزرگ آج کل ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کیا وہ اس کی کوئی نظیر پیش کتے ہیں کہ انہوں نے اپنی درخواست کو اپنے بھائی کے مقابلہ میں منسوخ دیا ہو اور ایثار اور ہمدردی سے کام لیا ہو۔ غالباً وہ ایسی ایک نظیر بھی پیش کتے۔ وہ اس کی صرف یہی ہے کہ ان کو صرف مال و جاہ مقرر ہے اور نہیں۔ زبان پر ہمدردی کے الفاظ ہی الفاظ ہیں حقیقت کچھ نہیں۔ آج کل کیا ہمہ دردی ہے۔ جس میں خلوص کا پتہ ہی نہیں۔

حضرت علیؑ خواص فرماتے ہیں کہ اگر کسی جگہ کوئی عالم ہو اور دین کا کام رہا ہو اور سمجھتا ہو کہ میں یہ کام تو اب کے لئے کر رہا ہوں۔ یا کوئی پیر ہو اور تربیت باطنی کر رہا ہو اور دل میں یہ سمجھتا ہو کہ میں دین کے لئے یہ کام کران دو لوں کو ایک علامت سے اپنے خلوص کا امتحان کرنا چاہئے۔ علامت یہ ہے کہ اگر اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص اچھا ہے اور وہ بھی جیسا یا اس سے اچھا کام کر سکتا ہو تو دیکھنا چاہئے کہ یہ شخص کام کو اچھا پیر کرتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کے پیر کو دے اور خود اس کام سے

رے اور کسی دوسرے کام میں لگ جاوے تو وہ مخلص ہے اور اگر اسی فکر ہو کہ یہ کہاں سے امراء نکلاؤ اس کو تو مخلص نہیں لیا کار ہے۔

اسی طرح جاہ و مال کے مقصود نہ ہونے بلکہ خدمت خلق مقصود ہونے لامرت یہ ہے کہ اگر یہ دیکھو کہ ہمارا بھائی ہم سے اچھا کام کرے گا، تو تم اس چھوڑ دو تا کہ وہ دوسرا شخص اس منصب پر فائز ہو جائے۔ دوسرے کو بتانا ہے کہ خود اس کام سے الگ ہو جاؤ۔ اور جو شخص ایسا ہو گا وہ اپنی میرا دھارہ امت سنانے کے لئے یا عہدہ حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹری ٹریننگ پیٹ کیوں حاصل کرے گا مگر آج کل تو اس حکومت اور منصب کے لئے روپیہ خرچ کر کے ڈاکٹری ٹریننگ حاصل کئے جاتے ہیں۔ یہ صراف علامت ہے اس کی کہ خدمت مقصود نہیں بلکہ جاہ و مال مقصود ہے۔ یہاں تک تو جاہ کے حاصل کرنے کی بل تھی۔

۵۔ کا مصرف اب باقی رہا جاہ کے صرف اور استعمال کرنے کا قاعدہ کہ جاہ کہاں صرف کی جاتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

رف جاہ کے مواقع مختلف ہیں اور ہر ایک کا جدا حکم ہے اور اس کے متعلق کی قاعدہ یہ ہے کہ جہاں استعمال جاہ سے دوسرے شخص کی منفعت مقصود یعنی دوسرے پر جاہ کا اثر ڈالا جا رہا ہو اور اس منفعت کی تفصیل اس شخص جب ہے تو اس صورت میں جاہ سے کام لینا جائز بلکہ واجب ہے۔ ایک شخص نماز نہیں پڑھتا اور ہم اپنی جاہ کے اثر سے اس کو نماز پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ تو اس موقع پر صرف جاہ واجب ہے۔ حاکم اپنے ملازموں سے

بادشاہ اپنی رعایا سے نماز پڑھوا سکتا ہے۔ اثنان و ثنا گردوں سے، شوشہ ہر روز سے، باپ اولاد سے حکومت کے ساتھ یہ کام لے سکتا ہے۔ تو ان لوگوں کو واجب ہوگا کہ اپنی جاہ سے کام لیں اور ماتحتوں سے نماز پڑھوائیں۔

ایک صورت اس کے مقابل یہ ہے کہ استعمال جاہ سے دوسرے کی مصلحت مقصود نہیں بلکہ اپنی ہی منفعت مقصود ہے۔ اس صورت میں جاہ کا کام لینا جائز نہیں۔ جیسے ریشیوں کی عادت ہوتی ہے کہ ریل پر جانے کو تانگہ لگا کر اب اس سے اُجرت ملے نہیں کرتے ویسے ہی تانگہ میں سوار ہو جیتے ہیں۔ اسی پہنچ کر ایک آنہ دو آنہ اس کے ماتحت پر رکھ دیتے ہیں۔ وہ عزیز ان کی جاہ و جہ سے کچھ نہیں کہتا۔ یہ صورت حرام ہے بلکہ یا تو ابتدا میں اُجرت ملے کر عرف عام کے موافق اس کو پوری اُجرت دے۔

اسی قبیل کی ایک صورت یہ ہے کہ تحصیلدار صاحب، محتا تیار صاحب کسی جگہ پہنچے اور لوگوں نے ان کے واسطے سواری خود ہی پیش کر دی۔ ظاہر ہے ہدیہ کی صورت ہے مگر حدیث میں حکام کو رعایا سے ہدایا لینے کی ممانعت اور شریعت کا فتویٰ ہے ہدایا الاصل و غلول۔ ہاں اگر کسی کا تعلق آپ کے ساتھ پہلے سے دوستی یا قرابت کا ہو کہ وہ پہلے بھی آپ کو ہدیہ دیا کرتا ہو۔ ایسے شخص کا ہدیہ لینا حکومت کے بعد بھی جائز ہے۔ کیونکہ اس صورت میں جاہ سے نہیں آیا بلکہ چاہ سے یعنی محبت سے آیا ہے۔ مگر شریعت صاحب جاہ کو زور ڈالنے کی اجازت نہیں دی۔ ہاں خوش دلی سے محتاج کوئی ان کی خدمت کرنے کو اس کا مقصد لقمہ نہیں مگر محبت اور خوش

پہچاننے کی سنت ضرورت ہے کہ حکام سے محبت لوگوں کو کم ہوتی ہے۔ خوف اور غرض کا تعلق زیادہ ہے اس لئے حکام کو سخت احتیاط کی ضرورت ہے اور ان ہی حکام میں میانجی لوگ بھی داخل ہیں جو اپنے اثر کو بے جا عمل میں صرف کرتے ہیں۔ یہ لوگ خوب کان کھول کر سن لیں کہ شاگردوں سے ہر قسم کی خدمت لینا ان کو جائز نہیں۔

مثلاً شاگردوں سے کہتے ہیں کہ ذرا پانی پلا دینا، ذرا پنکھا بھل دینا بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت سخت کام شاگردوں سے لیتے ہیں اور مقصود محض اشتہار ہوتا ہے بجایہ لوگ کس معاوضہ میں شاگردوں سے کام لیتے ہیں۔ کیا پانی پلانے کے عوض میں ان کو شاگرد بنایا تھا۔ ان صورتوں میں بھی ایسے شخص سے کام لیا گیا ہے جس سے کام لینا جائز نہیں۔ ہاں مصلحت تاویب سے جائز ہے بشرطیکہ غرض بھی تاویب ہو نہ کہ اپنے آپ کو راحت پہنچانا بلکہ مقصود یہ ہو کہ شاگرد کو کام کا سلیقہ آ جاوے اور اس کے لئے بھی ولی سے اجازت لینا شرط ہے۔ اور ولی کے واسطے یہ قانون ہے کہ جس میں اس شاگرد کی مصلحت ہو اس کی اجازت دینا ولی کو جائز ہے جب ایسی صورت ہو تو بے شک اُستاد کو شاگرد سے کام لینا جائز ہے۔ نہ یہ کہ اپنی رحمت کے لئے ٹھنڈی ہوا پنکھے سے کر رہے ہیں۔ اس بیچارہ کو کوئی کئی گھنٹے پنکھا بھلتے ہو جاتے ہیں۔ نہ پڑھتے ہیں نہ یاد کرتے ہیں۔ گھنٹوں ان سے پاؤں دبواتے ہیں بڑی بڑی خدمتیں لیتے ہیں۔ ایسا تصرف کرنے کا تو خود ولی کو بھی اختیار نہیں۔ پھر جس کو ولی سے اجازت لینے کی بھی ضرورت ہو اس کو تو ایسا تصرف کرنا کب جائز ہوگا۔ بس اُستاد تو آج کل بچوں کو اپنی ملک سمجھتے ہیں جیسے غلام۔ جہلاء یوں کہتے

ہیں کہ جان خدا کی اور بڑیاں ہاں باپ کی اور گوشت اُستاد کا۔ خوب سمجھ لو کہ
اُستاد کو شاگرد پر حق ملک نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے شریعت میں خاص حدود
ہیں۔

میاہی لوگوں کی یہ حالت ہے کہ بی بی پر تو خفا ہو کر آئے اور بچوں پر غصہ
نکالا اور تمہی بجائی شروع کر دی۔ ایسے ظالموں کو شاگرد بھی ایسے ہی مل جاتے ہیں
جو درحقیقت ان کی عقوبت ہیں۔ چنانچہ ان میں بعض طلبا تو وہ ہیں جن میں ادب
ہی نہیں ہوتا اُستادوں کا جیسے تعلیم جدید کے طلباء میں کہ وہ اُستاد کو اُستاد ہی نہیں
سمجھتے بلکہ اسکول کا نوکر سمجھتے ہیں اور بعض شریک لڑکے ایسے ہوتے ہیں کہ ظاہر میں تو
ادب کرتے ہیں مگر دل سے ادب نہیں کرتے اور بعض اُستادوں سے خیانت بھی
کرتے ہیں۔

چنانچہ لوٹاری میں ایک میاہی تھے۔ لڑکے ان کی سپریں چڑا کر کھا جاتے ان
کے پاس کسی جگہ سے بہت سے بتائے آئے تھے۔ انہوں نے لڑکوں سے
پچانے کے لئے ایک بدھنے میں ان کو بھر کر اوپر سے چھنی ڈھانک کر اٹھا لگا دیا
لڑکوں نے کمیٹی کی کہ کسی طرح بتائے کھانے چاہئیں۔ مگر اس میں حیران تھے کہ کیا تیر
کریں کیونکہ لوٹے کے منہ کو اٹھا لگا ہوا ہے۔ آخر یہ رائے ہوئی کہ اس میں لوٹنی
سے پانی بھر کر شربت بنا کر پی جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ کئی روز کے بعد میاہی صاحب
کا بتائے کھانے کو جی چاہا۔ بدہنی مٹا کر جو مٹولی بالکل میدان صاف سوایوں کو
ایسے ہی مل جاتے ہیں

غرض یہ میاہی لوگ بہت ہی ظلم کرتے ہیں بچوں پر۔ حالانکہ ظلم کرنا کسی پر بھی

جو حرام ہے خاص کر عاجز بچوں پر اگر چہ باپ بھی اجازت دے دے پھر غضب
 کہ تصور نہ ہو کسی کا اور ایک طرف سے سب کو گھڑنا شروع کر دیتے ہیں۔
 قصہ میں ان کو خبر نہیں رہتی کہ کون تصور دار ہے اور کون بے تصور ہے۔ کوئی مقدمہ
 ہوتا ہے تو بلا تحقیق سب کو مارنا پٹینا شروع کر دیتے ہیں اور مارتے اس قدر ہیں
 جس کی انتہا نہیں ہے۔

حکام اور میاں جی کیلئے دستور العمل

میں عہدہ داروں کو بھی اور میاں جی
 لوگوں کو بھی ظلم سے بچنے کا ایک
 دستور العمل بنانا ہوں۔ وہ یہ کہ غصہ میں کسی مقدمہ کا فیصلہ نہ کیا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم نے ہم کو یہی سکھایا ہے۔

لا یقضی القاضی وهو غضبان

کہ قاضی کو چاہئے کہ غصہ کی

حالت میں فیصلہ نہ کرے۔

میاں جی وغیرہ کو بھی چاہئے کہ غصہ میں نہ ماریں۔ جب غصہ آئے تو خاموش
 ہو جائیں۔ جب غصہ اتر جائے تو خود کریں کہ کتنی سزا دینی چاہئے اور ہر جرم پر
 ٹھہرنا چھپوں کا حد منفرد کی لیں۔ یہ نہیں کہ بے طرح مارنا شروع کر دیا۔ خواہ ہاتھ ٹوٹے
 یا ٹانگے کہ جو شخص اس دستور العمل کا لحاظ رکھے گا اس کے ہاتھ سے ظلم نہ ہوگا۔

اب رئیسوں کی کیفیت سنئے کہ ذرا ملازم نے تین پاؤں کی اور ان کو غصہ
 آیا اور لگے اس پر بے بجا ڈبوتے پڑنے بلکہ ملازم تک بھی محدود نہیں ہے۔
 بے تعلق لوگوں پر بھی ظلم سے نہیں رکھتے۔

ہمارے یہاں کا قصہ ہے ایک شخص رئیس تھے اور بڑے متکبر ایک

غریب قوم کے آدمی ہمارے حضرت حاجی صاحب کے مریدان کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ صاحب سفید کپڑے پہنے ہوئے آ رہے تھے۔ وہ رئیس صاحب بھی راستہ میں بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر بہت ہی ناگوار ہوا کہ اس نے بھی ہمارے جیسے صاف کپڑے پہنے ہیں۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے معلوم ہوا کہ قضائی ہے اور حاجی صاحب کا مرید ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حاجی صاحب نے ہی اس کا دامغ خراب کیا ہے۔ بڑے ولی ہو گئے۔ بس اس غریب کو پاس بلا کر پانچ جوڑے لگائے۔ اس بیچارے نے کہا کہ شیخ جی خدا کے یہاں جا کر اس کا مزہ چکھو گے۔ یہ بات سن کر آپ کو اور مسخروں کو جھا کہ آپ نے اس کے سامنے جو تار کھ دیا کہ تو اب میرے مار لے۔ اس نے کہا، پیری کیا مجال ہے جو ایسی گستاخی کروں۔ تو آپ کیا کہتے ہیں کہ اب تو سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ ہمیں خدا تعالیٰ کا ہی حکم ہے کہ تمہارے جوڑے لگائیں۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ ہم نے تو بلا اجازت بھی تم کو مار لیا اور تم اجازت سے بھی ہم کو نہیں مار سکتے اور تمہیں حکم نہیں۔

پھر اس ظلم کا سبب کیا تھا صرف تکبر یعنی اپنے کو بڑا سمجھنا کہ یہ قضائی ہے اور ہم شیخ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ سب خدا تعالیٰ کے بند سے ہیں خواہ قضائی ہوں یا اور کوئی ہو۔ ان باتوں کے انسداد کا طریقہ یہی ہے کہ بے وجہ کسی پر غصہ مرت کر دو اور غصہ میں فیصلہ مرت کر دو۔

نسب پر یا منصب پر فخر کرنا بھڑو۔ آخرت میں اس کو کون
نسب اور فخر پوچھنا ہے۔ خوب فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ

انما من بھتة المثلک اکلاد ابوہم آدم والام حواء

جس کی نسبت فرماتے ہیں :-

ما الفضل الا لاهل العلم انهم

علی الہدیٰ لمن استہدیٰ ادلاء

ہاں شرافت نسبی بھی خدا تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ اگر کوئی شریف النسب

ہو تو خدا تعالیٰ کا شکر کرے۔ نہ یہ کہ جس کے پاس یہ نعمت نہیں اس پر ظلم کرے، بلکہ

اس نعمت کے شکر میں تو چھوٹوں کے ساتھ احسان کیا کرو۔

ایک رئیس صاحب تھے، ان کا برتاؤ چھوٹوں کے ساتھ دیکھئے کہ ایک

بھنگن ان کے گھر کمانے آئی، بچی کو ایک جگہ بٹھلا کر کام میں لگ گئی، بچی رٹنے لگی

تو انہوں نے بے تکلف اس کو گود میں اٹھا لیا۔ حالانکہ بھنگن کی بچی تھی جو لوگ

واقعی شریف ہیں، ان میں شرافت سے تواضع پیدا ہوتی ہے غرور پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب

صورتیں تختیں جاہ کے استعمال کی۔

ان ہی میں ایک صورت جاہ سے کام لینے کی چنڈہ کے بارہ میں اثر سے

کام لینا بھی ہے۔ اس میں دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس پر ہم زور ڈال رہے ہیں

اس پر شرعاً انفاق واجب ہے۔ مثلاً ایک شخص کے ذمہ زکوٰۃ ہے اور ہم اس پر اثر

لے، اگر کسی کو شبہ ہو کہ اس تقریر پر تو چنڈہ دار اس کے لئے امر اور وسوسہ پر

زور ڈالنے کی گنجائش نکل آئی۔ کیونکہ آج کل اکثر امر اور وسوسہ زکوٰۃ نہیں دیتے

بس چنڈہ لے کر ان سے کہہ دیا جاوے کہ آپ اس میں زکوٰۃ کی نیت کر لیجئے

اور ہم اس میں شرائط زکوٰۃ کی رعایت کریں گے تو جواب آگے موجود ہے کہ

اواسے واجب کے لئے زور ڈالنا تو جائز ہے مگر اس قید کے ساتھ تو

رہتیہ حاشیہ برص ۲۶۸

ڈال سکتے ہیں تو ہمارے ذمہ واجب ہے کہ اس پر ایسا اثر ڈالیں کہ زکوٰۃ ادا کرے
 مگر یہ زور ڈالنا حرام ہے کہ غلام مدرسہ میں یا فلاں انجمن ہی میں وہ۔
 ایک صورت یہ ہے کہ جن پر ہم چندہ کے لئے زور ڈال رہے ہیں اس
 پر اتفاق واجب نہیں اور جس کام کے لئے چندہ کیا جا رہا ہے وہ کسی خاص شخص کے
 ذمہ نہیں بلکہ واجب علی الکفایہ ہے۔ تو اس میں اثر اور جاہ سے کام لینا جائز نہیں
 خواہ چندہ کسی مدرسہ کے لئے ہو یا قومی کام کے لئے یا مسجد کے لئے۔ دلیل اس
 کی یہ ہے۔

لا یجوز مال امرئ مسلم الا

بطيب نفس منه

میاں بی بی کے علاقہ کو سب جانتے ہیں کہ کبنا کچھ ہوتا ہے کہ دونوں میں
 عشق کا علاقہ ہوتا ہے مگر اس کے بارہ میں بھی حق تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے
 وَأَلْوَا النَّسَاءِ صِدْقُهُنَّ مَخْلُوعَةٌ فَإِنْ طَبِقَ لَكُم مِّنْ شَيْءٍ مِّنْهُ لَفَسَا
 فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا۔

اگر وہ خوشی سے مہر کا کچھ حصہ معاف کر دیں تو جائز ہے ورنہ جائز
 نہیں۔

یعنی بی بی کا اتنا کہہ دینا کہ میں نے مہر معاف کر دیا کافی نہیں ہے بلکہ خوشی سے

دلیلیہ حاشیہ از صفحہ ۲۶۷ زور ڈالنا جائز نہیں کہ ہماری ہی معرفت ادا کرو بلکہ ان

کو آزادی دینا واجب ہے خواہ مساکین کو دیں خواہ ان کو۔

معاف کرنا معتبر ہے۔ دیکھئے میان بی بی کا ایسا تو علاقہ مگر وہاں بھی یہ حکم ہے کہ ظاہری معافی کافی نہیں ہے۔ یہ بھی دیکھ لو کہ ایسے قرآن بھی موجود ہیں جن سے اُس کی خوش دلی پائی جاتی ہو، تو دوسروں کے عطا یا میں تو اس کا لحاظ بہت ہی زیادہ ضروری ہوگا۔ پس چندہ میں اس کا بہت ہی خیال کرنا چاہئے۔

مثلاً ہم ایک شخص سے چندہ مانگنے گئے اور اُس نے مجمع میں ہم کو دو روپے دیئے اور ظن غالب یہ ہے کہ اگر ہم اُس سے خلوت میں مانگتے تو ایک ہی روپیہ دیتا۔ اس صورت میں ایک روپیہ تو حلال ہے اور ایک روپیہ حرام ہے۔ ہمارے کہنے سے تو اُس نے ایک روپیہ دے دیا اور اگر اُسی کام کے لئے دوسرا کہتا تو کچھ نہ دیتا۔ تو اس صورت میں ایک روپیہ بھی جائز نہیں۔

اسی طرح اگر کوئی درویش باطنی تصرف سے کسی کے قلب میں یہ خیال ڈال دے کہ فلاں شخص کو ایک ہزار روپیہ یاد

باطنی تصرف

تو اُس کا لینا بھی حرام ہے۔ لوگ اس کو کمال سمجھتے ہیں مگر یہ صورت حرام ہے کہ باطنی تصرف سے کسی کا مال لیا جاوے۔ تجربہ ہے کہ ایسی صورت میں آدمی وہب کر کچھ دے دیتا ہے پھر بعد میں پچھتا تا ہے۔ یہ اس کی علامت ہے کہ خوش دلی سے نہیں دیا تھا۔

ایک مسئلہ یاد آگیا، اثر باطنی کے متعلق۔ وہ یہ کہ بعض لوگ بددعا کیا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ہلاک ہو جاوے۔ تو اگر کسی نے کسی کے واسطے بددعا کی اور وہ اتفاق سے مر گیا۔ تو اُس کا کیا حکم ہے۔ تفصیل اس میں یہ ہے کہ یہ بددعا کرنے والا صاحب تصرف ہے یا نہیں۔ اگر واقعات سے اُس کو اپنا صاحب تصرف

نہ ہونا معلوم ہے۔ تو اس کو اگر بددعا کرنا چاہتے نہ تھا تو صرف بددعا کا گناہ ہوا۔
 قتل کا گناہ نہ ہوگا۔ اور اگر واقعات سے اس کو اپنا صاحب تصرف ہونا معلوم
 ہو تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ جن وقت اس نے بددعا کی ہے آیا اس وقت یہ
 خالی الذہن تھا یا دل اس بات پر متوجہ تھا کہ یہ میرا جائے۔ اگر خالی الذہن تھا
 تو بھی بددعا ہی کرنے کا گناہ ہوا۔ قتل کا نہیں ہوا۔ اور اگر دوسری شق تھی یعنی اس
 کے ہلاک کی طرف باقاعدہ توجہ تھی تو قاتل ہونے کا بھی گناہ ہوا۔ کیونکہ اس نے
 اپنے فعل سے اس کو قتل کیا۔ تصرف نفس سے قتل کرنا اور نہ ہر دے کے بارے میں برابر
 ہے۔ اور یہ تجربہ سے ثابت ہے کہ نفس بھی قاتل ہوتا ہے جیسے لاکھ پاؤں قاتل
 ہیں۔ تو جیسے لاکھ پاؤں سے قتل کرنا قاتل ہے ایسے ہی قلب سے قتل کرنا بھی
 قاتل ہے۔ کیونکہ دونوں کا فعل برابر ہے۔ قتل کے سب احکام جاری ہوں گے
 البتہ اس قتل میں شہد کے احکام جاری ہوں گے۔

ایک مسئلہ اسی کے متعلق اور ہے۔ وہ یہ کہ کوئی شخص کسی عورت سے
 نکاح کرنا چاہتا ہے اور وہ نہیں چاہتی اور اس پر نکاح کرنا واجب بھی نہیں، تو
 اس نے کسی سے تعویذ کر لیا اس عرض سے کہ وہ نکاح کرے تو یہ بھی جائز نہیں
 نہ ایسا تعویذ دینا جائز ہے۔ کیونکہ اس میں بھی عامل کی قوت خیالی کا اثر ہوتا ہے
 اور قلب سے کسی کو مجبور کرنا جائز نہیں۔ البتہ میاں بی بی کی موافقت کے لئے
 تعویذ کرنا جائز ہے۔ مثلاً کوئی شخص حقوق واجبہ اپنی بی بی کے ادا نہیں کرتا اس نیت
 سے تعویذ کرنا جائز ہے کہ دونوں میں موافقت ہو جائے اور شوہر حقوق کو ادا
 کرنے لگے۔ مگر عامل یہ تصدیق نہ کرے کہ شوہر اس پر فریفتہ ہو جائے بلکہ صرف

تصور اولے حقوق واجبہ کا رکھے۔ اور جن کو آج کل تسخیر کہتے ہیں اُس کا قصد نہ کیے
تعویذ دینے والے اور لینے والے سب کو یہی لحاظ رکھنا چاہئے۔

اسی استعمال حجاب کے فروع میں سے ایک جزئیہ آج کل
سفرائش کا مسئلہ کی سفارش کا بھی ہے جو حقیقت میں زور ڈالنا ہے

لوگ زور ڈال ڈال کر اپنے کام کے لئے دوسروں کو مجبور کرتے ہیں اور جو چیز
دوسرے کے ذمہ واجب نہ تھی اُس کو اُس کے ذمہ لازم کرتے ہیں۔ سو یہ جائز
نہیں کیونکہ یہ دوسرے کو مجبور کرنا ہے۔ ہاں اگر سفارش اس طریقہ سے ہو، کہ
دوسرے پر بار نہ ہو، اُس کی آزادی میں خلل نہ پڑے تو جائز بلکہ سنت ہے
دلیل اس کی حضرت بریرہؓ کا قصہ ہے کہ آپ نے اُن سے فرمایا کہ

اے بریرہ تم منیث سے نکاح کر لو۔ یہ اُن کے شوہر کا نام ہے جن سے یہ
خیار عین کے سبب جدا ہو چکی تھیں۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یہ حکم ہے یا سفارش۔ آپ نے فرمایا حکم نہیں سفارش ہے۔ اس پر انہوں نے
عرض کیا تو میں اس سفارش کو نہیں مانتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ سفارش کی حقیقت
کے لئے یہ لازم ہے کہ دوسرے کی آزادی میں خلل نہ پڑے۔ چنانچہ آپ نے
پھر اُن کو مجبور نہیں کیا۔ نہ اُن کے صاف جواب سے آپ کو ناگواری ہوئی۔ بہر حال
سفارش میں یہ صورت ہونا چاہئے کہ جس سے سفارش کی ہے اُس کی آزادی میں
خلل نہ ہو، نہ اُس پر بار ہو اور اگر وہ ان کی سفارش قبول نہ کرے تو سفارش کرنے
والا برا نہ مانے۔

اب تو کہا جاتا ہے کہ صاحب جب تک زور دار الفاظ نہ ہوں، تو

سفارش سے کیا ہوتا ہے۔ اس لئے خوب زور دار الفاظ لکھو تا کہ اثر پڑے۔ حکام
یہ تو جبر اور اکراہ ہے۔

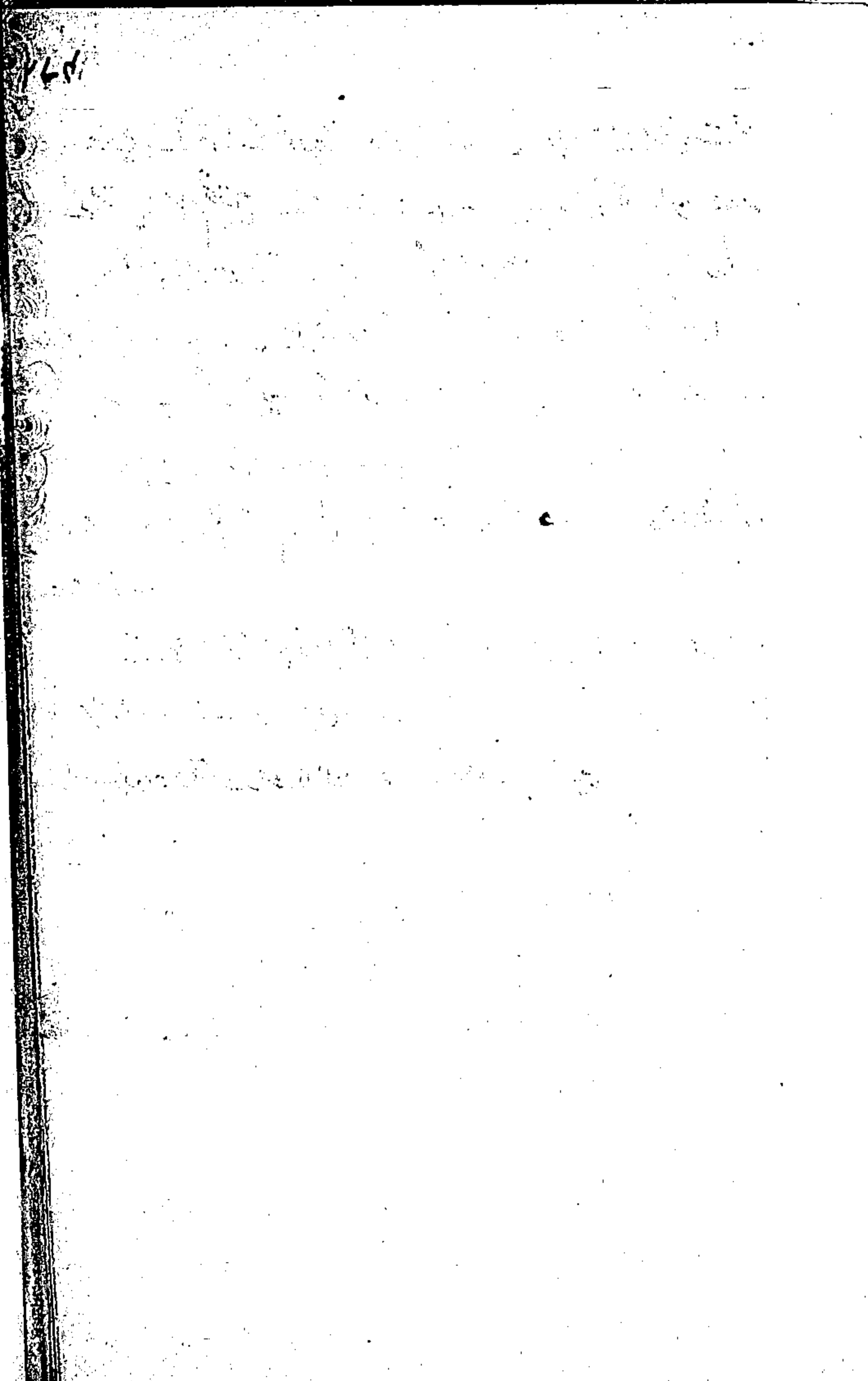
یہ چند صورتیں جاہ سے کام لینے کی جو آج کل رائج زیادہ ہیں مع ضروری احکام
کے بیان کر دی گئیں اور بھی اس کے متعلق بہت سی جزئیات ہیں مگر سب کا استنباط
ایک جلسہ میں دشوار ہے۔ اس لئے اب میں بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور جس
حدیث کی خطبہ میں تلاوت کی تھی اس کا ترجمہ کر کے ختم کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ
علیہ وسلم فرماتے ہیں: **مَنْ رَاعَى حُكْمَ رَسُولٍ مِنْ رِجَالِهِمْ فَهُوَ بِرٌّ** اور جس
اور حاکم ہے۔ کوئی اپنے گھر والوں پر کوئی نوکروں پر۔ اور بھی کچھ نہیں ہے تو اپنے
نفس اور ہاتھ پاؤں پر ضرور حاکم ہوگا۔ اور سب سے پوچھا جائے گا کہ تم نے
اپنی رعیت کے بارہ میں کیا کیا۔ یعنی ہم نے یہ جاہ اور اثر جو تم کو ماتحتوں پر دیا
تھا اس کو کہاں استعمال کیا۔

یہ سوال تو اس صورت میں ہے جب کہ جاہ اور اثر خدا تعالیٰ کا عطا کیا ہوا
ہو بدھن اس کے کسب کے اور اگر اس کے کسب اور اسباب سے حاصل ہوا
ہے تو یہ سوال بھی ہوگا کہ تم کس ذریعہ سے راہی بنے تھے۔ پھر حال رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ثابت ہو گیا کہ جاہ کے بھی حقوق ہیں۔ قیامت میں
ان کی باز پرس ہوگی کہ کہاں سے حاصل کی اور کہاں صرف کی۔ جیسے مال کے
متعلق پوچھ ہوگی کہ

من این اكتسبتہ واين
کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ
کیا۔

اسی واسطے میں نے نمونہ کے طور پر متعدد چیز نیاست بیان کر دیں۔ مزید چیز نیاست اور ان کے متعلق احکام تحقیق سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مگر میرے اس مختصر بیان سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ جاہ اور اثر جس کا نام ہے اس کا خود حاصل کرنا بجز ہمتیہ امور توں کے جائز نہیں اور جو بدون تحصیل کے حاصل ہو جائے اس کا ہر جگہ استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ اب لوگ شریعت کو نماز روزہ ہی میں منحصر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ شریعت نے سب چیزوں سے بحث کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی کو فکر اور تلاش ہی نہ ہو۔ مگر حجت الہیہ قائم ہو چکی ہے۔ اب کوئی عمل نہ کرے گا تو عند اللہ اس سے مواخذہ ہوگا۔

اب دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرماویں۔ آمین ثم آمین وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔



خیر الممال للرجال

تجارت اور آنحضرت کے متعلق یہ وعظ ۸۔ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ کو قلی بازار، کانپور میں فرمایا جو ۱۴ گھنٹے میں ختم ہوا۔ حاضرین قریباً ۵۰۰ کی تھی۔ حکیم محمد یوسف صاحب مرحوم بجنوری نے قلمبند کیا۔

خطبة بالوره

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله محمدٌ واستغفرتُ واستغفرتُ وتوكلتُ به وتوكلتُ
 عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا
 من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له
 ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد
 أن سيدنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله صلى الله تعالى
 عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم. أما بعد فاعوذ بالله
 من الشيطان الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم. رجال
 لا تلهمهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله ط وإقام الصلاة و
 إيتاء الزكاة ط يخافون يومًا تتقلب فيه القلوب والأبصار
 يمجزيهم الله أحسن ما عملوا ويزيدهم من فضله والله
 يرزق من يشاء بغير حساب ط

ترجمہ

خاص بندے ایسے ہیں کہ ان کو تجارت اور خرید و فروخت
اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا
کرنے سے غافل نہیں کرتی اور وہ ڈرتے ہیں اس دن سے
جس میں قلوب اور آنکھیں اٹ پڑے ہو جائیں گے
ضرور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے نیک اعمال کا بدلہ دیں گے
اور اپنے فضل سے زیادہ دیں گے اور اللہ تعالیٰ جس
کو چاہتے ہیں، روزی بے حساب عطا فرماتے ہیں۔



علم اور عمل

یہ ایک آیت ہے جو ماقبل سے مترتب ہے مگر میں نے اس وقت اس پر اکتفا کیا ہے۔ کیونکہ جن مضمون کا بیان کرنا اس وقت مقصود ہے اس کے لئے یہ آیت کافی ہے۔ رجاء ترکیب میں قائم ہے، ایک قرأت پر فعل ملفوظ کا ایک صورت میں مقدر کا جن پر یُسَبِّحُ ماقبل فعل دلالت کر رہا ہے۔ کیونکہ اس جگہ قرأتیں دو ہیں یُسَبِّحُ بصیغہ معروف اور یُسَبِّحُ بصیغہ مجہول ہے۔ اس قرأت پر یہاں یُسَبِّحُ بصیغہ معروف مقدر کیا جاوے اس بنا پر میں نے اس کو تلاوت میں یہاں شروع کیا۔ مگر ہر حال میں مطلب ایک ہی ہے۔ یہ سب اس لئے عرض کر دیا تاکہ ترکیب معلوم ہونے سے ترجمہ میں آسانی ہو۔

خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ مدح فرماتے ہیں ان خاص بندوں کی جن میں یہ خاص صفات ہوں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ پس ہم کو چاہئے

وہ خاص صفات اپنے اندر پیدا کریں۔ مگر ہم لوگوں کا عجیب مذاق ہے کہ فقط تذکرہ میں تو ان صفات کی مدح کی جاتی ہے مگر ان صفات مدح کی تحصیل نہیں کی جاتی۔

اس کی ایسی مثال ہے، جیسے کوئی شخص اکتساب مال پر قادر ہو اور اُس کے اصول بھی اُس کو معلوم ہوں لیکن وہ ان اصول کی صرف مدح ہی مدح کرتا ہے مگر مال کا اکتساب نہیں کرتا۔ بھلا بیٹے کہ نری مدح سے اُس کو کیا فائدہ مل سکتا ہے یا ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کو کھانے کی حاجت ہے اور سامان بھی کھانے کا موجود ہے۔ اُس سے کہا جاتا ہے کہ کھاؤ مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ ہاں تعریف بہت کر رہا ہے کہ اس کھانے سے ایسی فوٹ آجاتی ہے اور اس سے یہ ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے خود محروم ہے۔ سبب کے منہ تک رہا ہے۔ مگر کھاتا نہیں۔ بس تعریف کرنے کو ہی کافی سمجھ رہا ہے۔ انصاف سے کہئے کہ کوئی شخص دنیا میں اس کو عاقل قرار دے گا۔ ہرگز نہیں!

مگر تعجب کی بات ہے کہ آج کل دین کے معاملے میں عقلاء اور اہل الہائے اپنے کو عاقل تو سمجھتے ہیں اور اسلام کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ان صفات کی مدح بھی کرتے ہیں جو اسلام نے تعلیم فرمائی ہیں۔ مگر جن صفات کی مدح کی جاتی ہے ان صفات کی تحصیل میں سعی نہیں کرتے۔ دنیا میں کوئی ایسا مسلمان نہ ہوگا جو حضرات صحابہؓ اور بزرگوں کے اخلاق کی مدح نہ کرتا ہو کہ فلاں ایسے بزرگ تھے اور فلاں ایسے تھے۔ ان میں ایسی اچھی اچھی صفات تھیں کسی مسلمان سے اس کے خلاف نہ سنا ہوگا۔ مگر اس شخص سے کوئی پوچھے کہ تم نے بھی ان

خوبیوں کے حاصل کرنے کی طرف توجہ کی تو صاف جواب ملے گا۔ تو کیا محض ان کا معتقد ہو جانا کافی ہے۔ پھر اس سے بڑی سخت غلطی یہ ہے کہ لوگ اس کو تاہی کی تاویلیں کر لیں گے مگر غلطی کا اقرار نہیں کریں گے۔ اگر آدمی غلطی کا اعتراف کرے تو اصلاح کی بھی امید ہے مگر ہم نے تو کلمہ حق اُرید بہ الباطل لاس سے بال ہر اولیا جاتا ہے، کے طور پر یہ حدیث یاد کر لی ہے۔

الْحَمْدُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ قَالَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي
جَوَابِ مَنْ سَأَلَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ تَقُولُ فِي
رَجُلٍ أَحَبَّ قَوْمًا وَلَمْ يَلْقَ بِهِمْ رَوَاهُ الشَّيْخَانُ۔

جو شخص جس سے محبت رکھے اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے کہ آپ سے دریافت کیا، آپ اس کے بارہ میں کیا فرماتے ہیں کہ ایک شخص ایک قوم سے محبت رکھتا ہے اور ان کے ساتھ ملحق نہیں ہے۔ اس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا۔

یعنی جو شخص جس قوم سے محبت رکھے وہ انہیں میں سے ہے۔ کسی نے اس کا ترجمہ نظم میں کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ۔

أَحِبُّ الصَّالِحِينَ وَكُنتَ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللَّهَ يَرْزُقُنِي صَاحِبًا

میں نیکوں سے محبت کرتا ہوں اور ان میں سے نہیں ہوں۔ شاید اللہ تعالیٰ مجھ کو نیکی کی توفیق عطا کر دیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ اگر کھانے سے کسی کو محبت ہو تو کیا محض محبت سے

پریت بھر جائے گا۔ وہاں نہیں کہتے۔

أَحِبُّ الْأَكْلِينَ وَكُنْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللَّهَ يَرْزُقُنِي رَغِيْفًا

کھانے والوں سے محبت کرتا ہوں اور میں ان میں سے نہیں ہوں
شاید اللہ تعالیٰ مجھ کو روٹی عنایت کر دیں۔

کہ میں کھانے والوں کو دوست رکھتا ہوں اسی سے میرا پریت بھر جائیگا
یہ اس شعر کے مصنف پر اعتراض نہیں کرتا اور حاشیہ و کلاس حدیث پر تو کون اعتراض
کے سکتا ہے۔ میں تو استدلال باطل کرنے والوں پر اعتراض کرتا ہوں اور ان سے
پوچھتا ہوں کہ اگر اس کے یہ معنی ہوتے جو آپ نے سمجھے ہیں کہ محبت ہی کافی
ہے اور کسی بات کی ضرورت نہیں جیسا آج کل لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ تو وہ
پہلے لوگ بھی یوں ہی رہا کرتے کچھ بھی نہ کرتے۔ بس محبت ہی کا سلسلہ رہتا اور
انہی والے بھی صرف محبت کرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ بس کوئی بھی
عمل نہ کرتا۔ بس صرف آپ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی عمل کر لیتے اور دوسرے
لوگ صرف محبت کو کافی سمجھ لیتے مگر ایسا تو نہیں ہوا۔

اب رہی یہ بات کہ پھر اطہر ومع مع صاحب کے
کے کیا معنی ہیں۔ سو بات یہ ہے کہ اس میں عمل کرنے

اشتقاق اور فضل

والوں کے لئے ایک تسلی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جس کو
اہل سلوک سمجھ سکتے ہیں۔ باقی جس کو درد ہی نہ ہوا ہو وہ داناں کی قدر کیا جانے وہ
تسلی یہ ہے کہ اہل طریق عبادت کرتے ہیں، گوشش کرتے ہیں مگر پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے
کہ کچھ کمی رہ گئی۔ اور واقع میں کوئی نہ کوئی کمی رہ ہی جاتی ہے۔ اگر کمی محسوس نہ ہو تو

یہ بھی برکتِ عمل اور ترقی کے لئے مانع ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ بندہ عمل کے بعد بھی کمی کو محسوس کرے۔ چنانچہ کالمین اس کو محسوس کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کا احتمال فرماتے ہیں۔

لَا أَحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ

میں آپ کی تعریف کا احاطہ

نہیں کر سکتا۔

کہ میں آپ کی ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ حالانکہ آپ میں فی الواقع کمی نہیں مگر عظمتِ حق پر نظر کر کے آپ فرماتے ہیں کہ میں حق ادا نہیں کر سکتا۔ سو یہ کمی اضافی ہے حقیقی نہیں۔ کیونکہ جو درجہ ثنا کا آپ سے مطلوب ہے اور جو طاعتِ خدا تعالیٰ کو آپ سے مقصود ہے آپ سے اس میں ذرہ برابر بھی کوتاہی نہیں ہوئی مگر آپ جب عظمتِ خداوندی پر نظر کرتے ہیں یعنی عظمتِ حق جس درجہ کو مقتضی ہے جس کے آپ مرکب نہیں ہوئے اور وہ امکانِ بشر سے خارج ہے۔ اس کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمادے ہیں۔ لَا أَحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ کمی کا اپنے اندر محسوس ہونا کمالات میں سے ہے۔ پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہے تو پھر اولیاء تو کیا چیزیں پھر عوام تو کوئی چیز ہی نہیں۔ بہر حال ہم میں طاعت کی کمی ضروری ہے اور اس کمی پر نظر نہیں تو ہمارے اندر خود ایک کمی یہ ہوگی کہ اپنے نقص پر نظر نہیں بہر حال جب ہمارے اعمال پورے نہیں تو ضابطہ کا مقتضا تو یہ ہے کہ ہمیں کچھ جزا اور اجر بھی نہ ملے۔ ویسے اللہ تعالیٰ افضل فرماوے تو وہ اور بات ہے ان کے فضل کو کون روک سکتا ہے۔ باقی ہم ضابطہ سے جزائے موعود کے

کسی طرح مستحق نہیں۔ اور واقع میں مستحق تو اتنی کے بھی نہیں تھے۔ اگرچہ اعمال میں کمی بھی نہ ہوتی جتنا وعدہ ہے۔ وعدہ کے اعتبار سے غیر لازم استحقاق ہے مگر اب کمی کی صورت میں اس کے بھی مستحق نہیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اے اللہ! ہم نے کام ہی کیا کیا ہے پھر جزا کیسے ملے گی۔ اور یہ سب باتیں موٹی ہیں مگر چونکہ ہم کو فکر نہیں اس لئے ذہن میں نہیں آتیں ورنہ جن حضرات کو فکر ہے ان کی حالت دیکھو۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے کیسے متواصل فکر تھے۔ کسی وقت قلب مبارک آپ کا بے چینی سے خالی نہ تھا۔ باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی کہ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل، تمام ملائکہ سے افضل اور پھر احتمال بازہ پرس کا بھی نہیں۔ اول تو اس وجہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر کوئی بات بازہ پرس کی تھی ہی نہیں۔ اگر شاید خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو احتمال بھی ہوتا بازہ پرس کا تو اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اطمینان کر دیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں فرما دیا۔

يَغْفِرُ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ
مَنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ
تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے
پچھلے گناہ بخش دیں۔

یہاں ایک عاشقانہ نکتہ ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذنب کا اطلاق کیا گیا۔ حالانکہ واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر ذنب سے پاک ہیں۔ یہ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مجھ سے کچھ گناہ ہو گیا ہو۔ تو اس شبہ کو بھی رفع فرما دیا گیا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے عاشق

اپنے محبوب سے رخصت ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میری خطا معاف کر دیجئے گا۔ حالانکہ عاشق سے خطا کا احتمال کہاں۔ خصوصاً ایسا عاشق جو عشق کے ساتھ عقل بھی کامل رکھتا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی نشان ہے۔

اولیاء اللہ ایسے ہوئے ہیں۔ جن سے باوجود کمال

شغل اور استغراق

عشق کوئی امر خلاف عقل اور دین کے صادر نہیں ہوا

شیخ عبدالحق دہلویؒ باوجود غایت استغراق کے فرماتے ہیں کہ

”منصور بچہ بود کہ از یک قطره بفریاد آمد۔ اینجا مردانہ کہ دریا با
فرہ برد و آرد و غ نزنند۔“

منصور بچہ تھا کہ ایک قطره شراب عشق سے شور و غل کرنے لگا۔
یہاں ایسے رہا اور مرد ہیں کہ دریا کے دریا پی جاتے ہیں اور
ڈکار تک نہیں لیتے۔

حضرت شیخ علی احمد صاحبؒ بارہ سال تک مراقبہ میں مشغول رہے

کچھ ہوش نہ تھا۔ حتیٰ کہ پیر کے یہاں سے مزاج پرسی کے لئے ڈوم آیا تو آپ
کو تیروی گئی کہ شیخ کے یہاں سے ڈوم آیا ہے۔ آپ نے سراٹھا کر اتنا فرمایا
کہ پیر اچھے ہیں۔ کہا، جی ہاں! خیریت سے ہیں۔ اور اُس کی یہ خاطر کی کہ آپ
گو لہ پھیکے بلانمک کے کھایا کرتے تھے۔ اُس روز فرمایا کہ آج گو لہوں میں نمک
ڈال دینا۔ اُس بیچارے کے تو زخم پر نمک چھڑکا گیا۔ وہ تو بڑی بڑی خاطروں
کا خوگر تھا۔ اُس نے واپس ہو کر شیخ سے بڑی شکایت کی کہ حضرت انہوں نے
تو آپ کو بھی زیادہ نہیں پوچھا۔ صرف کچھ دیر کو آنکھیں کھول کر اتنا پوچھا تھا کہ

شیخ اچھے ہیں۔ اس کو سن کر شیخ پھرک گئے اور فرمایا اُن کی محبت ہے کہ ایسی حالت میں مجھ کو یاد رکھا۔

دیکھئے حضرت صابر صاحبؓ اس قدر تو مشغول و مستغرق تھے مگر بارہ سال تک ایک وقت کی نماز وقت سے ٹلی نہیں۔ عوام الناس اہل کمال کو کیا جانیں وہ تو بھنگڑوں کو جانتے ہیں جو نماز بھی نہ پڑھیں۔ استغراق محمود وہ ہے جو سنت کے دائرہ سے خارج نہ ہونے والے۔ غرض انبیاء علیہم السلام کی تو بڑی شان تھی، اولیاء اللہ ایسے ایسے گزرے ہیں جن کا دین غالب تھا عشق پر اور اُن کو استغراق میں بھی دین سے غفلت نہ ہوتی تھی۔

غم اور فکر | نگر چونکہ ہم خالی ہیں اس غم سے کیونکہ ہمارے اوپر دوسرا غم ضرور رسال مسلط ہو گیا ہے (یعنی غم دنیا) اس لئے ہم کو دین کے کاموں میں خللاوت محسوس نہیں ہوتی۔ باقی جن کو یہ غم حاصل ہے اُن کی تو اُس غم سے یہ حالت ہے۔

خوشا وقت شوریدگانِ عیش اگر ریش بینند و گریہ پیش
اُس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے۔ اگر غم دیکھتے ہیں تو اُس پر مسرہم رکھتے ہیں۔

گدایانے از پادشاہی غور با امیدش اندر گدائیِ صبور
ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے ہیں اور اُس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہیں۔

دنا دم شرابِ الم در کشند و گریہ تلخ بیست دم در کشند

ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں۔ جب اس میں رنج کی کڑواہٹ
دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں۔

ان اشعار کی بندش بتلا رہی ہے کہ سچا مضمون ہے۔ کیونکہ ان اشعار کا
قلب پر اثر پڑتا ہے اور جتنا ہے۔ جو بات دل سے نہیں ہوتی اس کا اثر اول
تو ہوتا نہیں۔ اگر عارضی طور پر ہو جاتا ہے تو باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ رنگین و عظمین
کہ بعض لوگوں کو رونا آجاتا ہے مگر مجلس سے اٹھے اور سب فرج جاتا رہا۔

عرض اہل علم کی یہ حالت ہے مگر ہمیں دین کا علم ہی نہیں۔ اسی لئے اگر
ہم تقویٰ بھی اختیار کرتے ہیں تو وہ بھی نام ہی کا ہوتا ہے۔ ورنہ اس کی بھی یہ
حالت ہوتی ہے کہ کسی چیز سے لڑتا ہی نہیں۔ ہمارا تقویٰ کیا ہے؟ بی بی تمیزہ
کا وضو ہے کہ شوقِ مجاہد سے بھی نہیں لڑتا تھا۔

ایک بی بی تمیزہ تھی فاسقہ قاہرہ۔ کسی بزرگ نے اس کو وضو کرایا، نماز
پڑھوائی اور نصیحت کی کہ نماز پڑھتی رہنا۔ ایک عرصہ کے بعد وہ بزرگ جو پھر
اُدھر آئے تو ان بزرگ نے پوچھا کہ پابندی سے نماز بھی پڑھتی ہو؟ کہا، جی
ہاں! فرمایا، وضو بھی کرتی ہو؟ تو کہتی ہے کہ آپ جو وضو کرا گئے تھے میں اسی
سے پڑھ لیتی ہوں۔

یہ حکایت تو کتابی ہے۔ ایک حکایت مولانا رفیع الدین صاحب کی
بیان کی ہوئی ہے کہ ایک سقہ کو وضو کرا دیا اور خیال کیا کہ یہ تو ہر وقت پانی
میں رہتا ہے۔ اس کو کیا مشکل ہے وضو کرنا۔ اس لئے کوئی خاص تاکید نہیں کی
کچھ روز کے بعد دیکھا کہ وہ سقہ بے وضو نماز میں اکھڑا ہوا۔ اس سے پوچھا کہ

یہ کیا تو وہ کہتا ہے کہ جی اُس دن وضو کرا نہیں دیا تھا۔
 وضو پر ایک لطیف بات یاد آگئی۔ اللہ تعالیٰ کی کیا رحمت ہے کہ وضو
 میں وہی اعضاء دھونے کو بتلائے ہیں کہ اگر نہ بھی بتلاتے تو ضرورت کی وجہ
 سے اُن کو ویسے بھی دھوتے ہیں۔ سو کوئی کام بڑھایا نہیں۔ حق تعالیٰ کے
 حکام کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مریض طبیب کے پاس گیا اور کہا کہ گوشت
 کھانے کو طبیعت چاہتی ہے۔ طبیب نے کہا کہ گوشت تو مضر ہوگا۔ مگر طبیب
 غیبی بھی ہے۔ اُس نے کہا کہ گوشت کھا لینا مگر اس میں دھنیے کی پوٹی ڈال لیا
 کرو۔ ایسا طبیب کہاں ملے جو طبیعت کے موافق دوا اور غذا بتلائے۔ حق تعالیٰ
 کا ہر تعلیم ایسی ہی ہے۔ چنانچہ وضو میں وہی اعضاء دھونے کا حکم دیا جن کو ہم خود
 بھی دھوتے ہیں۔ کیونکہ ان ہی پر گرد و غبار کا زیادہ اثر ہوتا ہے مگر اتنا بتلا دیا
 کہ اس ترتیب سے دھو لیا کرو۔ جو امور فطرت کے مناسب تھے وہی تجویز
 فرمائے بشرطیکہ فطرت سلیمہ ہو۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا میں اس کو کہہ رہا تھا کہ بعض کا تقویٰ ایسا ہے
 جو کبھی ٹوٹتا ہی نہیں۔ چاہے کچھ ہی کر لیں۔ نہیں کر فرمایا کہ، ہاں پیروں کے ٹوٹنے
 سے نکاح تک ٹوٹ جاتا ہے۔

اس پر ایک پیر کی حکایت یاد آئی۔ کسی مرید نے نکاح پڑھنے کے لئے
 اُن کو نہ بلایا۔ دوسرے کسی آدمی سے نکاح پڑھوا لیا۔ پیر نے سمجھا کہ یہ تو بُری
 رسم نکلی۔ اس سے تو بڑا نقصان ہوگا۔ وہ اُس کے گھر پہنچا اور کہا کہ بغیر ہمارے
 کسی نے نکاح پڑھایا ہے۔ بہت نوحا ہوئے اور کہا کہ میں ابھی اس کو ادھیڑتا

ہوں۔ بس بیٹھ گئے پڑھنے وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا قسم ہے آفتاب کی اور اس کے
 روشنی کی (اُدھیر بے نکاحا۔ تمام آیتوں میں اسی طرح جوڑ لگاتے چلے گئے
 کہا ایک دو آیت اور رہی ہے بس اُدھیر اہی چاہتا ہے۔ اس بیچارے سے
 پانچ روپے نکال کر دے ویسے اور کہا اچی ایسا منت کر وہ

سو ہم جو اپنے تقویٰ طہارت کو ایسا سمجھتے ہیں کہ زوال کا خوف ہی نہیں
 و جو اس کی یہ ہے کہ ہم کو وہ غم نہیں جس سے فکر ہو۔ اسی غم کو ان اشعار میں
 فرمایا ہے اور چونکہ صاحب مشاہدہ کا سچا مضمون ہے اس لئے مؤثر ہوتا
 ان کا اثر دل پر پڑتا ہے۔ غیر صاحب مشاہدہ کے کلام میں اثر نہیں ہوا کرتا
 عارف شیرازی کے کلام میں بھی اسی لئے بے حد اثر ہے کہ وہ صاحب مشاہدہ
 ہیں۔ ان اشعار کو پھر دہراتا ہوں ہے

خوشا وقت شوریدگانِ عمش اگر دیش بینت و گریہ ہمیش
 گدایانے از بادشاہی تصور یا مبدیش اندر گدائیِ صنوبر
 و نادم شرابِ الم در کشند اگر تلخ بینت دم در کشند

محبت اور عمل

یعنی اہل اللہ اس غم میں بھی خوش رہتے ہیں یہ غم ایسی
 ہے کہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ

نعمت پر مسرور ہیں۔ یہ قید ایسی ہے کہ اس کا قیدی رہائی نہیں چاہتا ہے
 ایسے شخص خواہد رہائی نہ پسند شکارش بخود خلاص از کمند
 اس کا قیدی قید سے چسکارا نہیں چاہتا۔ اس کا شکار کمند سے خلاصی
 نہیں چاہتا۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی معشوق عاشق کو اسپانک پیچھے سے آکر
 بغل میں زور سے دبا لے کہ ہڈی پسلی ٹوٹنے لگے۔ اول بے خبری سے ذرا گھبرا یا
 اس گھبرانے کو دیکھ کر معشوق کہتا ہے کہ اگر تمہارا جی گھبراتا ہو، پریشانی ہو، تکلیف
 ہو تو چھوڑ دوں۔ تمہاری آزادی میں خلل پڑ گیا ہو تو چھوڑ دوں۔ اگر عاشق صادق
 ہے تو جواب میں یہی کہے گا۔

اسیرت نخواہد رہائی زبند شکار ت نخوید خلاص از کند
 نیز ا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اور نیز ا شکار کند سے چھکارا نہیں
 ڈھونڈتا۔

اور یوں کہے گا کہ بھائی خدا نہ کرے کہ مجھ کو اس قید سے رہائی ہو۔ جس کو
 یہ قید نصیب ہو گئی ہے وہ اس سے نکلنا کب چاہے گا۔ اسی طرح حضرت جب
 دین کا غم ہو جائے گا تو حقیقت کا ادراک ہو گا۔ اس وقت اپنی کمی اعمال میں محسوس
 ہونے لگے گی اور اس کمی کے احساس سے بعض اوقات دل شکستگی اور مایوسی کی
 نوبت بھی آسکتی ہے۔ ایسوں کی تسلی کے لئے فرمایا گیا ہے۔ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ
 أَحَبَّ یعنی اگر تم نے کوشش کی مگر پھر کمی رہ گئی تو غم مت کرنا، دل کو مت توڑنا
 پریشان مت ہونا۔ تم ان ہی کے ساتھ ملحق ہو جاؤ گے جن سے غم کو محبت
 ہے۔ غرض اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ ایسے شخص کی تسلی کے لئے فرمایا گیا
 ہے نہ کہ بے عملوں کے لئے۔

جیسے کوئی شخص کام میں کوشش کرے اور اس کا معلوم ہو کہ اس نے پوری
 کوشش کی ہے اور اتفاق سے کام میں کچھ نقص رہ جاوے تو اسیرت کی بوقت

اُس کو پوری مزدوری دیتے ہیں اور انہی کام کرنے والوں کے ساتھ لاسحق کرتے ہیں جن کے کام میں کوتاہی واقع نہیں ہوتی۔ یہ معنی ہیں اس حدیث کے اور گو مفید خالی محبت بھی ہے۔ یعنی اگر محبت بھی نہ ہوتی تو اُس کے اعتبار سے یہ خالی محبت بھی مفید ہے مگر یہ تو نہیں کہ عمل کی ضرورت ہی نہ رہے۔ بڑی محبت ہی محبت کافی ہو جاوے گو عمل کچھ بھی نہ ہو۔

اس کا ایک راز ہے۔ وہ یہ کہ بدون عمل کے جو محبت ہوتی ہے، اُس محبت میں بھی ثبات اور قوت نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شیخ کے دو مرید ہوں ایک تو ہوتے دوسرا غیر متبع۔ تو متبع ہی کی محبت قابل اعتبار ہوگی۔ اور دوسرا اس کی یہ ہے کہ جو اتباع کرتا ہے وہ شیخ کو پہچانتا ہے۔ روزمرہ شیخ کے ساتھ اس کی معرفت بڑھتی ہے اور معرفت سے محبت بڑھتی ہے بخلاف اُس شخص کے جو متبع نہیں وہ شیخ کو پہچانے ہی کا نہیں۔ تو اُسے محبت کہا خاک ہوگی۔ اُس کے نزدیک تو پیر اگر اُس کی مرضی کے خلاف ہوا تو پیر ہی نہ رہے گا۔ اور متبع شخص کی یہ حالت ہے کہ اگر پیر سے لغزش بھی ہو جاوے تو وہ موازنہ کرتا ہے اُس لغزش کا اُس کے کمالات کے ساتھ۔ پھر کمالات کو غالب دیکھتا ہے تو بد اعتقاد نہیں ہوتا اور اُس کی لغزش کو خیال میں بھی نہیں لاتا اور اس پر محمول کرتا ہے۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِسُونَ

پس جن لوگوں کی ترازو کا پلٹا
بھاری ہوگا وہی لوگ کامیاب

ہیں۔

اُس کو ایسا خیال کرتا ہے جیسے کوئی حسین ہو مگر اُس کے پھرے پر ایک

کامالات بھی ہو کہ وہ بھلا ہی نظر آتا ہے۔ اس تل پر اہل عرب کا مذاق یاد آیا عرب کی عجیب تشبیہات تھیں۔ اشعار کہا کرتے تھے کہ اُس کے چہرہ پر ایسا تل ہے جیسے میدان میں اونٹ کی منگنی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے یہ تہذیب لختی، اہل عرب کی۔ اُن کو تو اسلام ہی نے کام کی باتیں سکھلائیں۔ بعد کے اشعار دیکھئے وہ کیسے اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ عرب کو اونٹ بہت محبوب تھے۔ اسی واسطے ہر جگہ اُن ہی کا تذکرہ تھا۔ اس لئے محبوب کے تل کو بھی تشبیہ دی تو منگنی سے اگر اسلامی شعراء کے یہاں یہ مضمون ہوتا تو اور عنوان سے ہوتا۔

غرض یہ ہے کہ جو پیر کے کمالات کو جانتا ہے تو وہ اُس کی لغزش کو تل کی مثل سمجھے گا اور جس کی نظر کمالات پر نہیں اُس کے نزدیک معمولی لغزش بھی بلکہ غیر لغزش بھی پہاڑ کے برابر ہوگی۔

ایک شخص نے ایک بزرگ کی نسبت یہ کہا تھا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں کہ ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے یہاں ایک بی بی تھیں۔ انہوں نے ایک بزرگ کو پانخانے سجانے ہوئے دیکھا تو کہنے لگیں یہ کیسے بزرگ ہیں جو پانخانہ بھی کرتے ہیں۔ اسی بنا پر شریف عبداللہ نے بدوؤں کو اپنی ولایت کا معتقد بنانے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ اور یہ انتظام کیا تھا کہ وہ اُن کے پانخانہ پیشاب کی اطلاع کسی کو نہ ہونے دیتے۔ جہلاء کا اعتقاد ہی کیا۔ بس جاہل لوگ اُن کی ولایت کے قائل تھے۔ اُن کا یہ خیال جم گیا تھا کہ شریف صاحب پانخانہ پیشاب نہیں کرتے۔ اس لئے ولی ہیں۔

ایک شخص ایک معمولی بات پر میرے معتقد ہونے لگا اور ایک معمولی

بات پر غیر معتقد ہو گئے۔ معتقد تو اس بات پر ہوئے تھے کہ میں نے ایک شخص سے تین روپے نہ لئے تھے جو مجھ کو ہدیہ دینا چاہتے تھے۔ بس اتنی بات پر معتقد ہو گئے اور کئی سال تک معتقد رہے۔ اور غیر معتقد اس پر کہ ان کو دنیا کا ایک کام پیش آیا۔ انہوں نے مجھ سے سفارش چاہی۔ میں نے انکار کر دیا۔ بس غیر معتقد ہو گئے۔ کہنے لگے یہ کیسے بزدگ ہیں کہ ایک مسلمان کی سفارش نہیں کرتے۔

تادان کی دوستی | بس نادان کی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے۔ الف بیلی میں ایک حکایت جاہل کی دوستی کی لکھی ہے کہ ایک شخص قاضی کی لڑکی پر عاشق تھا اور وہ بھی اس کو بلاقی تھی مگر موقع نہ ملتا تھا۔ جمعہ کا دن آیا تو اس نے خیال کیا کہ آج اچھا موقع ہے۔ سب لوگ نماز کے لئے چلے جائیں گے۔ میدان خالی ہوگا۔ اس سے کہلا بھیجا، مگر اس نے خیال کیا کہ خوب کے پاس ابھی ہیٹ سے جانا چاہئے۔ چنانچہ ایک حجام کو بلا کر خط بنوانے کا ارادہ کیا۔ وہ نانی اس قدر بکی تھا کہ ذرا سا خط بنا لیا اور پھر بک مارنے لگا اور یہ شخص ادھورا خط چھوڑ کر اٹھ بھی نہیں سکتا۔ حجام بخوبی جھی تھا۔ کبھی خط کو چھوڑ کر دھوپ میں جا کھڑا ہوا، کبھی اسطرلاب نکال کر ارتفاع شمس کو دیکھتا غرض اس نانی نے ایسے قصے پھیلا دیئے کہ جمعہ کا وقت بھی گزرنے لگا۔ یہ شخص اس سے پیچھا چھڑا کہ معشوقہ کے مکان میں گیا۔ نانی صاحب بھی خیر خواہی سے جا کر مکان کے باہر ایک تخت پڑا تھا، اس پر بیٹھ گئے۔ جب قاضی صاحب جمعہ سے واپس ہو کر مکان پر آئے۔ گھر میں جا کر کسی غلام پر رخا ہو کر

اُس کو مارنے لگے، وہ رونے چلانے لگا۔ حجام صاحب سمجھے شاید میرے میاں پکڑے گئے اور پٹ رہے ہیں۔ فوراً مدد کے لئے پہنچ گئے اور کہنے لگے کہ اپنی بیٹی کو نہیں کہتا، اسی نے تو میرے اُقا کو بلا یا ہے۔ غرض راز فاش ہو گیا۔ وہ اُقا ڈرا کہ اب پکڑا سجاؤں گا۔ بیچارہ اندہ مکان کے اس حال کو معلوم کر کے کہیں کو چھپ کر بھاگا اور چھت پر سے کودا۔ پاؤں ٹوٹ گیا۔ جانے کس طرح پیچھا چھڑا کر وہاں سے بچا۔ نادان کی دوستی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک رئیس کے ہاں ایک ریچھ پلا ہوا تھا۔ جب وہ رئیس سونا تو ریچھ اُس کی مکھیاں جھلا کرتا۔ ایک روز اتفاق سے مکھیوں نے بہت زور باندھا۔ ریچھ اڑتے اڑتے دق ہو گیا۔ اُس نے دل میں کہا کہ اچھا میں تمہارا علاج بناؤں گا۔ جب مکھیاں اچھی طرح اُقا کے منہ پر بیٹھ گئیں، اُس نے بڑا سا پتھر لاکر اُن مکھیوں کے مارا۔ مارا تو تھا مکھیوں کے وہاں اُقا صاحب ہی کا پکنا چور ہو گیا۔ غرض نادان کی دوستی ہی کیا بلکہ مضر اور ایذا دہ ہے۔

اسی لئے حضرت مولانا گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میرے ایک مرید کو ہٹا دے تو فی مرید ایک آنہ اور مولوی کے ہٹانے پر فی مولوی چار آنہ لے لے۔ غرض یہ ہے کہ جو شخص نادان ہے اُس کو شیخ سے بھی برائے نام ہی محبت ہوگی۔ نادان کی دوستی رہ نہیں سکتی۔ وہ معمولی بات کو بھی بزرگی کے خلاف سمجھ گا۔ اور غیر معتقد ہو جائے گا۔ اُس کی نظر جہل کے سبب اکثر عیوب ہی کی طرف زیادہ ہوگی اور کمالات کو تو وہ جانتا ہی نہیں اُن پر تو اُس کی نظر کیا ہوتی۔ سچی محبت اسی کو ہوگی جس کو شیخ کی معرفت ہوگی اور شیخ کی معرفت

اُس کے اتباع سے ہوگی۔ جیسا اوپر قریب ہی مذکور ہوا۔ پس من احب
 پورے طور پر وہیں صادق اُسے گا جہاں اتباع ہو اور جہاں اتباع نہ ہوگی
 محبت بھی کامل نہ ہوگی۔ اسی درجہ کے لئے عبد اللہ بن مبارک کہتے ہیں۔

تعصی الاله وانت تطهر حبه

هذا العزيم في الفعالي بديع

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا ہے اور اُس کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے

اپنی جان کی قسم یہ فعلوں میں انوکھی بات ہے

لو كان حبك صادقا لاطعته

ان الغيب لمن يحب يطيع

اگر اس کی محبت میں صادق ہوتا تو اس کی فرمانبرداری کرتا۔ اس

لئے محبت کرنے والا محبوب کی اطاعت کیا کرتا ہے۔

مگر اس وقت مجھیں بہت ہی کم ہو گئے ہیں جو قبیح ہوں

ان محبت کا دم بھرنے والے بہت ہیں۔ ان کی مثال

احکام و آثار

وہی ہے۔ جیسے ایک بدوی کو کسی نے دیکھا کہ زار زار روتا رہا ہے اور ایک

گناہ کے پاس پڑا ہے۔ اُس نے رونے کا سبب پوچھا تو کہا، میرا کتا

مارے بھوک کے جہاں بدب ہے۔ اُس کے فراق میں روتا ہوں۔ اُس

شخص کی نظر ایک تھیلے پر پڑی جس میں روٹی کے ٹکڑے بھرے ہوئے

تھے۔ اُس نے بدوی سے کہا کہ اس تھیلے میں کیا ہے۔ کہا روٹی کے ٹکڑے

ہیں۔ کہا پھر اس کو کھلاتا کیوں نہیں۔ کہنے لگا۔

گفت ناید بے درم در راه نان یک ہمت آب و ویدہ ایگان
روٹی تو بغیر پیوں کے راستہ میں نہیں ملتی لیکن آٹنو تو مفت کے

ہیں۔

یعنی اتنی محبت نہیں کہ روٹی خرچ کر دیں اور آٹنو تو مفت کے ہیں پھر
آٹنو کی جگہ دس بہادوں کا اور روٹی کو لگے ہیں وام۔ پس محبت روٹنے کی ہے
کھلانے پلانے کی نہیں ہے۔

مغرض یہ ہے کہ غیر تبع کو محبت نہیں ہوتی یعنی کامل۔ اور یہ قاعدہ ہے
کہ قابل اعتبار وہی چیز ہوتی ہے جو معتد بہ درجہ میں ہو۔ جیسے رائی کا دانہ ترازو میں
رکھا جائے تو اس کا وزن تو ضرور ہوتا ہے۔ اگر ایک دانہ میں وزن نہیں تو ویسے
ہی دانے بہت سے ڈال کر ترازو کا پتہ کیسے جھک گیا۔ یہ تو سب کو مستلم ہے
کہ ایک دانہ میں وزن ضرور ہے مگر چونکہ اس پر آثار مرتب نہیں ہوتے۔ اس
لئے اس کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ نہ شریعت نے اعتبار کیا ہے نہ اہل عرف نے۔
گو فلاسفہ کے نزدیک یہ بات مافی ہوتی ہے کہ جب چوٹی زمین پر چلتی ہے
تو ساری زمین کو حرکت ہو جاتی ہے اور دلیل سے یہ بات سچی ہے۔ مگر سننے
والوں کو تعجب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس پر احکام و آثار مرتب نہیں دیکھے
جانتے۔ اس لئے قابل اعتبار نہیں سمجھا۔ اسی طرح احکام شریعیہ و حسیہ میں وہی چیز
معتبر ہوگی جس پر احکام و آثار مرتب ہوں۔ پس محبت وہی معتبر ہوگی جس پر
آثار مرتب ہوں یعنی جس میں آثار ہو وہی محبت قابل اعتبار ہوگی، نرا اُجبت
کچھ بھی نہیں۔

مخلاصہ یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے مطلب کی حدیث یاد کر لی ہے اپنے
کو عمل سے فارغ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ صَلَاحَةُ الْحَقِّ اُرِيدَ بِهٖ الْبَاطِلُ ہے
یعنی اَلْمَرْءُ مَعَ أَحَبِّ بِالْكَلِّ حَقٌّ ہے مگر اس سے اپنے مطلب کے لئے
باطل مراد لیا گیا ہے جس کو خدا تعالیٰ نے بھی رد کیا ہے۔

چنانچہ غزوہ اُحُد کے متعلق فرماتے ہیں۔

غزوہ اُحُد

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُم مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمْنَةً نَّفَاسًا
يَغْشَىٰ طَائِفَتَيْنِ مِّنْكُمْ وَطَائِفَةٌ مَّقْدَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ فَذُوقُوا
يَا لَلَّذِي غَيَّرَ الْحَقَّ عَلَيْنَ الْجَاهِلِيَّةِ ط يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ
مِنْ شَيْءٍ ط قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ ط يُخَفُّونَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ
مَا لَا يُبَدُّونَ لَكَ ط يَقُولُونَ لَوْ كَانَتْ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ
مَا قَتَلْنَا هٰهٰنَا ط قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ
عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلَى مَفَا جِعِهِمْ ؕ وَ لِيُنَبِّئَنَّ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ
وَلِيُخَوِّعَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔

پھر تم پر اتارا تنگی کے بعد امن کو۔ ۱۰۵ اونگھ تھی کہ گھیر رہی تھی تم میں
سے بعضوں کو اور بعضوں کو فکر پڑی تھی اپنی جان کی۔ خیال کرتے
تھے اللہ پر۔ جھوٹے خیال جاہلوں کے سے کہتے تھے کچھ بھی کام
ہے ہمارے ہاتھ میں۔ تو کہہ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہے
اپنے جی سے چھپاتے ہیں جو تجھ سے ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں
اگر کچھ کام ہوتا ہمارے ہاتھ میں تو ہم مارے نہ جاتے۔ اس جگہ

آپ کہہ دیجئے اگر تم ہوتے اپنے گھروں میں البتہ باہر نکلتے جن پر لکھا تھا مارا ہی جانا اپنے پڑاؤ پر۔ اور اللہ کو آزمانا تھا، جو کچھ تمہارے جی میں ہے اور نکھارنا تھا جو کچھ تمہارے دل میں ہے اور اللہ کو معلوم ہے دل کی بات۔

یہ حاصل سے مدلول آیات کا غزوہ اُحد میں اول غلبہ مسلمانوں کو تھا اور اُتار فتح کے نظر آتے تھے۔ اس کے بعد مسلمانوں سے بے حکمی ہوئی اور شکست ہوئی۔ اُس میں بہت سے شہید ہو گئے اور جو میدان میں باقی رہے اُن پر اونگھ آئی اور اس کے بعد سب رُعب و وحشت جاتی رہی۔ سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو کر پھر لڑائی قائم کی۔ جو لوگ اُس میں ضعیف الایمان تھے انہوں نے کہا۔ هَلْ لَنَا مِنَ الْأُمْرِ شَيْءٌ۔ ظاہر معنی تو اس کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا سو کیا ہمارا کیا اختیار ہے اور یہ معنی نہایت اچھے ہیں مگر اُن کی نیت میں یہ نہ تھا۔ بلکہ نیت میں یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے مشورہ پر عمل نہ کیا جو اتنے لوگ مرے۔ اگر ہمارے مشورہ پر عمل کرتے، تو کیوں مارے جاتے۔ حق تعالیٰ نے انکار فرمایا۔ فرماتے ہیں يَخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ کہ دل کی بات آپ سے ظاہر نہیں کرتے۔ اُن کے دلوں میں تو یہ ہے لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأُمْرِ شَيْءٌ مَا تَلَانَا هَهُنَا کہ اگر ہمارے مشورہ پر عمل کیا جاتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ اگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم گھروں میں بھی ہوتے تو بھی موقع پر آکر مارے جاتے پتھر نہیں سکتے یہ تمہارا غلط خیال ہے۔ اس آیت میں یہ جو کلمہ ہے هَلْ لَنَا مِنَ الْأُمْرِ

شئی۔ یہ کلمہ تو حق ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں اللہ نے جو چاہا سو کیا، مگر انہوں نے اس سے باطل مراد لیا۔ کیونکہ ان کی نیت میں دوسری بات تھی کیونکہ ان کی مراد یہ تھی کہ لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ لَنَأْمُرَنَ الْأَمْرَ شَيْئًا مَا قَتَلْنَا هَهُنَا پس یہ قول اھل لَنَا مِنْ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ دیکھا کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں منافقین کا ہے اور وہ علی الاطلاق کفر کی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ ذو وجہین بات کہہ سکتے تھے۔ چنانچہ یہ بات انہوں نے ذو وجہین کہی۔

اس کا ایک محل تو حق ہے۔ وہ محل حق یہ ہے کہ وہ اعتقاد قادر ظاہر کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے اختیار میں کوئی چیز نہیں سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو اس نے چاہا وہ کیا۔ ظاہر تو یہ کر رہے ہیں مگر ان کے دل میں یہ تھا کہ اگر ہمیں اختیار ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ پس وہ ظاہر تو کچھ کر رہے تھے اور دل میں ان کے کچھ اور تھا۔ سامنے تو اعتقاد حق ظاہر کیا جو اسلام کے موافق ہے اور دل میں یہ کہ اگر یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا یعنی اگر ہمیں اختیار ہوتا تو مارے نہ جاتے۔ یہ اعتقاد اسباب کے مؤثر ہونے کا ہے۔ اور یہی ان کا عقیدہ تھا کہ اسباب مؤثر بالذات ہیں۔ پس اسی پر

يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا
يَبْدُونَ لَكَ
اپنے جی میں چھپاتے ہیں جو تم
سے ظاہر نہیں کرتے۔

مرتب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں تو کچھ ہے اور ظاہر کچھ کر رہے ہیں۔ آگے اس کو بیان فرماتے ہیں۔

يَقُولُونَ لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ
کہتے ہیں کچھ بھی کام ہے ہمارے

الْأَمْرُ مِنْ شَيْءٍ مَا قَاتَلْنَا هُنَا لَا تَحْتَمِلِينَ -

کہ ان کے دلوں میں یہ ہے کہ اگر ہمارا اختیار ہوتا تو ہم مارے نہ جاتے۔
اگے اس کا رد ہے۔

قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ الْخَوَافِ
کہہ دیجئے اگر تم گھروں میں بھی
ہوتے۔ الخ

مطلب یہ ہے کہ یہ تمہارا خیال باطل ہے۔ تم کہیں بھی ہوتے جن کے
لئے قتل لکھا گیا تھا تو وہ یہیں آکر قتل ہوتے اور جا نہیں سکتے تھے۔ غرض اس آیت
سے ان کی تائید ہو گئی کہ سچی بات سے جھوٹی بات مراد لینا کس قدر برا ہے
یہی حال ہے اس شخص کا جو الْمَدْعُوعُ مَعِ مَنْ أَحْبَبَ سے غرض باطل یعنی عدم
ضرورت عمل پر تمسک کرتا ہے۔

اس حدیث کی طرح ہم نے اور چند
حدیثیں بھی یاد کر رکھی ہیں۔ جیسے

دَاخِلُ جَنَّةٍ بِسَبْحَةِ الْفَجْرِ

مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ
جس نے لا الہ الا اللہ کہا،
دَخَلَ الْجَنَّةَ۔
جنت میں داخل ہو گیا۔

اس سے اپنے نفس کے موافق یہ مراد لے لی کہ بس یہی کافی ہے۔ نہ کسی
عمل کی ضرورت ہے نہ کسی گناہ سے بچنے کی حاجت۔ جو جی چاہے کرتے
پھر و بس لا الہ الا اللہ کہہ لو سیدھے جنت میں چلے جاؤ گے۔ یہ بھی وہی کلمۃ
الحق۔ اُرِيدَ بِهَا الْبَاطِلُ دیکھ تو سق ہے مگر اس سے مراد باطل لی گئی ہے۔
اگر کوئی کہے کہ ہم نے جو اس حدیث میں کہا ہے خود اسی حدیث ہی

میں آگے مصرع ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَأَنْ زُكِّنَ وَإِنْ سَحِقَ

یعنی اگر چہ وہ زنا کرے اور چوری کرے

تب بھی جنت میں داخل ہوگا۔ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعد لا الہ الا اللہ کہہ لینے کے کچھ بھی کرتا پھرے کچھ مضر نہیں۔

جواب یہ ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اعمال مامور بہا رجن کا ملو کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بجالانے اور معاصی سے بچنے کی ضرورت نہیں بلکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ زنا و سرقر سے ایمان نہیں جاتا۔ اس ایمان کی برکت سے کبھی نہ کبھی جنت میں داخل ہو جائے گا۔ گو بعد سزا سہی۔ تو اعمال کی عدم ضرورت اس سے کیسے ثابت ہوئی۔ جیسے جہلاء کا زعم ہے کہ جو جی چاہے کرتا پھرے کچھ بھی حرج نہیں۔ اور موٹی بات ہے کہ اگر صرف لا الہ الا اللہ کافی ہوتا اور کسی عمل کے کرنے یا گناہوں کے چھوڑنے کی ضرورت نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیوں اعمال کی تاکید فرماتے اور گناہوں پر وعیدیں کیوں ارشاد فرماتے۔ یہ تو بہت آسان بات تھی۔ اسی کی تعلیم فرما دیتے۔ نیز جب آپ ہی سے اعمال ساقط نہ ہوئے تو اور کس سے ساقط ہو سکتے ہیں۔ دیکھئے آخر صحابہ میں کوئی بھی سمجھ دار تھے یا نعوذ باللہ سارے ناواقف ہی تھے۔ کیا صحابہ نماز نہیں پڑھتے تھے اور اعمال نہیں کرتے تھے۔ کیا صرف لا الہ الا اللہ پیرس کرتے تھے ان کے واقعات دیکھ لیجئے دین پر ان کو کیسی توجہ تھی۔ مستحب تک کو چھوڑنا بہت برا خیالی کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ صرف تمہارا مذاق۔ یہاں دلائل

کا یہ مفہوم نہیں۔ صرف نفس کو اعمال کی مشقت سے بچانے کے لئے تم نے
جیسے تلاش لٹی ہیں۔ کیا آیت

وَلَطَّلْتُ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ
چاہئے کہ عمل کریں۔
اس کی مثل عمل کرنے والوں کو

اول حدیث

مَنْ تَوَكَّأَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا
فَقَدْ كَفَرَ
جس نے نماز کو قصداً چھوڑ دیا
وہ کافر ہو گیا۔

وغیرہ یہ نصوص نہیں ہیں۔ کیا آپ کو صرف ایک ہی نص ملی۔ مجھے تو شرم آتی ہے
ایسی ظاہر بات کی تفصیل کرتے ہوئے۔ غرض یہ بات

رِجَالٌ لَا تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ
نہیں غافل کرتی۔
ایسے بندے ہیں جن کو تجارت

جس کی اس وقت تفصیل کی گئی ہے اُن ہی اعمال کو تہلکہ ہی ہے جن کی
حق تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے۔

اب وہ صفات سنئے کیا ہیں۔ بعضے ایک لہجہ اور جہالت
میں گرفتار ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم تو ذات کے عاشق ہیں

ہمیں جنت و دوزخ سے کچھ سروکار نہیں۔ اس لئے ہمیں عمل کی کیا ضرورت
ہے۔ عمل تو وہ کرے جو جنت کو لینا چاہے۔ ہمیں اس سے مطلب ہی نہیں۔

ہم تو ذات کے عاشق ہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ ذات کے عاشق کو زیادہ عمل کرنا
چاہئے۔ جنت تو مختصر سے عمل میں مل جاتی ہے۔ ذات کی طلب میں تو بڑی

مشققت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ کے قرب کے لئے اور زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔ اب ان اعمال کو سفیئہ ارشاد فرماتے ہیں۔
 لَا تَلْهَيْهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ
 ان کو تجارت اور خرید و فروخت
 عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ الْخ
 اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں
 کرتی۔

اپنے اچھے بندوں کی ایک صفت یہ ارشاد فرمائی کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو غافل نہیں کرتی تجارت اور بیع ذکر اللہ سے۔ اس صفت کا حاصل ایک غلطی کا رفع ہے اور اسی غلطی کی وجہ سے لوگوں میں عمل کی ہمت نہیں رہی۔ آج کل کے غیر محقق و عظیمین نے عقل کو کھو رکھا ہے۔ ایسی ایسی حکایات لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کی ہمت باقی نہیں رہتی۔ اور وہ غلطی یہ ہوئی ہے کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ دین کا کام کرنے سے آدمی دنیا سے جاتا رہتا ہے۔ اس لئے وہ دین کا کام نہیں کرتے۔

تو خوب سمجھ لیجئے کہ دین کا کام کرنے سے آدمی دنیا سے نہیں جاتا بلکہ جس وقت آدمی کو دین کا شوق ہوتا ہے تو ضروری دنیا تو اور زیادہ آسانی سے ملتی ہے البتہ فضول دنیا خود رخصت ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے چراغ کے جلنے سے تاریکی جاتی رہتی ہے۔ جب چراغ آیا تو اندھیرا کہاں۔ باقی ضروری دنیا میں تو اور زیادہ برکت نصیب ہوتی ہے تو ضروری اور مفید دنیا دین کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ پس بہت لوگ جو کہتے ہیں کہ دنیا کے تعلقات جب سب ختم ہو جائیں تب دین اختیار کریں۔ یہ خیالی محض غلط ہے۔ البتہ دین میں

یہ ضروری ہے کہ کمال پر غیر اللہ یعنی جو دنیا مضر ہے وہ خود رخصت ہو جاتی ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھو کہ دین پر چلنے سے بیٹا مر جائے گا۔ بہن مر جائے گی۔ مال و دولت سہا تا رہے گا۔ سو دنیا کی دولت رخصت نہیں ہوتی۔ البتہ ان چیزوں کے مضر تعلقات رخصت ہو جاتے ہیں یعنی بیٹے کے ساتھ جو تعلق اب ہے محبت کا جو صاحب عن اللہ ہے وہ نہیں رہتا۔ جو تعلق بیٹے کے ساتھ اب ہے وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہو جائے گا۔ سب چیزیں فنا ہوتی ہیں مگر فنا کے وہ معنی نہیں جو عوام کے نزدیک ہیں کہ آدمی کو کہیں کی بھی خبر نہ رہے نہ کھانے کی نہ پینے کی نہ اپنے تن کی۔ سو یہ معنی نہیں۔ فن کی کتابیں دیکھئے تو معلوم ہو۔ پڑھے لکھے لوگ بھی کتابیں پڑھتے ہیں مگر تدبر نہیں کرتے۔ فنا کا حاصل ہے فضول تعلقات کا سہا تا رہنا۔ یعنی دنیا کی چیزوں سے جو تعلق اب ہے وہ نہیں رہتا بلکہ وہ تعلق خدا کے ساتھ ہو جاتا ہے اور یہ بھی نہیں کہ یہ چیزیں کسی درجہ میں محبوب بھی نہ رہیں ان سے بالکل ہی بے تعلق ہو جائے۔ ان سے کوئی فاسطہ ہی نہ رہے۔ یہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی محبت مغلوب ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی عزر نہیں کہ ان چیزوں کے ساتھ بھی محبت کا تعلق ہو۔ مگر غالب تعلق اللہ کے ساتھ ہو۔ چنانچہ حق تعالیٰ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

قُلْ إِنَّ كَاتِبَاتِكُمْ وَأَبْنَاكُمْ وَمَوَالِيكُمْ وَأَمْوَالٌ بِنَاتِكُمْ وَمَوَالٍ بِنَاتِكُمْ وَأَمْوَالٌ بِنَاتِكُمْ وَأَمْوَالٌ بِنَاتِكُمْ
وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ بِنَاتِكُمْ وَأَمْوَالٌ بِنَاتِكُمْ وَأَمْوَالٌ بِنَاتِكُمْ وَأَمْوَالٌ بِنَاتِكُمْ
كَسَادَهَا وَمَسْكِنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ
وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ

بِأَمْرِهِ ط

کہہ دیجئے کہ اگر باپ تمہارے اور بھائی تمہارے اور بیٹے تمہارے اور بیویاں تمہاری اور قبیلہ اور کنبہ تمہارا اور مال جو کماٹے ہیں تم نے اور سوداگری جس کے مندا ہونے سے ڈرتے ہو اور گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، اگر یہ چیزیں تم کو زیادہ پیاری ہوں اللہ سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے پس انتظار کرو یہاں تک کہ لاؤے اللہ اپنا حکم۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ یہ صورت تو بڑی ہے کہ یہ چیزیں احب ہوں یعنی زیادہ محبوب ہوں اللہ سے۔ معلوم ہوا کہ اگر کم محبوب ہوں تو مضائقہ نہیں۔ آیت میں زیادہ محبوب ہونے کی مذمت کی گئی ہے یعنی یہ چیزیں زیادہ محبوب نہ ہونی چاہئیں۔

باقی اگر کسی کو شبہ ہو کہ اس میں تو مساوات کی نفی نہیں کی گئی کہ یہ چیزیں محبت میں مساوی بھی نہ ہوں

اہل اللہ کی حالت

تو اس سے شبہ ہوتا ہے کہ مساوات میں مضائقہ نہیں۔ حالانکہ یہ بھی خلاف ہے مساوات بھی نہ ہونا چاہئے۔ وہ بھی ایسی ہی بڑی ہے جیسے زیادہ احب ہونا بڑا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال ہی نہیں۔ اس لئے مساوات سے بحث ہی نہیں کی کیونکہ برابر ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ مشاہدہ ہے اور جو چیز واقع نہیں ہوتی اس سے بحث نہیں ہوتی۔ وہ تو خود ہی خارج ہے۔ پس بہت لوگ جو

یہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت ہوگی تو یہ چیزیں چھٹ جائیں گی۔ سو یہ بات نہیں یہ چیزیں چھوٹیں گی نہیں البتہ خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت ہونے سے ان چیزوں کی محبت کم ہو جاتی ہے جو خود مفید ہے کیونکہ محبت کم ہونے سے پریشانی کم ہو جائے گی۔ کیونکہ پریشانی کی حقیقت ہے کسی متوقع چیز کا چھٹ جانا اور جب محبت کم ہوگی اس کی طرف التفات بھی نہ ہوگا۔ تو اس کی تمنا اور توقع بھی نہ ہوگی۔ جب توقع ہی نہ ہوگی تو پریشانی کیسی۔ بلکہ وہ چیز ہوتی ہے اور نہ ہوتی، دونوں حالتیں برابر ہوں گی۔ جیسے کسی کو اولاد کی تمنا ہو تو اس کو نہ ہونے سے پریشانی ہوگی اور جو تمنا ہی نہ ہو تو کیا پریشانی ہوگی۔ اہل اللہ کو کسی چیز کے جاننے رہنے سے اسی لئے پریشانی نہیں ہوتی کہ ان کو کسی چیز کی تمنا ہی نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے پاس کسی امیر نے ایک بیش قیمت موتی ہڈی بھیجا۔ خادم نے پیش کیا۔ فرمایا، الحمد للہ! اور حکم دیا کہ اس کو رکھ لو۔ خادم نے رکھ لیا۔ اتفاق سے وہ موتی چوری ہو گیا۔ خادم نے یہ واقعہ بھی عرض کیا۔ ان بزرگ نے فرمایا، الحمد للہ! خادم کو بڑا تعجب ہوا۔ اس نے دوسرے وقت پوچھا کہ حضرت! مجھے بڑی ہیرت ہے۔ وہ یہ کہ جب موتی سٹور میں آیا تھا تو اس وقت بھی آپ نے الحمد للہ فرمایا تھا اور ضائع ہونے کی خبر معلوم ہو کر بھی یہی الحمد للہ فرمایا۔ اس میں کیا راز ہے؟ آنا اور جانا دونوں پر کیسے خوشی ہو سکتی ہے۔ فرمایا میں نے نہ اُنے پر الحمد للہ کہا نہ سجانے پر۔ بلکہ جس وقت آیا تھا میں نے قلب کو دیکھا کہ اُسے پر کچھ خوشی نہیں ہوئی۔ اس پر

میں نے الحمد للہ کہا تھا۔ اسی طرح جانتے رہنے پر میں نے قلب پر کچھ درج نہیں پایا۔ اس لئے میں نے الحمد للہ کہا۔ یہ حالت ہے اہل اللہ کی۔

اسی طرح ایک اور قصہ ہے کہ کسی امیر نے ایک بزرگ کی خدمت میں ایک چینی آئینہ بہت قیمتی ہدیہ بھیجا تھا۔ وہ بزرگ کبھی کبھی اس میں اپنا منہ دیکھا کرتے تھے۔ اتفاقاً وہ آئینہ خادم کے ماتھے سے گر کر ٹوٹ گیا۔ اس کو بڑا ہی ڈر ہوا کہ دیکھتے کیا ہوگا۔ کیسا جلال آئے گا۔

جلال پر ایک مضمون یاد آیا۔ وہ یہ کہ خدا کے اسماء کو لوگ جلالی اور جمالی کہتے ہیں۔ یہاں تک تو صحیح ہے۔ واقعی اسمائے باری تعالیٰ بعض جلالی ہیں اور بعض جمالی مگر لوگوں نے جو ان سے مراد نہ رکھی ہے وہ غلط ہے۔ لوگوں کے نزدیک جلالی ان اسماء کو کہتے ہیں جن کے پڑھنے سے وبال پڑے گری پیدا ہو، جنون پیدا ہو جائے اور جو اسماء ایسے نہ ہوں ان کو جمالی کہتے ہیں۔ سو یہ تفسیر محض غلط ہے۔ کہیں خدا کے نام سے بھی وبال اور نحوست یا جنون پیدا ہوتا ہے۔ لغو باللہ! بلکہ جلالی وہ ہیں جن میں معنی قہر کے پائے جاتے ہیں جیسے قہار، جبار، عزیز اور جمالی وہ ہیں جن میں معنی لطیف کے پائے جاتے ہیں، جیسے رحمن، رحیم، کریم، لطیف۔ سو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ میں دونوں صفتیں ہیں۔

اسی معنی کے اعتبار سے بعض بزرگوں کو بھی لوگ جلالی کہتے ہیں کہ ان کو غصہ بہت آتا ہے۔ سو یہ صحیح ہے کہ بزرگوں کو غصہ آتا ہے مگر اس میں مصالح ہوتے ہیں۔ پس ان کا جلال بھی مشتمل برجمال ہوتا ہے۔ جیسا حق تعالیٰ

کے قہر کے ساتھ بھی لطف ملا ہوا ہوتا ہے۔

اس لطف پر ایک آیت یاد آئی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَلَوْ يُوَاحِدُ اللَّهُ النَّاسَ

بِظُلْمِهِمْ مَا تَوَكَّلَ عَلَيْهَا

مِن دَابَّةٍ۔

ہیں سب کو ہلاک کر ڈالتے۔

نظاہر یہاں مقدم اور تالی میں ملازمت کا تعلق نہیں معلوم ہوتا کیونکہ مواخذہ تو ہو آدمیوں سے اور ہلاک ہوں و واب بھی۔ اگر یوں فرماتے تو ملازمت کا تعلق ہوتا۔

وَلَوْ يُوَاحِدُ اللَّهُ النَّاسَ

بِظُلْمِهِمْ مَا تَوَكَّلَ عَلَيْهَا

مِن النَّاسِ۔

فرماتے تو زمین پر کوئی آدمی نہ بچتا۔

سو بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آدمیوں کو ڈرا بھی رہے ہیں جو قہر و جلال ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کا شرف بھی بتلا رہے ہیں جو لطف و جمال ہے تقریر اس کی یہ ہے کہ اگر انسان سے مواخذہ کیا جاتا تو سارے عالم کو اس لئے درہم برہم کر دیا جاتا کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے انسان ہی کے واسطے ہے جب یہ نہ رہتا تو کچھ بھی نہ رہتا۔ سبحان اللہ! جن پر غصہ ہے ان کی شرافت و مقصودیت بھی ظاہر کی جا رہی ہے۔ صاحبو! واقعی تم بڑے مرتبہ والے ہو

مگر افسوس ہم لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر تدبیر نہیں کرتے اگر تدبیر کرتے تو اللہ تعالیٰ کے عرصہ میں بھی رحمت نظر آتی اور اس سے ہمارے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی۔ اسی طرح اہل اللہ بھی عرصے ہوتے ہیں مگر ان کے عرصہ کے اندر رحمت بھی ہوتی ہے۔ واقعات کو دیکھو تو معلوم ہو کہ وہ کتنی رعایتیں کرتے ہیں۔ چنانچہ جن بزرگ کا واقعہ میں بیان کر رہا تھا کہ خادم کے ماتھے سے ان کا آئینہ چینی ٹوٹ گیا جو موجب عتاب و عقاب ہوتا۔ مگر اس میں بھی ان کی رحمت کا ظہور ہوا۔ وہ اسی طرح کہ خادم کو جب عتاب کا ڈر ہوا تو اس نے سوچا کہ بزرگ زندہ دل ہوتے ہیں۔ لاؤ شاعری بگھاڑو۔ خوش ہو کر کچھ نہ کہیں گے۔ چنانچہ وہ حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ ج

از قضا آئینہ چینی شکست

آپ فی البدیہہ فرماتے ہیں۔ ج

خوب شد اسباب خود بینی شکست

یعنی اس آئینہ کا بھی جھگڑا ہی تھا۔ خود بینی کا سبب تھا، اچھا ہو لوٹ گیا۔ پاپ گنا۔ یہ حالت ہوتی ہے اہل اللہ کے دنیوی تعلقات کی کہ ان کو کسی چیز کے نہ آنے سے فرحت ہو، نہ جانے سے غم۔ اسی القطار تعلق کو کہتے ہیں۔

تا بدانی ہر کراینہ داں بخواند از ہمہ کار جہاں بیکار ماند
 جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا بنا لینے میں اس کو تمام دنیا کے کار و بار سے بیکار کر دیتے ہیں۔

اُن کا یہ مطلب نہیں کہ زراعت، تجارت، بی بی بی بیچے سب چھوٹ جاتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن سے دل کو کوئی خاص لگاؤ اور تعلق نہیں رہتا بلکہ خاص لگاؤ اللہ تعالیٰ سے ہو جاتا ہے۔

مکہ میں کثرت سے ایسے دکاندار ہیں جن کی یہ حالت ہے کہ دکان پر سودا لئے بیٹھے ہیں اور دلائل الخیرات پڑھ رہے ہیں، قرآن مجید کی تلاوت کر رہے ہیں، ذکر میں مشغول ہیں۔ کوئی خریدار آیا سودا دے دیا۔ پھر ذکر اللہ میں مشغول ہو گئے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ ٹھنڈی دیر بیٹھ کر جب بقدر ضرورت مل گیا دکان بند کی اور گھر کو بلکہ اکثر حرم شریف کو چل ویٹھے۔ بس اتنا تعلق ہے اُن کو دنیا کی چیزوں سے۔

رزقِ حلال کا اثر | ایک شخص عبداللہ شاہ تھے دیوبند میں جو گھاس بیچتے تھے جو ملتا تھا اُس میں سے ایک حصہ اپنی والدہ کو دیتے اور ایک حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے اور باقی اپنے خرچ میں لاتے۔ انہوں نے ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور دوسرے حضرات کی دعوت کی۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ دعوت کہاں سے کرو گے۔ تمہارے پاس ہے ہی کیا۔ کہنے لگے کہ جو حصہ خیرات کا نکالتا ہوں، اُسی سے دعوت کروں گا۔ غرض پابنخ اُنے جمع کئے اور حضرت مولانا کے پاس لائے اور کہا کہ تم ہی پکا لیجو۔ میں کہاں جھگڑا کروں گا۔ اگر دنیا دار بھی اس طرز کو اختیار کر لیں تو کیسا اچھا ہو۔ وہاں تھے کئی اور پیسے کل پابنخ اُنے۔ بزرگوں مہانوں کا مشورہ ہوا کہ کوئی کستی سی چیز تجویز کی جائے۔ پنا نچہ بیٹھے سچا دل گڑ کے تجویز ہوئے۔

بڑی احتیاط سے پکائے گئے۔ کوری ہانڈی منگائی گئی۔ پکانے والے کو وضو
 کرایا گیا۔ غرض ہر طرح کی احتیاط کی گئی۔ وہ چاول تھے ہی کتنے۔ ایک ایک
 دو لقمے کھائے۔ مولانا خود فرماتے تھے کہ ان دو لقموں کی یہ برکت دیکھی کہ
 ایک ماہ تک قلب میں الوار و برکات محسوس ہوتے تھے۔ ایک ماہ کامل یہ
 اثر رہا۔ اور میں کہتا تھا کہ جس کی کماٹی کے ایک لقمہ کا یہ اثر ہے تو جو دن بات
 اسی کو کھاتا ہے، اُس کی کیا حالت ہوگی۔

صاحبو! اگر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل محبت ہوگی تو یہ بات
 پیدا ہو جائے گی۔ پس اہل اللہ دنیا کو ضروری تو سمجھتے ہیں مگر الضوری بتقدیر
 بتقدیر الضوری ان کا مشرب ہوتا ہے یعنی ضروری چیز بقدر ضرورت ہی
 اختیار کی جاتی ہے۔ وہ حضرات بقدر ضرورت دنیا کو حاصل کرتے ہیں جیسے
 تم پانخانہ میں جاتے ہو تو کیا وہاں تفریح کے لئے جاتے ہو بلکہ ضرورت رفع
 کرنے کو۔ اور جہاں ضرورت رفع ہو گئی بس باہر نکل آئے۔ اسی طرح ان کے
 نزدیک دنیا ایک حاجت کی چیز ہے۔ تفریح کی چیز نہیں، دل لگانے کی جگہ
 نہیں۔ بس اللہ کی محبت میں یہ اثر ہوتا ہے کہ دنیا کی چیزوں سے ضروری تعلق
 رہ جاتا ہے زیادہ نہیں ہوتا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

تا بدانی ہر کراہی زوال بخواند از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

تعلق باللہ کا تعلق دنیا پر اثر
 پس یہ جو کہا جاتا ہے کہ اللہ کی محبت
 سے دنیا جاتی رہتی ہے تو اُس کے

معنی یہی ہیں کہ اُس کو دنیا سے تعلق و محبت نہیں رہتی۔ یہ معنی نہیں کہ وہ سوائے

حقوق کو معطل کر کے بیٹھ رہے۔ وہ کرتا سب کچھ ہے مگر دل اور ہی طرف رہتا ہے۔ بس یہ کیفیت ہوتی ہے کہ دل پیار دست بکار۔ دنیا داروں کی طرح نہیں کہ ہر وقت دنیا ہی میں ان کا دل رہتا ہے۔

چنانچہ ایک شاعر تھے ان کو نماز میں بھی شعر ہی کی سوچتی تھی۔ جہاں کوئی مصرعہ موزوں ہوا نماز توڑ دیتے اور شعر لکھ لیتے۔ ایسے ہی دنیا داروں کا مذاق ہے کہ اگر نماز کے وقت گاہک آگیا تو یوں سمجھتے ہیں کہ اگر نماز جماعت سے پڑھی اور دیر لگ گئی تو گاہک بھاگ جائے گا۔ اور مولوی صاحب کہتے ہیں کہ نماز جماعت سے پڑھو۔ یہ بڑی مشکل بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جانے کے بعد دنیا کی چیزوں سے ایسا تعلق نہ رہے گا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دی جائے۔ باقی وہ کمانے میں تم سے اچھا رہے گا۔

ہمارے قریب گاؤں میں ایک شخص ہیں ایک گاؤں میں کھیتی کرتے ہیں اور کھیتی بھی عجیب طریقہ سے۔ ایک بیل تو ان کے پاس ہے اور دوسرا بیل ضرورہ کے وقت کرایہ پر لے لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تیسرے چوتھے سال دس پانچ روپے کسی سے قرض بھی لے لیتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اتنا نکل پیدا ہو جاتا ہے کہ سال بھر کو کافی ہو جاتا ہے اور دین کی یہ حالت ہے کہ کام بھی کرتے ہیں اور ذکر میں بھی مشغول رہتے ہیں۔ اطمینان ان کے اندر اس قدر دیکھا کہ ایسا اطمینان ہوتا مشکل ہے۔ بیماری (انفلوئنزا) جو پھیلی تھی تو لوگوں کے دلوں کی کیا حالت تھی سب جانتے ہیں کہ کیسی پریشانی سب کو تھی۔ وہ اسی حالت میں میرے

پاس آئے تھے۔ خوشی کے ساتھ کہنے لگے کہ یہ بھی ایک شان ہے اللہ کی کہ ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ ذرا ہراس اُن پر نہ تھا۔ ویسے وہ دیکھنے میں گنوار ہیں۔ کوئی پڑھے لکھے آدمی نہیں۔ مگر فہم کی یہ حالت ہے کہ پڑھے لکھوں سے زیادہ فہم ہیں۔

دین اور فہم | دین سے فہم بھی درست ہو جاتا ہے۔ اسی درست فہم پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک شخص گنوار حضرت مولانا گنگوہی صاحب

کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مولوی جی، مجھے مرید کر لو۔ حضرت نے فرمایا، اچھا بھائی آ۔ مرید کرتے ہوئے جو باتیں کہلاتے ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھا کرو سب کچھ کہلو الیا۔ جب مولانا اپنی باتیں پوری فرما چکے تو آپ کہتے ہیں کہ مولوی جی تم نے افیم سے تو توبہ کر لی نہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی مجھے کیا خبر کہ تو افیم بھی کھاتا ہے۔ حضرت چونکہ طبیب بھی تھے، جانتے تھے کہ دفعۃً ایون کا چھوڑنا مشکل ہے اور طالب کی حالت کی رعایت ضروری ہے۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ کتنی کھایا کرتے ہو میرے ہاتھ پر رکھ دو۔ اُس نے گولی بنا کر حضرت کے ہاتھ پر رکھ دی۔ حضرت نے اُس میں سے کچھ کم کر کے باقی اُس کو دے دی اور فرمایا کہ اتنی کھا لیا کرو۔ پھر مشورہ کر لینا۔ وہ شخص کچھ دیر خاموش بیٹھ کر کہنے لگا۔ اہی مولوی جی جب توبہ ہی کر لی۔ پھر اتنی اور اتنی کیا۔ یہ کہہ کر ایون کی ڈبیہ نکال کر دیوار پر ماری اور یہ کہا کہ اہی افیم، جہاں میں نے تجھے چھوڑ دیا۔ میں یہ کہہ کر چلا گیا نہ ذکر پوچھا نہ مشغل۔

ایون کے چھوڑنے سے دست اُٹنے لگے۔ اُس نے کہلا کر بھیجا

کہ مولوی جی دعا کر دیجیو کہ میں اچھا ہو جاؤں مگر افیم نہ کھاؤں گا۔ عرض بڑی حالت تک نوبت پہنچی، مرتے مرتے بچا۔ مگر اچھا ہو گیا۔ تندرست ہو کہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے پوچھا کون؟ کہا میں ہوں افیم والا اور سارا قصہ بیان کیا۔ اس کے بعد دو روپیہ پیش کئے۔ مولانا نے کسی قدر عذر کے بعد دلجوئی کی۔ اور روپیہ قبول فرمائے۔ تو آپ کہتے ہیں کہ اچی مولوی جی! یہ تو تم نے پوچھا ہی نہیں کہ یہ کیسے روپیہ ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی اب تیار سے کیسے روپیہ ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ روپیہ افیم کے ہیں۔ حضرت نے پوچھا کہ افیم کے کیسے۔ اس نے کہا کہ میں دو روپیہ مہینہ کی افیم کھاتا تھا جب میں نے افیم سے توبہ کی تو نفس بڑا خوش ہوا کہ اب دو روپیہ ماہوار بچیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ تو دین میں دنیا مل گئی۔ بس میں نے نفس سے کہا کہ یہ یاد رکھو کہ یہ روپیہ تیرے پاس نہ چھوڑوں گا۔ یہ مدت سمجھ کہ تجھے دے دوں گا بلکہ اسی وقت نیرت کر لی کہ جتنے کی افیم کھایا کرتا تھا وہ پیر کو دیا کروں گا پس یہ دو روپیہ ماہوار آپ کے پاس آیا کریں گے۔

دیکھا آپ نے یہ گنوار کی حکایت ہے جس کو پڑھنا لکھنا کچھ نہ آتا تھا مگر دین کی سمجھ ایسی تھی کہ دین میں دنیا کی آمیزش کو فوراً سمجھ گیا۔ یہ وہ بات ہے کہ اچھے اچھے لوگوں کی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ کامل بزرگوں سے ایسے واقعات منقول ہیں۔

حضرت شیخ ابوالحسن نورانی کا واقعہ ہے کہ ایک جہاز میں بیس ملے شراب کے خلیفہ وقت کے واسطے آئے تھے۔ آپ بھی دریا کے کنارے

ٹہلنتے ہوئے پہنچے۔ جہاز والے سے پوچھا کہ اس میں کیا چیز ہے؟ اُس نے کہا کہ خلیفہ کے واسطے شراب آئی ہے۔ آپ نے مشکوں کو توڑنا شروع کیا۔ انہیں توڑ دیئے صرف ایک مشکا باقی رہ گیا تھا کہ اُس کو آپ نے چھوڑ دیا۔ اس واقعہ کی خبر خلیفہ کو پہنچی خلیفہ کو غصہ آیا اور اُن کے پکڑ لانے کا حکم حاضر کئے گئے۔ خلیفہ نے ایسی جرات کی وجہ دریافت کی تو آپ نے کہا حق تعالیٰ کا حکم ہے

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ

حکم کہ کرنے کا اور روک برائی سے جو تکلیف تجھ کو پہنچے اُس پر صبر کر۔

خلیفہ نے پوچھا کہ ایک کو کیوں چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ اس کے توڑنے میں نفس کی آمیزش ہو گئی تھی۔ اس لئے چھوڑ دیا۔ وہ اس طرح کہ جب میں انہیں مشکے توڑ چکا تو نفس کے اندر خیال ہوا کہ تو نے بڑا کام کیا کہ خلیفہ کی بھی پروا نہ کی۔ اس بات پر نفس بھولا۔ تو میں نے ایک کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ کام خالص اللہ کے واسطے رہا تھا۔ خلیفہ پر اس اخلاص کا یہ اثر ہوا کہ اُن کا معتقد ہو گیا اور محتسب شہر بنا دیا۔ اسی طرح نفس کی کید کی طرف اُس گنوار کا فہم بھی پہنچا۔

یہ حکایت (گنوار کی) اس پر یاد آگئی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ دین اختیار کرنے سے آدمی کا فہم بھی درست ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کو وہ باتیں منکشف ہوتی ہیں جو علماء کو بھی نہیں ہوتیں۔ یہ تو نعمت معنوی تھی باقی حسی نعمتیں بھی ایسے شخص کو اور دل سے زیادہ عطا ہوتی ہیں۔

چنانچہ سب نعمتوں کی روح اطمینان ہے اور
 اس شخص کو اطمینان کہ اگر خاص دین کے ہو

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

جاؤ گے تو اوروں سے اچھے رہو گے، ایسا بیسرا ہوتا ہے جو مال سے بھی کبھی
 حاصل نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک اور بات کہتا ہوں کہ دنیا کی چیزوں سے اگر تعلق
 کم ہو گیا تو ضرر کیا ہوا بلکہ تعلق کم ہونے سے تو اور قید سے رہائی ہو جائے گی
 بہر حال یہ اثر ہے دین میں کہ دنیا کا فکر و غم کم ہو جائے گا۔ یہ خود اس میں
 خاصیت ہے۔

باقی بعضوں کا یہ خیال بالکل ہی غلط خیال ہے کہ پہلے دنیا کے سب کام
 پورے کر لیں، اس کے بعد دین حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ دنیا کا سلسلہ تو کبھی ختم
 ہی نہیں ہوتا۔ ع

کار سے دنیا کسے تمام نہ کرو

بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ ساری عمر دنیا کے قصوں میں گزر جاتی ہے۔
 دین کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ بس اگر کامیابی کی صورت ہے تو یہی ہے کہ دین کا
 کام شروع کر دو۔ یہ انتظار ہی مت کر و کہ پہلے دنیا کا کام تمام کر لیں پھر دین کا کام
 کریں گے۔ دین کی روشنی پھیلنے سے فضول دنیا کی ظلمت خود ہی جاتی رہے گی
 اور میں تو کہتا ہوں کہ اگر اس کی ہمت نہ ہو، تو چلو یہ بھی نہ سہی بلکہ یوں کر و کہ دونوں
 کو ساتھ ساتھ شروع کر دو۔ دنیا سے فارغ ہونے کا انتظار مت کر و۔ دین خود
 دنیا پر غالب آ جاوے گا۔

دنیا کے ساتھ دین شروع کرنے کے متعلق بھی لوگ ایک بڑی غلط فہمی

میں مبتلا ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ طاعت و تجارت میں منافات ہے پھر دنیا کے ساتھ دین کیسے شروع کریں۔ اُن کا یہ خیال ہے کہ دکاندار ہی نہ ہو تب طاعت ہو سکتی ہے۔ دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ حق تعالیٰ اس غلطی کو بھی رفع فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

لَا تُلْهِكُمْ تِجَارَتُكُمْ وَلَا بَيْعُكُمْ
عَنِ
لَعْنَةُ اللَّهِ
یعنی تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت نہیں ڈالتی۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی صفت بیان فرما رہے ہیں کہ اُن کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت نہیں ڈالتی۔ یوں نہیں فرمایا رَجَالَ لَا يُخْبِرُونَ کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ تجارت نہیں کرتے۔ اگر دونوں میں منافات ہوتی تو یوں فرماتے۔ پس معلوم ہوا کہ دونوں میں منافات نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت تو وہ لوگ کرتے ہیں مگر تجارت اُن کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔ ذکر اللہ بیع و تجارت کو چھوڑاتا نہیں البتہ غفلت سے روکتا ہے۔

پھر مجال ایک غلطی تو یہ ہے کہ بعض لوگ یوں خیال کرتے ہیں کہ دنیا کو جب تک بالکل نہ چھوڑ دین، دین کیا اختیار کریں اور دنیا چھوڑنا مشکل اس لئے وہ دین کو اختیار ہی نہیں کرتے حالانکہ دین دنیا کو چھوڑاتا نہیں۔ یہ غلطی تو اُن لوگوں کی ہے جو ہنوز دین کے طالب ہی نہیں ہوئے۔ اس غلطی کا سبب وہی دین و دنیا میں تنافی کا اعتقاد ہے۔

ایک وہ لوگ ہیں جن کے قلب میں دین کی عظمت ہے اور بزعم خود اُس کے طالب بھی ہیں مگر اُن کی یہ حالت ہے کہ جس کو فقیر مَن لیا اُس کی تعظیم

کرنے لگے۔ گو وہ تعظیم شرک ہی کیوں نہ ہو۔ اگرچہ نشا اس تعظیم کا عظمت ہے دین کی مگر اس عظمت میں غلو ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ پیروں ہی کے ہوئے اور بیوی بچوں سے بے تعلق ہو گئے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تجارت اور دین میں تنافی ہے اس لئے دنیا کو بالکل قطع کرتے ہیں۔ اس غلطی کا سبب بھی وہی دین و دنیا کی تنافی کا اعتقاد ہے۔

ایک غلطی نئی تعظیم یافتوں کو ہوتی ہے کہ وہ خالص دنیا کے قصد کو ضروری نہیں سمجھتے۔ انہوں نے اصل اور مقصود بالذات دنیا ہی کو قرار دے رکھا ہے اس کے تابع دین بھی سہی۔ دین کو دنیا کے ساتھ ایسا سمجھتے ہیں جیسا دوپٹے میں سبک اصل مقصود تو دنیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ٹھوڑا لگاؤ دین کا بھی سہی۔ دین کو تنبوع نہیں سمجھتے جیسے کپڑا تو اصل ہے اور سبک اس کے تابع۔ اسی طرح یہ لوگ دنیا کو اصل قرار دے دیتے ہیں کہ اگر وقت نیچے تو خیر دین کا کام بھی کر لو۔ اگر نہ نیچے تو مت کر لو۔

بعض کا یہاں تک خیال ہے کہ مذہب صرف اس لئے ہے کہ دنیا کی ترقی کی جائے۔ بعض کو جنت و دوزخ سے بھی انکار ہے۔ کہتے ہیں کہ صرف ڈرانے کی عرض سے جنت و دوزخ کا ذکر کیا گیا ہے کوئی واقعی چیز نہیں۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر واقعی چیز سے جس کا غیر واقعی ہونا بھی بتلا دیا جائے کیسے تخلیف ہو سکتی ہے۔ جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ جس چیز سے ڈرایا جا رہا ہے اس کا وجود الفاظ ہی میں ہے واقع میں نہیں تو وہ اس سے کیا خاک ڈرے گا۔ پس یہ دعوائے عقل بھی غلط ہوا کہ صرف ڈرانے کی عرض سے دوزخ

کا ذکر کیا ہے۔ جب عقلاً یہ مصلحت محض باطل ہوئی تو یوں کہو کہ فضول ذکر کیا ہے۔ سو ایسا ایمان و اسلام آپ ہی کو مبارک ہو۔ جو خدا کی طرف لغو اور عیب کو منسوب کرے۔ اور اگر عرض بھی کر لو نعوذ باللہ جنت و دوزخ واقعی کوئی چیز نہیں اور اللہ تعالیٰ نے محض بطور پالیسی کے ان کا ذکر کیا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ جب خدا نے ہم کو ڈرایا ہے تو یہ تو معلوم ہو گیا کہ اس کی عرض یہی ہے کہ لوگ جنت و دوزخ کا اعتقاد رکھیں تو پھر اس کی کیا وجہ کہ خداوند تعالیٰ ایک پالیسی قائم رکھنا چاہتے ہیں اور آپ اس کو توڑنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کے وہ یہ بات لازم نہیں کہ خدا کی پالیسی کی حفاظت کریں۔ نہ معلوم ان لوگوں کی عقل کہاں چلی گئی یا مسخ ہو گئی۔

علاوہ اس کے اگر جنت و دوزخ کا وجود نہیں تو ان سے ڈرانا ایسا ہوا جیسے ہوتی سے بچوں کو ڈرایا کرتے ہیں کہ اس کا وجود کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ جھوٹ بولا۔ پھر اس کا بھی قائل ہونے پڑے گا کہ نیر اللہ تعالیٰ بے وقوفوں ہی کے ڈرانے کو ہیں۔ ان حائلوں کے ڈرانے کو نہیں کیونکہ ہوا سے تو بے وقوف ہی ڈرا کرتے ہیں۔ لندن کی ہوا کھانے والے خاک ڈریں گے۔ سبحان اللہ! کیا عظمت کی ہے ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی عنقریب معلوم ہو جائے گا آخرت میں۔ عرض ان لوگوں کے نزدیک اصل تو ہے دنیا باقی دین و مذہب وہ محض دنیا کی حفاظت کے لئے ہے۔

اس طرح سے مشاہدہ ہے کہ مذہب کے برابر کسی چیز
مذہب کا اثر کا اثر نہیں ہوتا۔ جب مذہب کی پابندی ہوگی تو فتنہ فساد

نہ ہوگا کوئی کسی کا حق نہ مارے گا، چوری نہ کرے گا۔ آپس میں اتفاق قائم رہے گا
پس دنیا پر امن ہوگی۔ گویا مذہب اُن کے نزدیک اس لئے بنایا گیا ہے کہ
دنیا کی حفاظت رہے۔

صاحبو! اس سے تو سارا قرآن و حدیث ہی اڑا جاتا ہے۔ پھر چونکہ اصل
مقصود ان کے نزدیک دنیا ہے اور اہل دین مقصود دین کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے
یہ لوگ دین و انول کو بے وقوف بھی سمجھتے ہیں۔ اور اس اعتقاد کا ایک اثر یہ
بھی ہے کہ اپنوں سے بوجہ طالب دین ہونے کے غیر معتقد اور غیر قوموں کی
بوجہ طالب دنیا ہونے کے مدح کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ مذاق ہے۔ دلیل
اس کی یہ ہے چنانچہ دیکھ جاتا ہے کہ مسلمانوں میں جو بات بھی ہے وہ تو ان
کے نزدیک بڑی اور غیر قوموں میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اچھی۔ ہمیشہ اپنے
لوگوں کی بُرائی اور غیر قوموں کی مدح کرتے رہتے ہیں۔

ایک اثر یہ ہے کہ علماء کی بات کو نہیں مانتے کیونکہ ان کو تو یہ قوف
شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ علماء ہمیشہ سے کہتے آ رہے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک
جماعت خالص مذہبی ہونی چاہئے جو محض مذہب کی خدمت کرے مگر
یہ لوگ اُس میں قبیل و قال کرتے رہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اُن کی یہ
ساری قبیل و قال اسی وقت تک رہی جب تک کہ غیر اقوام نے اپنے اندر
ایسی مذہبی جماعت پیدا نہیں کی تھی اور اب جو وہ ایسا کرنے لگے تو یہ بھی اُن
ہی کا دم بھرنے لگے۔ کہ مذہبی جماعت ضرور ہونا چاہئے۔ چنانچہ غیر قوموں کی
دیکھا دیکھی اب کسی قدر یہ بھی علماء کے ہم زبان ہو گئے ہیں۔ بس ان کا مشرب

وہی ہو جاتا ہے جو غیر قوموں کا مشرب ہو جاوے۔ حالانکہ بفضلہ تعالیٰ ہمیں قوموں سے کسی چیز کے لینے کی کچھ بھی حاجت نہیں۔ ہمارے یہاں تو سب کچھ ہے مگر ان کی مثال ایسی ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

یک سب پر ناں ترابر فرق سر تو بھی جوئی لبِ نال در بدر
ایک ٹوکرا روٹیوں کا بھرا ہوا تیرے سر پر رکھا ہوا ہے اور تو
روٹی کا ٹکڑا در بدر مانگتا پھرتا ہے۔

ہمارے یہاں تو جو ہرات بھر سے ہوتے ہیں اور یہ دوسروں سے کوڑیوں کے طالب ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ تقلید کرتے ہیں غیر قوموں کی حالانکہ اپنے یہاں سب کچھ ہے۔

اور طرفہ یہ ہے کہ اس کو رائہ تقلید میں پریشانی بھی اٹھانے
ہیں۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک اچھے صاحب

تھے جنٹلمین، مگر کے غریب تھے اس لئے کوٹ پتون بھی صرف سوئی گبروں
کا تھا۔ جس میں ذرا گرمی نہ تھی۔ جاڑے کا موسم، ریل میں سفر کر رہے تھے اور
جنٹلمین لباس پہنے ہوئے تھے۔ کان بھی کھلے ہوئے سر بھی کھلا ہوا۔ ایک انگریز
نے لیمن پانی اور برف پیا۔ آپ نے بھی تقلید میں برف پیا۔ لیمن اینٹھ گئے
ایک اور صاحب جو مجھ سے اس حکایت کو بیان کرتے تھے اُس دن پوریل بیٹھے
ہوئے تھے۔ اُن کے پاس رضائی تھی۔ اُن کو صاحب بہادر کے حال پر رحم
آیا۔ انہوں نے کہا کہ رضائی لیتے ہو۔ کچھ انکار نہ کیا چپکے سے لے لی۔ سب اینٹھ
مر وڈ نکل گئی۔ خدا کے بندے کو اس حالت میں بھی برف پیارہ گیا تھا۔ مگر صاحب

بہادر کیسے نہیں، اگر ایسا نہ کریں۔ وہی مثل ہے۔

کلاسے تک کبک و رکوش کرد تکب تو شینتین رافرا موش کرد

ایک کوٹے نے چکورد کی چال اختیار کی اپنی چال کو بھول گیا۔

ایک اور صاحب بہادر ریل میں سفر کر رہے تھے اور ایک مولوی

پرانے خیال کے سیدھے ساوے چلن دانے بھی اُن درجہ میں بیٹھے ہوئے

تھے اور اُن کے ساتھ صراحی تھی۔ اُن میں اُنہوں نے پانی بھر کر رکھ لیا تھا کیونکہ

راستہ میں پانی کی کمی تھی۔ آپ صراحی کو دیکھ کر کہتے ہیں یہ کیا بھنگیوں کا سا برتن

لیا ہے۔ اُنہوں نے کہا، جیسا میں ہوں ویسا ہی میرا برتن ہے۔ چو بکر بھارے

ساوے پٹر سے پہن رہے تھے اور ایسے لوگوں کی آج کل کچھ قدر نہیں۔ بلکہ

ایسے لوگوں کو یہ لوگ وقیانوسی خیال کا کہتے ہیں۔ اس لئے اُنہوں نے ایسی

بیباکی کی گفتگو کی۔ صاحب بہادر کو اتفاق سے شدت کی پیاس لگی اور پانی ساتھ

رکھنا خلاف تہذیب تھا۔ اب لگے کن آنکھوں سے مولوی صاحب کی صراحی

کو تکتے مگر شرم کے مارے مانگیں کیسے۔ واقعی کریم انضبی اہل اللہ پر رحم ہے۔

مولوی صاحب کو اُن کی حالت پر رحم آیا۔ کوئی اور ہوتا تو کبھی رحم نہ کرتا۔ اُنہوں

نے قرآن سے معلوم کر لیا کہ اس کو پیاس لگی ہے مگر شرم کی وجہ سے کہہ نہیں سکتے

تو یہ مولوی صاحب بٹکھٹ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے اور غٹوڑی مٹی ہی دیر

میں مٹوڑی خرٹاٹے بھی لینے لگے تاکہ یہ صاحب سمجھیں کہ سو رہے ہیں۔ جب

اپنے خیال میں اُنہوں نے سوتا ہوا سمجھ لیا تو اپنی سبک سے اٹھے صراحی سے پانی

پینے کے ارادے سے۔ یہ بھی چپکے چپکے دیکھتے رہے۔ صاحب بہادر نے

صراحی اٹھائی مگر ڈرتے جاتے ہیں کہ کہیں جاگ نہ جائیں۔ مگر اس وقت انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ اس خیال سے کہ بیچارے غریب کو پانی پی لینے دو پیاسا رہ جائے۔ دیکھتے کیا حوصلہ ہے اہل اللہ کا۔ عرض آپ نے خوب پانی بہا۔ جب پانی پی کر صراحی رکھنے لگے تو مولوی صاحب نے فوراً ہاتھ پکڑ لیا اور کہا، لا میں! آپ نے بھنگیوں کے برتن سے پانی کیسے پی لیا۔ اب تو بڑے خضیف ہوئے اور کہا، معاف کیجئے میں اپنی بات کو واپس لیتا ہوں۔ وہ غج سے حاققت ہوئی۔ پھر جو صاحب بہادر کو معلوم ہوا کہ مولانا کسی اسکول پر و فیسر بھی ہیں۔ اب تو لگے تعظیم کرنے۔

ایسے لوگوں کا ایک فیشن یہ بھی ہے کہ سفر میں بستر بچھونا نہیں لیتے۔ پانچ کا برتن ساتھ نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں کہ جہاں جائیں گے وہاں بستر بچھونا موجود ہے اور پانی اسٹیشنوں پر ملتا ہی ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے۔ کچھ نہیں صرف غیر قوم کی تقلید ہے نواہ اُن میں تکلیف ہی ہو۔

اُن کے اسی مذاق کی بناء پر میں نے الہ آباد میں ایک وعظ میں خضیمینو سے خطاب کیا تھا کہ صاحبو! لندن سے وارٹھی رکھنے کا فتویٰ آنے والا ہے۔ اخبار کی خبر ہے کہ لندن والوں نے اس پر رائے دی ہے کہ وارٹھی رکھنی چاہیے۔ اب قبل اس کے کہ وہ لوگ وارٹھی رکھیں تم جلدی وارٹھی رکھ لو۔ کیونکہ اگر اب نہ رکھی اور بعد میں تو ضرور ہی رکھو گے تو لوگ مطعون کریں گے کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے سے تو نہ رکھی اور لندن والوں کے کہنے سے رکھی۔ اس لئے ابھی سے رکھ لو تاکہ بدنامی نہ ہو۔

اسی طرح علماء کی اس بات کو کہ ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو محض دین کی خادم ہو اور کوئی کام اس سے نہ لیا جاوے کسی نے نہیں مانا تھا۔ مگر ابھی تھوڑے دنوں سے ہندوؤں نے یہ کام شروع کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ایک جماعت مذہبی ایسی ہونی چاہئے جو صرف مذہب کی خدمت کرنے والی ہو اور کوئی کام اس کے متعلق نہ ہو۔ بس دن رات یہی کام کیا کرے، تو مسلمان بھی کچھ کچھ سمجھنے لگے۔

غرض ان کو شب و روز دنیا ہی مقصود ہے۔ مذہب کو یہ لوگ محض اس لئے اختیار کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے مصالح دنیا محفوظ رہیں۔ باقی دین کو دینی حیثیت سے اختیار نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دینی امور کو از خود اختیار کرتے۔ اسی کو پسند کرتے۔ دوسری قوموں کے کیوں غلط رہتے۔ بس ایک غلطی ان لوگوں کی یہ ہے کہ دنیا کو اصل مقصود اور دین کو تابع قرار دیتے ہیں حالانکہ

لَا تُلْهِكُمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ تجارت اور خرید و فروخت ان
عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ کو اللہ سے غافل نہیں بناتی۔

کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا شو و مقصود نہیں بلکہ دین اصل مقصود ہے۔ اگر دنیا مقصود ہوتی تو یوں فرماتے لَا تُلْهِكُمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ یعنی ذکر اللہ کے شغل سے تجارت میں غفلت نہیں ہوتی۔ اب تو یوں فرما رہے ہیں کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دین ہے۔

یہ مسئلہ تو مسلمانوں کے نزدیک بالکل بدیہی
بلکہ حسی ہے کہ اگر دین مقصود نہ ہوتا تو انبیاء

بعثت انبیاء کا مقصد

علیہم السلام کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام نے دنیا
کمانے کے طریقے نہیں بتلائے ہیں۔ صرف احکام بتلائے ہیں اور چونکہ عقلی
مسئلہ ہے کہ فعل کا اثر قول سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے میں پوچھتا ہوں کہ
اگر دنیا مقصود تھی تو اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا نمونہ کیوں
نہیں بنایا۔ اس طرح سے کہ آپ کا کوئی کارخانہ ہوتا اور بہت بڑا کارخانہ ہوتا
جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دین میں بے مثل نمونہ بنے تو دنیا میں بھی بنتے۔
مگر احادیث ویکھ لیجئے کہ آپ کس چیز کا نمونہ تھے۔ اگر حدیث صحیح نہیں
دجیسا کہ ان میں سے بعض کا خیال ہے، تو تاریخ تو موجود ہیں (تو تاریخ ان
حضرات کا دین ایمان ہے، تو تاریخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات
دیکھئے کہ کیا تھے۔ معلوم ہو جائے گا کہ دنیوی اعتبار سے آپ کی کیا حالت
تھی۔

میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب
تادیباً اپنی پیپیوں کے پاس جانے کی ایک مہینے کے لئے قسم کھالی تھی اور
مشہور یہ ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو طلاق دے دی ہے۔
اور اس پر سب لوگ رو رہے تھے۔ اس حالت میں حضرت عمرؓ نے آپ
کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی مگر اجازت نہیں ہوئی۔ حضرت
عمرؓ کو شبہ ہوا کہ شاید آپ کو خیال ہوا ہے کہ حفصہؓ کی سفارش کرتے آئے

ہیں اور اگر ایسا ہوا تو ان کی سفارش مانتی پڑے گی۔ اس لئے اجازت نہیں ملی۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے پکار کر عرض کیا کہ میں حفصہؓ کی سفارش کرنے نہیں آیا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ فرمائیں تو میں حفصہ کا سر اتار لاؤں میں صرف واقعہ معلوم کرنے آیا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آنے کی اجازت دے دی۔

وہ حاضر ہوئے۔ اس کے بعد ان کی نظر دولت خانہ کی ہیئت پر پڑی تو دیکھا کہ گدے میں کھجور کے پٹھے بھرے ہوئے ہیں اور کچھ چمڑے تلکے بوڑھے تھے۔ بس یہ کائنات جتنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان کی نہ کیس نہ الہامی نہ میز نہ کرسی نہ بنگلہ نہ کوٹھی نہ اور کوئی ساز و سامان۔ اس حالت کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کے آنسو جاری ہو گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یہ قبیر و کبریٰ خدا تعالیٰ کے دشمن، صلیب پرستی کرنے والے، ان کے پاس تو یہ ساز و سامان اور آپؐ کی یہ حالت۔ آپؐ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ آپؐ کی امت پر دنیا کی وسعت فرمائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب سے یہ نہیں کہا کہ آپؐ پر وسعت فرمائیں۔ جیسے کہتے ہیں کہ آپؐ کے خادموں کو ایسا کر دیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ بات سن کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا

إِنِّي شَيْءٌ أَنْتَ يَا عُمَرُ اے عمر! تم ابھی تک شک

ہی میں ہو۔

ان لوگوں کو تو جو ملتا تھا سب کچھ دنیا میں مل گیا ہے وہاں کچھ نہیں اور ہمارے لئے آخرت کی راحت ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

اور یہ معاشرت ہے۔ آج کل بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حدیث مولویوں کی گھڑی ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تمہارے نزدیک تاریخ تو گھڑی ہوتی نہیں تاریخ ہی کو دیکھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں دنیا کم تھی یا زیادہ۔ سو حدیث میں بھی ہے اور تاریخ میں بھی ہے کہ دنیا آپ کے یہاں بہت تھی کم تھی۔ یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ کے یہاں جہان اُسے ہیں۔ پوچھنے پر آپ کے سارے گھروں سے جو اہل بیت آیا کہ گھر میں پانی تو ہے اور کچھ نہیں۔ کیا اس واقعہ سے نہیں معلوم ہوتا کہ آپ صرف دین کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ قرآن ہی کو دیکھ لیجئے دین کے ساتھ کہیں دنیا کا مطلوبیہ کے ساتھ تمام بھی نہیں لیا گیا جس جگہ ذکر ہے دین ہی کا بالذات امر فرمایا ہے۔ ایک جگہ بھی ایسی نہ ملے گی جہاں بالذات دنیا کی رغبت دلائی ہو۔

باقی میں کسبِ حلال سے منع نہیں کرتا۔
کسبِ حلال اور حُرْبِ نِیَا کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ عَدِيثٌ

پس کسبِ حلال تو فرض ہے۔ ماں حُرْبِ نِیَا سے منع کیا جاتا ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے۔

حُبُّ الدُّنْيَا دَامَ مِثْلَ خَلِيئَةٍ

کہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

حاجبوا ایک تو یہ ہے کسبِ نیا اور ایک ہے حُبِ دُنْيَا کَسْبِ دُنْيَا جَائِزٌ أَوْ لِعِضْمٍ مَّوَاقِعٍ يَرْتَجِبُ وَأَوْ فَرَضٍ يَجِبُ أَوْ حُرْبٍ دُنْيَا حَرَامٌ هِيَ الْوَقْفُ فِي بَيْنِ بَاهِمِ تَلَاذِمٍ نَهَى نَهْ كَسْبِ نِیَا كَسْبِ دُنْيَا لَازِمٌ أَوْ نَهْ حُرْبِ دُنْيَا

کے لئے کسب دنیا لازم کیونکہ کسب دنیا اس وقت بھی ممکن ہے کہ معاش حاصل کرے مگر اس کے ساتھ شغف نہ ہو۔ اسی طرح حرب دنیا اس وقت بھی ہو سکتی ہے کہ کماٹے بھی نہیں مگر اس کے ساتھ شغف ہو۔ مثلاً کوئی شخص دنیا نہ کما تا ہو مگر دین سے بھی غافل ہو تو اس کو حرب دنیا حاصل ہے اور کسب دنیا حاصل نہیں۔ کیونکہ دین سے غفلت ہونا یہی حرب دنیا ہے اور بعض جگہ دونوں جمع ہو جاتی ہیں یعنی کسب دنیا بھی ہو اور حرب دنیا بھی ہو۔ مثلاً ایک شخص دنیا بھی کما تا ہے اور دین سے بھی غافل ہے۔ اور بعض جگہ دونوں نہیں ہوتیں۔ نہ کسب دنیا نہ حرب دنیا۔ مثلاً کوئی شخص کسب دنیا نہیں کرتا اور دین سے غافل بھی نہیں کرتا۔ حرب دنیا و کسب دنیا متلازم نہیں۔ بعض حرب ہیں کا کسب نہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی کما سب ہو اور محرب نہ ہو سو ہم حرب دنیا سے منع کرتے ہیں باقی کسب دنیا وہ تو خاص فتوہ کے ساتھ ضروری ہے۔ آپس میں کہیں کہیں کہیں گے کہ شرعی فتوے سے تجارت فرعن کفایہ ہے اسی طرح زراعت بھی فرعن کفایہ ہے۔ کیونکہ زندگی موقوف ہے ان چیزوں پر اور ضروریات معاش کی تحصیل فرعن کفایہ ہے اور فرعن کفایہ وہ ہے کہ بعض کے کہ لینے سے بقیہ لوگوں کے ذمہ سے فرعن ساقط ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ خیال بالکل ہی غلط ہے کہ علماء کسب دنیا سے منع کرتے ہیں۔ بھلا فرعن کفایہ سے کون منع کر سکتا ہے۔ بس محرب دنیا ہونا تو کسی کو جائز نہیں۔ باقی کسب دنیا میں کسی قدر تفصیل ہے یعنی ایک وہ شخص ہے کہ جس کو کسب دنیا ضروری ہے۔ اور بعض وہ ہیں جن کے لئے کسب دنیا ضروری نہیں۔ بیان اس کا یہ ہے کہ جس شخص کو عدم کسب کی

حالت میں پریشانی ہو تو پریشانی کی حالت میں کسب دنیا ضروری ہے۔ اگر چاہتے کہ کسب دنیا کرے۔

ایک وہ لوگ ہیں کہ ان کے دنیا میں نہ مشغول ہوں
 علماء اور کسب دنیا سے کسی کا غم نہیں۔ نہ ان کا نہ اہل عیال کا۔ سو یہ لوگ

اگر کسب دنیا نہ کریں تو کچھ حرج نہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اگر وہ دنیا میں مشغول ہوں تو دین کی خدمت نہ کر سکیں۔ ان کے لئے کسب دنیا مناسب نہیں بشرطیکہ ترک کسب سے تشویش میں نہ پڑیں۔ اللہ کے ایسے بند سے مراد ہیں جو سستے ہیں مگر ایک جماعت سے دنیا پرستوں کی۔ وہ ایسے حضرات پر طعن و اعتراض کرتے ہیں کہ یہ اپنا بیج ہیں، آرام طلب ہیں۔ حالانکہ یہ مسئلہ عقلی بھی ہے چنانچہ اہل مہتموں کو ایک مسلم عند العیشاء و عند المہندوں کے نزدیک مثال سے سمجھاتا ہوں جو بالکل مذاق جدید کے موافق ہے۔

وہ یہ کہ سرکاری قانون ہے کہ جو شخص سرکاری ملازم ہو اس کو دوسرے کوئی کام تجارت وغیرہ کو ناممروع ہے۔ مثلاً کوئی شخص سرکاری ملازم ہے اور وہ ٹھیکہ لینے لگے تو سرکاری طور سے اس پر گرفت ہوگی۔ چنانچہ ایک شخص ملازم تھے انہوں نے ملازمت کی حالت میں مطیع کیا۔ کچھ روز کے بعد کسی نے خبری کر دی۔ ان پر شبہ ہو گیا۔ بہت قصہ پھیندا۔ گو پورا ثبوت ہونے سے بری تو ہو گئے مگر وہ پریشان اتنے ہوئے کہ انہوں نے ملازمت ترک کر دی۔

غرض سرکاری آدمی کو اجازت ہی نہیں کہ وہ دوسرا کام کرے۔

خریدار لوٹا جاتا ہے۔ مجبوراً اُن سے کہتے ہیں ابھائی ابھی اٹھنا ہوں ذرا ٹھہرو۔
 اس میں ٹھوڑا جھوٹ بھی تھا۔ عرض اُن کا دل بٹ جاتا۔ سبق میں کچھ سے کچھ
 بیان کر جاتے۔ پہلے تو طالب علموں کو منسی خوشی بتلا رہے تھے، اب دل
 دوسری طرف ہو گیا۔ طلباء کچھ پوچھتے ہیں اور پوچھنے کے سبب اٹھنے میں
 دیر ہوتی ہے تو اُن پر جھنجھلا تے ہیں، غصے ہوتے ہیں۔ بس علماء کے دنیا میں
 مشغول ہونے کا یہی اثر ہوتا ہے کہ وہ دین کا کام پوری طرح نہیں کر سکتے
 انہی کے متعلق ایک اور قصہ ہے کہ ایک روز میں راستہ میں جا رہا تھا
 ایک بڑھیا اپنے دروازے میں جھانک رہی تھی۔ مجھ کو دیکھ کر بولی کہ بیٹا،
 یہاں آنا۔ میں گیا تو بولی، کہ ایک مسئلہ بتا دو۔ وہ یہ کہ زکوٰۃ دینا مدرسہ میں جائز
 ہے یا نہیں۔ میں نے مسئلہ بتلایا۔ پھر کہنے لگی کہ میں نے اُن سے (یعنی لکڑیوں
 والے مولوی صاحب سے) بھی پوچھا تھا۔ انہوں نے بھی تمہارے موافق
 بتلایا مگر مجھ کو اُن کا یقین نہ ہوا کہ شاید اپنے مطلب کو کہتے ہوں اب تمہارے
 بتلانے سے یقین ہوا کیونکہ تم پر یہ شبہ نہیں۔ خیر میں نے بڑی بی کو سمجھا دیا کہ
 ایسا گمان علماء پر جائز نہیں۔

یہ ہے علماء کے دنیا میں مشغول ہونے کا نتیجہ۔ تو معلوم ہو گیا کہ مسائل
 تک میں اُن کا اعتبار نہیں رہتا۔ میں کہتا ہوں جو لوگ علماء کو مشورہ دیتے ہیں دنیا
 میں مشغول ہونے کا اگر علماء اُن کی رائے پر عمل کریں تو سب سے پہلے یہی
 لوگ اُن کو مردود ٹھہرائیں گے۔ اس لئے علماء کو یہ مشورہ مرت دو کہ وہ دنیا
 میں مشغول ہوں۔ اُن کے مشغول ہونے میں بڑی خرابی یہ ہے کہ خود تم کو اُن

کے فتاویٰ کا، اُن کے وعظوں کا اعتبار نہ رہے گا۔

عرض علماء کے دنیا میں مشغول ہونے کا یہ اثر ہے۔ اسی لئے میری رائے یہ ہے کہ علماء سے چندہ کی تحریک بھی ملت کراؤ۔ انہیں چندہ وصول کرنے کے لئے مدت مقرر کرو۔ اس میں بھی اُن کا اعتبار جاتا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ چندہ کی تحریک ردّ ساد کریں۔ اُن کی تحریک کا اثر زیادہ ہوگا کیونکہ وہ خود بھی دیں گے۔ علماء کی طرف سے تو یہ خیال ہوگا کہ وہ دوسروں ہی سے کہنے کو ہیں خود کبھی کبچہ بھی نہیں دیتے۔ علماء سے وہی کام لو جس کے لئے وہ ہیں یعنی ان سے دین سیکھو، مگر آج کل علماء سے وہ کام لیا جاتا ہے جو اُن کا نہیں ہے۔ کانفرنسوں میں لوگ علماء کو صرف اس لئے بلا تے ہیں کہ اُن کے قال اللہ اور قال الرسول کے ذریعہ سے خوب چندہ ہوگا۔ سبحان اللہ! مولوی کیا ہوئے بھاڑے کے ٹوٹے ہوئے۔ علماء کو بھی چاہئے کہ وہ ایسے امور سے احتراز کریں۔ علماء کا طرز تو وہ ہونا چاہئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ حکم تھا۔

وَأَمَّا أَهْلُكَ بِالصَّلَاةِ

اپنے اہل و عیال کو نماز کا

حکم کرو۔

یہی اُن کا طرز بھی ہونا چاہئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے

أَمْ تَسْتَلْهُمْ خَوْفًا فَخَرَّاجُ
رَبِّكَ خَيْرٌ وَهُوَ خَيْرُ
الزَّالِقِينَ

یا آپ اُن سے کچھ آمدنی
چاہتے ہیں تو آمدنی تو آپ
کے رب کی سب سے بہتر

ہے اور وہ سب دینے والوں سے اچھا ہے۔

سوانگنا علماء کا کام نہیں۔ ان قصوں کی بناء پر ان کی نشان کے خلاف ہے۔ اور وہ بات بھی ہے جو اوپر بیان کی گئی یعنی ان پر بدگمانی بھی ہوتی ہے اور رؤسا پر یہ بدگمانی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ظاہر سے کہ جو شخص

پچاس روپیہ اپنی جیب سے دے گا تو اوروں سے پچاس لے سکتا ہے اور یہ رؤسا کر سکتے ہیں۔ اس لئے علماء کو چاہئے کہ وہ اس کام کو نہ کریں۔

علماء و امراء کے اختلاط کا اثر

پھر یہ تحریک علماء کے فرض منصبی ہے۔ بھی مغل ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مولوی

صاحب کہتے تھے کہ چندہ کے واسطے امراء کے دروازوں پر جانے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اگر ہم کسی امیر کے پاس جائیں اور وہ شطرنج کھیل رہے ہوں، تو ہمیں ان کو منع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم اپنی غرض کو ان کے پاس جانتے ہیں۔ اس لئے دینا پڑتا ہے۔ غرض ان مقاصد کے سبب علماء کا اختلاط امراء سے اچھا نہیں اکثر ان کے اختلاط سے خود مولوی بگڑ جاتے ہیں۔

ایک کابلی مولوی صاحب مجھ سے ایک حکایت بیان کرتے تھے کہ میں ایک وزیر رہا کرتا تھا۔ وزیر صاحب وارطھی صاف کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیسا حسین چہرہ دیا ہے مگر جو پیر چہرہ کی زینت ہے اس کو آپ مٹا دیتے ہیں۔ اس کہنے سے وہ کچھ شرمائے۔ ایک دوسرے مولوی صاحب ان کے ہاں اور بیٹھے تھے وہ خوشامد میں کیا کہتے ہیں کہ وارطھی کبھی نہ رکھنی چاہئے اور جو یہ بیان فرمائی کہ

اس میں جویش پڑجاتی ہیں اور باہم زنا کرتی ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر یہ چیکہ آپ نے کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ اور باہرا کر میں نے ان مولوی صاحب کو بہت تارڑا اور کہا کہ تم کو خوف نہ ہوا کہ ایسی باتوں سے ایمان جاتا رہتا ہے۔ تو وہ فراب میں کہتے ہیں کہ ہم جب مکان سے چلتے ہیں، ایمان تو فلاں نالہ پر چھوڑ آتے ہیں۔

سو علماء کے لئے امراد کا اختلاط ایسا سم قاتل ہے اور وہ جس کی یہ ہے کہ جو چیز علماء کے پاس ہے یعنی علم، امراد کو بزعم خود اس کی ضرورت نہیں اور جو چیز امراد کے پاس ہے یعنی مال، علماء کو اس کی ضرورت ہے اس واسطے ان کو امراد کے پاس جا کر جھکنا پڑتا ہے۔ اس لئے حق بات نہیں کہہ سکتے۔ بس علماء کو تو آزاد رہنا چاہئے اور ان کی آزادی کی یہ حالت ہونی چاہئے۔

زیر بار اند درختاں کہ مشرک و ارنہ
 لے خوشا سرو کہ از بندِ غم آزاد آند
 پھل دار درخت زیر بار ہیں۔ سرو بہت اچھا ہے کہ غم کی قید سے آزاد ہے۔

اور اس آزادی کے ساتھ دین کی خدمت کرتے رہیں۔
علماء اور خواہ باقی یہ کہ پھر ان کی معاش کا کیا انتظام ہوگا۔ سوائس کی دو صورتیں ہیں یا تو توکل کریں یا پابندی سے جو خدمت کریں تدریس یا تبلیغ اس پر کسی مدرسہ یا انجمن سے تنخواہ مقرر کرالیں۔ پھر اس

پر اگر کوئی سوال کرے کہ یہ تو پھر وہی دین فروشی ہوتی جس کی خدمت کی سبب ہمیں
 سو میں اس کی تحقیق بتلاتا ہوں۔ سنیے اصولی اور عقلی مسئلہ ہے کہ جو کوئی کسی
 خدمت میں مجبوس ہو اس کا نفقہ اس کے ذمہ ہوتا ہے اور یہ قاعدہ تمام
 کے عقلاء کا معمول ہے۔ حتیٰ کہ سلاطین تک کے لئے بھی یہی قانون نافذ
 ہے۔ بادشاہ کو جو خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے وہ بھی محض اس لئے کہ وہ
 کے کام میں مجبوس ہے۔ کیونکہ بادشاہ وہ ہے جس کو ساری قوم حاکم بنا
 ہے اور اس کو بیت الممالک کے خزانہ سے تنخواہ دیتی ہے۔

اب یہ دیکھو کہ وہ خزانہ کس چیز کا نام ہے۔ اس کی حقیقت بتلاتا ہوں
 ساری قوم سے جو چندہ جمع کیا جاتا ہے کہ ایک پائی زید کی اور ایک پائی
 عمرو کی اور ایک پائی بکر کی۔ جس کو ٹھہری میں اس کو جمع کیا جاتا ہے اس
 کا نام خزانہ ہے۔ حقیقت اس کی وہی چندہ ہے۔ وہ بھی قومی چندہ ہے
 اسی سے بادشاہ کو تنخواہ ملتی ہے۔ صرف خزانہ کے لفظ سے اس کی عزت
 بڑھ گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خزانہ شاہی ہے مگر حقیقت اس کی وہی چندہ
 قومی ہے۔ پس یہی حقیقت اس چندہ کی ہے جس سے مولویوں کو تنخواہ
 نذر ملتی ہے۔ مگر مولویوں کے حق میں چندہ سے تنخواہ ملنے کو لوگ ذلت سمجھتے
 ہیں اور بادشاہ کے لئے ذلت نہیں سمجھتی جاتی۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ بادشاہ
 کو ایک لاکھ ملتے ہیں، اس لئے ذلت نہیں خیالی کی جاتی اور مولوی بیچاروں کو
 کو تھوڑی مقدار ملتی ہے۔ اس لئے اس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور
 انہیں دیکھتے ہیں کہ مولوی خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں مگر بغور دیکھتے ہیں

دونوں جگہ ایک ہی ہے اور جب حقیقت ایک ٹھہری تو جس نے پندہ میں سے ایک پیسہ لیا اس کی کم ذلت ہونا چاہئے اور جس نے زیادہ لیا اس کی زیادہ ذلت ہونی چاہئے۔

اب رہی یہ بات کہ بادشاہ کو خزانہ سے تنخواہ ملنے کے استحقاق کی عدت کیا ہے۔ سو وہ استحقاق کی عدت یہ ہے کہ وہ ملک کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے کیونکہ وہ قوم کی خدمت کرتا ہے۔ اس لئے اس کا نفقہ رعایا کے ذمہ ہے اور بادشاہ پر کیا موقوف ہے۔ سب کو چنڈہ تو ہی ہی سے تنخواہ ملتی ہے۔ کلکٹر کو بھی، ڈپٹی کلکٹر کو بھی، ایچ کو بھی، منصف کو بھی۔ بس یہ مسئلہ عقلی ہوا اور اسی قاعدہ کو شریعت نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ جیسے زوجہ کا نفقہ اس کے شوہر پر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس کے پاس محبوس ہوتی ہے۔

اب بتلائیے یہ عدت علماء کے استحقاق تنخواہ وغیرہ میں بھی مشترک ہے یا نہیں کیونکہ وہ بھی قوم کی دینی خدمت میں محبوس ہیں۔ اس لئے ان کا نفقہ بھی قوم کے ذمہ ہے۔ کیونکہ جب تک وہ معاش سے فارغ نہ ہوں تو ان کا کام کر نہیں سکتے۔ اگر ان کی خدمت نہ کی جاوے گی تو وہ کھائیں گے کہاں سے اور اس صورت میں ان پر کسی کا احسان بھی نہیں۔ کبھی کوئی احسان کرنے لگے۔ اس لئے کہ اگر وہ تنخواہ وغیرہ لیتے ہیں تو آپ کی دینی خدمت بھی تو کرتے ہیں۔ پس آپ کے ذمہ تو ان کا فرض ہے۔ اگر یہ کہاں دنیا میں نہ دیا تو شاید آخرت میں اگلا میں اور یہ دوسری بات ہے کہ وہ پیامت میں

معاف کر دیں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ معاف ہی کر دیں گے غرض
 علماء چونکہ قوم کی دینی خدمت میں مجبوس ہیں اس لئے ان کی تنخواہ یا نذرانہ قوم
 کے ذمہ ہے۔ البتہ کسی خواص و عظمیٰ پر نذرانہ ٹھہرا کر لینا یہ ناجائز ہے۔ باقی جو
 مجبوس ہونے کے سبب ندریں یا تبلیغ پر تنخواہ لیں گے وہ جائز ہے۔ ایسا
 نہ ہو تو پڑھنے پڑھانے کا اور تبلیغ کا سلسلہ ہی ختم ہو جاوے گا۔ اور سارا
 دین و دہم برہم ہو جاوے۔ اس تقریر سے دونوں باتوں کا جواب نکل آیا۔
 ایک تو یہ کہ مولوی تنخواہ وغیرہ کیوں لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خیرات کے ٹکڑے
 کھاتے ہیں۔ سو خوب سمجھ لو کہ اگر یہ لوگ خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں تو
 بادشاہ اور والسرائے اور بیچ، کلکٹر سب ہی خیرات کھاتے ہیں۔ اگر یہی بات
 ہے تو کسی کو بھی تنخواہ نہ دینی چاہئے۔ کیونکہ سب کو قوم ہی کے چندہ سے
 تنخواہ ملتی ہے۔

آزمائش علماء

مگر اس تقریر سے کوئی مولوی صاحب دھوکا میں نہ
 پڑ جائیں کہ ہم تو دین کی خدمت کر رہے ہیں اور ہماری
 تنخواہ نفقہ جس ہے۔ اس لئے ہم کا سب دینا نہیں۔ خوب سمجھ لیجئے اور
 اپنے معاملات میں غور کر لیجئے ان معاملات اور واقعات سے کاسب دینا
 ہونے نہ ہونے کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ معاملہ محل غور یہ ہے کہ بعض دفعہ
 ایسا ہوتا ہے کہ مولوی صاحب ایک جگہ لو کر ہیں۔ دین کی خدمت کر رہے ہیں
 اور پچاس روپے تنخواہ پاتے ہیں اور اس میں گزر ہی اوسط درجہ کا ہو رہا ہے
 تنگی بھی نہیں، پچاس روپے کافی ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں ایک جگہ

سے شرط آیا ملازمت کا کہ مبلغ سو روپے تنخواہ ملے گی یہاں چلے آؤ۔ شاید کہیں طلباء نے بیچاروں کی تعریف کر دی ہوگی۔ بعض مدیرین اس لئے بھی طلباء کی خاطر کہتے ہیں کہ کہیں مہتمم سے ان کی بُرائی نہ کر دیں اور نوکری جاتی رہے۔ اسی طرح بعض مہتممین بھی طلباء کی بہت خاطر داری کہتے ہیں اگرچہ وہ ناقابل ترقی ہوں کہ کہیں مدرسہ سے چلے نہ جائیں گے۔ مدرسہ کی رونق کم ہو جائے پھر اس سے چندہ کم ہو جائے۔ حالانکہ مدرسہ علمی کا مہتمم عالم باعمل ہونا چاہئے جو علم کے سبب تو بھلے بُرے کو سمجھتا ہو۔ کیونکہ نادانقت ہونے کی صورت میں طلباء کی جراثیم بڑھتی ہے اور جو عالم ہوگا وہ سب باتوں کو سمجھے گا اور طلباء پر اس کا دباؤ ہوگا۔ یا اگر مہتمم عالم نہ ہو تو کم از کم علماء باعمل کی صحبت میں رہا ہو۔ ہر بات کو سمجھتا ہو یہ نہ ہو کہ نہ عالم ہو نہ صحبت یافتہ ہو اور عمل کے سبب حدود طمع و غرض سے پاک ہو۔ خواہ اپنی غرض یا مدرسہ کی غرض سے تکیہ سواویا تکیر چہارہ پر یہ تو جملہ موثر منہ خفا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ کہیں طلباء نے مولوی صاحب کی تعریف کر دی وہاں سے سو روپے تنخواہ کی ملازمت آگئی۔ اب اس سے دین یا دنیا کی طلب کا حال معلوم ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ وہاں نئی جگہ میں نفع مالی بھی زیادہ ہے عزت بھی زیادہ ہے، مگر دین کی خدمت کا موقع زیادہ نہیں بلکہ دین کی خدمت اس جگہ زیادہ ہے جہاں تنخواہ پچاس روپے مگر کافی ہے۔ اب دیکھا جائے گا کہ مولانا پھلے تو نہیں۔ اگر لکھ دیا کہ میں نہیں آنا چاہتا ہوں میرا گزر ہو رہا ہے تو سمجھا جائے گا کہ مقصود ان کا دین کی خدمت ہے اور

تنخواہ نبھانے رہے ہیں اور ان کی تنخواہ جڑائے جس اور میری تقریر کا ممبر ہے اور جو مولانا چل ویسے تو سمجھا جائے گا کہ مولانا دنیا دار ہیں۔ انہوں نے جو تنخواہ کو جڑائے جس بنایا تھا وہ صحیح نہ نکلا بلکہ محض دعو کا تھا۔ اسی طرح جب مولوی صاحب کسی مدرسہ میں لو کر ہونے لگیں اور وہاں ایسی صورت ہے کہ جو تنخواہ ہم کو ملے گی ہمارا گزارہ معمولی طریقہ سے اُس میں ہو سکتا ہے۔ اگر اُس کو ہم نے بطیب خاطر اختیار کر لیا اور واقع میں ہمارے مناسب حال بھی یہی تھا کہ تین پانچ روپے کریں تو سمجھا جائے گا کہ تنخواہ لینا دراصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود دین ہے اور اگر باوجود کافی ہونے کے پھر بھی تین پانچ روپے کے تنخواہ ملے ہوتی تو معلوم ہو گا کہ مولوی صاحب دنیا دار ہیں۔

اب تو یہ حالت ہے کہ گاہر مولوی کا سا مولویت کا بھاؤ ہونے لگا ہے لوگ بیس روپے تنخواہ کہتے ہیں اور وہ مولانا کے گزر کے لئے کافی ہے مگر مولانا کہتے ہیں کہ چالیس لوں کا جب ر ہوں گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ تین روپے لیجئے۔ مولانا کہتے ہیں کہ اچھا نہ ہمارا کہنا رہے نہ تمہارا، بس بیست روپے۔ آپس میں جھگڑا تکرار ہو رہا ہے۔ بالکل گاہر اور مولوی کا سا سودا ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول ہی نظر میں لوگوں کے دل سے اتر جاتے ہیں۔ خیر کہنے سننے سے منتسب قرار پا گئے۔ پھر تھوڑے دنوں میں مولانا کے بیڑ ہو گیا۔ اب درخواست ہے کہ ہمارے ذمہ ایک خرچ آگیا ہے ذرا خیال رکھئے گا۔ اب اس جستجو میں ہیں کہ تنخواہ میں اضافہ ہو جائے۔ وقتاً فوقتاً لوگوں کے کان میں یہ بات ڈالتے ہیں۔ خیر لوگوں نے طوعاً و کرہاً چالیس کر دیئے۔ پھر اس پر بھی قناعت نہیں۔

سال چھ مہینے میں دوسرا بچہ ہو گیا۔ اب پھر لوگوں کے سر پر۔ درخواستیں کرتے کرتے لاقفت عنداً حیا تک نوبت پہنچتی ہے۔ پس اگر یہ صورت ہے تو نیاداری ہے۔ اور اگر دوسری صورت ہے کہ تنخواہ میں گزر ہونے کی صورت میں اس کو چھوڑ کر زیادہ تنخواہ پر نہیں گئے یا جو تنخواہ گزر کے قابل مل گئی منظور کر لی۔ کچھ تین پانچ نہ کیا اور خدمت دین میں مشغول ہو گئے تو ایسے شخص کو کاسبِ دنیا نہ کہا جائے گا۔

یہ تو معیار تنخواہ کی صورت میں تھا لیکن اگر کسی میں قوتِ توکل اعلیٰ درجہ کی ہو اور وہ تنخواہ وغیرہ سب چھوڑ دے تو سبحان اللہ! مگر ہر ایک کے لئے یہ صورت درست نہیں کیونکہ سب میں یہ قوت نہیں یا کسی میں قوتِ توکل خود اپنی ذات کے واسطے تو ہے مگر اہل و عیال میں قوتِ توکل ایسی نہیں ہے۔ یعنی اگر تنخواہ نہ لیں تو وہ لوگ پریشان ہو جائیں۔ تو ایسے شخص کو بھی تنخواہ چھوڑنا درست نہیں کیونکہ یہ بھی ایک عبادت ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال کی کوئی خدمت کرے۔ ان کے حقوق کو ادا کرے۔ عرض اس بات میں لوگوں کے مختلف حالات ہیں۔ بعض کو مال کے ہونے سے پریشانی ہوتی ہے۔ بعض کو نہ ہونے سے پریشانی ہوتی ہے اور ہونے سے اطمینان رہتا ہے پس جس کو جس طرح اطمینان اور جمعیتِ قلب حاصل ہو وہ کرنا چاہئے۔

میں نے جو ابھی عرض کیا ہے کہ بعض کو مال کے ہونے سے پریشانی ہوتی ہے اس پر تعجب نہ کیا جائے۔ واقعی اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں جن کو مال کی کثرت سے

اہل اللہ کا استغناء

بار ہوتا ہے۔ وہ یوں سمجھتے ہیں کہ جس قدر مال زیادہ ہوگا اس کے حقوق کا ادا کرنا اتنا ہی مشکل ہوگا۔ اس لئے ایسے لوگ کثرتِ مال سے گھبراتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ایک صاحب مطبع میں ملازم رکھنا چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ علمی لیاقت تو مجھ میں ہے نہیں۔ اس لئے بڑا کام تو کر نہیں سکتا۔ البتہ قرآن کی تصحیح کر لیا کروں گا۔ اس میں دس روپیہ ماہوار دے دیا کرو اور اللہ اللہ کیا تو واضح اور زہد ہے۔

اسی زمانہ میں ایک ریاست سے تین سو روپیہ مالانہ کی نوکری آگئی۔ مولانا جو اس میں لکھتے ہیں کہ میں آپ کی یاد آوری کا شکر گزار ہوں۔ مگر مجھ کو یہاں دس روپے ملتے ہیں جس میں پانچ روپے تو میرے اہل و عیال کے لئے کافی ہو جاتے ہیں اور پانچ بیچ جاتے ہیں۔ آپ کے یہاں سے جو تین سو روپے ملیں گے، ان میں پانچ روپے تو خرچ میں آئیں گے۔ آگے دو سو پچانوے جو بچیں گے میں ان کا کیا کروں گا۔ مجھ کو ہر وقت یہی فکر لگا رہے گا کہ ان کو کہاں خرچ کروں۔ اس لئے معذور ہوں۔ اس لئے تشریف نہیں لے گئے۔

اسی کے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو بھی لکھا تھا اور سو روپیہ تنخواہ لکھی تھی۔ مولانا نے دوسرا جواب دیا کہ میں آسکتا ہوں مگر تین سو روپے سے کم میں نہیں آسکتا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نے فرمایا کہ مولانا ذرا سنبھل کر جواب لکھئے۔ اگر تین سو کی منظوری یہ طلبی آگئی تو وعدہ پر جانا پڑیگا تو مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کے ساتھ یہ جملہ بھی بڑھا دیا کہ مگر اس

میں ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ جب چاہوں گا یہاں رہوں گا جب چاہوں گا وہاں رہوں گا۔ وہ رئیس صاحب سمجھ گئے کہ ان حضرات کو انا ہی منظور نہیں اور واقعی جانا بخوڑا ہی منظور تھا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ بات ظرافت کے طور پر لکھ دی تھی۔

اللہ اکبر! کس قدر استغفار تھا ان حضرات میں۔ واقعی اہل اللہ کے دل پر مال کی کثرت سے بھیجی بار ہوتا ہے۔ اُن کو خیال ہوتا کہ خدا سب نے اس کے حقوق ہم سے ادا ہوں یا نہ ہوں۔

میرے ذوق میں اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو سلطنت دی گئی تھی تو اُس کے ساتھ اُن کی یہ خاص تسلی بھی حقوق ادا ہو سکتے یا نہ ہو سکتے کی کر دی گئی تھی۔ ارشاد ہے۔ هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْتَدِحْ اَوْ امْسَلْ بِغَيْرِ حِسَابٍ کہ یہ ہماری عطا ہے خواہ کسی پر احسان کرو یا جمع کرو۔ یعنی عطا و امساک بالکل تمہارے اختیار میں ہے۔ آپ پر کسی قسم کی پابندی نہیں۔ تم سے اس کا کوئی حساب نہ ہوگا۔ اس تسلی کے بعد اُن کو سلطنت سے گرائی نہیں ہوئی ورنہ گھبرا جاتے اور ایک دن بھی بادشاہت نہ کر سکتے۔

اس آیت پر ایک بات یاد آگئی کہ آج کل تعلیم جدید والے ترقی دنیا پر اس سے دلیل پکڑتے ہیں اور کہتے ہیں کیا سلیمان علیہ السلام بادشاہ نہ تھے معلوم ہوا ترقی دنیوی محمود ہے۔ اول تو ان لوگوں کو تمام انبیاء علیہم السلام میں دلیل پکڑنے کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام ہی ملے ہیں۔ میں کہتا ہوں کیا اور انبیاء علیہم السلام دنیا میں نہیں ہوئے۔ ان کے حالات بھی

یعنی چاہتیں۔ دیکھ لیجئے کہ ان میں سے اکثر کی بلکہ قریب قریب کل انبیاء علیہم السلام کی کیا حالت تھی۔ سب کی حالت قریب قریب فقر کی رہی ہے۔ دوسرے خود یہ استدلال بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ حکمت الہیہ سے ہر زمانہ کا ایک خاص مقتضا ہوتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بڑے بڑے جبار اور متکبر بادشاہ تھے۔ اس وقت کا مقتضا یہی تھا کہ نبی کو بطور معجزہ ایسی سلطنت دی جاوے جس کا سب لوگ مان لیں۔ اسی واسطے جانوروں اور ہوا تک پر ان کو حکومت دی گئی کہ تمام بادشاہ پست ہو گئے۔ پس سلطنت ان کا معجزہ تھا۔ یہ راز تھا ان کی سلطنت میں، ترقی دنیا مطلوب نہ تھی۔ چنانچہ اس حالت میں بھی حسب نقل عارف رومی۔

زبان سلیمان خویش را مسکین بخواند

یعنی آپ اپنے کو مسکین ہی کہا کرتے تھے اور اپنی قات کے لئے بادشاہی سامان سے کام نہ لیتے تھے بلکہ حسب نقل ہمیشی زیور اپنی دستکار زبیل سازی کے پیوں سے کھاتے پیتے تھے اور بادشاہرت سے گھبراتے تھے کہ مبادا حقوق کی ادائیگی میں کمی رہ جائے۔ اس لئے آپ کے بالے میں ارشاد ہوا۔

فامنتج أو اصبت بخیر پس خواہ کسی پر احسان کرو

حساب۔ یا بے اندازہ جمع کرو۔

کہ ہم ان حقوق کے متعلق آپ سے حساب نہیں گے۔ آپ نہ

گھبرائیے۔

جمعیت قلب | میں نے اوپر اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ اصل چیز جمعیت قلب ہے جس طریقہ سے بھی حاصل

ہو۔ بعض کو پریشانی ہوتی ہے۔ مال کے ہونے سے ان کے لئے مال کا نہ ہونا اچھا اور بعض کو جمعیت ہوتی ہے مال کے ہونے سے ان کے لئے مال کا ہونا اچھا۔ ہر ایک کی حالت جدا ہے پس اگر کسی کو مال کے نہ ہونے سے تکلیف نہ ہو اس سے چاہئے کہ خدا نے جس کام کے لئے اس کو پیدا کیا ہے اس میں صرف وہی کام کرے۔

اس بیان پر ایک شعر ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ ادھر تو جو بایا با سہ یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں لگو اور اس کے ساتھ ہی یوں کہا جاتا ہے کہ نائل مرت رہو۔ دونوں باتوں کا اجتماع کیسے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب دنیا میں لگا جاوے گا تو دوسری طرف سے غفلت ضرور ہوگی۔ یہ تو وہ بات ہو گئی ہے

در میان فقر و ریاضت بندم کردہ
بازمگویی کہ وامن تر کن ہوشیار باش

دگر سے دریا میں تو نے مجھے تختہ سے بانڈھ دیا ہے۔ پھر کہتا

ہے کہ ہوشیار رہ کہ وامن نہ بھیگے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض غیر محقق ہی کیے گا۔ محقق کبھی یہ اعتراض نہ کرے گا۔ بات یہ ہے کہ امور غیر مطلوبہ دو قسم کے ہیں اختیاری اور غیر اختیاری امور غیر اختیاری میں تو ملا مرت نہیں۔ وہ تو اختیار سے باہر ہیں۔ انسان ان کا ملکوت نہیں کیا گیا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ لَمْ یُکَلِّفِ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا

وَسَعَهَا كَمَا أَنَّ تَعَالَى كَسَى كَمَا اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے
البتہ امور اختیار یہ پر ملامت ہے۔ پس غفلت ایک تو اختیاری ہے اور
ایک غیر اختیاری ہے۔ غفلت اختیاری میں تو ملامت ہے اور غیر اختیاری
میں بالکل ملامت نہیں۔

مثلاً ایک نیک کام کیا جو توبہ کے ساتھ کرنا چاہئے تھا اور بلا
اختیار اس میں غفلت ہو گئی تو یہ موجب ملامت نہیں۔ اس صورت میں
"اور میانِ فقر و دیا تھنتر جہدم کروہ" کہاں ہے؟ کیونکہ اس میں ملامت ہی نہیں
ہاں یہ سوچنا کہ قلب کی ایسی حالت کیوں ہے کہ دنیا میں لگ کر اللہ سے
غفلت ہو جاتی ہے۔ اور یہ سوچ کر غفلت دور کرنے کی تدبیر کرنا یہ امر
اختیاری ہے۔ اس اصلاح میں کوشش نہ کرنے پر بلے شک ملامت ہے
جیسا قرآن کا بلا اختیار غلط پڑھنا قابل ملامت نہیں۔ ہاں صحیح پڑھنے کی کوشش
نہ کرنا یہ اختیاری ہے اور قابل ملامت ہے۔

غرض یہ سوچنا کہ غفلت کا سبب کیا ہے پھر اس کی تدبیر کرنا یہ امر
اختیاری ہے۔ جب اس کا سبب سوچے گا یہ معلوم ہو گا کہ خدا کی محبت
قلب پر غالب نہیں ورنہ غفلت کیوں ہوتی۔ جن حضرات میں خدا کی محبت
غالب ہوتی ہے ان کے تمام کام خدا ہی کے واسطے ہوتے ہیں گو ظاہر
میں وہ دنیا کے کام معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو دنیا میں لگ کر بھی خدا سے
غفلت نہیں ہوتی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو اس کی معشوقہ نے بلایا اور وہ یہ

چاہتا ہے کہ معشوقہ کے پاس اس نیت سے جاؤں کہ وہ دیکھ کر خوش ہو
 اس لئے حجام کو بلا یا کہ وہ خط بنا لے، غسل کرے اچھے کپڑے پہنے اور اس
 کے بعد محبوبہ کے پاس جائے تو جو شخص عشق سے خالی ہے وہ اس کو اس
 شغل میں دیکھ کر یوں کہے گا کہ یہ تو اپنے بناؤ سنگار میں مصروف ہے محبوبہ سے
 غافل ہے مگر اس کو کیا خبر ہے کہ اس کی نیت ہر چیز میں محبوب ہی کے لئے
 ہے۔ کپڑے پہنتا ہے تو اس نیت سے کہ محبوب خوش ہو گا اور غسل کرتا
 ہے تو اس نیت سے کہ محبوب کو اچھا لگوں گا۔ غرض اس کی ہر چیز میں محبوب
 ہی مقصود ہے۔ جب یہ حالت ہے تو اس کو محبوب سے غافل کس طرح کہیں
 گے۔ اگر تم بھی حق تعالیٰ کی محبت کو غالب کر لو تو دنیا کے ہر کام میں تمہارا بھی
 یہی حال ہو جائے گا۔ اب جو ہم کو دنیا میں لگے کہ خدا سے غفلت ہو جاتی ہے
 تو اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت حق غالب نہیں اور اس محبت سے مراد وہ محبت
 ہے جس کا انسان مامور ہے۔ سو اس محبت کا غالب کرنا اختیاری ہے اس
 لئے ہمارے ذمہ ہے کہ محبت الہی کو دل میں غالب کریں۔ باقی اس کے
 اختیاری ہونے کی دلیل وہ مشاہدہ اور واقعات ہیں۔ آزا کر دیکھ لو، تدبیر
 کے دیکھ لو۔ خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ یہ امر اختیاری ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب گرو لیدٹ پایداز وٹے قناب

سورج کا نکلنا سورج کے وجود پر دلیل ہے اگر تم کو دلیل کی خواہش

ہے تو اس سے منہ پھیرو۔

جب اختیاری ہے تو اس کی تدبیر کیجئے اور ہر کام تدبیر ہی کرنے

سے ہوتا ہے۔ نری تمنا یا باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر آپ چاہیں کہ تفریح کر کے اور محض وعظ من کر کام ہو جاوے تو یہ نہیں ہو سکتا۔
 کارکن کار بگور از گفتار کاندزین راہ کار باید کار
 کام کرو باتوں کو ترک کرو۔ اس راہ سلوک میں کام کرنا چاہئے
 کام۔۔۔!

اب تدبیر کے متعلق یہ سوال ہو گا کہ کیا دنیا کو چھوڑ
 دیں۔ یہ سوال اس لئے پیدا ہوا ہے کہ کسی غیر محقق
 کے ہاتھ میں محض گئے تھے۔ اس نے اسی طرح بتلایا ہو گا۔ اس نے بتلایا ہو گا
 کہ ایک وقت کھانا کھایا کرو۔ چھ مہینے میں بیوی بچوں کو دیکھ لیا کرو۔ نیز طاقت
 سے زیادہ کام بتلایا ہو گا۔ کیونکہ آج کل کے پیروں میں یہ بھی ایک مرض ہے
 کہ وسعت سے زیادہ کام بتلایا دیتے ہیں۔ جس سے وہ پریشان ہو کر ہمت
 ہار دیتا ہے اور مایوس ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے مولانا شیوخ کو تعلیم فرماتے
 ہیں۔

چار پارا قدرت بار نہ برصغیراں قدر ہمت کار نہ
 چار پاروں پر ان کی طاقت کے مطابق بوجھ لا دو۔ کمزوروں کو
 ان کی ہمت کے موافق کام دو۔
 طفل را گر تاں وہی بر جائے شیر طفل مسکین را ازاں تاں مردہ گیر
 بچہ کو اگر بجائے دودھ کے روٹی دی جائے تو بچہ کو اس روٹی
 سے مردہ سمجھ لو۔

اگر بچہ کو بوٹیاں کھلانے لگو گے تو اس کا پیٹ پھٹے گا یا نہیں۔ اسی کی شکایت عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

خستگان را چو طلب باشد وقت نبود

گر تو بیدار کنی شرط مروت نبود

مکڑوروں میں جب طلب ہو اور قوت نہ ہو، اگر تم اُن کی ہمت سے زیادہ کام دے کر ظلم کرو تو مروت کے خلاف ہے۔

یہ رسمیں پیروں کو خطاب ہے جو محقق نہ ہوں۔ شیوخ کو چاہئے کہ ہر ایک کی حالت دیکھ کر اس کے مناسب تعلیم کریں۔ جیسے کوئی مریض طبیب سے یوں کہے کہ میں ناواہ ہوں قیمتی نسخہ کا منتحل نہیں ہو سکتا، ارزاں نسخہ لکھ دو۔ تو طبیب کو چاہئے کہ اس کی حیثیت کے موافق نسخہ تجویز کرے۔ اسی طرح شیوخ باطن کو طالب کی طاقت و ہمت کا لحاظ لازم ہے۔ اگر کسی کو ایک سال کا دستور العمل ایک دن میں بتلا دیا تو وہ کس طرح کرے گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ کام چھوڑ کر بیٹھ رہے گا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے اور کام ہو جاوے۔ کچھ نہ کچھ تو مشقت اٹھانا ہی پڑے گی۔ جو لوگ گھر بیٹھے کام بناتا چاہیں، وہ اپنے گھر پر رہیں مشائخ کو پریشان نہ کریں۔

مولانا نے غنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص نے ایک گونے والے سے کہا کہ میری بیٹی پر بشر کی تصویر بنا دو تاکہ گھر میں قوت رہے وہ تصویر بنانے بیٹھا اور سوئی چھوٹی۔ اس نے ایک آہ کی اور پوچھا، کیا

بناتے ہو؟ اُس نے کہا کہ دم بناتا ہوں۔ آپ بولے کہ دم نہ بناؤ۔ یہ کوئی کھیل
 مٹھوڑا اڑائے گا۔ اُس نے دم چھوڑ کر دوسری طرف سوئی چھوٹی۔ پھر آہ کی آواز
 پوچھا کہ اب کیا کرتے ہو؟ اُس نے کہا کہ سر بناتا ہوں۔ آپ نے کہا، یہ کوئی
 دیکھے گا مٹھوڑا ہی۔ ایسے ہی رہنے دو۔ پھر اُس نے پیٹ بنانا سچا لیا تو آپ
 کہتے ہیں کہ یہ کوئی کھائے گا مٹھوڑا ہی۔ غرض جس عضو کو بناتا تھا۔ آپ یہی کہتے
 تھے کہ اس کو کیوں بناتے ہو۔ اس پر بنانے والے نے سوئی پھینک دی اور

کہا۔

شیر بے گوش و سر و شکم کہ دید
 این چنین شیر سے خدا ہم نافرید
 شیر بغیر کان اور سر اور پیٹ کا کس نے دیکھا ہے۔ ایسا شیر تو
 خدا نے بھی نہیں بنایا میں کیا بناؤں گا۔

اگے مولانا فرماتے ہیں۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن
 از چنین شیرتہ یاں بس دم مزن
 یعنی اگر تمہارے اندر اتنی بھی طاقت نہیں کہ سوئی کو بڑا شنت
 کر سکو تو شیر کا نام بھی مرت لو۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ چاہیں کہ رہیں تو اسی سر کرنے پر جس پر پہلے
 سے تھے اور کام ہو جاوے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ دہلی جانا ہو تو ذرا گھر سے
 ہٹو بھی تو سہی۔ چلتے تو ہو نہیں اور چاہو کہ دہلی پہنچ جاویں تو کیسے ممکن ہے
 اور یہاں تو برخلاف مقاصد دنیا کے کوشش کے بعد ناکامی میں بھی کامیابی
 ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ کام کرنے کے بعد جو ناکام رہے

وہ بھی عند اللہ کامیاب ہے۔ مگر کام تو کرے۔ باقی یہ نہیں ہو سکتا کہ رہو تو اسی چکر میں اور چاہو کہ ہمیں مقصود تک پہنچا دو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

صاحبو! مقصود بہت دور ہے۔ وہ کیا ہے۔ رضائے حق تعالیٰ جس کی

مثال جنت کی سی ہے کہ جنت سے پہلے پلصراط ہے اور اس سے پار ہو کہ جنت ہے۔ اور جس طرح پلصراط پر رفتار ہر شخص کی مختلف ہوگی۔ بعض ساری کی طرح عبور کر جائیں گے اور بعض کی رفتار گھوڑے کے سوار کی سی ہوگی اور بعض کی اس سے کم اور بعض کی اس سے بھی کم۔ اسی طرح یہاں سلوک کا مقام اخیر یعنی رضا جنت کے مشابہ ہے اور لوگ اس مقام تک مختلف طرق سے پہنچتے ہیں۔ بعض جلدی اور بعض دیریں۔ بس جیسے پلصراط پر چلنے کے بعد جنت ملے گی اور بعد تکلیف کے راحت نصیب ہوگی اسی طرح یہاں بھی ہے کہ تکلیف کے بعد راحت نصیب ہوگی۔

باقی اس سے اطمینان رکھو کہ شیخ محقق تمہارے دنیا کے کام نہیں چھڑا دینا بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ وہ عوام لو کہی بھی اس وقت تک نہ چھڑائیں گے جب تک حلال میسر نہ ہو جائے۔ کیونکہ افلاس بعض دفعہ کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

كَوَالْفَقْرِ اِنَّ يَكُوْنُ كُفْرًا

تنگ دستی بعض دفعہ کفر کے

قریب ہو جاتی ہے۔

اس لئے محقق عوام کو دنیوی تعلقات ملازمت وغیرہ سے الگ نہیں کرتا۔ حرام نوکری سے بھی تدریجاً الگ کرتا ہے کہ پریشانی نہ ہو۔ پھر

خیر الممال لکرتھال

بھی تعجب ہے کہ ایسا راستہ بے ضرر اور اس پر بھی ہم نہ چلیں۔ صاحبو! مجھ پر
 کا طریق گو کسی قدر مشکل تو ہے مگر محال نہیں۔ بس کسی محقق سے تعلق پیدا کر لو صرف
 صالح مرث ڈھونڈو و مصلح کو ڈھونڈو۔ تندرست کو مرث دیکھو بلکہ تندرست
 کنندہ یعنی معالج کو تلاش کرو۔

شیخ وہ ہونا چاہئے جو خود بھی متقی ہو اور مصلح بھی ہو۔ گو ایسا شیخ تمہارے
 دنیا کے کام نہیں چھڑائے گا۔ مگر یہ بھی نہیں کہ تم تو کچھ نہ کرو اور شیخ تمہاری اصلاح
 کی غرض سے تمہارے پیچھے پیچھے پھرے۔ کیونکہ اس کی جوتی کو غرض پڑی ہے
 جو تمہارے پیچھے پھرے گا۔ بس ان اصول پر فوراً کام شروع کر دو۔ کل پر سوا
 کا انتظار مرث کرو۔ گو یہ دریا مئے ناپیدا کنار ہے مگر جب خدا تعالیٰ کا فضل
 شامل حال ہوگا تو انشاء اللہ ایک نہ ایک دن دوسرے کنارہ پر پہنچ ہی جا
 میں مکرر کہتا ہوں اور اطمینان کلی دلاتا ہوں کہ تمہاری معاش میں خلل ہرگز نہ
 پڑے گا۔

مگر یہ بھی نہیں کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے اور پرہیز تو کرنا ہی پڑے
 اگر کسی مریض سے طبیب کہے کہ بھائی دوا پینا اور پرہیز کرنا
 اور مریض یوں کہے کہ حضور آپ ہی پی لیں۔ آپ ہی پرہیز کر لیں۔ تو ایسے مریض
 کو کیوں کر شفا ہوگی۔ شفا تو خود مریض کے دوا پینے اور پرہیز کرنے سے
 ہوگی۔ باقی یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ اس طریق میں ذرا بھی تعب اور مشقت نہیں
 البتہ نفس کے خلاف کرنا پڑے گا۔ سو اس میں کیا مشقت ہے مثلاً پانی
 عورت کو مرث دیکھو، پوری مرث کرو۔ سو اس میں کون سی مشقت ہے بلکہ

یہ تو باتیں وہ ہیں کہ ان کے چھوڑنے سے علاوہ ایصال الی المقصود کے اور بہت سی دنیوی مضر توں سے بچ جاؤ گے۔ پھر تمہارا نقصان ہی کیا ہوا۔ دنیا بھی نہیں گئی بلکہ اور سنور گئی اور دین مل گیا۔ بس صرف متقاومت کرنا پڑے گی نفس کی۔ اور یہ کام تو ضرور کرنا پڑے گا۔ اب تمہیں عرض ہو تو تم اس طرف آؤ۔ آگے تم جانو۔ باقی خدا تعالیٰ کو کوئی عرض نہیں کہ گھیر کر لاویں۔ مگر جب آؤ سمجھ کر آؤ۔ کبھی خام ہوئیں لے کر نہ آؤ کہ اس میں ایسی لذت ہوگی، ایسے انوار ہوں گے کشف و کرامت ہوگی۔ جب کچھ نہ ہو تو بعد میں کہو کہ دھوکا ہی ہو گیا۔

جیسا کسی بدوی نے کلام اللہ میں یہ سن کر کہ خدا نے انجیر اور زیتون کی قسم کھائی ہے انجیر کھالیا تھا۔ بہت اچھا معلوم ہوا۔ پھر آپ نے زیتون بھی کھایا وہ بد مزہ اور بکسا معلوم ہوا تو آپ کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ زیتون کی بے چکھے ہی قسم کھالی۔ بڑا دھوکا ہوا۔

اسی طرح اس طریق کے زیتون میں بکسا پن تو ہوگا مگر وہ زیتون ایسا ہے کہ لا شَرْ قِیْتِیۃً وَلَا عَرَبِیَّةً (نہ مشرق میں نہ مغرب میں) پھر تو وہ زیتون ایسا اچھا لگے گا کہ کسی چیز کی بھی اس کے سامنے کچھ حقیقت نظر نہ آئے گی جیسے تمباکو کھانے والوں کو تمباکو اول اول کیسا بڑا معلوم ہوتا ہے مگر پھر اس سے زیادہ کوئی چیز مزیدار نہیں معلوم ہوتی۔ اسی طرح جب کوئی مریض کھاتا ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے مگر پھر وہی اچھی لگتی ہے کہ گھی بھی اس کے سامنے اچھا نہیں لگتا۔ کیا خدا کے راستے کی چیزیں مریض سے بھی کم ہیں۔ یہ راستہ بھی اول اول قدر سے و شوار اور بد مزہ معلوم ہوتا ہے مگر پھر تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اس

کی تحصیل میں سجان و مال سب کچھ دینا گوارا کر لو گے۔ ذرا اس راستہ پر چل کر تو دیکھو
میں کہاں تک تفصیل کروں۔ کیا تصوف کا لقمہ منہ میں بنا کر دے دوں۔ پکا و اور کھاؤ
ترکیب ہم بتلا دیں گے۔ پہلے کچی روٹی پکاؤ گے پھر پھلکے پکانے لگو گے مگر اس
کے ساتھ یہ بھی ہے کہ روٹی پکانے میں دھواں بھی ضرور لگے گا۔ مطلب یہ ہے
کہ اس طریق میں مقاومت نفس اور شیخ کی ڈانٹ ڈپٹ بھی برداشت کرنی
پڑے گی۔ جیسے روٹی پکانے میں دھواں اور آگ کی گرمی ضرور لگتی ہے۔

حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد
آبادی بعض لوگوں پر تیزی فرماتے تھے۔

سختی مشائخ کی حکمت

اس پر ایک تعلقہ دار نے مجھ سے شکایت کی کہ گنج مراد آباد میں تو غلامی کرنا
پڑتی ہے۔ اس لئے کوئی اور پیر بتلاؤ جہاں کچھ رعایت ہو۔ بس اتنی سی بات
پر برگشتہ ہو گئے۔ صاحبو! اتنے پیر کے تو لگیں گے ہی۔ مشائخ کی سختی تو برداشت
کرنا ہی پڑے گی۔ مگر وہ سختی عین حکمت اور مصلحت ہوتی ہے۔ وہ بے فائدہ
سختی نہیں کرتے بلکہ معالجہ کرتے ہیں امراض کا۔ گو سمجھ میں نہ آوے۔

ہمارے ہاں خانقاہ میں ایک شخص تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے
شخص کو امر بالمعروف کیا۔ امر بالمعروف ہے تو اچھی چیز مگر مجھ کو ان کے طرز
سے یہ محسوس ہوا کہ منشاء اس کا کبر ہے۔ انہوں نے اپنے کو اچھا اور دوسرے
کو حقیر سمجھ کر ایسا کیا ہے۔ میں نے ان کو بلایا اور کہا۔ کیا آپ محتسب ہیں یا
کسی کی طرف سے نامور ہیں۔ انہوں نے اول اول بہت تاویلیں کیں مگر اخیر میں
سمجھے۔ میں نے ان کی یہ سزا مقرر کی کہ خانقاہ کے لوگوں کی جو تیاں سیدھی کھا

کریں۔ چنانچہ وہ کرتے رہے۔ پھر مکان پھلے گئے۔ رہاں بھی غالباً کرتے رہے۔
 جب میں نے دیکھا کہ مرعش نکل گیا۔ لکھ بھینجا کہ اب نہ کرو۔
 انہوں نے ایک شخص سے بیان کیا۔ واقعی مجھ میں یہ مرعش تھا اور مجھ کو اس
 تدبیر سے اتنا نفع ہوا کہ دس برس کے مجاہدہ سے بچی نہ ہوتا۔ کبھی برسوں کا علاج
 ایک آن میں ہو جاتا ہے۔ عرض مشارح کی سنتی اور بد مزاجی میں اصلاح ہی ہوتی ہے
 اس کو سنتی سمجھنا غلطی ہے۔

عادت اللہ | اسی طرح اس کے علاوہ ایک غلطی اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ یہ
 مشہور ہے کہ فلاں بزرگ نے فلاں کو ایک نظر میں عورت
 کر دیا۔ ایک نظر میں کیمیا بن گئی۔ ایسے باتوں کو سن کر بعض لوگ پیر کے بھروسہ
 پر کام سے بیٹھ رہتے ہیں اور خیال کر لیتے ہیں کہ پیر ایک نظر میں ہم کو کمال بنا
 دیں گے۔ ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ سو یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کام اپنے
 ہی کرنے سے ہوتا ہے۔ باقی بعض واقعات جو مشہور ہیں کہ ایک نظروں طالب
 کی کیمیا بن گئی۔ سو یہ بھی ایک درجہ میں صحیح ہے مگر یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ اس اکیر
 بننے سے پہلے کتنی دیر لگی تھی اور کیا کچھ ان کو کرنا پڑا تھا۔ کتنے اور کیسے کیسے
 مجاہدے انہوں نے کئے تھے۔ جب اکیر بنے۔ ہاں عین اکیر بننے کے وقت
 دیر نہیں لگی۔ ایک نظر میں کام ہو گیا۔ یہ ہے حقیقت واقعہ کی۔ البتہ کہیں فرق
 عادت کے طور پر ایسا بھی ہو گیا ہے کہ کچھ بھی نہیں کرنا پڑا۔ صرف ایک نظر میں
 کام ہو گیا مگر یہ تناؤ و نادر ہے۔ **وَالنَّشَازُ كَالْمَعْدُومِ دَنَادُ مِثْلُ مَنْ هُوَ نَهِي كَيْ**
 ہے، عادت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ کام کرنے سے ہوتا ہے۔ جو بھی ہوتا

ہے —

شاہ بھیک صاحب حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب کے مرید ہیں۔ ان کو ایک نظر میں کامل کر دیا تھا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے کیا تھا۔ کتنے ریاضات و مجاہدے کئے تھے۔ اس کے بعد یہ نوبت آئی۔ ایک دن ان کے مجاہدہ کا سنئے۔

یہ شخص نے ایک روز کسی بات پر ان سے کہا کہ جاؤ نکل جاؤ۔ یہ نکل کے یہاں آگئی۔ گھر گرنے کو ہو گیا۔ بی بی صاحبہ نے کہا، ایسے کاموں کا ایک آدمی تھا، اسے ہی نکال دیا۔ اب گھر کی مرمت کون کرے۔ آپ نے فرمایا میں نے نکال دیا ہے تم بلا لو۔ بی بی صاحبہ نے بلا لیا۔ شاہ بھیک صاحب اور بی بی صاحبہ سے پاس نہیں گئے تاکہ حضرت شیخ کو ناگوار نہ ہو۔ بی بی صاحبہ نے کہا کہ بھائی بھیک چھت خراب ہو گئی۔ کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ اس کو درست کر جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لائے، پھرت پالی، مٹی ڈالی، کوٹا پٹیا۔ جس وقت چھت کوٹ رہے تھے، شاہ ابوالمعالی گھر میں تشریف لائے۔ معلوم ہوا کہ بھیک چھت کوٹ رہے ہیں۔ اس وقت آپ رونی کھانے بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں لئے ہوئے صحن میں آئے اور فرمایا، لومیاں بھیک! وہ آپ زبان سے اتنا سنتے ہی چھت پر سے کود پڑے۔ آپ نے ہاتھ پکڑ کر لیا اور لقمہ منہ میں دے دیا۔ بس ایک لقمہ میں کام ہو گیا اور کامل ہو گئے۔ سو یہ تو صحیح بات ہوئی کہ ایک نظر میں کامل ہو گئے مگر یہ دیکھنا کہ کتنی وقتوں کے بعد اور کتنے مصائب کے بعد سوکھی لکڑی میں آگ

جلد لگتی ہے مگر سوکھتی ہے کتنے دنوں میں۔ شیخ کے پاس رہ کر پہلے اپنا گیلہ اپنی
تو دور کرو۔ اس کے بعد پھر آگ کا فوراً ہی اثر ہوگا۔ عارف شیرازی اسی کو تو
فرماتے ہیں :-

دوش وقتِ سحر از غمہ نجاتم دادند
وند راں خلقتِ شرب آبِ حیاتم دادند
کل رات صبح کے وقت غمہ و غم سے مجھ کو نجات دی شرب
کی خلقت میں مجھ کو آبِ حیات دی۔

کیہا نیست عجب بندگی پیرمغان
خاکِ او گشتم و چندیں در جاتم دادند
پیر کامل کی اطاعت عجب کیہا ہے۔ اس کے قدموں پر رہنا
اتنے درجات پائے۔

اس میں طریقہ بھی بتا دیا کہ میں نے شیخ کا اتباع کیا تھا۔ اس کی جوتوں
کی خاک بن گیا تھا۔ اس لئے ایسا ہوا اور ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اختیار ہی ہے
پھر کیا عذر ہے۔ پس اس طریقہ سے غلبہِ محبت پیدا کر لو۔ پھر دنیا میں لگ کر بھی
اللہ سے غفلت نہ ہوگی۔ یہ ہے کامیابی اور فرضا۔ اگر کامیاب نہ بھی ہوئے
تب بھی اسی جماعت کے ساتھ مشغول ہو گے اور یہی معنی ہیں اس کے کہ اس
طریق کی تکامی میں بھی کامیابی ہوتی ہے۔ اسی واسطے اہل طریق کہتے ہیں کہ
کام کرنے والے اس طریق میں ضرور کامیاب ہی ہوتے ہیں۔ ناکامی محض کسی
کو نہیں ہوتی۔

ذکر اللہ

آگے فرماتے ہیں۔ عَنِ ذِكْرِ اللَّهِ وَاقَامِ الصَّلَاةِ وَآيَتَاءِ
الزَّكَاةِ۔ یعنی وہ ایسے بندے ہیں جن کو تجارت اور بیع ذکر

اللہ اور نماز اور زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی۔ ذکر فعل قلب ہے اور نماز فعل
جوارح عبادت بدنی ہے۔ زکوٰۃ عبادت مالی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت
و بیع ان کو نہ قلب کی عبادت سے غافل کرتی ہے نہ بدنی عبادت سے غافل
مالی عبادت سے۔ اس میں یہ بھی تبلا دیا کہ محض عبادت ظاہری کافی نہیں، بلکہ
قلب کو بھی عابد و ذاکر بناؤ۔ اور ظاہر ہے کہ ذکر قلبی موقت نہیں۔ کیونکہ اس
میں تعین وقت کی قید نہیں۔ وہ تو ہر وقت ہو سکتا ہے۔ کسی کام میں اس سے
حرج ہی واقع نہیں ہو سکتا بخلاف دوسرے اعمال کے۔ جیسے نماز ہی ہے
مثلاً اس میں وقت کا اس لئے تعین ہے۔ اگر تعین نہ ہو تو دوسرے ضروریات
میں بڑی دقت پیش آئے۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی ورنہ مال ہی فنا ہو جاوے جس
کا ضرر ظاہر ہے اور تعین دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔

پس مجموعہ دلائل سے یہ حاصل ہوا کہ نماز و زکوٰۃ تو وقت معین پر ادا کرو
مگر ذکر ہر وقت کرو یعنی دل سے ہر وقت اللہ کی طرف متوجہ رہو۔ اسی کو
کہتے ہیں۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہ سے گنہ آگاہ نباشی

ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب حقیقی سے غافل مرت ہو
شاید کہ غم پر لطف کی نگاہ کریں اور غم آگاہ نہ ہو۔

بس اس میں ہر وقت لگے رہو۔ خدا جانے کس وقت کام بن جاوے اور
گو مقصود اس تقریر کا ذکر قلبی ہی ہے مگر وہ عادت پیدا ہوتا ہے، ذکر لسانی سے
اس لئے زبان کو بھی ڈاکر بنانا چاہئے۔ گو کسی وقت ذکر قلبی سے خالی ہی ہو
وہ بھی اگر خلوص سے ہو موثر ہوتا ہے۔

شاید اس پر کوئی ناواقف کلام کرے کہ زبان سے نام لینے سے کیا
ہوتا ہے جب اس کے ساتھ قلبی توجہ نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ کھٹائی کے نام
لینے میں تو یہ اثر مشاہد ہے کہ اس کے نام لینے سے منہ میں پانی بھرا ہوتا ہے
کیا اللہ کا نام اتنا بھی نہیں ہے کہ دل تک اس کا اثر پڑے۔

صاحبو! اعتراض مت کرو۔ اللہ اللہ کہہ لیا کرو۔ پھر خود دیکھ لو گے کیا

اثر ہوتا ہے۔ تجربہ سے یہی ترتیب ہے سلوک کی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی

سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ اپنے رب کے نام

کی پاکی بیان کرو۔

میں اس طرف اشارہ بیان فرمایا ہے۔ اس میں لفظ اسم بڑھا کر ابتدا بیان فرمائی

ہے سلوک کی کہ اول اپنے رب کے نام کی تسبیح کرو۔ اسی واسطے سَبِّحْ

رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ اپنے رب کی پاکی بیان کرو، نہیں فرمایا بلکہ اسم کا لفظ

بھی لائے۔ گویا یہ تعلیم فرمادیا کہ ابتدا نام ہی سے کرو۔ اس سے آگے ترقی

ہو جاتی ہے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں اور تسلی کرتے ہیں۔

از صفت و ز نام چہ زاید خیال وال خیالش بہت دلال وصال

وصف اور نام سے کیسا خیال پیدا ہوتا کہ وہ اس کا خیال وصال

کے لئے رہنا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب یہ خیال مت کر کہ صفت اور نام سے کیا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس سے خیال پیدا ہوگا۔ پھر وہی خیال رہتا ہے وصال ہو جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر فرضاً ذکر لسانی سے نفع تو ہوم بھی نہ ہو، شب بھی محبوب کا نام لینے میں کم سے کم مزہ تو آوے ہی گا۔ اسی کو ایک شاعر کہتا ہے۔

أَدْنَى سِقْنِي نَحْمًا أَدْنَى لِي رَحَى الْخَمْرِ
وَلَا تَسْقِنِي سِرًّا مَتَى أَمْكَنَ الْجَهَنَّمُ

کہ اے ساقی شراب پلاتا جا اور اس کے ساتھ یہ بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے۔

ایسے ہی معنوں کی حکایت ہے۔

دید معنوں را یکے صحرا نورد
در بیابان غمش بنشسته فرد
ریگ کا قد بود انگشتاں قلم
می نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے معنوں شیدا چسبت این
می نویسی نامہ بہر کسبت این
گفت مشق نامہ بیلا می کنم
خاطر خود را تسلی مسید ہم
معنوں کو کسی تے جنگل میں دیکھا کہ تنہا بیٹھا ہوا اپنی انگلی سے ریت
پر کچھ لکھ رہا ہے۔ پوچھا کس کو خط لکھ رہے ہو۔ جواب دیا کہ میں
اپنی محبوبہ بیلا کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اپنے دل کو
تسلی دیتا ہوں۔

عشق کا خود مقتنا ہے محبوب کا نام لینا۔ جب یاد سمجھ میں آگیا تو بس
چلتے پھرتے زبان سے اللہ کا نام لیتے رہو۔ اس طرز پر

لَا تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ
عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ - الخ
اُن کو اللہ کی یاد سے نہ تجارت
غافل کرتی ہے نہ خرید و فروخت

کا ایک شعبہ تو حاصل ہو جائے گا۔ اور اگر چند دن ایسا کر کے لمبی اجازت کرو
کہ ہم نے تو ایسا کیا تھا مگر دل میں اثر نہیں ہوا۔ تو وہ یہ ہوگی کہ آپ نے اس
نیت سے نہیں کیا ہوگا کہ دل میں اثر ہو۔ اگر اس نیت سے کرو تو ضرور اثر
ہوگا۔ اُگے ارشاد ہے۔

يُنْفِقُونَ يَوْمًا مَا تَقَلَّبَ فِيهِ
الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ
وہ اس دن سے ڈرتے ہیں
کہ اس میں دل اور آنکھیں لٹ

پلٹ ہو جائیں گی۔

اس میں عجب کا علاج ہے۔ یعنی اُن کو عبادت کر کے ناز نہیں ہوتا باوجود
عبادت کرنے کے پھر بھی ڈرتے ہیں۔ یہی مضمون دوسری آیت میں بھی ہے
تَلُوبُهُمْ وَجِلَّتْ اَنْهُمُ
اِلَى رِجْتِهِمْ رَا جَعُونَ۔
اُن کے دل ڈرتے ہیں اس
بات سے کہ وہ اپنے رب

کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

پہلی آیت کے ترجمہ کا یہ حاصل ہے کہ وہ ڈرتے ہیں اُن دن سے
کہ لٹ پلٹ ہو جائیں گے اُس میں دل اور آنکھیں۔ مطلب یہ کہ اُن میں
باوجود عبادت کے پھر خوف ہے، عجب نہیں۔ وہ اپنے اعمال کی ہیچ

سمجھتے ہیں۔

عمل اور اجر

ایک مسئلہ یہاں سے اور مستنبط ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جو عمل کو پیچ سمجھے گا وہ ثمرات کا منتظر نہ ہوگا۔ تو اس میں اس کی بھی تعلیم ہے کہ اعمال کے ثمرات کا انتظار نہ کرو۔ جیسے آج کل اکثر کی یہ حالت ہے کہ یہاں دو چار روز ذکر کیا اور منتظر ہوئے تھیں کہ۔

حضرت حاجی صاحبؒ ان تجلیات کے متعلق فرماتے تھے کہ حجاب نورانی اشد میں حجاب ظلمانی سے۔ کیونکہ سالکین کو جو انوار نظر آتے ہیں، وہ ظاہر ہے کہ خدا تو نہیں غیر خدا ہیں۔ مگر یہ عجیب ہونے کے سبب ان کی طرف توجہ کرتا ہے ان سے مزے لیتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ان کو مقصود سمجھنے لگتا ہے بخلاف حجاب ظلمانی کے کہ ان کی طرف ایسا التفات نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اشد نہیں۔ مگر لوگ ان ثمرات مانع ہیں کہ چاہتے ہیں اور انہی کو مقصود سمجھتے ہیں۔ سو ان کے آنے کا ہرگز قصد نہ کیے اور اگر بلا قصد آویں تو ان کی طرف التفات نہ کرے۔

ان کی مثال ایسی ہے جیسے بچہ کو لٹو دے کر یا پیسہ دے کر پہلاتے ہیں۔ اسی طرح بندی سلوک کو اس رنگ آمیزی سے پہلایا کرتے ہیں کہ نشاط سے کام میں لگا رہے۔ سو مقصود کام ہی ہے۔ اسی لئے اکثر یہ انوار عقلاء کو نہیں دکھائے جاتے بلکہ کم عقلوں کو دکھاتے ہیں۔ تاکہ ذکر اللہ کا چمک لگ جاوے اور آگے کو قدم بڑھاوے اور میں جو ان انوار کی نفی کر رہا ہوں، وہ بددیر مقصودیت ہے ورنہ فی نفسہ وہ محمود ہیں گو مقصود نہیں۔ ان کو مذموم

نہ سمجھنا چاہئے۔ اگر خود آئیں اُنے وو۔ ان کے دُور کرنے میں بھی پریشانی مت اٹھاؤ۔ اگر نہ آئیں تو معنوم مرت ہو کیونکہ مقصودیت کے درجہ میں تو ہیں نہیں نہیں آتے بلا سے مرت آئیں۔

اس آیت میں یُخَافُونَ یَوْمًا (اس دن سے خوف کرتے ہیں) فرمایا۔ یُخَافُونَ نہ فرمایا۔ حالانکہ بظاہر یُخَافُونَ زیادہ مناسب تھا کیونکہ اصل خوف کی چیز اللہ تعالیٰ ہیں۔

سو بات یہ ہے کہ اس میں ایک خرابی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض کو عروج کے مقام میں پہنچ کر فنا کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے جس سے وہ ماسوائے اللہ سے ایسا مستغنی ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کی چیزوں کو بے وقعت سمجھنے لگتا ہے کہ نہ جنت کی پروا ہے نہ دوزخ کا ڈر، نہ یوم آخرت سے خوف، صرف خدا ہی سے تعلق، محبت یا خوف رہتا ہے اور استغناء میں ایسا غلو عبادت کے خلاف ہے۔ اس وقت شیخ کامل اس کو عروج سے نزول کی طرف لاتا ہے تاکہ اللہ کی چیزوں کو بے وقعت نہ سمجھے اور اپنے کو خدا کی سب چیزوں کا محتاج جانے، نہ کہ اُن چیزوں کی ذات کی وجہ سے بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے دیکھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا عالی مقام تھا مگر پھر بھی آپ جنت طلب کر رہے ہیں۔ جنت تو جنت کھانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں غَيْرِ مُؤَدِّعٍ وَلَا مُسْتَفْنِيٍّ عَنْهُ رَبَّنَا یعنی ہمیں آپ کی ہر چیز کی حاجت ہے۔ ہم آپ کی کسی چیز سے بھی مستغنی نہیں۔ ہم تو بندے ہیں۔ ہر حال اور

ہر چیز میں آپ کی عطاؤں کے محتاج ہیں۔

اہل طریق کا جو قول ہے کہ غیر اللہ سے مستغنی ہو جاؤ اس کے یہ معنی ہیں

کہ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کو کوئی مقصود سمجھنے لگے۔ اس سے استغناء ہونا

چاہئے۔ باقی اس حیثیت سے کہ ان چیزوں کو تعلق ہے اللہ تعالیٰ سے اس

حیثیت سے ان کے ساتھ تعلق رکھے۔ تو اس سے استغناء نہ ہونا چاہئے

بلکہ ان چیزوں کی طرف اپنے کو محتاج سمجھے۔ یہ عین عبدیت ہے۔

پس آیت میں لفظ یَوْمًا لاکر تاک کو علو سے عبدیت کے مقام پر

انارتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خدا سے تو کیوں نہ ڈرتے۔ وہ تو خدا کی

چیزوں تک سے بھی ڈرتے ہیں۔ پس یَوْمًا لانے میں یہ نکتہ ہے۔ اور بعض

مقام پر یُنْفَخُونَ رَبَّهُمْ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، فرمایا ہے۔ وہ اس

طرف اشارہ ہے کہ اصل خوف اللہ ہی سے ہونا چاہئے۔ اسی لئے صوفیاء

کرام کہتے ہیں کہ اگر عذاب بھی نہ ہو تب بھی خدا سے ڈرنا چاہئے۔

اگے فرماتے ہیں یَجْزِيهِمْ اللَّهُ۔ اس میں لام عاقبت سے مطلب

یہ ہے کہ جن لوگوں میں یہ صفات ہوں گے۔ ان کا یہ انجام ہوگا۔ ان کو یہ ملے گا

أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا فِي أَحْسَنَ اور مَا عَمِلُوا جو انہوں نے عمل کئے ہیں ایک

ہی چیز ہے۔ لفظ أَحْسَنَ سے یہ بتلا دیا کہ ہر عمل تمہارا احسن ہی ہے پس یہ قید

واقعی ہے استرازی نہیں۔

جیسے ہم جنوں کو کھاتے ہیں تو پہلے کھلے کھلے انتخاب کر کے کھاتے ہیں

اور پھر سب کو کھا جاتے ہیں۔ بے کھلے ہوئے بھی کھلے ہوؤں کے ساتھ

جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی ہے کہ ٹیک عمل کیسا ہی ہو سب اَحْسَنَ مَا عَمِلُوا میں داخل ہے۔

سبحان اللہ! کتنی بڑی رحمت ہے اور کتنی بڑی تسلی فرمائی ہے اور کتنا بڑا انعام ہے ہم ناچیزوں پر۔ اور ہماری کتنی ہمدت بڑھاتے ہیں۔ قرآن میں تدبیر کیا جائے تو جابجا رحمت اور تسلی نظر آئے گی۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد ہے۔

وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ کہ اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف بلا تے ہیں۔

یوں نہیں فرمایا۔

وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الصَّلَاةِ اور اللہ تعالیٰ نماز اور زکوٰۃ
وَالزَّكَاةِ۔ کی طرف بلا تے ہیں۔

اگر ابتداءً یوں فرما دیتے تو ہم گھبرا اٹھتے اور دل توڑ دیتے۔ قلب پر بڑا بار ہوتا کہ بڑی مشقتوں کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ پس حق تعالیٰ نے یہ رحمت فرمائی کہ عبادات کی طرف بلائے کہ سلامتی کے گھر کی طرف بلانا فرمایا تاکہ دل کو رغبت پیدا ہو جاوے۔ پھر اس رغبت سے عبادت کی طرف دل بڑھے۔ واقعی کیا رحمت ہے۔ اس کے علاوہ رحمت اور دل بڑھانا اور دیکھئے وہ یہ کہ قاعدہ کے موافق جزا بقدر مجزی بہ کے ہوتی ہے یعنی جیسا عمل ہو ویسی ہی اس کی جزا ہونی چاہئے۔ سو اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم نے جیسے اعمال کئے ہیں۔ ویسی ہی جزا مل جاتی اور ہمارے اعمال کی حالت

معلوم ہی ہے جیسے کچھ ہیں۔ چنانچہ اگر ہم بندوں کا کام ایسا ناقص کریں جیسا حق تعالیٰ کا کرتے ہیں تو ہم کو پوری اُجرت تو کیا ادھوری بھی نہ ملے بلکہ نزاوی جاوے تو قاعدہ مذکورہ کے موافق ہم کو اس صورت میں جزا ملنی چاہئے تھی کہ دس برس یا بیس برس جنت میں رکھ کر پھر باہر کر دیئے جاتے۔ کیونکہ محدود کی جزا قاعدہ کے موافق محدود ہی ہوتی ہے مگر کیا رحمت ہے اور کیسا ہمارا دل بڑھاتے ہیں کہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَيُزِيدُكُمْ مِنْ فَضْلِهِ
اور زیادہ دیں گے ان کو
اپنے فضل سے۔

کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے زیادہ دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اعمال تو ہمارے اس قابل نہیں مگر یہ ہمارا فضل ہے کہ استحقاق سے زیادہ دیتے ہیں۔ صرف تمہارے اعمال پر حصر نہیں رکھتے بلکہ ہم جنت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دیں گے۔ اس میں تو شاید کسی کو یہ ناز ہو تا کہ ہمارے اعمال شاید بچے جیسے ہوں یعنی ان میں خاصیت ہو نشوونما کی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا مِنْ فَضْلِهِ کہ تمہارے اعمال بچے و بچے نہیں جنت بلکہ یہ محض ہمارا فضل ہے اور کچھ نہیں۔ اگے ارشاد ہے۔

وَاللَّهُ يَزِدُّكَ مِنْ نِعْمَائِهِ
اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے

بغیر حساب۔ ہیں بے حساب و زری دیتے ہیں

یعنی کسی کو حق تعالیٰ پر حق اعتراض نہیں۔ اللہ مہیاں جس کو چاہیں بے حساب

روزی دیں۔ ان کو کوئی روکنے والا نہیں۔ جس کو دیتے ہیں محض اپنے فضل اور

مشیت سے دیتے ہیں جس میں کسی کو مزارحمت کا منصب نہیں۔ بس آیت کا بیان ختم ہوا۔ ان اعمال کا آیت میں بیان ہے۔

صاحبو! یہ ہے مومن کا اصلی مال۔ باقی جس کو ہم مال سمجھتے ہیں وہ مال نہیں بلکہ جو مال میں کام آوے وہ ہے مال حقیقی یعنی اعمال صالحہ، واللہ! مال سے وہ راحت نہیں جو ان اعمال سے راحت ہوتی ہے۔ دونوں جہان میں اسی کو ارشاد فرماتے ہیں۔

مَنْ عَمِلْ مَالِحًا مِنْ ذِكْرٍ أَوْ آئِنًا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ
حَيٰوَةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

کہ ہم نیک کام کرنے والوں کو جو کہ مومن ہیں دنیا میں بھی پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے یعنی ایسی زندگی جس میں راحت ہی راحت ہوگی یعنی اس سے دل کو سکون و اطمینان ہوگا اور آخرت میں ان کے نیک اعمال کی کامل اجرت دیں گے۔

ایک جگہ اس کے مقابل ارشاد ہے۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَعْمٰی۔

یعنی جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملتی ہے گزران تنگی کی یعنی دنیا میں۔ اور قیامت کے روز اس کو اندھا اٹھا دیں گے۔

یہ نتیجہ ہے خدا کی یاد سے غفلت کا کہ یہاں بھی مصیبت و ماں بھی مصیبت۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ دنیا داروں کی یہاں بھی زندگی تنگ ہے۔ یہ حال ہے کہ

مال و دولت تو ان کے پاس سب کچھ ہے مگر اطمینان و راحت جس کا نام ہے وہ عیسے نہیں۔ بعض اوقات تو ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ موت کی تمنا کرتے ہیں۔ اور اعمال صالحہ سے مجال کا عیش بھی اور مال کا عیش بھی۔ دنیا بھی اچھی اور آخرت بھی اچھی۔ اصل مال اس کو کہنا چاہیے۔ دنیوی مال کو تو مال اسی کہتے ہیں بیل الیہ القلوب یعنی اس کی طرف قلب مائل ہوتا ہے۔ پس اعمال صالحہ کو بھی مال کہنا اس وجہ سے درست ہے کہ وہ اس قابل ہیں کہ قلب ان کی طرف مائل ہو۔

پس وعظ کا مقصود تو ختم ہوا۔ اب دو ایک باتیں تفسیر آیت کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ آیت میں رجال کا لفظ آیا ہے۔ عورتوں کا ذکر نہیں کیا۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو وہ تابع ہیں مردوں کے۔ دوسرے دلالت النص کے طور پر وہ خود بخود ہی اس حکم میں اس طرح سے آگئیں کہ یہ صفات جب مردوں کے لئے موجب مدح ہیں۔ اگر کسی عورت میں ہوں تو وہ اور بھی زیادہ قابل مدح ہیں۔ عورت ہو کر ان صفات کو اختیار کرے، تو بڑی ہمت کی بات ہے۔

روح آیت کی اور ان سب صفات کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دل کو ایسا تعلق ہو کہ دوسرے تعلقات پر غالب آجاوے۔ جیسا لا تلتھیں اس میں نص ہے یعنی صفت تو اس کی عبودیت ہو اور تعلق الوہیت سے ہو۔ پس بندہ کا کمال یہی ہے کہ الوہیت اور عبودیت کو اس طرح جمع

جاوے۔ اور اس کی یہی صورت ہے کہ تعلق تو اللہ سے ہو اور نشان عبادت کی ہو۔

بس اب بیان کو ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام "خیر الممال للرجال" رکھتا ہوں۔ اس نام کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حدیث میں عورت کو مال کہا گیا ہے اور یہ مال ہے تشبیہاً۔ اس لئے میں نے بھی اعمال کو تشبیہاً مال کہہ دیا۔ اور چونکہ میں اس وقت تجارت گاہ میں ہوں جہاں تجارت زیادہ ہے تو شاید کسی کو اُن میں سے یہ خیال ہو تا کہ تجارت مانع سے آخرت سے۔ اس لئے میں نے اُن کے مناسب مضمون اختیار کیا اور اُس کی اچھی طرح تفصیل کر دی کہ تجارت مانع آخرت نہیں۔ البتہ آخرت کے اختیار کرنے سے دنیا کی قید اور اُس کے ساتھ تعلق ضرور کم ہو جاوے گا۔ سو اس کا کیا مضائقہ بلکہ یہ تو مفید ہے کہ پیر میں ایک بٹری تھی وہ کم ہو گئی۔ بس یہ خلاصہ تھا بیان کا۔ اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ عمل کی توفیق دیں۔ آمین!

انشرف علی!

۲۴۸

خیرالاناث اللاناث

گورنوں کے بہترین سرمایہ کے متعلق یہ وعظ ۶ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ
 کو تازہ مکان مطبع قیومی کا پنور میں فرمایا۔ دو گھنٹے میں ختم ہوا۔ اسناد
 کا جمع تھا۔ کچھ مرد بھی شریک تھے۔ حکیم محمد یوسف صاحب مرحوم
 بجنوری نے قلمبند کیا۔

خطبة نالوره

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله، نحمده، ونستعينه، ونستغفره، ولو من به
ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور الفسنا ومن سيئات
اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا
هاوي له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك
له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله
عليه الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه وبارك وسلم
اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله
الرحمن الرحيم، واذا تلى عليهم آياتنا بينت قال
الذين كفروا للذين امنوا اي الفرقين خيرا مما و
احسن ندياة وكم اهلكنا قبلا من قرون هدا احسن اثانا
ورسياه

پہلی آیت میں کفار کا نفاق، ساز و سامان اور اہل و اعوان پر
 مذکور ہے جو حاصل ہے مال و جہاہ کا اور دوسری آیت میں
 ن سے زیادہ سادان و نمود والوں کا مبعوض اور عذاب سے ہلاک کیا جانا
 اور ہے جو حاصل ہے مال و جہاہ کے قابل نفاق نہ ہونے کا۔

سب سے پہلے قابل عرض بات یہ ہے کہ گو اس جلسہ میں مرد بھی شریک
 بن کر زیادہ مقصود مستورات کو ملنا ہے۔ اس لئے مردوں کے مذاق کی زیادہ
 رعایت نہ کی جائے گی۔ گو فائدہ دونوں میں مشترک ہے مگر اس وقت اس پر
 مرد نہیں کہ نفع معتد بہ مردوں کو ہونے اس کے دلچسپ ہونے پر نظر ہے۔ بلکہ
 مردوں کا افادہ اصل مد نظر ہے تاکہ عورتیں جن کو وعظ سننے کا موقع بہت کم
 ہے محروم نہ رہ جائیں۔ اس وقت وعظ میں مضامین متعدد وہ ہوں گے۔
 ہوں گے سہل۔ ارادہ تو یہی ہے۔ اگے اللہ تعالیٰ کو جو بھی منظور ہو پورا

میں جو امراض پائے جاتے ہیں۔ اس وقت ان کا بیان اور ان کا معالجہ بتانے کا قصد ہے اور تلاوت کی ہوئی آیات میں ایسے ہی امراض کا ذکر ہے۔ جیسا آیات کے حاصل سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ جب تک مرض نہ معلوم ہو اس کا علاج کیسے کیا جائے۔ اس لئے ضرور ہے کہ اول ان امراض کو ظاہر کیا جائے تاکہ مرض معلوم ہونے پر اس کے علاج کی طرف توجہ ہو۔

زیادہ تر افسوس تو یہی ہے کہ ہم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے اندر کچھ امراض بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علاج کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ اور جن کو امراض کا کچھ احساس بھی ہے ان کی بھی یہ حالت ہے کہ آثار کو تو دیکھتے ہیں مگر ان کے اسباب کو نہیں دیکھتے کہ اس کا سبب کیا ہے اور یہ فعل کیوں پیدا ہوا۔ پس خوب سمجھ لیجئے کہ ہر فعل کسی خاص صفت سے پیدا ہوتا ہے اور وہ صفت سبب ہوتی ہے اس فعل کا۔ تو پہلے اس صفت کا علاج کرنا چاہئے۔ اس کے بعد وہ فعل خود بخود جاتا رہے گا۔ جن کی فہم کوتاہ ہے وہ صرف اثر کو دیکھتے ہیں اور اس کے علاج کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ ان کا یہ فعل کون سی صفت سے پیدا ہوا۔ اسی لئے علاج سے فائدہ معتد بہ نہیں ہوتا۔ پس اس وقت بھی مقصود یہ ہے کہ ہمارے اندر جو صفات مذکورہ ہیں ان کو معلوم کیا جائے پھر ان کا علاج کیا جائے جس سے اصلاح افعال کی ہو اور مراد صفت سے فطرت کا درجہ نہیں۔ وہ تو عمل علاج نہیں بلکہ درجہ خلق یعنی عمل باطنی کا ہے۔

سو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں میں

دو قسم کے امراض | دو مرض بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ایک حُب

مال، دوسرے حسبِ جاہ۔ گودونوں کا رنگ مردوں اور عورتوں میں مختلف ہے یعنی مردوں میں حسبِ مال اور حسبِ جاہ کا اور رنگ ہے اور عورتوں میں دوسرا رنگ ہے مگر دونوں میں یہی دو مرض زیادہ ہیں۔ مردوں میں حسبِ جاہ اس رنگ سے ہے کہ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ عورتیں اپنے کو بڑا تو نہیں سمجھتیں مگر اپنے کو بڑا ظاہر کرنا چاہتی ہیں۔ ایسی باتیں اور ایسے طریقے اختیار کرتی ہیں کہ جن سے ان کا بڑا ہونا دوسرے پر ظاہر ہو۔

اسی طرح حسبِ مال کے رنگ بھی دونوں میں مختلف ہیں۔ مردوں کو زیادہ روپے سے محبت ہے اور کسی چیز سے اتنی نہیں۔ اسی واسطے اس کے جوڑنے اور جمع کرنے کے روپے رہتے ہیں۔ اور عورتوں کو زیور اور کپڑے اور برتن وغیرہ خانگی سامان سے زیادہ محبت ہوتی ہے کہ رنگ برنگ کے کپڑے ہوں، قسم قسم کے برتن ہوں، مختلف قسم کے زیور ہوں علیٰ ہذا مگر اس بارہ میں مردوں کی سمجھ عورتوں سے اچھی ہے۔ کیونکہ روپیہ تو ایسی چیز ہے جس سے ہر چیز حاصل ہو سکتی ہے۔ جس کے پاس روپیہ ہے اس کے پاس سب کچھ ہے۔ کیونکہ وہ ہر چیز کا بدل ہو سکتا ہے اور ہر چیز اس سے حاصل ہو سکتی ہے۔ بخلاف کپڑے اور برتن وغیرہ کے کہ وہ ہر چیز کا بدل نہیں ہو سکتے اور ہر چیز اس سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ مرد بکثرت جاہداویں خریدتے ہیں۔ کہیں مواضعیات، کہیں مکانات مول لیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی سامان سے محبت ہے روپے سے نہیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ وہاں بھی سامان سے محبت نہیں۔ بلکہ روپیہ سے محبت و رغبت ہے۔ جائداد کے لینے میں بھی روپیہ بھنسانے کی ایک صورت کہی ہے۔ پس مردوں کو جو جائداد سے محبت ہے وہاں بھی غیر منقول سے منقول ہی مقصود ہے۔ جائداد سے آمدنی ہوتی رہے گی اور محفوظ رہے گا پس وہاں بھی مقصود روپیہ ہی ہے۔

عورتوں کی حرص

عورتوں میں یہ رنگ نہیں۔ وہ تو ساز و سامان فریفتہ ہیں۔ ہر وقت چیزوں کے جمع کرنے کی

کو حرص رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روپے کو بے طور اڑاتی ہیں۔ اول تو اس وجہ سے کہ ان کو اس بات پر نظر نہیں کہ روپے سے ہر چیز حاصل ہو جا رہے۔ دوسرے روپیہ ان کا کمایا ہوا نہیں جس سے دل دکھے۔ اس لئے بیدار خیر کرتی ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ کسی نے ایک شخص کو دیکھا کہ دو شمالہ سے اپنے ادھوڑی کا جوتا صاف کر رہا ہے۔ یہ اس کو ملامت کرنے لگا، تو اس نے کہا، بات یہ ہے کہ جوتا تو میری کمائی کا ہے اور دو شمالہ ہے ابا جان کی کمائی کا۔ یہ طبعی تفاوت ہے اپنے مکسوب اور غیر کے مکسوب میں کہ اپنی کمائی کو لگتی ہے اور دوسرے کی کمائی دل کو نہیں لگتی۔

خیر جو کچھ بھی وجہ ہو ان کو روپیہ کی قدر نہیں۔ ان کو زیادہ شوق چیز کا ہے حتیٰ کہ فضولیات تک ان کی نظر پہنچتی ہے۔ پس ان کو تو یہ خبر ہے چاہے کہ فلاں چیز بیک رہی ہے فوراً اس کے خریدنے کا اہتمام ہوتا ہے۔

گو یا پہلے ہی سے اس چیز کی منتظر تھیں۔ یہاں تک حالت ہے کہ ایک ضابطی بنائی کسی کپڑے کی۔ اس کے بعد دوسرا کپڑا سامنے آ گیا۔ بس کوشش کریں گی کہ اس کو بھی خرید لیں۔ یہ واقعات میری آنکھوں کے دیکھے ہوئے ہیں۔ اور اس کا بہانہ کیا ٹھہرایا ہے کہ یہ کپڑا اگلے سال کام آ جاوے گا اور اگر کہا جاوے کہ اگلے سال اور تیار ہو جاوے گی یا پہلی کو فروخت کر کے دوسری بنا لو، تو کہتی ہیں کہ ایک تو آنے جانے کے لئے ہے اور ایک گھر کے لئے۔ عرض گھر گھڑا کی دوسری کی ضرورت کو ثابت کرتی ہیں۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ وہ کپڑا پسند آ گیا ہے اور کچھ نہیں۔ حالانکہ شوہر سمجھاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے پاس گنجائش نہیں مگر وہاں اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ ان کو چیزوں سے ایسی مثبت ہے کہ ہر شے کے لئے میں ضرورتیں تراش لیں گی۔ برتن بکڑا ہوا آ جاوے خواہ اس کی کچھ بھی ضرورت نہ ہو بس خرید لیں گی۔ پتہ چلے گا گنجائش والے گھروں میں اتنا سامان موجود ہے کہ کبھی استعمال کی بھی نسبت نہیں آتی۔ مگر عورتوں کو سامان کے خریدنے سے کسی وقت بھی انکار نہیں۔ اُدھی کو تو حقیقت میں غٹوڑ سے ہی سامان کی ضرورت ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں۔

حرص قانع نیست صاحب رزہ اسباب معاش

آنچه مادر کار دارم اکثر سے در کار نیست

یہ حالت ہے کہ بڑے بڑے فرس اور صندوق نشوں رکھے ہوئے ہیں

مگر ان کی خریداری بند نہیں ہوتی۔ خصوصاً نازک اور تکلف کا سامان خریدنے کا

آج کل بڑا ہی شوق ہے۔ جو سوائے زینت و آرائش کے کسی کام کا نہیں اور

ماشاء اللہ پختہ ایسا ہے کہ اگر ذرا ٹھیس لگے جاوے تو کسی کام کا بھی نہیں۔

جیسے ایک شخص چوڑیوں کی گٹھڑی کر رہے ہوئے چارہ پختہ رات
میں ایک گنوار ملا۔ گنواروں کی عادت ہوتی ہے کہ لکڑی مار کر پوچھا کرتے

اُس نے گٹھڑی میں لکڑی مار کر کہا کہ اس میں کیا پیر ہے۔ چوڑی والے نے

کہا کہ ایک دفعہ اور مار دو تو کچھ بھی نہیں۔ بیچا ہے کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔

یہی حال تکلف کے سامان کا ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی میں کسی

کا بھی نہیں۔ مگر مستوریت کو دن رات اسی کا اہتمام ہے کہ گھر میں بہت

پتیلیں ہوں، تکلف کا سامان ہو۔ ہر وقت یہی دھن ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان کے

اندر حسبِ حال اس رنگ میں ہے کہ ان کے پاس کتنی ہی پتیلیں ہوں مگر طالب

مزید ہی رہتی ہیں۔ ان کا پیرٹ ہی نہیں بھرتا۔

ایک عورت نے خود مجھ سے کہا تھا کہ ہماری مثال تو جہنم کی سی ہے۔

کہ اس سے کہا جائے گا اہل امتلت کہ کیا تو بھر چکی۔ تو وہ کہے گی اہل

یعنی کچھ اور بھی ہے۔ اسی طرح ان کو صبر نہیں طالب مزید ہی رہتی ہیں۔

جب کبھی ان سے پوچھو تو یہی کہیں گی کہ ہمارا

پاس کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ شکر کرتا تو کبھی جواب

ہی نہیں۔ مولوی عبدالرب صاحب واعظ ایک مضمون اپنے وعظ میں فرما

کرتے تھے۔ گو مضمون تو ہے شاعرانہ مگر ہے واقعی۔

چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ عورتوں کے پاس اگر کپڑوں کے صندوق

بھرے ہوں مگر ان سے جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں چارہ پختہ سے۔ سارا

برتنوں سے بھرا ہوا ہو مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں چار ٹھیکرے۔ جوتیوں کے کتے ہی جوڑے ہوں مگر ہمیشہ یوں ہی کہیں گی کیا ہیں دو لیترے۔ یہ مضمون ممکن ہے قافیہ کی ضرورت سے بنا ہو مگر واقعہ سچا ہے۔

حاصل یہ کہ ان کو سامان سے کبھی صبر ہوتا ہی نہیں۔ مرد تو کپڑوں میں پیوند تک لگا لیتے ہیں مگر عورتیں ہیں کہ ان کو نئے کپڑوں کے صندوق بھر کر بھی کفایت نہیں ہوتی۔ چاہتی ہیں کہ کپڑوں سے گھر بھر لیں۔ اگر سخت مجبوری ہو تو پیوند بھی لگالیں گی۔ مگر وسعت میں تو لگاتی ہی نہیں۔ بعض مرد بیچارے ہیں تو مرد اور چار اٹھ آنے کے مگر بیبیوں کو دیکھو تو بیگم بنی ہوئی ہیں مرد اپنے لئے پیوند لگے کپڑوں کو عیب نہیں سمجھتا مگر عورت غریب کی بھی ہوگی اپنے کو ایسا بنائے گی کہ گویا بنت الامیر وزوجہ الکبیر ہے اور یہ سب ساز و سامان اور سجاوٹ شوہر کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کو دکھانے کی غرض سے ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ محض کلم فہمی کی بات ہے۔ دکھانے سے ہوتا کیا ہے کیونکہ آپس میں خاندان والوں کو ایک دوسرے کا حال تو معلوم ہی ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت اتنی ہے اور اس کی اتنی بھر دکھانے سے نتیجہ کیا۔ یہ مانا کہ عورتوں کے مناسب زینت ہے مگر اس میں اعتدال تو ہر حد سے بڑھی ہوئی تو نہ ہو۔ ان میں حسبِ مال کا یہ رنگ ہے اور مردوں میں بھی یہ مرض حسبِ مال کا موجود ہے مگر رنگ مختلف ہے۔

دوسرا مرض عورتوں میں حسبِ جاہ ہے اور
عورت اور حسبِ جاہ
 یہ مرض مردوں میں بھی ہے مگر دوسرے رنگ

میں۔ وہ بھی اپنے کو بڑا بناتے ہیں مگر رنگ اور ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر مردوں میں اور کمالات بھی ہیں جیسے علم وغیرہ۔ اس لئے ان کا حربہ جاہ اس قدر نازیبانہیں اور عورتوں میں تو یہ بھی نہیں مگر پھر بھی ان میں حربہ جاہ ہے۔ گو یہ اپنے کو بڑا نہیں سمجھتیں مگر یہ چاہتی ہیں کہ دوسرے ان کو بڑا سمجھیں ان میں اس کے ساتھ تذل اور تواضع کی بھی ایک نشان ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض بیبیاں پائنتی بلٹھتی ہیں اور خدا و مرد سرمانے۔ اور خود بان لگا کر جنگن وغیرہ کو دے دیتی ہیں۔ ان بیچارہ یوں میں اس قسم کی تواضع بھی ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کی کوشش بھی کرتی ہیں کہ ہم سب سے بڑھی رہیں بیچارہ یوں میں کمالات تو ہیں نہیں مگر چاہتی ہیں کہ زیور اور سامان بہت سا ہو۔ کہ دوسروں سے بڑھی پڑھی رہیں۔ جب کہیں جائیں گی، تو خوب زیور لاد پھاند کر جائیں گی۔ خواہ مانگا ہوا ہی زیور ہو اور گو دوسروں کو معلوم بھی ہو کہ مانگ کر پہنا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہم کو کوئی ہلکانہ سمجھے۔ رات دن اسی کا اہتمام ہے۔ یہی سبق ہے کہ پیک ہو، گوڑہ ہو، ٹھپہ ہو، چک ہو، کپڑے کی تراش ایسی ہو، جھال بھی لگا ہوا ہو۔ جہاں تک ان کے امکان میں ہے بناوٹ کا اہتمام کرتی ہیں۔

اس کے متعلق ان میں کمیٹی بھی ہوتی ہے جس میں بڑے بڑے معاملات اس کے متعلق طے ہوتے ہیں کہ بہن ذرا بتلاؤ تو کہ اس کو تہ کے ساتھ کون سا پاجامہ اچھا لگے گا اور اس جوڑے پر دوپٹہ کون سا ہونا چاہئے۔ پھر ان کا سب سے بدترین مذاق ہے کہ یہ سب ذہنت محض دوسرے کے

خوش کرنے کو کرتی ہیں۔ باقی خاوند کے سامنے ایسی میلی کچیل رہیں گی جیسے مٹنگن۔ اگر کہیں برادری وغیرہ میں جائیں گی تو غسل صحت بھی ہوگا یعنی جیسے آدمی تندرست ہو کر مدت کے میل کچیل کو اچھی طرح صابون کھلی وغیرہ لگا کر بدن سے صاف کرتا ہے۔ جب واپس آئیں گی تو خاوند کی قسمت میں وہی مبارک صورت ہوگی۔ جہاں گھر میں آئیں فوراً زیبائش کے کپڑے اتار پھینکے۔ خدا جانے یہ عورتوں کا کیا مذاق ہے۔ کہتی ہیں وہاں ضرورت تھی اس لئے زیور کپڑے پہن لئے۔ یہاں کیا ضرورت ہے! اور وہ ضرورت صرف یہ ہے کہ شان کو ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ ہم کو کوئی ہلکا نہ سمجھے۔ اگر اعتدال سے زینت ہو تو مصالحتہ نہیں مگر اتنا انہماک کہ ہر وقت اسی میں لگی رہتی ہیں یہ ٹھیک نہیں۔

یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ ان کے پاس اچھا خاصا زیور ہے مگر کسی بی بی کے پاس کسی اور وضع یا نقشہ کا زیور بنا ہوا دیکھا بس فریفتہ ہو گئیں۔ اور اس سے فرمائش کی جاتی ہے کہ بہن ذرا مجھ کو دے دینا میں بھی ایسا ہی بنواؤں گی۔ پھر اس سے زیور لے کر شوہر سے فرمائش کرتی ہیں کہ ایسا بنوادو۔ اب وہ ہر چند سمجھاتا ہے کہ اس کو کیوں خواب کرتی ہو اچھا خاصا بنا بنا یا زیور خواب ہو جاوے گا۔ سنار کھوٹ ملا دے گا تو چار پیسہ کا زیور رہ جائے گا۔ مگر ایک نہیں سنتیں۔ یہی کہتی ہیں کہ مجھے تو اسی نمونہ کا بنوادو، کچھ ہی ہو۔ اب وہ بیچارہ ان کے اصرار پر دلجوئی بھی کرتا ہے اور یہ اس کی عقل پر غالب ہو جاتی ہیں۔ عاقل و لشکنی کو پسند نہیں کرتا۔ آخر

وہ کہتا ہے کہ تم جیتی میں مارا۔ اور پھر اس پر بھی بس نہیں۔ اگر اگلے مہینہ اور کوئی نمونہ سامنے آگیا تو یہ کہتی ہیں کہ اب یہ نمونہ ہونا چاہئے۔

غرض ہر چیز پر ان کا عشق ہے۔ بس یہی چاہتی ہیں کہ جیسی چیز اور کس کے پاس ہو ویسی ہی ہمارے پاس ہو جاوے۔ شوہر کی ساری کمائی اور کی زیب و زینت ہی میں صرف ہوتی ہے۔ اور یہ ساری مذکورہ خرابیاں حجاب اور حجبِ مال کی ہے مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی۔ صرف فرق ہے کہ مردوں میں کسے قدر ضرورتوں پر نظر ہے اور عورتوں میں ضرورتوں پر نظر نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق بیان کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے یہ آیت اس وقت اختیار کی ہے۔

اگرچہ آیت میں کفار کی حالت بیان کی گئی ہے کہ ان میں فلاں

خوارج اور معتزلہ کا مذہب

فلاں صفات ذمبیہ پائی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کی حالت بیان نہیں کی گئی مگر اس عنوان سے بیان کرنے میں ایک بڑا فائدہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس میں اس پر دلالت ہے کہ یہ صفات فی نفسہ ایسی بری خصال ہیں کہ کفار میں بھی باوجود کافر ہونے کے بری ہیں۔ تو مسلمانوں میں تو اسلام کے ہوتے ہوئے بدرجہ اولیٰ نہ ہونی چاہئیں۔ اس اعتبار سے یہ آیت مسلمانوں کے لئے ان صفات ذمبیہ سے زیادہ مانع ہونی چاہئے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک تو سیاہ کپڑے پر دھبہ ہو، وہ ایسا برا نہیں معلوم ہوتا جیسا سفید کپڑے پر معلوم ہوتا ہے۔ یہ میں نے اس لئے

کہا کہ بعض لوگ شاید یوں کہیں کہ یہ آیتیں تو کفار کے بارہ میں ہیں اور مسلمانوں میں ان کو کیوں جاری کیا جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں ان آیات کے جاری کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ صفات اگر مسلمانوں میں پائی جاویں تو ان کو ان صفات کی وجہ سے کافر بنایا جاوے۔ اس وجہ میں تو منطبق کرنا حرام ہے اور اس میں ترک ہے خصوصاً کا۔ یہ تو مذہب ہے خوارج کا۔ وہ کہتے ہیں کہ کبارہ کے ارتکاب سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لا تکفروا بذنوب ولا تقہجوا
یعنی کسی مسلمان کو کافر مت
من الایمان۔ بناؤ کسی گناہ کی وجہ سے اور

اس کو ایمان سے خارج مت کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو جملے ارشاد فرمائے ایک لا تکفروا بذنوب اور دوسرا لا تقہجوا من الایمان۔ بظاہر دوسرے جملہ کے بیان کرنے کی حاجت نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ لا تقہجوا من الایمان تو لا تکفروا بذنوب میں خود ہی آگیا۔ کیونکہ جب مسلمان کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ ہوا تو خروج من الایمان بھی نہ پایا گیا۔ پھر دوسرا جملہ ارشاد فرمانے کی کیا ضرورت تھی۔

سو اس کا راز یہ ہے کہ آپ کے بعد دو مذبوح فرقے بڑے بڑے پیدا ہونے والے تھے جن کا فتنہ عظیم تھا۔ ایک خوارج دوسرے معتزلہ خواجہ کا مذہب یہ ہے کہ مسلمان گناہ کبیرہ کی وجہ سے کافر ہو جاتا ہے اور معتزلہ

کہتے ہیں کہ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر تو نہیں ہوتا مگر مومن بھی نہیں رہتا ایک
بین بین حالت ہو جاتی ہے۔ نہ اس کو کافر کہہ سکتے ہیں نہ مومن۔ آپ نے
ان دونوں فرقوں پر نکیر فرمائی۔ پہلے جملہ میں تو خوارج کا رو ہے اور دوسرے
میں معتزلہ کا۔ اس لئے آپ نے دو جملے ارشاد فرمائے۔

میں ہر چند قصد کرتا ہوں کہ ایسے غیر اہل علم کے مجمع میں ایسی باتیں نہ بیان
کروں جو اہل علم کے لائق ہیں عوام کے مناسب نہیں مگر ایک اوصاف بات
بیان ہو ہی جاتی ہے۔ بہر حال ان آیات کا مسلمانوں کے حق میں اس طرح جاری
کرنا کہ ان کو ان صفات کے ارتکاب سے کافر بنایا جاوے، یہ تو مذموم ہے
لیکن ایک دوسری صورت ہے کہ تعبیر (من العار) یعنی شرم دلانے کے طور
پر ان آیات کو مسلمانوں پر جاری کیا جاوے۔ یہ عین حکمت ہے اور شرعاً
مطلوب ہے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من ترك الصلاة متعمداً یعنی جس نے عداً نماز چھوڑ دی

فقد كفر وہ عملاً کافر ہے۔

گو عقیدہ کے اعتبار سے کافر نہیں۔ یعنی نماز کا ترک کرنا کفار کا سا عمل ہے
کہ وہ بھی نماز نہیں پڑھتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک صلوٰۃ کو کفر فرمایا
گو اس میں تاویل ہے مگر اصل مقصود عار دلانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں
کی کسی خصلتیں مسلمانوں میں کیوں ہوں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جو صفات ان آیات میں مذکور ہیں ان کے مذموم

ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جس کو ناز و نعمت سے پالتے ہیں اور جس کی زیادہ خاطر واری کرتے ہیں وہ اگر نافرمانی کرے تو اس پر غصہ بھی بہت آتا ہے ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی اہل بیت سے زیادہ کون مورد انعام و فضل ہوگا۔

بہر حال ان نصوص سے معلوم ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کو کسی کی ذات سے نہ ایسی محبت ہے کہ چاہے جو بھی کرتا رہے پھر بھی کچھ نہ کہیں۔ اور نہ کسی کی ذات سے ایسا بغض ہے کہ وہ کسی ہی اطاعت و فرماں برداری کرے پھر بھی قدر نہ ہو۔

میں نے اپنے بیان میں ایسی کی قید اس لئے لگائی ہے کہ حق تعالیٰ کو بعض سے اتنی محبت ضرور ہے کہ ان کو معاصی نہیں کرنے دینے۔ ان کے افعال کے ساتھ خدا تعالیٰ کو محبت ہو گئی ہے جس سے ان کی حفاظت کیتے ہیں۔ ان کو گناہوں سے بچاتے ہیں۔ پشیمانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں۔

ولولا ان ثبتناک لقد
کدت ترکن الیہم شیئا
قلیلا۔
یعنی اگر ہم آپ کو ثابت
قدم نہ رکھتے تو آپ ان کی
طرف کسی قدر ٹھوڑا سا مائل

ہونے کے قریب ہو جاتے۔

اللہ اکبر۔ کیا شان حفاظت ہے کہ قلیل در قلیل کے میلان سے بھی حفاظت کی جاتی ہے۔ اگر کبھی ایسوں سے لغزش ہونے والی ہوتی

ہوتی ہے تو ان کو سنبھال لیتے ہیں۔ اگے نہیں بڑھنے دیتے۔ ایسے بندوں کو خدا تعالیٰ نے پہلے سے محفوظ رکھا ہے۔ معصیت ان سے ہوتی ہی نہیں انبیاء علیہم السلام سب ہی ایسے ہوئے ہیں۔ اولیاء میں بھی بعض ایسے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مراد کہتے ہیں اور ایک ہوتے ہیں مرید جو کہ مجاہدہ کے معاصی سے محفوظ رہتے ہیں۔ بعض اولیاء کو یہ مرتبہ دیا ہے۔ یعنی مرادیت کا، ان کے ارادوں کے اسباب بعد منہدم کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان سے معصیت سرزد ہی نہیں ہوتی۔ ایسے اولیاء کو محفوظ کہتے ہیں اور انبیاء کو معصوم۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ انبیاء سے تو معاصی صادر ہوئے ہیں پھر معصوم ہونے کا حکم کیسے کیا گیا۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے بارہ میں سے عصی آدم ربہ کہ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ عصی کے معنی مجازی مراد ہیں یعنی خطائے اجتہادی۔ جیسا اپنے موقع میں ثابت ہو چکا ہے۔ اور خطائے اجتہادی میں تو ایک گناہ ثابت ہوتا ہے۔ پس وہ صورت خطا ہے ورنہ واقع میں طاعت ہے کیونکہ ثواب مخصوص ہے طاعت کے ساتھ۔ پس انبیاء علیہم السلام کی لغزشیں حقیقت میں طاعات ہی ہیں۔ ان کو حق تعالیٰ عقوبت کا کام کرنے ہی نہیں دیتے۔ اس وقت اس تحقیق کا زیادہ موقع نہیں۔

اس وقت رنجہ فقیر اتنا بتانا ہے کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی بندہ کے ساتھ حق تعالیٰ کا یہ معاملہ ہو کہ اس کو گناہ کرنے ہی نہ دیں مگر یہ نہیں ہو سکتا

کہ باوجود گناہ کرنے کے محبت باقی رہے۔ اسی واسطے میں نے اپنی تقریر
 میں اسی کی قید لگائی۔ بہت لوگوں کو یہ ناز ہے کہ ہم کچھ ہی گناہ کر لیں کچھ
 ہو گا کیونکہ ہم بزرگوں کی اولاد ہیں۔ مگر یہ خیال محض باطل ہے۔ یہ عقیدہ یہود و اولاد
 نصاریٰ کا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ خدا تعالیٰ کو کسی سے ایسی محبت نہیں کہ
 معافی کرنے پر بھی وہ باقی رہے۔ نہ ایسا بغض ہے کہ طاعت سے بھی
 قدر نہ ہو۔

جیسے انسان کا حال ہے کہ کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ جو کچھ بھی
 کرے سب معاف اور یا بغض ہو جاتا ہے تو وہ جو کسی ہی طاعت کرے
 مگر قبول ہی نہیں۔ جیسے کسی حاکم کو کسی کی ذات سے بغض ہو جاتا ہے تو وہ اُس
 کو قید ہی کرنا چاہتا ہے۔ وگلا، وپیر، مٹرو وغیرہ سب کے سب رہ جاتے ہیں۔
 کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی سے ذاتی نفرت ہوتی ہے اُس کے ہزار
 کمالات بھی بے اثر ہو جاتے ہیں بلکہ عیوب نظر آنے لگتے ہیں۔
 ایک بزرگ تھے۔ اچھے اچھے لوگ اُن کے معتقد تھے مگر بی بی اُن کی
 نہایت نالائق تھی۔ وہ اُن کی معتقد نہ تھی بلکہ ایذا میں رہتی تھی۔ ہمیشہ اُن سے
 لڑتی رہتی تھی۔ اُن کے خوارق اور کرامات کو بھی دیکھتی تھی مگر اس کا اعتقاد
 ہی اُن پر نہ ہوتا تھا۔ ایک روز وہ بزرگ قضا ہوا میں اڑے اور اپنے گھر
 کے اوپر سے گزرے تاکہ بی بی دیکھے اور ایذا دینا چھوڑ دے۔ مسنورات نے
 جو اُن کے گھر میں جمع تھیں دیکھ کر کہا کہ یہ کوئی ابدال معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی
 بی بی نے بھی کہا کہ واقعی ابدال ہی ہیں۔ جب وہ گھر میں آئے تو بی بی نے

اللہ اکبر! آج ہم نے عجیب بات دیکھی جو کبھی نہ دیکھی نہ سنی۔ ایک بزرگ
 واپس اڑ رہے تھے۔ بڑے صاحب کمال تھے۔ اُن بزرگ نے کہا کہ بی بی
 نے پہچانا بھی۔ کہا نہیں۔ فرمایا وہ میں ہی تھا۔ تو وہ کہتی ہے کہ ماں جب ہی
 بڑھے اڑ رہے تھے۔ اُس بی بی کو اُن کی ذات سے بغض تھا۔ اس لئے
 وجود ایسا کمال دیکھنے کے بھی اُن کی معتقد نہ ہوئی۔

بات یہ ہے کہ انسان جس کے متعلق کوئی رائے اچھی بڑی قائم کر لیتا
 ہے تو گو اُس کو کیسی ہی دلیل اُس کے خلاف کی ملے مگر یہی چاہتا ہے اپنی
 رائے نہ بدلے۔ سو خدا تعالیٰ کی شان اس سے بہت ارفع ہے کہ کوئی ہزار
 برس بھی اطاعت کرے اور بغض ذاتی کی وجہ سے اُن کے نزدیک اُس کی
 مدد نہ ہو یا کوئی گناہ کیا کرے اور حُب ذاتی کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہیں۔ ماں
 بات ضرور ہے کہ کسی کی طاعت سے نہ اُن کا ذرہ برابر نفع نہ کسی کی
 عصیت سے اُن کا کچھ ضرر۔ وہاں تو یہ کیفیت ہے۔

بہر کہ خواہد گو بسیا و بہر کہ خواہد گو برو
 دار و گیر و حاجب درباں دریں درگاہ نیست

حق سبحانہ تعالیٰ کے غنی ہونے کے یہی معنی ہیں نہ وہ معنی جس کو عوام سمجھتے
 ہیں کہ نعوذ باللہ نہ کسی بات کا انتظام ہے نہ کسی کے آرام و تکلیف کی پروا ہے
 جس کو چاہا بدو ن کسی حکمت کے نتیجہ کر دیا، جس کو چاہا مصیبت میں ڈال دیا
 جسے چاہا بیمار کر دیا۔ جب کوئی یتیم ہو جائے یا عزیز ہو جائے یا مصیبت
 میں پڑ جائے تو ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ خدا کی ذات بے پروا ہے یعنی

کسی کے نفع و ضرر کی کوئی رعایت نہیں۔ ایسے موقع پر یہ کلمہ بہت ہی سحر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو کسی پر رحم نہیں اتانہ کسی کی مصلحت کی خاطر کہتے ہیں۔ لوگ بدذات حال یہ چاہتے ہیں کہ جو مصلحت کسی واقعہ میں ہم کو ہے، خدا تعالیٰ بھی نعوذ باللہ اسی کے موافق معاملہ فرماویں۔ اگرچہ یہ عقیدہ ہے مگر اقوال سے تو یہی مفہوم ہوتا۔ بڑے بڑے اس میں مبتلا ہیں۔

یہ جو بیماری آج کل ہوئی تھی۔ اس میں کیسے کیسے کلمات لوگوں نے کہے ہیں۔ کفر تک بکا ہے۔ بیماری ہوئی تھی اس میں بہت جگہ ایسا ہوا کہ یہ عقیم رہ گئے۔ گھر میں کھانے کو نہ تھا۔ بی بی بیوہ ہو گئی تو لوگ کہتے تھے کہ بس اللہ میاں کے یہاں نعوذ باللہ کوئی قاعدہ نہیں۔ اندھا دھند معاملہ ہے کسی کی پرواہ ہی نہیں۔ بڑی بڑی شکایتیں کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی، اس سے تو کہنا چاہئے۔ خدا تعالیٰ کے معنی ہونے کے یہ معنی نہیں جو مذکور ہوئے بلکہ معنی ہیں کہ کسی کی طاعت سے ان کو نفع نہیں اور کسی کے کفر و معصیت سے ان کا ضرر نہیں۔ چنانچہ اسی معنی کو صریحاً فرماتے ہیں۔

ان تکفروا فان اللہ غنی یعنی اگر تم کفر کرو تو اللہ تم

عنکم سے غنی ہے۔

یعنی اس کا کچھ بھی ضرر نہیں جیسے سلاطین دنیا کو رعایا کے بگڑنے سے ضرر ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر کسی بادشاہ کی رعایا اس سے باغی ہو جائے تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کا تخت و تاج باقی نہیں رہتا۔ ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔ اس کا احتمال حق تعالیٰ میں نہیں ہے۔ اگر تمام آسمان و زمین

لے باغی ہو جاویں تو وہاں ذرہ برابر بھی ضرر نہیں اور یہ بھی نہیں کہ کوئی ہزار
س تک معامی کہتا رہے پھر رجوع کرے اور توبہ کرے تو قبول نہ ہو۔
انچہ ارشاد بالا کے بعد ہی یہ بھی ارشاد ہے۔ وان تشکروا یبڑقہ

شیطان سے رعایت | چنانچہ میں ایک روایت سیر کی نقل کرتا
ہوں۔ سیر کی روایت بطور تائید کے بیان

دی جاوے تو مضائقہ نہیں۔ جب کہ وہ لفظوں سے متناہد ہو اس روایت
سے معلوم ہوگا کہ شیطان کو بھی جو سب سے اعلیٰ درجہ کا نافرمان ہے حق
الی نے توبہ سے مستثنیٰ نہیں کیا۔

وہ روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حق تعالیٰ سے
سجرات کے لئے تشریف لے جا رہے تھے کہ شیطان ملا اور آپ سے
کہا کہ میری بھی ایک درخواست ہے۔ میں بہت گنہگار ہوں۔ میرے
لئے بھی حق تعالیٰ سے دو کلمہ کہہ دیجئے گا۔ انبیاء علیہم السلام بڑے شفیق ہوتے
۔ اُن کے اس کہنے پر آپ کو رحمت کا جوش ہوا اور آپ نے وعدہ
رایا۔ عرض خدا تعالیٰ سے مناجات ہوئی۔ آپ شیطان کا پیام بھول گئے
حق تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کسی بندہ سے وعدہ کیے بھول گئے۔ آپ کو
واگیا اور آپ نے شیطان کے پاس میں عرض کیا۔ اس پر ارشاد ہوا کہ
میں سے کہہ دینا کہ ہمارا تمہارا جس بات پر بگاڑ ہوا ہے وہی اب بھی ہے
راؤم اس وقت موجود نہیں مگر اُن کی قبر موجود ہے۔ اُن کی قبر کو سجدہ کر لے

میں سب معاف ہے۔ آپ بہت خوش ہوئے کہ یہ تو بڑا کستا نسخہ
 اس میں اُس کا کیا حرج ہے۔ اچھا ہو کہ وہ ایسا کر لے تو دنیا سے سارا فسار
 مٹ جاوے۔ عرض آپ واپس تشریف لائے اور شیطان ملا تو اُس
 نے فرمایا تو بڑا خوش قسمت ہے۔ وہاں سے عجیب و غریب جواب
 سے۔ اُس نے کہا بتلائیے تو سہی۔ آپ نے جو جواب ارشاد ہوا
 سے کہہ دیا۔ اُس نے کہا سبحان اللہ! اچھا پیام لائے۔ جب میں نے
 کو اُن کی زندگی میں سجدہ نہیں کیا تو اب مرنے کے بعد تو ضرور کروں گا۔ کم
 خبیث ملعون نے یہ جواب دیا۔

شیطان کی خود ہی حالت ایسی ہے کہ آسان سے آسان نسخہ
 کم بخت کو بتلایا تو اُس سے نہ ہو سکا۔ جب سخناس و داغ میں گھسا
 عمل کون کرے لیکن اگر وہ بھی توبہ کر لے تو اُس کو بھی روک ٹوک نہیں۔
 کم بخت کیوں کرنے لگا۔ اُس کی قسمت ہی میں نہیں۔
 آگے راز قدر کا ہے اس میں خوش نہ کرنا چاہئے۔ عرض جب شد
 کے لئے بھی توبہ کی گنجائش ہے تو پھر اور کون رہ گیا۔ حق تعالیٰ بعد فرما
 کیا رُکے ارشاد فرماتے ہیں۔

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ إِثْمًا لِيُنَاصِفَ لَهُ الْعَذَابَ لَعْنًا

الْقِيَامَةِ وَيَجْلَدُ فِيهِ مِثْلَ نَجْمِ اللَّيْلِ إِذَا سَوَّىٰ

اس آیت میں کسی کو توبہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جب تک مغرب کے
 آفتاب نہ نکلے اس وقت تک یہی قانون ہے کہ ہر ایک کی توبہ قبول ہے

کوئی بھی ہو۔ غرض قانون عام ہے گواہوں کا زمانہ محدود ہے۔
 خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی سے بھی حسب ذاتی اور بعض ذاتی نہیں
 کفار سے بھی ان کی ذات کی وجہ سے لعن نہیں بلکہ ان کے افعال سے لعن
 ہے جس میں کفر سب سے اشد ہے۔ اور دوسرے افعال بھی موجب
 لعن ہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ حقیقت میں یہ افعال
 مبعوض ہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ ان افعال

احتیاط کی ضرورت

کی وجہ سے خدا تعالیٰ کو کفار سے لعن ہے تو ان سے ہمیں بھی بچنا چاہئے
 ایک تو اس وجہ سے کہ وہ افعال مبعوض ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ ہم تکلف
 میں فروغ کے۔ اس لئے ہمارے حق میں ان کا قبح زیادہ شدید ہوگا۔ اس لئے
 ہم کو اور بھی زیادہ بچنا چاہئے۔ یہ تو تمہید تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ لعن اور
 حسب کار افعال و صفات پر ہے نہ ذات پر۔

اب میں آیت کی تفسیر شروع کرتا ہوں جس میں اللہ تعالیٰ کفار کا
 ایک مقولہ بیان فرماتے ہیں جس کو وہ مسلمانوں سے کہا کرتے تھے۔ وہ
 مقولہ یہ ہے ای الفرقین خیر مقاماً واحسن ندیا یعنی جبریل ہاری
 آیتیں کھلی کھلی ان لوگوں کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو یہ کفار ایمان والوں
 سے یوں کہتے ہیں کہ دونوں فریق میں سے کونسا فریق بہتر ہے۔ مکان میں اور
 اچھا ہے محفل میں۔ واذا تتلى عليهم في حصم کی ضمیر نلاہرا ان کفار کی
 طرف عائد ہے مگر نہ تخصیص کی بنا پر بلکہ تبلیغ عام کے وقت وہ تلاوت

ان لوگوں کے سامنے بھی ہو جاتی تھی۔

تخصیص کی نفی اس لئے کی گئی کہ ایسا نہ ہوتا تھا کہ خاص ان کا کوئی جلسہ کر کے اس میں تلاوت ہوتی ہو۔ گو کفار نے جدا جلسہ چاہا تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اگر ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ ہم آپ کی بات کو نہیں مانتے مگر ہماری مجلس غریبہ سے علیحدہ کر دیجئے۔ ہم ان میں بیٹھنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ ذلیل لوگ ہیں اور ہم رؤسا ہیں۔ ان میں بیٹھ کر ہماری عزت کو بیٹھ لگتا ہے ہمارے امانت ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حجرت کی غرض سے اس کا کچھ نحیف سا خیال بھی کیا تھا تا کہ ان کے پاس پھر کوئی عذر نہ رہے اور شاید ہدایت ہی ہو جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ

وَجِهَهُمْ عَلَيْكَ مِنْ حَسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَعَنْ حَسَابِكَ

عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ۔

اور مت ڈور کرو ان کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام

چاہتے ہیں رضامندی اس کی۔ تم پر نہیں ان کے حساب میں سے

کچھ اور نہ تمہارے حساب سے ان پر کچھ تم اگر ان کو ڈور کرو

پھر ہو جاؤ گے تم بے انصافوں میں سے۔

ایک جگہ اسی کے قریب المعنی یہ آیت ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ

يُرِيدُونَ وَجِهَهُمْ عَلَيْكَ وَعَنْ عَيْنِكَ عَنْهُمْ تُرِيدُونَ زِينَةَ الْحَيَاةِ

الدنيا ولا تطعم من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هواه و
كان امره شوطا۔

اور روک رکھو اپنی ذات کو اُن کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے
رب کو صبح و شام۔ طالب ہیں اُن کی رضا مندی کے اور نہ بٹیں
تمہاری آنکھیں اُن کو چھوڑ کر تلاش میں رونق دنیا کی زندگی کی اور نہ
کہا مانو اُن کا جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے اور پیری
کی اُن نے اپنی خواہش کی اور ہے اُن کا کام حد سے نکلا ہوا
یہ تدریج مستقل جملہ نہیں ہے کہ جس سے لازم آوے کہ آپ سے اس کا یعنی
ازادہ زیست دنیا کا صدور بھی ہوا ہو بلکہ نہی کے تحت میں ہے۔ اور ترکیب
میں حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی آنکھیں ان سے نہ ہٹیں جس کا منشا اور
سبب ازادہ حیات دنیا کا ہونا۔ آگے صاف صاف فرما دیا۔

فمن شار فليؤموم ومن شاد
فليكفر۔

کفر کرے۔

آپ کو کچھ خوشامد نہیں پڑی۔ عرض آپ کو منع فرما دیا کہ کوئی خاص جلیبہ
ان نجیثوں کے لئے نہ کیا جاوے۔ ان کو سود و فخر پر سے آئیں، اور نہ
جائیں جہنم میں۔

مقام طالب و مطلوب | امام مالک سے خلیفہ نے درخواست
کی تھی کہ شہزادوں کے واسطے حدیث

سنانے کا جلسہ علیحدہ کر دیا جاوے کیونکہ عام جلسہ میں پڑھنا ان کے لئے ہے۔ آپ نے اس کو منظور نہیں کیا۔ خلیفہ نے پہلے ان سے یہ فرمائش کی کہ آپ شہزادوں کو مکان پر آکر درس دیا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ علم مطلوب ہے طالب نہیں۔ خلیفہ سمجھ دار تھے اور نبوت کا زمانہ بھی قریب تھا۔ لہذا فوراً سمجھ گئے اور شہزادوں کو حکم دیا کہ امام کے مکان پر جا کر جلسہ عام میں بیٹھا کریں۔

یہ تو تنبی علیہم کے متعلق متحقق تھی۔ اس کے بعد آیت میں بینا کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کھلی کھلی آیتیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسائل مستنبط بھی کھلے ہوئے ہیں بلکہ ظاہر مقصود یعنی عبارتہ النص بالکل کھلا ہوا ہے۔ اس میں کوئی غموض نہیں۔ باقی دلالتہ النص اور اشارتہ النص اور اقتضائہ النص وہ کھلے ہوئے ہیں کہ ہر کوئی اس کو سمجھ لے۔ چنانچہ ایک آیت میں ارشاد ہے

وَإِذَا جَاءَهُمْ مِنْ أَمْرٍ أَوْ آيَةٍ أَوْ نَذِيرٍ أَوْ بَأْسٍ أَوْ عَذَابٍ أَلِيمٍ
رَوَاهُ إِلَى الرَّسُولِ وَالْأُولَى الْأُمْرُ مِنْهُمْ لَعَلَّهُمْ
الَّذِينَ لِيَسْتَنْبِطُوهُ مِنْهُمْ

اس میں منافقین کی شکایت ہے کہ جب کوئی خبر امن کی یا خوف کی آتی ہے اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ جب معمولی خبروں کی حقیقت سمجھنے میں تو اشتباہ شرط ہے تو اور امور علمیہ تو جدارہ ہے۔ لہذا ظاہری مدلول کھلا ہوا ہے۔

ہی۔

غرض کفار اہل ایمان کی نسبت یوں کہتے ہیں کہ دیکھو گھر کس کا اچھا ہے۔

بیٹھک کس کی اچھی ہے یعنی اپنی زیب و زینت سے مسلمانوں پر کفار فخر کرتے تھے اور مقصود ان کا یہ تھا کہ اگر ہم بُرے ہوتے تو ہم سے خدا تعالیٰ کو بغض ہوتا اور جب بغض ہوتا تو نہ ایسا اچھا گھر دیتے نہ بیٹھک دیتے، نہ مال دیتے، نہ اولاد دیتے۔

غالباً انہوں نے کسی پچانسی کے مجرم کو نہ دیکھا ہو گا کہ اُس کی کسی خاطر کی جاتی ہے مگر آج کل تو سب جانتے ہیں کہ پچانسی والے کی بڑی خاطر کی جاتی ہے۔ اُس سے کہتے ہیں کسی چیز کو دل چاہتا ہو تو بتلا دو۔ اگر وہ کہے فلاں چیز کو دل چاہتا ہے تو اُس کے لئے وہ چیز موجود کی جاتی ہے۔ اُس سے پوچھتے ہیں کہ کسی سے ملو گے۔ اگر کہے تو ملاتے بھی ہیں۔ تو اس وقت سب جانتے ہیں کہ اس کی کسی خاطر کی جاتی ہے مگر نتیجہ بھی سب کو معلوم ہے کہ کیا ہوتا ہے۔ اب اگر وہ پچانسی والا اُس منتظر کو دیکھ کر یوں سمجھے کہ میں حاکم کا بڑا محبوب ہوں اور یہ خیال کرے کہ رؤساء کو ابھی چاہئے تک بھی نہیں دی گئی اور میری یہ خاطر ہو رہی ہے تو یہ اس کی کتنی بڑی حماقت ہے۔

قاعدہ یہی ہے کہ جتنا سنگین مقدمہ ہوتا ہے اسی قدر کفار کی غلط فہمی مجرم کو مہلت دی جاتی ہے۔ تو شرک و کفر سے

بڑھ کر کون سا جرم ہو گا۔ اس لئے اُس میں مہلت بھی اچھی دی گئی۔ پس کفار کا یہ استدلال کتنا باطل تھا کہ ہم خوشحال ہیں۔ ہمارے گھر اچھے ہیں۔ ہمارے شہت گاہ عمدہ ہے۔ اس لئے ہم خدا کے محبوب ہیں۔ اور تمہارے پاس کیا ہے۔ روٹی بھی پیٹ پھر کر نہیں ملتی۔ ہمارا خوشحال ہونا دلیل ہے اس

امری کی کہ ہم حق پر ہیں۔

اس دلیل کی ایسی مثال ہے جیسے ایک سرحدی دیہاتی ہندوستان آیا تھا۔ ایک دکان پر اس نے حلوار کھا دیکھا۔ کھانے کو جی چاہا۔ پاس کچھ تھا نہیں۔ تو آپ نے کیا کیا کہ حلوا مٹھی میں بھر کر وہاں سے بھاگے۔ حلوانی پیچھے پیچھے دوڑا۔ جب دیکھا کہ یہ تو پیچھا ہی نہیں چھوڑتا، تو آپ سارا حلوا منہ میں رکھ گئے اور کہا جاؤ، یہ حلوانہ تمہارا نہ ہمارا نہ ہمارا۔ کیونکہ خان نے اپنی منشاء کے موافق لطف کے ساتھ تو کھایا ہی نہ تھا۔ حلوانی آپ کو حاکم کے پاس لے گیا۔ حاکم نے یہ سزا تجویز کی کہ اس کو ایک گدھے پر سوار کر دو اور لڑکوں کی فوج پیچھے تالیاں بجاتی جائے۔ اس طرح شہر سے باہر کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ کوئی لڑکا دف بجارہا تھا۔ کوئی تالیاں پیٹ رہا تھا۔ عرض اس ذلت کے ساتھ وہاں سے نکلے گئے اور اپنے ملک میں پہنچے۔ وہاں لوگوں نے پوچھا، "آغا ہندوستان رفتہ بودی۔ چہ طور یافتی؟"

تو آپ کہتے ہیں، "بابا! ہندوستان خوب ملک است۔ حلوہ خوردن مہفت است۔ فوج طفلان مہفت است۔ سوار ہی شتر مہفت است۔ ہندوستان خوب ملک است۔"

یعنی ہندوستان میں مجھ کو دو ہا بنا یا گیا۔ پیچھے پیچھے باجا بجاتا چلا آتا تھا۔ دود تک گدھے کی سواری ملی۔ سبحان اللہ! کیا آپ کا مذاق تھا۔ اسی طرح سمجھ لیجئے کہ دنیا کا سامان نافرمان کے لئے ایسی ہی سزا ہے، جیسی خان کی سزا تھی۔ مگر وہ اس کو سزا نہیں سمجھتے اور اس کا سزا ہونا کچھ

آخرت ہی پر موقوف نہیں۔ وہاں تو سزا ہو ہی گی۔ اس سزا و سامان کا سزا
 ہونا فہم سلیم کو دنیا ہی میں محسوس ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔
 انما یرید اللہ لیعذبکم
 بہا فی الحیوۃ الدنیا۔ کہ ان کو مال و دولت سے

دنیا میں (بھی) عذاب دے۔

اس ارشاد میں اس کی تحقیق زیادہ نہیں فرمائی کہ وہ عذاب کیا ہے
 کیونکہ ذرا سے غور سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کا سزا و سامان بظاہر سامان
 راحت تو ہے مگر ان کو اس سے راحت نہیں۔

کیونکہ نافرمان لوگ ہمیشہ دوسرے
 پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں کہ اگر

دولت اور کفار کی خصالت

مال میں نقصان ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اگر چور لے گئے تو کیا ہوگا اور یہ ہوگا تو کیا
 ہوگا اور وہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ دن رات اسی اوجھڑن میں مبتلا ہیں۔

چو میرد مبتلا میرد چو نیزد مبتلا نیزد

اولاد نہیں ہوتی تو اس کی فکر میں ہیں اور اگر ہو گئی تو بھی فکر سوار ہے
 کہ جانے زندہ رہے گی یا نہیں۔ عرض ہر وقت تر و دیں ہیں۔ دن رات
 مال و اولاد کی فکر میں پریشان ہیں۔

ایک رئیس تھے۔ ان کو اولاد نہ ہونے کا غم تھا۔ مدت کے بعد
 اولاد ہوئی تو یہ غم سوار ہوا کہ دیکھئے زندہ بھی رہے گی یا نہیں۔ یہاں تک
 کہ ان کی شادیوں بھی کر دیں۔ پھر یہ غم سوار ہوا کہ اولاد کے بھی اولاد ہوتی

ہے یا نہیں۔ بیچارے ہر وقت غم و پریشانی میں رہتے تھے۔

یہی وہ عذاب ہے جو اہل دنیا پر دنیا میں مسلط کیا جاتا ہے۔ غرض

وہاں بھی عذاب اور یہاں بھی عذاب۔ اگر صرف وہاں ہی ہوتا وہ بھی بہت کافی تھا چہ جائیکہ دونوں جگہ ہو۔ بخلاف ^{الحق اللہ} کے کہ وہ عذاب سے آخرت میں بھی انشاء اللہ تعالیٰ بری ہیں اور دنیا میں بھی۔ اُن کو یہ فکر ہی نہیں ہوتی کہ مال ہوگا تو کیا ہوگا اور نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ اولاد نہ ہوگی تو کیا ہوگا اور ہوگی تو کیا ہوگا میر جائے گی تو کیا ہوگا۔ جو حالت پیش آئے اُن کے نزدیک سب یکساں ہے۔

یہ مسلم ہے کہ سامانِ کلفت سے فی نفسہ کلفت ہوا کرتی ہے۔ مگر وہاں ایک عارض ہے جس کے سبب اُن کو کلفت نہیں پہنچتی۔ وہ عارض کیا ہے محبت حق۔ چونکہ اُن کو محبت ہے خدا تعالیٰ سے اس لئے جو سبب بھی کلفت کا پیش آتا ہے وہ اُن کے حق میں عین راحت ہوتا ہے محبت کا خاصہ ہی یہ ہے کہ محبوب کی طرف سے جو تکلیف بھی پہنچے وہ راحت ہی ہوتی ہے۔ عشقِ مجازی میں اس کا تجربہ کر لیجئے کہ عشاق کو محبوب کی طرف سے کتنی کلفتیں پہنچتی ہیں مگر وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔

غرض کفار استدلال کرتے تھے کہ ہماری حالت اچھی ہے۔ اگر ہم بڑے

ہوتے تو ہمیں یہ چیزیں کیوں دی جائیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہاں کے اچھے ہونے سے کیا استدلال ہو سکتا ہے۔ جیسا اچھی بیان ہوا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اموال دنیا پر فخر کرنا کفار کی خصلت ہے چنانچہ

پہلے تو خدا تعالیٰ نے کفار کا قول نقل کیا۔ اُسے اُس کا رد ہے۔ چنانچہ فرماتے

وَمَا أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مَن
قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِثًا قَرْنٍ هَلَاكٍ كَرِيسٍ جَوْسَامَانٍ
اور مشظریں تم سے بڑھے ہوئے تھے۔

یعنی اُن کی ظاہری حالت بہت اچھی تھی۔ مال و اسباب بھی بہت
تھا۔ اچھے اچھے مکانات تھے، نشست گاہیں نہایت آراستہ و پیراستہ
تھیں۔ خلاصہ یہ کہ زیب و زینت کی چیزیں اُن کے پاس بہت تھیں، مگر پھر
بھی معذب ہوئے۔ تو ان میں بھی وہی دو مرض تھے حُرْبِ بَالٍ و حُرْبِ جَاهِ۔

افسوس ہے کہ آج کل اکثر عورتوں کی یہی
حالت ہے کہ مال کی بھی محبت ہے اور

حُرْبِ بَالٍ کے اثرات

جہاں کی بھی میرا مقصود اس کی ذمہ داری سے اس وقت اس پر تنبیہ کرنا ہے۔
کہ کفار کی خصمت مسلمانوں میں نہ ہونا چاہئے۔ اور یہاں گو چند علمی مضامین
بھی قابل بیان ہیں مگر اس وقت وہ بیان سے مقصود نہیں۔ کیونکہ مجمع مستورات
کا ہے علمی مضامین کو وہ کیا سمجھ سکتی ہیں۔ اس لئے سہل سہل مضامین بیان کر
رہا ہوں۔

غرض اس آیت سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ نہ برتنے کی چیزیں قابل فخر
ہیں نہ زینت کی چیزیں قابل فخر ہیں مگر عورتوں کو تو دن رات یہی فکر ہے
کہ چیزیں جمع کر لیں جو کہ مال ہے اور اُس سے جہاں پیدا کریں۔ اور چونکہ یہ

دو بڑے مرض ہیں اس لئے ان کا علاج نہایت ضروری ہے کیونکہ اس سے
 اور امراض مختلفہ پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً انسان کسی کا مال مارتا ہے تو وہ سب سے
 مال کی وجہ سے۔ اگر حسبِ مال نہ ہو تو کیوں ایسا کرے گا۔ غیبت اسی
 سے کرتا ہے کہ اپنے کو بڑا اور دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے جو کہ جہاں ہے
 غصہ کو جب ہی جاری کرتا ہے جب اپنے کو بڑا اور دوسرے کو حقیر خیال
 کرتا ہے۔ جو کہ جہاں اور تکبر ہے۔ اور یہ تکبر ایسی بڑی خصلت ہے کہ اس
 سے اور بہت سی بُری باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ شیطان میں یہی تو تھا۔ اسی لئے
 یہ کہا تھا۔

خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَ
 مِنْ طِينٍ۔

کہ تو نے مجھ کو آگ سے
 پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔

میں بڑا ہوں یہ چھوٹا ہے۔ لوگو! تم جو بڑا بننا چاہتے ہو تو ذرا اپنی
 حقیقت کو تو دیکھو۔

ایک بزرگ کے سامنے ایک شخص آکر پڑتا ہوا گزرا۔ اُنہوں نے اُس
 کو نصیحت کی۔ اُس نے کہا تم مجھے نہیں جانتے میں کون ہوں۔ وہ بزرگ
 بولے، اہلِ جاہننا ہوں۔

اُولَئِكَ نَظَفَةٌ مَذْمُومَةٌ وَاخْرُكْ حَيْفَةً قَدْسِيَّةً وَاثْبَابِي
 ذَلِكْ نَحْمَلُ الْعَذَابَةَ۔

یعنی اول تو ایک نطفہ ناپاک تھا اور اخیر میں سڑا ہوا مروار
 ہو جاوے گا۔ اور درمیانی حالت یہ ہے کہ تیرے اندر پانخانہ

بھرا ہے۔

ہماری عجب حالت ہے۔ اگر ہمارے پیٹ میں سوراخ ہوتا۔ جس سے ہر وقت پاخانہ بہتا یا اُس میں سے ہر وقت بد بو آیا کرتی تو کوئی ہمیں اپنے پاس بھی نہ بیٹھنے دیتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایسا چھپا دیا ہے کہ دوسرے کا ذہن بھی نجاست تک نہیں جاتا۔ ورنہ ہماری کیا گت ہوتی۔ اگر ہم بیٹھ کر اپنی اس حالت کو سوتھ لیا کریں کہ ہمارے اندر پاخانہ بھرا ہوا ہے تو یہ بھی پورا علاج ہے تکبر کا۔ میں کہتا ہوں کہ جو شخص تکبر میں مبتلا ہو، وہ پاخانہ میں بیٹھ کر ذرا اپنی حالت پر غور کر لیا کرے کہ میرے اندر سے کسی چیز اور کس طرح نکل رہی ہے۔ اگر اسی کا مراقبہ کر لیا کرے تو کافی ہے بعض لوگ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں کہ تم ہمیں نہیں سمانتے۔ ایسے لوگوں کا جواب یہی ہے جو ان بزرگ تے دیا تھا۔

اسی بیماری میں دیکھئے کیا کیا حالتیں ہوتیں۔ ایک دن کی بیماری میں آدمی ڈھیللا ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کو اپنے حسن و جمال پر ناز ہو اور چیچک نکل آئے تو اُس سے پوچھئے کہ اب کہاں گیا وہ حسن و جمال اور کمال۔ بعض عالموں کو دیکھا گیا کہ علوم کے ماہر تھے۔ ان کو ایسی بیماری لاحق ہوئی کہ الحمد للہ یاد نہ رہی۔ انسان کس کمال پر فکد کرے۔

مال اور خسر | مال پر فخر کرنا تو بڑی ہی بیوقوفی ہے۔ کیونکہ اور کمالات کو تو انسان سے من و سبب تلبس بھی ہے جیسے علم شجاعت اور سخاوت، مال میں یہ بھی نہیں۔ مال کو انسان کے ساتھ صرف اضافت کا تعلق ہے

کہ یہ فلاں کا مال ہے۔ اصناف پر کیا فخر اگر کہیں چورا گیا اور سب جمع ہو کر
 لے گیا تو بس مضاف الیہ ہی مضاف الیہ رہ گئے۔ مضاف ہو تھا وہ نکل گیا
 تھا نہ بھون میں، ایک بی بی تھیں کچھ اثاثہ پاس تھا۔ ایک ہی بیٹا
 اُس کی شادی کے واسطے خوب سامان کیا۔ اُن کو خرافات میں خرچ کرنے
 سے منع بھی کیا گیا تو بڑیں، واہ ایک ہی تو بیٹا ہے۔ ارمان تو نکال لوں
 ہر چند منع کیا مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ عرض خوب شیخ چلی کا سا گھر بنا یا کہ اگر خرچ
 جاوے گا تو کیا ہوا۔ بہیز میں اتنا آوے گا نیوتے میں اتنا۔ اتنا فلاں کا دوں
 اور اتنا فلاں نے گا۔ پھر اتنا پرخ جاوے گا۔ عرض خوب جمع کر کے رکھا۔ چور
 تاک لگا رہے تھے۔ بس سب کا سب ایک ہی رات میں اٹھا کر لے گئے
 جب یہ حالت ہے مال کی اس پر فخر کرنا حماقت ہے۔ جو بہیز فخر کی ہیں
 مثلاً علم وغیرہ اُس پر بھی فخر نہ چاہئے۔

اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے کو نہیں نکلتا۔ اپنے آپ کو خدا جا
 کیا سمجھتا ہے کہ مجھ سے زیادہ کوئی اونچا نہیں۔ بس میں ہی ہوں جو کچھ ہوں
 اسی طرح لوگوں نے دنیا میں اپنے سے بڑوں کو نہیں دیکھا۔ اس لئے تکبر
 کرتے ہیں۔ اپنے سے بڑوں کو دیکھیں تو حقیقت معلوم ہو جائے۔ جب
 اپنے سے بڑے بڑے بھی دنیا میں موجود ہیں تو پھر فخر کی کہاں گنجائش ہے
 ماں اپنے سے بڑا کوئی نہ ہوتا تو کچھ گنجائش بھی تھی فخر کی۔
 بوستان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک گاؤں کا چوہری تھا جو
 کی عزت و توقیر گاؤں میں بہت زیادہ تھی۔ وہ اتفاق سے ایک جگہ بہت

یہاں شاہی لشکر پڑا تھا۔ ماطھی، گھوڑے، حشم، خدم، نقیب، چوبدار ہزاروں
 تعداد میں سب ہی کچھ تھا۔ چو وصری یہ حال دیکھ کر کانپنے لگا۔ اُس کا لڑکا
 ہی اُس کے ساتھ تھا۔ اُس نے کہا، ابا جان! آپ بھی تو چو وصری ہیں اور
 ایسے بڑے ہیں اور ایسے ہیں۔ آپ کی یہ حالت کیوں ہے۔ آپ کے پس
 ہی تو حشم خدم ہیں۔ اُس نے کہا، بیٹا میں چو وصری اسی وقت تک ہوں جب
 تک یہاں قدم نہیں رکھا۔ میں تو گاؤں تک چو وصری ہوں۔ یہاں میری کچھ بھی
 سستی نہیں۔

اسی طرح گولہ کا کیرا جب تک گولہ کے اندر سے یوں سمجھتا ہے کہ
 میں بڑی سلطنت کا مالک ہوں۔ مجھ سے زیادہ کون ہوگا۔ مگر جب گولہ کا
 ہیٹ پھوٹا تو اپنی حقیقت کھلی۔ اسی کو کہتے ہیں۔

پوآن کیسے کہ درنگ نہاں است زمین و آسمان سے سماں است
 شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید نخل شد چو دریا سے پہنا بدید
 یعنی پانی کا ایک قطرہ اوپر سے ابر میں سے چلا اور اپنے کو سمجھ رہا
 تھا انا کذا و انا کذا کہ میں ایسا ہوں اور ایسا ہوں۔ مدد ہوں یعنی حسین و جمیل
 ہوں۔ ممنون ہوں یعنی چمک دکھتا ہوں میطر ہوں۔ غرض اپنی صفات
 کمال پر ناز کر رہا تھا۔ جب شیخ آیا اور دریا کو دیکھا تو سب پر طائی گئی
 فرماتے ہیں۔

نخل شد چو دریا سے پہنا بدید

آگے نجدت میں وہی قطرہ کہتا ہے۔

کہ جائیکہ دریا ست من کیستم گراو ہست حقا کہ من کیستم

اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی کی طرف نظر کی جائے
مستی اور نستی کا تفاوت معلوم ہو جاوے۔ اسی کو آگے کہتے ہیں۔

ہمہ ہر پڑھتند از ان کمتر اند کہ باہ مستیش نام ہستی برند

عارف نظامی فرماتے ہیں۔

پناہ بلسندھی وہستی توئی ہمہ نیستند آنچه ہستی توئی

یوستاناں میں ایک اور حکایت لکھی ہے۔ جگنو سے کسی نے پوچھا

کہ پار تم رات میں تو نظر آتے ہو۔ دن میں کہاں رہتے ہو۔ تو اس نے جواب

دیا۔

کہ من روز شب جز بصر انیم وکے پیش نور شدید پیدا نیم

کہ میں دن رات صحرا ہی میں رہتا ہوں۔ میں کہیں چلا نہیں جاتا

مگر آفتاب کے سامنے مرٹ جاتا ہوں۔

خدا جانتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی عظمت منکشف ہو جائے یعنی اپنی

استعداد کے موافق، ورنہ ہم کیا سمجھیں اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت کو، تو نہ اپنے

علم پر نظر رہے نہ اور کسی چیز پر، نہ کوئی اپنے کو میر صاحب کہیں، نہ ڈیو

صاحب کہیں۔ یہ حالت ہو جاوے کہ سب کچھ بھول جاویں۔

بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے وجود کو وجود حقیقی بنا رکھا ہے اور

خدا کا ہوئی۔ اسی لئے ہمیں بڑائی سوجھتی ہے۔ پس اصل مرض اپنے کو بڑ

سمجھنا ہے اور اس کی اصل ہے خدا کو بڑا نہ سمجھنا۔ ساری خرابی اسی کی ہے پس اس کا علاج کرو۔

نیز اس سے ایک اور مرض بھی پیدا ہوتا ہے یعنی عورتوں کا مذاق | زیب و زینت کا خیال۔ چنانچہ زینت میں عورتوں

کا مذاق یہ ہے کہ خوب زینت کرنا چاہتے۔ کوئی جہان آجائے تو بڑے بڑے سامان ہوتے ہیں۔ خاصداں جو جہان کے سامنے ایک دفعہ گیا تھا، دوسری دفعہ پان اس میں نہیں جانا چاہتے۔ بلکہ دوسرا خاصداں ہونا چاہتے صرف یہ بات ظاہر کرنے کے لئے کہ ہمارے یہاں خاصداں اور کبھی ہے پھر ایک دفعہ تانبے کا ہو تو دوسری بار کوٹ کا ہو۔ اسی طرح اور چیزوں میں اندازہ کر لیجئے۔ روزانہ تو گھر کوڑے سے بھرا پڑا رہتا ہے۔ جہان آیا تو عساف کیا۔ عرض ہر بات میں دکھلاوا ہے۔ اُن کا تو مذہب یہ ہے کہ کوئی یوں نہ کہے کہ ایسے ہیں اور ویسے ہیں۔ اور کوئی سے اُن کی مراد مخلوق ہی ہوتی ہے۔ کاش! اللہ تعالیٰ کو بھی اس عموم میں داخل کیا جاتا کہ اُن کے تاخوش ہونے کا بھی خیال ہوتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دین سے دنیا بھاری ہے اس لئے اس کی زیادہ رعایت کی جاتی ہے سو بالکل غلط۔ دنیا کیا بھاری ہوتی۔ دنیا ہے کیا چیز۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ! کھانا، پینا، گنا، موتنا۔ بس اتنی ہی تو حقیقت ہے دنیا کی۔ یہ امیر کو بھی حاصل ہے اور غریب کو بھی۔ ہاں اگر پانچ روپیہ والے کی خوراک پانچ چھٹانک ہے اور پانچ ہزار والے کی پانچ ہزار

چھٹانک ہوتی تو کہہ سکتے تھے کہ امیر ہونے میں بڑا فائدہ ہے مگر ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہاں اتنا فرق بے شک ہے کہ یہ پانچ چھٹانک سوکھاتا ہے اور وہ تڑپتا ہے بلکہ امیر صاحب تو پانچ چھٹانک کھا بھی نہیں سکتا وہ تو پانچ تو لہ ہی کھائیں گے۔ گھی کی کثرت سے ان کی خوراک ہی نہیں رہتی۔

جب میں نواب صاحب ڈھاکہ کے یہاں گیا تھا تو وہ میری دیکھنے سے گھی کم ڈلواتے تھے۔ کیونکہ ہم لوگوں کے مذاق میں زیادہ گھی ڈالنے سے کھانے کا مزہ ہی باقی نہیں رہتا۔ مگر وہاں نواب صاحب کے چچا سے معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں تو سیر بھر گوشت میں سیر بھر گھی پڑا کرتا ہے۔ پڑنے کہا، اتنا گھی تو ہمارے یہاں بیوں کو دیا جاتا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ گھی کوئی زیادہ مرغوب چیز نہیں مجھ سے پوچھا گیا۔ قرآن مجید سے کیسے معلوم ہوا۔ میں نے جواب دیا کہ قرآن مجید نے جنت میں چار نہریں بتلائی ہیں۔ ایک پانی کی۔ ایک دودھ کی۔ ایک شراب ظہور کی۔ ایک شہد کی۔ اگر گھی بھی مرغوب ہوتا تو ایک نہریں کی بھی مذکور ہوتا پھر یہ کہ امیر صاحب کو ایک بچے کھانا نصیب ہوتا ہے اور غریب کو جب صبح ہوئی اور بی بی سے پوچھتے ہیں کچھ ہے بس یا سی و اسی جو کچھ ہو کھا پی کر کھیت یا کچھری یا دوسرے کام کو چلے گئے اور امیر صاحب کو ایک بچے کھانا نصیب ہوگا۔ کیونکہ مکلف کھانے تو جلدی تیار نہیں ہو سکتے۔ تو صاحب ہم بازار آئے ایسی امیری سے۔

عورت اور زیور | اسی طرح جو عورتیں دن رات زیور وغیرہ لادنے کی فکر میں رہتی ہیں وہ پوری قید میں ہیں اور اگر اس زیور وغیرہ کی زکوٰۃ نہ دی تو یہاں بھی قید اور وٹال آخرت میں بھی قید مگر عورتوں میں جو جھڈ کی ایسی عادی ہیں کہ لادے ہی رہتی ہیں۔

ایک بیٹے کی حکایت ہے کہ اُس نے اپنی بی بی سے کہا کہ ذرا سل کا بٹہ اٹھا دیجیو۔ وہ بولی کہ میں اتنا بوجھ کس طرح اٹھاؤں۔ وہ بیچارہ خاموش ہو گیا۔ پھر اُس نے یہ کہا کہ بی بی سے چھپا کر سل کو سنار کے پاس لے گیا۔ اور کہا کہ اس پر سونا چڑھا دے اور ایک زنجیر ڈال دے۔ اُس نے سونا چڑھا دیا اور زنجیر بھی ڈال دی۔ اب اُس کو گھر لائے۔ بی بی سے کہا کہ میں نے تمہارے واسطے یہ ایک قسم کا زیور بنوایا ہے۔ یہ سنتے ہی اُس نے وہ سل اپنے گلے میں ڈال لی اور لگی ادھر ادھر چلنے پھرنے۔ ذرا بھی بوجھ نہ معلوم ہوا اگرچہ گردن جھک گئی۔ لالہ جی نے کہا کہ تجھ سے تو سل کا بٹہ بھی نہیں اٹھتا تھا اب سل کیسے اٹھالی۔

بعض دفعہ یہ حالت ہوتی ہے کہ کان زیور کو لادے سے لادے سوچ جاتے ہیں مگر ان کو شوق میں کچھ نہیں سوچتا۔ ان کو تو اس کے لادنے بچانے سے یہ مقصود ہے کہ ذرا بڑی نظر آویں۔ اور کچھ بھی نہیں۔ غرض اس امیری کا یہ انجام ہے کہ یہاں بھی اس سے راحت نہیں ملتی۔ اور بڑی عورتوں کا کیا گلہ کیا جاوے۔ اس بات میں بچیوں کی بھی عجیب حالت ہے۔

ہمارے یہاں قصبہ گنگوہ میں عورتوں کی ناک اکثر نہیں بندھوانے کیونکہ

علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ باقی ہمارے یہاں سب بندھواتے ہیں ہمارے یہاں ایک شخص کی لڑکی تھی جس سے اُن کو بہت محبت تھی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر اس کی ناک نہ بندھائی جائے تو کچھ حرج تو نہیں میں نے کہا کچھ حرج نہیں بلکہ بہتر ہے۔ انہوں نے اس بچی سے جا کر میری طرف منسوب کر کے کہا کہ اب تیری ناک نہیں بندھے گی۔ انہوں نے تو کہا تھا اس عرض سے کہ وہ خوش ہوگی کہ میں تکلیف سے بچی، اچھا ہوا مگر لڑکی نے یہ بات سُن کر بڑی تڑپا کی اور کہا کہ میرے ہی واسطے یہ فتویٰ رہ گیا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے گھر والوں کے لئے یہ فتویٰ نہ بتلایا۔ عرض پچھوں کو بھی اس قدر شوق ہے زیور کا کہ روتی جاتی ہیں اور کان ناک بندھائی جاتی ہیں۔ کس قدر محبت ہے زیور سے۔

عورت اور حُر زینت | اسی واسطے حق تعالیٰ نے کفار کے رد میں عورتوں کے متعلق یہ ارشاد

فرمایا ہے۔ اومن ینشاء فی الحلیۃ وہو فی الخصاص غیر مبین یعنی کفار جو ملائکہ کو نعوذ باللہ خدا کی بیٹیاں بتلاتے تھے اور کہتے تھے الملائک بناحت اللہ کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ خدا تعالیٰ اُن کا رد فرماتے ہیں کہ اُن کی عقل کہاں جاتی رہی۔ خدا کی اولاد بھی کس کو بنا یا جن میں یہ دو بڑی صفیں ہیں ایک تو ان میں قوت بیانیہ نہیں ہوتی۔ ان میں قوت استدلال نہیں۔ مرد کے ساتھ جب ان کی گفتگو ہوتی ہے وہ بیچارہ اس سے رنج ہی اٹھاتا ہے وہ تو مناظرہ رشیدیہ کے قانون سے گفتگو کرتا ہے اور یہ الیٰ سیدھی ملائکہ

پہلی جاتی ہیں۔ بس زبان چلائے جائیں گی۔ خواہ ایک بات بھی موقع کی نہ ہو
مرد بیچارہ اُن کی زبان زوری دیکھ کر چپکا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کبھی چپکی نہیں ہوتی
اسخبر یہ مناظرہ میں اُن پر غالب آجاتی ہیں۔ اگر محض بولنے اور بک بک کرنے
کا نام مناظرہ ہے، تو گدھا بڑا مناظرہ ہے۔ سو ایک تو اُن میں یہ نقص ہے۔

دوسری بات اُن میں یہ ہے کہ اوہٹ ینشوی فی الحلیۃ اُن کی پورٹ
زیور اور زینت میں ہوتی ہے۔ ان کے اندر ایک خاص شانِ حُرّتِ زینت
کی ہے جس میں کہ ان کی ساری عقل صرف ہو جاتی ہے۔ اُن کے علوم و کمالات
تک رسائی نہیں ہوتی۔ تو جس میں یہ دو بڑی صفتیں ہوں اُن کو خدا کی اولاد بنانا
کتنی بڑی حماقت ہے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ امور تو عورتوں میں فطری ہیں پھر فطری امر پر کیوں ملامت
کی گئی۔ وہ تو اختیار سے باہر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مقصود فطری پر ملامت نہیں بلکہ اعتدال کی
تعلیم مقصود ہے کہ عورتوں کو زینت میں انہماک نہ ہونا چاہئے۔ باقی اعتدال
کے ساتھ تو زینت ضروری ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ مرد بی بی کو تزکِ
زینت پر مار سکتا ہے۔ مگر یہ نہ ہونا چاہئے کہ رات دن اسی فکر میں رہیں
لیکن ان کا مذاق یہ ہو گیا ہے کہ رات دن اسی فکر میں پڑی رہتی ہیں اور غنیمت
ہے کہ غریب آدمی اس قسم کے بہت سے بکھڑوں سے بچے ہوئے ہیں۔
اور اُن کی مستورات کھانا بھی پکاتی ہیں اور دیگر مشاغل خانہ داری میں بھی لگی
رہتی ہیں۔ اس لئے اُن کو زیب و زینت کے لئے فرصت کہاں بخلاف

امراء کے کہ ان کی مستورات کو کام تو کچھ ہوتا نہیں۔ اس لئے دن رات ان کو یہی مشغلہ ہوتا ہے۔

غریب اور راحت | نیز غریبوں میں ایک اور امتیاز بھی ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں کا نام ہے وہ بھی ان غریبوں

ہی کو حاصل ہے۔ یعنی راحت کیونکہ وہ دن کو کام کرتے ہیں اور کام بھی جس کی ضرورت ہے اور رات کو بے فکر پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں۔ وقت پر کھاتے ہیں۔ محنت و مشقت سے بھنم بھی خوب ہوتا ہے۔ غذا بدن کو لگتی ہے۔ اکثر غریبوں کو وہ دولت پیشتر ہے جس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

من أصبح آمناً في سوية معافى في جسده وعندہ

قوت يومه فكانما حيرت له الدنيا بعد

افسرها۔

یعنی جو شخص صبح کو اس حال میں اٹھا کہ اسے کسی شخص کا خوف نہ ہو مگر مقدمہ وغیرہ کا، کسی دشمن کا۔ معافی فی جسده بدن میں مرض اور دکھ نہ ہو اور اس کے پاس ایک دن کا کھانا ہو تو گویا ساری دنیا اس کے لئے کھٹی ہو گئی۔ اسی کا گویا ترجمہ ہے۔

چون ترانمانے و خرقانے بود ہون موعے تو سلطانے بود

اور ذرا سوچا جاوے کہ اگر کسی کو ساری دنیا مل بھی جاوے تو کیا ایک روز میں سب کھاپی کر خرچ کر لے گا۔ ہرگز نہیں! خرچ تو مفدا ہے کہ

موافق ہوگا۔ سوائقی دنیا غریب کے پاس بھی ہے۔ اور اگر کسی غریب کے پاس دنیا اس سے بھی کم ہو مگر آخرت کا سامان پورا ہو تو سب کچھ ہے اور اگر کسی امیر کے پاس دنیا میں سب کچھ ہو اور آخرت کے لئے کچھ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔

ایک مثال سے یہ بات خوب سمجھ میں آ جاوے گی۔ مثلاً ایک شخص ریل میں وہلی جانے کے قصد سے سوار ہوا۔ راستہ میں کسی اسٹیشن پر اترا۔ وہاں دیکھا کہ قسم قسم کی چیزیں بک رہی ہیں۔ وہ بندہ خدا خوب دل کھول کر چیزیں خریدنے لگا۔ اور ان کے کھانے میں ایسا مشغول ہوا کہ ریل چل دی اور وہ وہیں رہ گیا۔ مقصود سے جا تارہا۔ تو ایسے مزہ اٹانے کو مزہ نہیں کہہ سکتے۔ عاقل شخص یہی کہے گا کہ جب مقصود سے رہ گیا تو ایسے مزہ پر خاک۔ اور ایک وہ شخص ہے جس نے یہ مزے نہیں اٹائے اور وہلی پہنچ گیا۔ حقیقت میں پہلے شخص نے سراسر اپنا نقصان کیا اور دوسرے شخص کا سوائے اس کے کچھ بھی نقصان نہیں ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے مخلوط سے محروم رہا۔ مگر منزل مقصود تک تو پہنچ گیا۔ جہاں اطمینان سے ہر قسم کے مخلوط حاصل کر سکتا ہے۔

یہی حال دنیا اور آخرت کا ہے۔ ایک دن کو جو بچاں برس سے نسبت ہے، دنیا کو آخرت سے وہ نسبت بھی نہیں۔ وہاں تو ابدالاباد ہے اور وہاں ہر قسم کی راحت کا وعدہ بھی ہے بشرط ایمان۔ البتہ قدر کا مقابلہ تو کوئی کہہ ہی نہیں سکتا۔ مگر جو مومن ہے اسے ضرور توقع ہے۔ پھر

خدا تعالیٰ کسی کا ایمان ٹھوڑا ہی چھینتے ہیں اور قدر کی وجہ سے بھی جو شخص ایمان سے محروم رہے گا تو وہ بھی اپنے ارادہ سے محروم ہے۔ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ زبردستی ایمان اُس کے قلب سے نکال لیں۔ اور جو بے مومن کو دنیا کی آخرت کی توقع ہے۔ پھر دنیا سے دل لگانے کی کوئی وجہ نہیں اور آخرت سے غفلت کسی طرح سبب نہیں۔ کیونکہ دنیا میں جب کسی چیز کی توقع ہوتی ہے تو اُس کی تحصیل کے لئے آرام کو چھوڑ دیتے ہیں۔

مثلاً کسی کو بوجھ و پیہ کی ملازمت کی توقع ہوتی ہے تو اُس کے لئے کسی کسی مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ اسکولوں میں پڑھتے ہیں، سفر کرتے ہیں، ہر قسم کی تکالیف اٹھاتے ہیں۔ تو جس چیز کا یقین دلایا گیا ہے تو یقین کے بعد اُس کے لئے آرام کو کیوں نہ چھوڑنا چاہئے۔ خصوصاً جب دونوں میں ایک خاص تفاوت بھی ہے۔ وہ یہ کہ سامان دنیا تو ایسی چیز ہے کہ جس قدر بڑھتا جاتا ہے اسی قدر محنوم کا ہجوم ہوتا جاتا ہے۔ اور اس کی کسی حد پر بس نہیں ہوتی۔ کسی دنیا دار سے نہیں سنا، نہ اُس نے کسی حد پر پہنچ کر یوں کہا ہو کہ اب مجھے ضرورت نہیں۔ شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

اگر شدید سستی کہ در صحرائے غور

گذرت چشم تنگ دنیا دار را

ہوس کی کوئی حد ہی نہیں البتہ ان عملوں کے دور کرنے والی اگر کوئی

چیز ہے تو وہ تعلق مع اللہ ہے۔

ایک آسان مراقبہ | میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر خدا سے تعلق ہو جائے

تو کبھی غم پائیں نہ آوے۔ یہ ہے زندگی اور یہ ہے حیاتِ طیبہ۔ بخلاف دنیا کے کہ اس کی لذت خیالی لذت ہے اس لئے میں سب کو عموماً اور عورتوں کو خصوصاً خطاب کرتا ہوں کہ دنیا کی فنا اور آخرت کی بقا کا مراقبہ کیا کریں۔ زیادہ نہیں تو دس ہی منٹ کے لئے روزانہ کیا کریں۔ اور وقت بھی وہ لیں جو محض بیکار ہو یعنی جس وقت سونے کو لیں اس وقت دس منٹ کے لئے سوچ لیا کریں کہ دنیا ایک نہ ایک دن ہم سے چھوٹ جائے گی۔ سارا سامان پڑا رہ جاوے گا۔ پھر آخرت کو پیش نظر کریں کہ خدا تعالیٰ کے سامنے جاننا ہوگا۔ اعمال پیش ہوں گے۔ اعمال ٹھیک نہ ہوئے تو دوزخ میں جانے کا گمان غالب ہے۔ اس واسطے ہمیں اچھے اعمال کرنا چاہئیں تاکہ دوزخ کے عذاب سے بچیں اور جنت ملے۔ جس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سب نعمتیں ہوں گی۔ اور وہ دنیا کی نعمتوں کی طرح فنا نہ ہوں گی۔ خدا تعالیٰ کا دیدار بھی وہاں ہوگا۔ جو سب نعمتوں سے بڑی نعمت ہوگی۔ جس میں یہ حالت ہوگی۔

ہر چند پیر و خستہ دین نا تو اس شرم

پہر کہ نظر بر وئے تو کر دم جو ان شرم

اور ظاہر ہے کہ ایسی دائمی نعمت کو چھوڑ کر دنیا کی فانی چیزوں میں

منہمک رہنا سراسر بے عقلی ہے۔ حرص دنیا کے متعلق مجھے ایک قطعہ یاد آیا

اسی کا مراقبہ کر لیا کریں۔ اور بھی کچھ نہیں تو یہی سہی۔ کیونکہ عورتوں کو گیت کا

بہت شوق ہوتا ہے تو وہ مراقبہ کے لئے اسی کو پڑھ لیا کریں یہ تو آسان
مراقبہ ہے۔

کل ہوں اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
خوب ملک روم ہے اور سرزمین طوس ہے
گر پیسہ ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی
اس طرف آواز طبل اور صر صرے کوئی ہے
صبح سے تا شام چلتا ہوں گلگلوں کا دور
شب ہوئی تو ماہر ووں سے کنارہ بوں ہے

سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو جو قید آرزو کا مجھوں ہے
لے گئی بیک باگی گداز غریبوں کی طرف
جس جگہ جان تمنا سو طرح بچو کس ہے

مرفدین دوین دکھلا کر لگی کہنے مجھے
یہ سنگ در ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤں ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حشمت کیا ہے آج

کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت انہوں ہے

حقیقت یہ ہے کہ انسان مال و جاہ پر کیا ناز کرے جب کہ اس سے
زیادہ مال و عزت والے آج زمین کے اندر ایسے بے گن و بے بس پٹے
ہیں کہ نہ مال ان کے ساتھ گیا نہ عزت کچھ کام آئی۔ یہی سلا ہر شخص کو پیش

آنے والا ہے۔ البتہ اگر آخرت کا سامان ساتھ ہے تو یہ وہاں ضرور آرام دیگا پس یہ مراقبہ ہر شخص کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس مراقبہ سے انشاء اللہ پورا علاج ہو جاوے گا، حسب مال اور حسب جاہ کا۔ یہی دو مرض بڑے مہلک مرض ہیں جو اصول امراض ہیں۔ ان ہی سے تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ تو ایک وقت معین کیے کہ یہ سوچا کر و کہ دنیا بیچ دو بیچ ہے۔ اس لئے دنیا یہاں سے چلی گئی تو کیا اور ہم دنیا سے چلے گئے تو کیا۔

عورتوں کی ایک حالت یہ ہے کہ شادیوں کے

شادی میں بربادی

موقع پر اتنا خرچ کرتی ہیں کہ سارا گھر خالی کیے

کو تیار ہو جاتی ہیں اور مقصود وہی نام ہوتا ہے۔ مگر اکثر تو نام بھی نہیں ہوتا کیونکہ بد نام کرنے کو بہت لوگ موجود ہو جاتے ہیں اور اگر ہو بھی گیا تو کیا ملتا ایک صاحب نے ویو بند میں بیٹے کی شادی کی اور بہت ہی ضرورت سے زیادہ خرچ کیا۔ ایک بزرگ بھی وہاں تھے۔ انہوں نے ان سے کہا کہ آپ نے خوب ہی خرچ کیا اور بڑے جوصلہ سے کام کیا۔ اس بات سے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد ان بزرگ نے فرمایا کہ مگر انیسویں پر ہے کہ آپ نے خرچ کیے کیا چیز خریدی، نام؟ کہ اگر اس کو بازار میں لے جاؤ تو اس کا کیا اٹھے گا۔ ایک پیسہ بھی نہیں۔ شیخ صاحب! یہ تو آپ سے طاقت ہو گئی۔ باقی اور سب آپ نے اچھا کیا۔

خوب سمجھ لیجئے کہ اگر آپ برباد ہوئے تو کیا کوئی عزیز و قریب آپ کا ساتھ دے گا، ہرگز نہیں۔ مصیبت میں کوئی پاس بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ اپنے

پر اسے سب آسودگی کے ساتھ ہیں۔

علاجیوایہ ساری خرابیاں حسب مال اور حسب جاہ کی ہیں۔ یہی بات اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

قال الذین کفرو والذین آمنوا ای المضریقین خیر مقامًا

واحسن ندبًا۔

یعنی کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تبتلاؤ ہم دونوں فرقوں

میں سے کس کا گھر اچھا ہے اور کس کی مجلس اچھی ہے۔

آگے ان کا جواب ہے۔

وکدراھلکنا قبلہم من

یعنی ہم نے تم سے پہلے

فزون ہوا حسن اثاثا ورتبًا

لوگ ہلاک کر دیئے جو تم سے

اچھے سامان والے اور اچھے منظر والے تھے۔

جیسے فرعون، مان، شدار، قارون وغیرہ۔

پھر ہلاک بھی ایسے جن کا نام و نشان تک بھی مرٹ

اہل اللہ کی کوشش

گیا بلکہ مرنے کے بعد اکثر فقراء کا تو نام بھی باقی

رہتا ہے کہ ان کی جو تیاں تک آج سر پر رکھی جاتی ہیں بخلاف بادشاہوں

کے کہ ان کی تو کھوپریاں بھی ماری ماری پھرنی ہیں۔

ایک ہندو کلکڑ ہمارے ضلع میں تھا۔ بیمار ہو کر نبی تالی گیا۔ وہاں مر گیا

اس کی مہیم لاش کو نبی تالی سے لائی تھی۔ اس کی لاش کو کہاڑ بہنگی میں لٹے ہوئے

مہیم کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ ایک شخص نے دیکھا کہ اس کا سر کہیں

گیا اور پتھر پر لگتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ عرض اُن کی تو کھوپڑی تک کا بھی احترام ہوتا۔ بخلاف اہل اللہ کے کہ اُن کی جو تیاں تک محترم ہیں۔

ہمارے قصبہ کے قریب لوٹاری ایک قصبہ ہے۔ وہاں ہمارے دادا حضرت میا بچی نور محمد صاحب قدس اللہ سرہ تشریف رکھتے تھے۔ اُن تیاں اب تک محفوظ رکھی ہیں جن کو لوگ آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ میں بھی حضرت میا بچی صاحب کی جو تیاں آنکھوں سے لگاتی تھیں۔

اس سے بڑھ کر ایک اور واقعہ ہے۔ وہ یہ کہ وہاں ایک صاحب اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کوئی شخص میا بچی صاحب کی شاگردوں زندہ ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک ہندو سلوٹائی زندہ ہے۔ آپ اس کے پاس گئے اور اس کو بلایا اور پوچھا کہ تو نے میا بچی سے پڑھا ہے۔ اس نے کہا، پھر پوچھا کبھی تجھے مارا بھی ہے؟ کہا، ہاں! کہا کس جگہ مارا تھا؟ کہا گدی پر مارا تھا۔ کہا بھائی میں مسلمان ہوں اور تو ہندو ہے۔ شاید تو مجھ سے بڑے لیکن اگر تو اجازت دے تو میں اس جگہ کو چوم لوں، یہاں مارا ہے۔ اس نے اجازت دے دی۔ تو آپ نے اس جگہ کو بوسہ دیا۔ یہ کشش تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ اللہ والے تھے۔ اسی لئے لوگ اُن کی جو تیاں چومتے ہیں۔ اسی لئے تو عاشقانہ رنگ میں کہتے ہیں۔

عشق را نازم کہ یوسف ابیزار آرد ہچو صنعا ز اہدے او بہ نار آرد

اُن سے اتنی محبت کیوں تھی۔ اس لئے کہ وہ اللہ والے تھے۔ اگر جان عزت کبھی چاہے تو اس کا طریقہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا

کرے۔ مگر اس میں یہ عرض نہ ہو کہ ہماری عزت ہوگی بلکہ ہستی اختیار کرو۔
 طریق میں ہستی ہی سے علو ہوتا ہے اور جو علو چاہتے ہیں تو اول علو ہو جائے
 پھر علو ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ دنیا کی محبت ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ سارے امراض
 اسی سے پیدا ہوتے ہیں اور سارے امراض کا علاج دنیا کی فنا اور آخرت
 کی بقا کا پیش نظر رکھنا ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ ہر وقت یہ خیال رکھو
 کہ گناہ پر سزا ہوگی اور نیک کام پر جزا ملے گی۔ اجمالاً اتنا کافی ہے
 تمام اعمال کے بیان کی اس وقت گنجائش نہیں نہ ضرورت ہے۔ کیوں
 کتابوں میں سب تفصیل موجود ہے۔ اور اب تو اردو میں بھی اچھی اچھی کتاب
 طبع ہو گئی ہیں جن کو کسی محقق سے معلوم کر لیں۔ پھر وہ کتابیں دیکھا کریں یا
 کریں اور ان کے موافق عمل کریں۔

بس اب ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام خیرالاثاث للاناث رکھتا
 ہوں یعنی اچھی پونجی عورتوں کے لئے۔ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہم
 کو عمل کی توفیق عطا فرمادیں۔ آمین!

علاج الحرس

حرس کی مذمت کے متعلق مستورات کی درخواست پر یہ وعظ
 ۹۔ شوال ۱۳۲۳ھ بروز یکشنبہ بوقت صبح مکان موقوفہ خود واقعہ
 تھانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر فرمایا جو ۲ گھنٹہ ۴۵ منٹ میں ختم
 ہوا۔ مرد تقریباً ۲۰ تھے۔ مجمع مستورات پردہ میں تھا مولانا ظفر احمد
 صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا

خطبة بالوره

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله محمدًا ونستعينه ونستغفره ونؤمن به و
نتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات
أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا
هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك
له ونشهد أن سيدنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله
صلى الله تعالى عليه وعلى آله وصحبه وبارك وسلم
أما بعد قال النبي صلى الله عليه وسلم لو كان لابن آدم
واديان من المال لا يتغنى ثالثًا ولا يملأ جوفه إلا التراب
ويتوب الله على من تاب

یہ ایک حدیث ہے جس میں آدمی کی ایک خاصیت بیان کی گئی ہے جو تمام بنی آدم میں قریب قریب مشترک ہے۔ کوئی اس سے بچا ہوا نہیں الا ماشاء اللہ۔ اور بعض کے اشتناء ہی کی وجہ سے قریب قریب کا لفظ کہا گیا ہے۔ چونکہ یہ مرض ایسا عام ہے اس لئے اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ معمولی یہ ہے کہ جب تک کوئی مضمون ضروری ذہن میں نہ آجائے اس وقت تک بیان نہیں کیا جاتا اور اسی لئے اس بیان میں تاخیر ہوئی۔ حالانکہ بیان کا وعدہ بہت دلوں سے ہو چکا تھا۔ چنانچہ وعدہ کے بعد بھی میں گھر میں پوچھتا رہا کہ مستورات کو کس قسم کے مضمون کی زیادہ ضرورت ہے اور ان میں کیا کیا عیوب زیادہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کچھ ضرورتیں ظاہر کیں مگر کوئی اہم ضرورت خیال میں نہ آئی۔ اور بات یہ بھی ہو گئی ہے کہ اب کوئی ضروری مضمون ذہن میں بہت کم آتا ہے۔ کیونکہ پہلے تو اپنے عیوب پر نظر کر کے دوسروں کو اپنے

اور پھر قیاس کر لیا جاتا تھا کہ ان میں بھی یہ عیوب ہوں گے۔ اس لئے ضرورت جلدی سمجھ میں آجاتی تھی۔ اور اب قیاس سے بھی کسی میں کوئی عیب ہی نظر نہیں آتا۔ اس لئے کوئی ضروری مضمون بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور یہ حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے کیونکہ مخلوق کے عیوب پر نظر نہ ہونا فی نفسہ بڑی نعمت ہے اس لئے اب مجھے بعض دفعہ بیان کے لئے کئی کئی روز تک تردد رہتا ہے کہ کیا بیان کروں۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی کئی روز تک سوچتا رہا۔ مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ تو پھر میں نے ایک کتاب ویسے ہی اپنے سامنے سے اٹھائی مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کون سی کتاب تھی۔ اتفاقاً وہ سامنے رکھی تھی میں نے اٹھا لی اور کھولنے سے پہلے ہی حق تعالیٰ سے دعا کی کہ بیان کے لئے کوئی ضروری مضمون اس میں نظر پڑ جائے۔

اس کے بعد جو اُسے کھولا تو نظر کے سامنے سب سے پہلے یہ حدیث آئی۔ میں بہت خوش ہوا کیونکہ

عورت اور حرام

واقع میں اس کا مضمون بہت ضرورت کا ہے خصوصاً عورتوں کی ضرورت کا کیونکہ عورتوں میں دنیا کے متعلق حرام بہت ہے۔ ان کے یہاں اس کی کوئی حد ہی نہیں۔ یہ بے ضرورت بھی بہت چیزیں جمع کر لیتی ہیں حتیٰ کہ بعض دفعہ اتنی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ ان کو یاد بھی نہیں رہتا کہ ہمارے پاس کیا کیا ہے۔ چنانچہ بعض چیزیں رکھی رکھی خراب بھی ہو جاتی ہیں اور بیدار رکھ کر ایسی بھولتی ہیں کہ نام بھی نہیں لیتیں اور یہ بھول جانا جیسا کہ عورتوں کی حرام کی دلیل ہے کہ اتنا سا مال جمع کیا تھا کہ یاد بھی نہیں رہا۔ ایسے ہی حق تعالیٰ کے منعم ہونے کی بھی

دیں ہے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے اتنی نعمتیں دیں کہ ہم کو یاد بھی نہیں رہتا کہ ہمارے پاس کیا کیا چیزیں ہیں۔

وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها کا ایک محفل یہ بھی ہے کہ تم یاد سے نعمتوں کا احصاء نہیں کر سکتے اور ایک محفل اور ہے جو دل کو زیادہ لگتا ہے کہ ضرورت اور حاجت کی صفت سے تم اس کا احصاء نہیں کر سکتے بلکہ بہت چیزیں تم کو بے ضرورت معلوم ہوں گی۔ واقعی بعض دفعہ اتنی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ انسان سوچنے لگتا ہے کہ ان کو کس کام میں لاؤں تو جیسا کہ اس سے خدا تعالیٰ کا منعم ہونا ظاہر ہوتا ہے ایسے ہی ہماری حرص بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ہم بے ضرورت بھی بہت چیزیں جمع کرتے رہتے ہیں جن کے لئے کوئی مصرف بھی ذہن میں نہیں آتا۔ یہ مادہ عورتوں میں خصوصاً زیادہ ہے۔

ان کے متعلق مولوی عبدالرب صاحب کا ایک لطیفہ ہے کہ عورتوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ان کے پاس کپڑوں کا صندوق بھی بھرا ہوا ہو مگر پھر بھی جب پوچھو یہی کہیں گی میرے پاس کیا ہیں چار پٹیٹھے اور برتن چاہے کتنے ہی ہوں مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں چار ٹھیکرے اور چوتوں کے دو تین جوڑے رکھے ہوئے ہوں گے مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں دو لیترے۔

وہ واعظ آدمی تھے قافیہ خوب ملا پایا۔ واعظوں کے بیان میں ایسی صنعتیں بہت ہوتی ہیں اور اسی کو لوگ پسند کرتے ہیں۔ مولویوں کے وعظ کو پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کو یہ قافیہ نہیں آتے۔ مگر واقعی عورتوں کی حالت تو وہی ہے جو مولوی عبدالرب صاحب نے کہی ہے۔ چنانچہ بعض عورتیں ضرورت کے موافق کپڑے

بنائیتی ہیں۔ اس کے بعد پھر کوئی بزاز عمدہ سی پھینٹ لے آیا تو ایک دو پارہ
کی اگلے سال کے لئے ضرور خرید لیں گی۔ بس اس بارہ میں یہ بالکل اس
مصدق ہیں۔

لختہ برداز دل گزر دہر کم زوشیم من قانش فروش دل صد پارہ شیم
باقی شاعر نے جس معنی کے اعتبار سے لختہ برداز دل کہا ہے اس
مصدق عورتیں نہیں ہیں۔ کیونکہ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میرے سامنے جو
بھی آجاتا ہے میں اس پر فریفتہ ہو جاتا ہوں۔ سو یہ بات ماشاء اللہ تعالیٰ عورتوں
میں نہیں ہے بلکہ اس بارہ میں تو وہ عورتوں کے مشابہ ہیں۔ جیسے ان کے بارے
قاصرات الطرف امہ علی ازواجہا آیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے
کسی کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں گی۔ یہی حالت ہندوستان کے اکثر حصہ کی عورتوں
کی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے سوا کسی پر نظر نہیں کرتیں۔ گو بعض کم بخت ایسی
ہیں کہ آبرو میں بڑ لگا دیتی ہیں۔ مگر ایسی بہت کم ہیں۔ زیادہ تر عورتیں عقیقت
ہوتی ہیں۔ ان کے دل پر غیر مرد کا خیال ہی نہیں گزرتا۔ نہ حلال کا نہ حرام کا۔ مگر
باغ میں پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں ایسے ہی بعض دوسری قسم کی
ہیں۔ خیر ان سے قطع نظر کہ اکثر کو دیکھا جائے تو وہ قاصرات الطرف
مصدق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں نکاح ثانی کا رواج کم ہے۔ حقیقت
میں یہاں کی عورتیں یہی چاہتی ہیں کہ شوہر کے مرنے کے بعد خود ہی مر جائیں
مگر موت تو قبضہ میں نہیں ہے۔ یہ اسباب
موت اور اختیار وہ گو قبضہ میں ہیں مگر حرام ہیں اور واقع میں اسباب

موت اختیار کرنے کے بعد بھی موت قبضہ میں نہیں ہے کیونکہ اسباب موت اختیار کرنے سے موت کا آجانا لازم نہیں۔ ایسے بہت واقعات ہوئے ہیں کہ بعض لوگوں نے سکھیا کھا لیا اور نہیں مرے۔ اسی طرح بعضوں نے گلا کاٹ لیا اور نہیں مرے۔

ایک شخص ایک انگریز کا قصہ بیان کرتے تھے کہ اُس کو کسی نے کچھ تہمت لگائی تو بدنامی کے رنج سے اُس نے استرہ لے کر اپنا گلا کاٹ لیا اور کمرہ اندر سے بند کر لیا تھا پھوڑی دیر کے بعد نامی سے جو خون نکلا تو طازم گھبرایا کہ یہ خون کیسا۔ اُس نے کمرہ کے کوارٹوں میں جو اوپر آٹینے لگے ہوئے تھے ان میں سے جھانکا تو دیکھا کہ مباحرب بہا در کا گلا کٹا ہوا پیچھے کو گرا ہوا ہے مگر کھال اٹکی ہے اور خون بہ رہا ہے اس نے فوراً پولیس اور ڈاکٹر کو کو خبر دی سب نے آکر کوارٹ کھولے اور ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کیا۔ اس وقت ڈاکٹر کو یہ معلوم ہوا کہ بدن میں کچھ حرارت باقی ہے اور رگیں سب نہیں کٹیں، تو اُس نے جلدی سے سراٹھا کر سیدھا کر کے جھا دیا اور گلے میں فوراً ٹانکے لگا کر کوئی دوا لگا دی۔ شام تک اُس مردہ نے آنکھیں کھول دیں اور چند روز میں مقوی دوائیں کھا کھا کر چلنے پھرنے لگا۔ راوی کہتے تھے کہ وہ بالکل اچھا خاصا ہو گیا۔ صرف ایک عیب ہو گیا تھا کہ گنگنا بولتا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ کون ہی رگ خراب ہو گئی تھی۔

تو موت تو کسی کے قبضہ میں نہیں مگر عورتیں خاوند کے مرنے سے کالمیت ضرور ہو جاتی ہیں اور پہلے زمانہ میں تو بعض عورتیں سح ہر صیت ہو جاتی تھیں

چنانچہ یہ سنی کی رسم بھی اسی محبت کی وجہ سے نکلی تھی جو ہندوستان کی عورتوں کو خاوند سے ہوتی ہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا کا یہ اثر ہے کہ یہاں عورت کو مرد سے تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندی شاعری اس کی دلیل ہے۔ اس میں عورت کی طرف مرد کو خطاب ہوتا ہے۔ میرے پیار وغیرہ۔ اور عرب میں مرد کو عورت کی طرف گمیلان ہوتا ہے جیسا کہ عربی شاعری اس پر شاہد ہے۔ اور فارس میں بڑا گندہ اثر ہے کہ وہاں مرد کو مرد سے میلان ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں مذکر کی طرف سے مذکر کو خطاب ہوتا ہے اور اب یہ اثر ہندوستان کی اردو شاعری پر بھی ہو گیا ہے اور حیرت یہ کہ بعض ثقہ اور دیندار لوگ بھی اس اثر سے نریج سکے۔ حضرت امیر خسرو کتنے بڑے درویش ہیں مگر شاعری میں وہ بھی لڑکوں اور مردوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

اے وہی والے تبارِ ساوہ پگ بستہ و ریشہ کج ہنساوہ
 کہ دند مرا خراب آخسہ ہندو بچکال ساوہ زادہ

خیر ہندوستان میں یہ اثر خارجی آ گیا ہے۔ ورنہ یہاں کی آب و ہوا کا اصلی اثر یہ ہے کہ عورت کو مرد کی طرف میلان ہوتا ہے اس لئے وہ شوہر کے مرنے سے کالمیت ہو جاتی ہیں۔ نہ نکاح کریں نہ زینت و آرائش عمر بھر کریں اسی لئے یہاں نکاح ثانی منعیوب ہو گیا ہے۔ مگر اب رواج ہونے لگا ہے اور اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ گو نشا اس کا

نکاح بیوگال

امر طبعی تھا مگر بعد میں عقلی کیا ہرنت پیدا ہو گئی۔ ورنہ لوگ حکم شرعی کو عجیب سمجھنے لگے تھے۔

تھی کہ کانپور میں ایک بیوہ عورت سے کسی نے کہا کہ دوسرا نکاح کرنا سنت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں نے دو دو نکاح کئے ہیں تو بھی دوسرا نکاح کر لے۔ تو وہ کج بخت کیا کہتی ہے کہ دیکھو حضور کی بیٹی حضرت فاطمہؓ نے تو دوسرا نہیں کیا۔ وہ خاندانی بی بی سے تھیں اور دوسری بیٹیوں نے جو کیا ہے، تو ظالم نے ایسا سخت لفظ کہا کہ اس کو نقل کرتے ہوئے ہونگے کھڑے ہوتے ہیں۔ نقل کفر کفر نباشد۔ کج بخت کہنے لگی کہ وہ کسی کم ذات بی بی سے ہوں گی۔ نعوذ باللہ، استغفر اللہ!

حالانکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نکاح ثانی کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی وہ تو حضرت علیؓ کے سامنے وفات پا گئی تھیں۔ پھر حضورؐ کی سب صاحبزادیاں حضرت حدیجہؓ ہی سے تھیں اور کسی اور بیوی سے بھی ہوتیں، تو آپ کی ازواج میں کم ذات کوئی بھی نہ تھی۔ سب شریف زادیاں اعلیٰ خاندان سے تھیں۔ مگر اس کم بخت نے حضورؐ کی صاحبزادیوں کو ایسا سخت لفظ کہا۔

جب اس طبعی اثر کا نتیجہ یہاں تک پہنچ گیا تو علماء نے اس بدعت کے مٹانے میں ٹولا و عملاً ہر طرح کوشش کی۔ پہلے مجھے علماء پر شبہ ہوتا تھا کہ نکاح ثانی کے باب میں تصحیح اعتقاد کافی ہے۔ عملی سعی کے لئے ضرورت ہے۔ بعض تصحیح عقائد پر کیوں اکتفا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ سر ہو ہو کر بیوہ کا نکاح کیوں کرتے ہیں۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ظاہر کو بھی باطن میں بڑا اثر ہوتا ہے اور جب کسی عمل کو دائماً متروک رکھا جاتا ہے تو باطن پر اس کا اثر ضرور رہتا ہے۔ بدن عمل کے اعتقاد کی جڑ نہیں نکلتی۔ اس لئے علماء کی رائے صحیح ہے کہ اس

بدعت کا استیصال بدون عملی سعی کے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب سے اس پر عمل ہونے لگا ہے۔ اس وقت سے اعتقاد بھی درست ہونے لگے ہیں۔ عزائم اور گناہوں کے متعلق یہ شعر اس معنی کو تو صحیح نہیں جو شاعر کی مراد ہے۔ شوہر کے باب میں ان کی یہ حالت نہیں ہے۔ مگر اور چیزوں کے متعلق ان کی یہی حالت ہے۔ زیور اور کپڑوں کے باب میں وہ بالکل اس شعر کا مصداق ہیں۔

لختے بڑا زول گزرد ہر کہ رہشیم
من قاش فردش دل صد پارہ شویشیم

کہ جو چیز بھی دیکھتی ہیں ان پر اس کی حرص غالب ہو جاتی ہے۔ ان کو چیز کا دکھانا ہی غضب ہے۔ پھر بد دن خریدے یا بنوائے ان کو صبر نہیں آتا۔ بس ان کو تو کوئی نئی چیز دکھاؤ ہی نہیں۔ عرض چونکہ ان میں حرص کا مادہ زیادہ ہے اس لئے یہ حدیث ان کے حال کے بہت مناسب ہے اور بعد میں یہ بھی اتفاقی مناسبت ہو گئی کہ میں نے اس مکان کو جس میں یہ بیان ہوا ہے وقف کر دیا ہے۔ اسباب کو معلوم ہوا ہو گا اور یہ فعل اس خاصیت کا مقابل ہے جو حدیث میں مذکور ہے کیونکہ حرص میں اپنی ملک کے اندر چیزوں کو لایا جاتا ہے۔ اور وقف میں ملک سے نکالا جاتا ہے۔ تو وقف، حرص کا مقابل ہوا اور اس پر یہ حدیث پر عمل ہے کیونکہ حضور کا مقصود حرص سے روکنا ہے جس کو کسی جگہ فعل میں ہو گیا اور یہ نفاختم نہیں بلکہ شکر ہے۔ بہر حال اس حدیث میں ایک ضروری مضمون ہے۔ عورتیں خود سے سنیں کیونکہ یہ مضمون خصوصیت سے ان کے مناسب ہے۔

فتوحات کی ضرورت

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر ابن آدم کے پاس دو وادی سونے چاندی

کے ہوں تو وہ تیسرے کا طالب ہوگا۔ وادی کہتے ہیں اس نشیبی زمین کو جس میں پانی بہتا ہو۔ جیسے ندی اور نالہ۔ تو اس لفظ میں زیادہ مبالغہ ہے کہ اگر انسان کے پاس چاندی سونا اس کثرت سے ہو کہ پانی کی طرح بہتا ہو جب بھی وہ زیادہ کا طالب ہوگا۔ چنانچہ اس کے پاس دو وادی بھی ہوں تو تیسری کا طالب ہوگا اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تین ہوں گے تو لا تنبغی رابعاً کہ چوتھے کی تلاش میں ہوگا۔ سعدیؒ نے اس کا خوب ترجمہ کیا ہے۔

ہفت اقلیم اور بگرد پادشاہ ہچناں در بند اقلیمے دگر
 سلاطین کو تو اقلیم و سلطنت کی ہوس ہوتی ہی ہے مگر اب تو یہ حالت ہے کہ رعایا بھی سلطنت کے خواب دیکھتی ہے۔ پھر اس کا نتیجہ کیا ہے سوائے پریشانی کے کچھ نہیں۔ بس ان کی وہ حالت ہے، جیسے چیونٹی کے مرنے کے دن قریب آتے ہیں تو اس کے پر لگتے ہیں۔ اس وقت تو وہ خوش ہوتی ہے کہ آنا میں بھی ہوا میں اڑنے لگی اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے۔

چیونٹی کے لگے پر تو وہ کہنے لگی اڑ کر
 میں مثل سلیمان ہوں ہوا میں کئی دن سے

مگر اس کو یہ خبر نہیں کہ اس کی ہلاکت کے دن قریب آگئے ہیں۔ اسی طرح جب رعایا سلطنت کے خواب دیکھے گی تو اس کا نتیجہ بجز ہلاکت کے کچھ نہیں اور باوجودیکہ اس خواب پریشانی کا منشا محض حرص ہے اور کچھ نہیں

مگر یہ لوگ اس کو دین سمجھتے ہیں اور اس کا نام ترقی اسلام رکھا ہے۔

صاحبو! نام کے بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ نتائج اور آثار کو دیکھنا چاہئے کہ اس ہوس خام کے آثار و نتائج کیا ہیں۔ کیا اس سے اسلام کو کچھ ترقی ہوتی ہے یا کفر کو۔ صوفیاء بڑے محقق ہیں اور ان سے زیادہ دیندار کون ہوگا۔ ان کی تعلیم یہ ہے۔

آرزوی خواہ بیک اندازہ خواہ برنابا کوہ را یک برگ کاہ
یعنی آرزو اور تمنا کا مضائقہ نہیں مگر اپنے اندازہ کے موافق
ہونی چاہئے حد سے زیادہ آرزو نہ کرنا چاہئے، کیونکہ پہاڑ
کو گھاس کا تنکا ہٹا نہیں سکتا۔

تو دیکھیے محققین حد سے زیادہ ہوس کو منع کرتے ہیں کیونکہ تجاوز عن الحد
میں پریشانی ہی پریشانی ہے اور شریعت نے مسلمانوں کو پریشانی سے بچانا
چاہا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ اور رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لا ینبغی للمؤمن ان یدل نفسه قالوا یا رسول اللہ
وکیف یدل نفسه قال یتحمل من البلا لہما لا یطیقہ

نص قرآنی سے معلوم ہوا کہ جس ہوس کا نتیجہ ہلاکت ہو وہ ممنوع ہے

وہ دین نہیں خلاف دین ہے۔ اور حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو اپنے
آپ کو ذلیل کرنا بھی جائز نہیں گو ہلاکت بھی نہ ہو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا
رسول اللہ! مسلمان اپنے آپ کو کیونکر ذلیل کرتا ہے؟ فرمایا ایسی بلا کو سہرا

دھڑلے جس کے تحمل کی طاقت نہیں۔ اس سے بھی تجاوز عن الحد کی مذمت معلوم ہوتی۔

یہ تو مصائب اختیار یہ کے متعلق شریعت کی تعلیم تھی۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو اختیار ہی مصائب سے جو پریشانی ہوتی ہے وہ کبھی پاس نہ آسکے۔

مصائب غیر اختیار یہ کا شریعت نے ایسا علاج
تفویض کی اہمیت بتلایا ہے کہ تمام حکماء عالم بھی جمع ہو جائیں تو اس کی نظیر نہیں لا سکتے۔ سنیئے وہ علاج کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

وَالَّذِينَ إِذَا مَا بَثَّهِمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ

رَاجِعُونَ۔

کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں یعنی اس کی ملک میں وہ ہمارا مالک ہے اور مالک کو ہر قسم کے تصرف کا مملوک میں حق ہے، اور ہم اس کے پاس لوٹ کر جانے والے ہیں۔

اس میں تعلیم ہے کہ مصیبت کے وقت اس مضمون کا استحضار کرنا چاہئے مگر ہم لوگوں نے اس کو محض وظیفہ بنا لیا ہے جیسے اور وظیفے ہوتے ہیں تخیل اور حجب وغیرہ کے یعنی محض زبان اور ہونٹوں تک اس کا اثر رہتا ہے۔ دل سے بالکل اس مضمون کو نہیں سوچتے۔

تو اس کی ایسی مثال ہوئی جیسے کسی نے سنا تھا کہ گل بنفشہ زکام کے لئے مفید ہے اس نے گل بنفشہ پکا کر ہونٹوں کو لگا لیا۔ تو بتلایئے اس سے

نوکام کیونکہ جاتا رہے گا۔ اسی طرح ہماری پریشانی کیونکہ دور ہو جب کہ ہم نے انا اللہ کو محض ہونٹوں سے لگا رکھا ہے۔ اسے بھائی اس کو دل کے اندر اتارو۔ پھر دیکھو پریشانی کہاں جاتی ہے۔ شاید تم یہ کہو کہ قرآن میں تو قالوا آیا ہے تفکر و انہیں آیا اور قول کا صدور ہم سے بھی ہو جاتا ہے پھر نفع کیوں نہیں ہوتا تو آپ کو خبر بھی ہے کہ قول کسے کہتے ہیں۔

ان الكلام مني الفواد وانما

جعل اللسان على الفواد وليد

اصل قول تو قلب ہی سے ہوتا ہے اور قرآن میں یہی مراد ہے کہ زبان و دل دونوں سے یہ کلمہ کہا جائے۔ شاید تم یہ کہو کہ جب ہم زبان سے کہیں گے تو دل میں بھی پہنچ جائے گا کیونکہ اس وقت تصور تو لازم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دل میں کیا پہنچے گا محض الفاظ ہی الفاظ پہنچیں گے۔ اور مقصود معنی کا پہنچانا ہے وہ بدون تامل و تفکر کے نہیں پہنچ سکتے۔ اگر ہم اس کلمہ کو تصور معنی کے ساتھ کہا کریں تو پریشانی پاس نہیں آسکتی۔

چنانچہ اس میں اول تعلیم یہ کی گئی ہے کہ انا اللہ کا استحضار رکھو کہ ہم اول ہماری تمام چیزیں حق تعالیٰ کی ملک ہیں اور مالک کو مملوک میں ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہے۔ دوسروں کو کسی کی ملک میں کسی تجویز کا حق نہیں۔ اس میں ہماری تجویز کو قطع کیا گیا ہے کہ تم اپنی طرف سے کوئی خاص حالت اور خاص صورت اپنے لئے یا اپنے متعلقین وغیرہ کے لئے تجویز نہ کرو کیونکہ تم سب خدا کی ملک ہو۔ اور تجویز کا حق مالک کو ہے تم کو نہیں ہے اور یاد رکھو کہ پریشانی

کا دار ہی تجویز ہے کہ انسان اپنے لئے یا اپنے متعلقین کے لئے ایک خیالی پلاؤ پکالیتا ہے کہ یہ لٹکا زندہ رہے اور تعلیم یافتہ ہو اور اس کی اتنی تنخواہ ہو پھر وہ ہماری خدمت کرے اور یہ مال ہمارے پاس رہے۔ اس میں یوں ترقی ہو اور اتنا نفع ہو۔ اسی طرح شیخ چلی کی مانند ہر چیز کے متعلق کچھ نہ کچھ منصوبہ قائم کر لئے جاتے ہیں۔

جیسے شیخ چلی کا قصہ ہے کہ ایک شخص نے دو پیسہ کی مزدوری پر تیل کا گھڑا اُس سے اٹھوایا کہ فلاں جگہ تک پہنچا دو۔ آپ گھڑا سر پر رکھے ہوئے چلے اور راستہ میں تجویزیں پکانے لگے کہ ان دو پیسوں کے دو انڈے لاؤں گا ان کے نیچے نکلواؤں گا۔ اس طرح میرے پاس بہت سی مرغیاں ہو جائیں گی پھر ان کو بیچ کر بکریاں خریدوں گا۔ ان میں بھی اسی طرح سلسلہ توالہ چلے گا۔ پھر ان کو بیچ کر گائے خریدوں گا۔ پھر بھینسوں گا۔ پھر ان کو بیچ کر بہت سا روپیہ حاصل ہوگا تو میں ایک دکان کھولوں گا۔ جس میں بہت نفع ہوگا تو ایک عالیشان محل بناؤں گا۔ اور بادشاہ زادی کو پیغام نکاح دوں گا۔ بادشاہ میری ریاست کو دیکھ کر بس فوراً ہی نکاح کر دے گا۔ پھر اس سے ایک لڑکا ہوگا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ رہے گا اور کبھی مجھ سے پیسہ مانگے گا تو میں کہوں گا ہنشت! بس ہنشت جو کیا تو سر کے ہلنے سے گھڑا گر پڑا اور سارا تیل بہ گیا مالک نے کہا ارے یہ کیا کیا۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ میاں جاؤ بھی۔ تمہارا تو چند پیسوں کا تیل ہی ضائع ہوا اور میرا تو سارا کتبہ ہی ہلاک ہو گیا اور سب کا رخانہ تباہ ہو گیا۔ کیونکہ سارے منصوبوں کا نشانہ تو وہ دو پیسے تھے جو میاں کو مزدوری

میں ملتے۔ جب مزدوری پوری نہ ہوئی تو پیسے بھی نہ ملے اور جب پیسے نہ ملے تو سب انڈے بچے رکھے رہ گئے۔ لوگ اس حکایت پر ہنسنے لگے تو فرمایا کہ

ہم اس پر ہنستے ہیں مگر درحقیقت ہم سب اسی مرض میں مبتلا ہیں کہ بادل دیکھ کر گھڑے بھوڑ دیتے ہیں اور دروازے کی امیدیں پکانے لگتے ہیں۔ پھر جب تجویز اور امید کے خلاف وقوع ہوتا ہے تو پریشانی اور رنج میں کہ قمار ہوتے ہیں۔ اگر پہلے سے کوئی تجویز نہ ہو تو پریشانی کبھی پاس نہ پھٹکے۔ اسی لئے اہل اللہ سب سے زیادہ آرام و راحت و مسرت میں ہیں۔ ان کو کسی واقعہ سے پریشانی اور غم نہیں ہوتا کیونکہ وہاں تجویز کا نشان ہی نہیں ہے۔ بلکہ نفوذِ کلی ہے۔ بس ان کو ایک غم آخرت کا تو ہے اور کسی بات کا غم نہیں مگر غم آخرت ایسا نورانی اور لذیذ ہے کہ اس کے بدلے میں وہ سلطنت بھی لیتا نہیں چاہتے۔ اسی لئے کہتے ہیں

غم دین خور کہ غم غم دین سرت ہمہ غم لا فروتر ازین سرت
غم دنیا مخور کہ بیہودہ سرت ہاتھ کس در جہاں نیا سودہ سرت

اس مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غم دین بیہودہ نہیں ہے بلکہ یہ غم موجب راحت ہے۔ اسی لئے

موت کے مشتاق

اہل اللہ ہر وقت شاداں و فرجاں نظر آتے ہیں کہ کوئی مرے جب خوش، جیسے جب خوش، بیمار ہو جب خوش، قحط ہو جب خوش۔ کیونکہ وہ ہر حال میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، محبوب کی طرف سے ہو رہا ہے

ہر چیز از دوست می رسد نیکو ست

عرض انا للہ میں تجویز کو قطع کیا گیا ہے تاکہ چونکہ بعض کو ابتداء اس پر قدرت نام نہیں ہوتی تو ان کے لئے انا الیہ راجعون کی بھی تعلیم ہے کہ کسی کی مفارقت سے غم نہ کرو کیونکہ غم بھی ایک دن وہیں پہنچو گے، جہاں وہ گیا ہے۔ اس میں تسلی عام اور نام ہو جاتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدر آباد کسی کے عزیز کو بلا لے اور اس کو مفارقت کا صدمہ ہو۔ پھر نظام اس کو خط لکھ دے کہ تم بھی غمغریب نہیں بلائے جاؤ گے۔ تو اب غم مفارقت نہیں ہوتا۔

اسی طرح اہل اللہ کو کسی کی مفارقت سے زیادہ غم نہیں ہونا بلکہ وہ تو کسی کو مرنا ہوا دیکھ کر خود بھی موت کے مشتاق ہوتے ہیں۔ پھر کسی کے مرنے سے کیا غم کرتے۔ وہ تو موت سے ایسے مسرور ہیں کہ اس کے لئے نذریں ملتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں :-

خرم آن وز کزین منزل یراں بوم
راحت جاں طلیم وز پے جانان بوم
نذر کرم کہ گداید سپر اس غم رنڈے
تا در میگاہ نشاواں وغر نواں بوم

اور یہ محض باتیں ہی نہیں ہیں بلکہ عارفین نے اس کو کر کے دکھلا دیا ہے۔ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مر رہے تھے تو سب لوگ رورہے تھے اور وہ یہ کہہ رہے تھے :-

وقت آن آمد کہ من عرباں شوم
جسم بگذارم سرا سر جاں شوم
عرض شریعت مسلمانوں کے لئے پریشانی کو پسند نہیں کرتی۔ اسی لئے مرنا

اختیار و غیر اختیار یہ سب کے لئے ایسی تعلیم دی گئی ہے جس سے پریشانی کا استیصال ہو جاتا ہے۔

رعایا کو ہوس سلطنت ہوتا پریشانی کا سبب ہے۔ اس لئے یہ ہوس دین نہیں ہے بلکہ حد سے تجاوز ہے جس کی ممانعت آئی ہے اور مشاء اس ہوس کا محض حرس ہے اور ہر آرزو اور خواہش نہیں ہوا کرتی۔ تو حرس سے پریشانی ہی پریشانی ہوگی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

راحت کی صورت

ام لا تسلك ما تمنى۔ اس لئے سر لیں کو کبھی راحت نہیں مل سکتی۔ کتنا ہے۔

ما حصل ما يتمنى الطرا بیدر کہ
تجوى الريح بما لا تشتهي السفن

انسان بہت دفعہ ایک آرزو قائم کرتا ہے اور وہ خاک میں مل جاتی ہے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس لئے اگر راحت چاہتے ہو تو احکام پر عمل کرو اور حرس کو قطع کر تم اپنے لئے نہ سلطنت تجویز کرو نہ گداگری، صرف خدا تعالیٰ کی غلامی اختیار کرو۔ اس کے بعد وہ جو چاہیں گے خود دے دیں گے۔

یہاں سے معلوم ہو گیا کہ آج کل جو لوگ ترقی متعارف کے معلم ہیں، وہ درحقیقت پریشانی کی تعلیم دے رہے ہیں کیونکہ جس چیز کا نام انہوں نے ترقی رکھا ہے اس کی حقیقت محض حرس ہے اور جو لوگ ترقی متعارف سے مانع ہیں وہ راحت کے معلم ہیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہر حال میں شریعت کے

موافق چلو اور اس میں راحت ہی راحت ہے۔ شریعت میں چل کر پریشانی پاس نہیں آسکتی۔ بہر حال حرس تمام پریشانیوں کی بڑھ ہے۔ اور یہ مرض عورتوں میں زیادہ ہے۔ اور یہ ایسا مرض ہے کہ اس کو اعم الامراض کہنا چاہئے کیونکہ اسی کی وجہ سے جھگڑے فساد ہوتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں۔ اگر لوگوں میں حرس مال نہ ہو تو کوئی کسی کا حق نہ دباؤ۔ پھر ان فسادات کی بھی نوبت نہ آئے۔ بدکاری اور چوری وغیرہ کا منشا بھی حرس ہے۔ کہیں حرس مال ہے کہیں حرس لذت۔ نیز اخلاقِ رذیلہ کی بڑھ بھی یہی حرس ہے کیونکہ عارفین کا قول ہے کہ تمام اخلاقِ رذیلہ کی اصل کبر ہے اور کبر کا منشا بھی ایک گونہ حرس ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ بھی حرس کی ایک فرد ہے کیونکہ تکبر طلب جاہ کا نام ہے۔

تو اس میں جاہ کی ہوس ہے بلکہ غور کیا جائے تو مال کی بھی جاہ کی ہوس | حرس ہے کیونکہ طلب جاہ اس واسطے کی جاتی ہے کہ

صاحب جاہ کو ضروریاتِ معاش سہولت سے مل جاتی ہیں۔ اس کی حاجتیں آسانی سے پوری ہو جاتی ہیں۔ جو کام دوسرے شخص کا سینکڑوں روپے خرچ ہونے سے نکلتا ہے، وہ صاحب جاہ کی زبان بولنے سے ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سفرو حضر میں مشاہدہ ہے کہ کلکٹر اور حاکم کے منہ سے جہاں یہ نکلا کہ ہم کو دودھ کی ضرورت ہے تو ہر شخص دودھ لانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اور جہاں یہ نکلا کہ ہم کو گائے کی ضرورت ہے تو ہر طرف سے لوگ گائے ہی گائے لئے چلے آتے ہیں۔ چاہے دل سے یا بدولی سے مگر حاکم کا منشا پورا ضرور ہو جاتا ہے تو صاحب جاہ کو انجامِ خواج سہل ہو جاتا ہے۔ مال بھی آسانی سے ملتا ہے

وردہ کم از کم روپیے کی بچت تو ضرور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص خوشامد میں کچھ لاتا ہے مفت ہی پیش کرتا ہے۔

اسی لئے سو فیما نے صاحب جاہ کے اواب میں لکھا ہے کہ ایسا شخص اپنی حوائج کو ظاہر نہ کرے کیونکہ اس سے لوگ فکر میں پڑ جائیں گے اور ہر شخص اس کی حاجت کو پورا کرنا چاہے گا۔ اس لئے صاحب جاہ کو اظہار حاجت مناسب نہیں۔

شاید کوئی کہے کہ ہم تو اظہار حاجت کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اگر تم پر بار نہ ہو، گرانی نہ ہو تو یہ کام کرو۔ تو خوب سن لو کہ یہ مقدمات شرطیہ سب فضول ہیں کیونکہ معتقدین ان مقدمات کو نہیں دیکھتے بلکہ وہ تو تالی کو دیکھ کر حوائج کا تالا کھولنے میں لگ جاتے ہیں۔

امام غزالی نے جاہ کی حقیقت ملک القلوب لکھی ہے اور ملک القلوب سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہمارے کام سہولت سے نکلتے رہیں۔ پس تکبر کا منشا بھی حرص ہے اور کبر تمام روائی کی بڑ ہے۔ تو حرص منشاء ہوا تمام معاصی کا چنانچہ منشا ہے کہ نا انصافی کا منشا بھی حرص ہے اور تفاخر کا منشا بھی یہی ہے کیونکہ مال دولت کو دکھانا جمع مال ہی کے بعد ہو سکتا ہے اور وہ جمع ہوتا ہے حرص سے تو حرص کا ام الامراض اور اصل معاصی ہونا ثابت ہو گیا۔

یہاں سے اس حدیث کا مطلب واضح ہو گیا ہو گا۔ حسب اللہ نیار اس

لے لا یحیی ما فیہ من اللطف فللہ و رد ما ابلغہ ۱۲ جامع

حل خطیۃ حُب دنیا ہی کا نام تو حرض ہے اور عورتوں میں یہ مرض مردوں سے زیادہ ہے۔ ان کو زلیوہ کپڑے اور برتنوں کی بہت حرض ہے۔ پھر اس سے زیادہ و نفاخہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ جب محفل میں بیٹھیں گی تو کسی پہانہ سے اپنے کین پھول اور کنگن دکھانا چاہیں گی۔ کنگن تو ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ وہ تو سب بے تکلف دیکھ لیتے ہیں البتہ کین پھول اور طوق کلو بند وغیرہ دوپٹے سے مستور ہوتے ہیں۔ تو جوان میں ثقہ نہیں ہیں وہ تو بدالانت قال دکھلاتی ہیں کہ اسے فلانی! دیکھئے میرے کین پھول کیسے ہیں؟ اچھے بھی بنے ہیں گلو بند عمدہ بھی ہے جس سے سب سمجھ جاتی ہیں کہ مقصود یہ جملانا ہے کہ ہمارے پاس یہ چیزیں بھی ہیں اور جو ثقہ بھی ہیں وہ بدالانت قال تو نہیں دکھلاتیں مگر بدالانت سماں دکھلاتی ہیں کہ بیٹھے بیٹھے ان کے کان میں یا گلے میں کھجلی اٹھتی ہے۔ بار بار کان اور گلا کھجلاتی ہیں۔ مگر یہ کھجلی اول دل میں ہوتی تھی۔ پھر کان میں ہونے لگی۔

بہر حال حرض سے اول قلب کو پریشانی ہوتی ہے پھر ظاہر کو بھی پریشانی ہونے لگتی ہے۔ تو اس کا علاج ضروری ہوا۔ جو اس حدیث میں مذکور ہے جس کی تقریر یتوب الیہ علی من قاب کی شرح میں ذکر کی جاوے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَوْحَانِ لَابِنِ
آدم اور انسان | آدم وادیان من الممال۔ اس میں حضورؐ نے لفظ ابن آدم اختیار فرمایا ہے، انسان نہیں فرمایا۔ کیونکہ ابن آدم کے عنوان میں ایک مقبول کی طرف نسبت ہے جس سے شرم دلانا منظور ہے کہ ایسے مقبول کا بیٹا اور نبی زادہ ہو کر اس کی شخصیت ایسی جو بہائم جیسی ہے۔ دوسری توجہ یہ بھی ہو

سکتی ہے کہ حرس کو مذموم کے ساتھ خاص نہ کیا جائے بلکہ عام مان لیا جائے
 جو محمود و مذموم سب کو شامل ہو۔ اس صورت میں لفظ ابن آدم میں اضافت سے
 بناء حرس کی طرف اشارہ ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام میں ایک حرس محمود پیدا
 ہوئی تھی مگر حضرت انسان اس کی وجہ سے حرس مذموم میں مبتلا ہو گئے۔ مگر یہ
 تو جہہ عوام کے مناسب نہیں بلکہ خاص کے سمجھنے کی ہے۔ عوام کو ابن آدم
 کہنے کی وہی وجہ سمجھنی چاہئے جو پہلے مذکور ہوئی ریز ابن آدم کہنے سے اس خاص
 کے عموم پر اور فطری ہونے پر بھی اشارہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ حرس کا مادہ اس میں طبعی ہے۔ آگے اس کا علاج بتلاتے
 ہیں مگر علاج صحیح بتلانے سے پہلے ایک غلط علاج کا غلط ہونا بتلاتے ہیں۔
 کیونکہ انسان میں ایک مرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے امراض کا علاج خود کیا
 کرتا ہے جیسے عورتوں کی بھی عادت ہے کہ وہ اکثر امراض کا علاج خود کیا کرتی
 ہیں مگر حقیقت میں وہ الٹا علاج ہوتا ہے جس سے بجائے اصلاح کے فساد
 ہی بڑھتا ہے۔ کسی کے پیٹ میں درد ہو تو اس کا علاج عورتوں میں یہ ہے کہ
 کھانا کھا لو۔ چنانچہ کہا کرتی ہیں کہ یہ بھوک کا درد ہے کھانے سے جاتا ہے گا
 بھوک کا درد! یہ درد کی نئی قسم ہے جو اطباء کو بھی معلوم نہیں۔

اسی طرح مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری کے پاس ایک مریض آہ
 آہ کہتا ہوا آیا۔ اس کو درد شکم کی شکایت تھی۔ مولوی صاحب طبیب بھی سختے
 آپ نے ایک نسخہ تجویز کر کے اس کو دیا کہ یہ دوا پی لو۔ تو آپ کہتے ہیں کہ
 حضرت اگر پیٹ میں دوا پینے کی گنجائش ہوتی تو میں کھانا ہی اور نہ کھاتا۔ اس

کے نزدیک بھی درد کا علاج کھانا ہی تھا۔

ایسے ہی آج کل لوگوں نے مرض حصر کا علاج ایٹا کہا ہے۔ اور یہ بھی وہ لوگ کرتے ہیں جو حصر کو مرض سمجھتے ہیں ورنہ عام طور پر تو اس کو مرض بھی نہیں سمجھتے۔

آج کل کی ترقی | چنانچہ آج کل تعلیم یافتہ لوگوں نے حصر کا نام ترقی رکھا ہے اور اس کے فضائل بیان کئے جاتے ہیں مگر صاحبزادے

عنوان بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی ڈاکو کا نام کاسب رکھے اور اس کو الکا سب حبیب اللہ کا مصداق بنانے لگے یا جیسے ایک باد نے کہا تھا کہ ہم جو ساجیوں کو لوٹتے ہیں یہ جائز ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں
يا ايها الذين امنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى اولياء
بعضہم اولياء بعض۔

اور سلطان روم نصاریٰ سے موالات رکھتا ہے تو رنعود باللہ وہ

بھی منہم ہے۔ اس سے ہر طرح لینا جائز ہے اور ہم حجاج کو اسی واسطے لوٹتے ہیں تاکہ دباؤ میں سلطان ہم کو دے۔

یا جیسے معتزلہ اپنے کو اہل توحید و اہل عدل کہتے ہیں کیونکہ وہ زیادت صفات کے ملکہ ہیں اور عاصی کی معصرت کو بدون عذاب کے تا جائز کہتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے کو مواسد اور اہل عدل کہتے ہیں۔ اور تمنا تھا یہ ہے کہ آج کل بعض پیپری اپنے کو معتزلی لکھتے ہیں۔ حالانکہ جس جماعت کی طرف وہ اپنے کو منسوب کرنا چاہتے ہیں وہ جماعت اس لقب سے نفرت کرتی ہے اور

اس کی اپنے سے نفی ترقی ہے کیونکہ معتزلہ کا لقب تو ان کو ہم نے دیا تھا
 لاحترالهم عن جماعة الحق ورنہ وہ اس لقب سے خوش نہ تھے۔ اس
 کی ایسی مثال ہے جیسے شیعہ کو ہم لوگ رافضی کہتے ہیں مگر وہ اس لقب سے
 جلتے اور ناخوش ہوتے ہیں۔

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک سنی محرم کے زمانہ میں شیعوں کی مجلس میں
 جانے لگا۔ وہ خاص مجلس تھی جس میں سنیوں کے آنے کی مخالفت تھی۔ دروازہ
 پر پہرہ تھا جو کوئی اندر جاتا اس سے پہلے پوچھ لیتے تھے کہ تم کون ہو۔ جو کوئی
 شیعہ بتلاتا اس کو اندر جانے دیتے ورنہ روک دیتے۔ جب یہ سنی صاحبِ دروازہ
 پر پہنچے تو ان سے بھی پوچھا گیا۔ تو آپ کہتے ہیں کہ ہم رافضی ہیں۔ سب سمجھ گئے
 کہ یہ سنی ہے کیونکہ شیعہ اپنی زبان سے کبھی خود کو رافضی نہ کہے گا۔ چنانچہ یہاں
 نکال دیئے گئے۔ اسی طرح کوئی معتزلی اپنی زبان سے خود کو معتزلی نہیں کہہ
 سکتا۔ یہ آج کل کے نیچرلوں کی کم علمی ہے جو لقب مذلت کو خود اختیار کر لے رہے
 ہیں۔

بہر حال عنوان کے اچھا ہونے سے معنون اچھا نہیں ہو سکتا۔ ورنہ پھر
 ڈاکو بھی اپنے کو کاسب کہہ سکتا ہے اور بدوؤں کا فعل بھی مستحسن ہو جائے گا
 پس ترقی کا عنوان تو عمدہ ہے کیونکہ قرآن میں بھی اس کا امر آیا ہے فاستبقوا
 الخیرات استباق کے معنی ہیں ایک دوسرے پر سبقت کرنا۔ یہی ترقی
 کا حاصل ہے۔

یہاں سے ایک مترجم قرآن کی غلطی واضح ہو گئی۔ جس نے یا ابانا انا

ذہبنا لتتبع میں استنباق کا ترجمہ کبڑی سے کیا ہے کیونکہ کبڑی میں ایک دوسرے پر دوڑنے میں سبقت مقصود نہیں ہوتی۔

دوسرے کبڑی کا میدان اتنا وسیع نہیں ہوتا جس میں سب کھیلنے والے اتنے دور چلے جائیں کہ ایک بچہ کو بھڑیا اٹھالے جائے اور کسی کو خبر نہ ہو بلکہ یہ بات دوڑنے میں بے شک ہوتی ہے کہ دو جماعتیں آپس میں دوڑیں کہ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے۔ تو اس میں ایسا ہو سکتا ہے کہ سب کے سب دوڑتے ہوئے اتنی دور نکل جائیں کہ جس لڑکے کو سامان پر بٹھایا جائے وہ نظروں سے غائب ہو جائے۔

تیسرے کبڑی کا لفظ نہایت قبیل ہے جو فصحا کے کلام میں مستعمل نہیں ہوتا اس لئے بھی ترجمہ قرآن میں اس کا لکھنا معیوب ہے کیونکہ قرآن کا ترجمہ ایسا فصیح و بلیغ و پر شوکت ہونا چاہئے۔ مگر باوجود ان غلطیوں کے وہ ترجمہ آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں بڑا مقبول ہے۔ حالانکہ معنوی غلطیوں کے ساتھ اس میں لفظی غلطیاں بھی بہت ہیں۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ ترقی کا عنوان قرآن میں بھی آیا ہے اس لئے یہ عنوان ظاہر میں بہت عمدہ ہے۔ اس کی خوبی میں کلام نہیں ہو سکتا۔

مگر قرآن میں اس کو خیرات کے ساتھ مفید کیا گیا ہے کہ باہم

ترقی خیر خیرات میں ترقی کرو۔ اب فیصلہ اس پر ہے کہ جس امر میں تم ترقی کی تعلیم دے رہے ہو وہ خیر ہے یا نہیں۔ تو ظاہر ہے کہ تم ترقی مال و حکومت کی تعلیم دے رہے ہو اور اس کا خیر ہونا تم شریعت سے ثابت

نہیں کر سکتے۔

شاید تم یہ کہو کہ قرآن میں ہے۔

وانه لحب الخیر لشدید اور کتب علیکم اذا حضر

احدکم الموت ان تترك خیر ان الوصیة للوالدین اللہ

یہاں خیر سے مراد مال ہے۔ لہذا ترقی مال بھی ترقی خیر ہوتی۔ اس کا جواب

یہ ہے کہ فاستبقوا الخیرات میں خیر مطلق مراد ہے کہ خیر مطلق میں باہم سبقت

کو۔ اور مال خیر مطلق نہیں بلکہ خیر مفید ہے جس کی خیریت کے لئے بہت سی

شرطیں ہیں جن کی تم رعایت نہیں کرتے۔ لہذا تم اپنی ترقی مالی کو ترقی خیر نہیں کہہ

سکتے۔ اور جس درجہ میں مال خیر ہے اس درجہ میں طلب مال سے ہم مانع نہیں

ہیں بلکہ اس کو ہم بھی جائز بلکہ فرض کہتے ہیں۔ کیونکہ حدیث میں ہے حسب

الحلال فریضة بعد الفریضة۔

مگر تم ہی بتلاؤ کہ جیسی ترقی آج کل دینی زمانہ تحریکات میں، ہورہی تھی

کیا وہ خیر تھی؟ کیا اس میں شریعت سے تجاوز نہ تھا کہ مسلمانوں کو نہتہ نہتہ کا

لقب دیا گیا۔ ہندؤں کو مولا نا کہا گیا، قشتے لگائے گئے۔ گائے کے گوشت کو

ممنوع کہا گیا۔ مسلمانوں سے قربانی کی گامیں چھینی گئیں اور ایک ہندو کی نسبت

کہا گیا کہ ہوت شتم نہ ہوتی ہوتی تو وہ نبی ہوتا پھر جن لوگوں نے یہ باتیں کہیں

ان سے قطع تعلق نہیں کیا گیا بلکہ ان کو بدستور لیڈر مانا گیا، وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس

صورت میں بھی تمہاری ترقی استباق فی الخیر کا مصداق تھی تو فرعون سب سے

زیادہ ترقی یافتہ اور کامیاب ہونا چاہئے۔ اس وقت لوگوں کی یہ حالت تھی

کہ جب کوئی یہ کہتا کہ یہ کام شریعت کے خلاف ہے تو اس کو یہ جواب دیا جاتا کہ تم تو محض ملائے ہو تم کو سیاست کی کچھ خبر نہیں۔ یہ وقت جائز و ناجائز کے سوال کا نہیں۔ اب تو جس طرح ہو ترقی حکومت ہونا چاہئے۔

افسوس! الی لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ شریعت میں سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ ملاناپن ہی مطلوب ہے اور سلطنت سے مقصود بھی ملاناپن ہی کا پھیلاؤ ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

الذین ان مکنا ہم فی الارض اقاموا الصلوة و اتوا الزکوٰۃ
وامروا بالعرف و نه و اعن المنکر۔

مگر لوگ اسی کو مٹا رہے تھے تو اس صورت میں اس کو ترقی خیر کون کہہ سکتا ہے پس حصر کا عنوان ترقی رکھ لینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ مگر ان لوگوں نے تو اس عنوان سے اس کے عیب کو چھپانا چاہا ہے۔ جب اس کا نام ترقی رکھ لیا تو اب وہ ان کے نزدیک مرض اور عیب ہی نہ رہا پھر وہ اس کا علاج کیا خاک کریں گے۔

مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کو مرض سمجھتے ہیں۔
ہوس اور موت لیکن وہ اس کا علاج خود کرنا چاہتے ہیں اور ان کا علاج کیتے ہیں۔ ان کے علاج کا حاصل یہ ہے کہ ایک دفعہ خوب جی بھر کر ہوس کو پورا کر لو۔ پیٹ بھر کے گناہ کر لو۔ لڑکوں اور عورتوں کو خوب گھور لو۔ پھر توبہ کر لیں گے۔

چنانچہ ایک جٹلمین مجھ سے ملے جو انگریزی پڑھ رہے تھے اور دین

کا بھی کچھ خیال تھا۔ وہ کہنے لگے کہ میری نیت مستقل کے متعلق یہ ہے کہ انگریزوں
 پڑھ کر بی اسے پاس کر کے بڑی سی نوکری کروں گا اور خوب پیٹ بھر کے
 رشوت لوں گا۔ اور مال جمع کر کے ایک دو گاؤں خرید کر ملازمت کو ترک
 کر دوں گا۔ پھر زندگی بھر اللہ اللہ کروں گا۔

اس غلطی میں جہاں صوفی بھی مبتلا ہیں۔ وہ بھی تقاضائے معصیت کا علاج
 اسی طرح کرتے ہیں کہ ہو جس کو اچھی طرح پورا کر کے پھر توبہ کر لینا چاہئے۔ رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط خیال کا اس حدیث میں جواب دیا ہے اور
 جواب بھی حکیمانہ دیا ہے۔ حکیمانہ نہیں دیا۔ ضابطہ کا جواب تو یہ بھی کافی تھا کہ
 یوں فرما دینے کہ ازالہ حرس کی نیت سے بھی ہوس پورا کرنا اور انا لہ تقاضائے
 گناہ کی نیت سے گناہ کرنا بھی جائز نہیں مگر اس جواب سے فلسفی و مارع والوں
 کو تسلی نہ ہوتی۔ وہ اس کے ناجائز ہونے کی وجہ نہ سمجھ سکتے۔ اس لئے آپ
 حکیمانہ جواب دیتے ہیں کہ حرس کے مفسدات پر عمل کرنے سے ہی بھر نہیں سکتا۔
 کیونکہ انسان کا طبعی خاصہ یہ ہے کہ اگر اس کے پاس مال کے دو جنگل بھی ہوں
 جن میں سونا چاندی پانی کی طرح بہتے ہوں پھر بھی وہ تیسرے کا طالب ہوگا۔
 پس یہ خیال ہی غلط ہے کہ ہوس کے پورا کرنے سے ہوس بجھ جائے گی۔ بلکہ
 جتنا اس کو پورا کرو گے یہ اتنا ہی بڑھے گی۔ انسان کی ہوس کے پیٹ کو مٹی کے
 سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ نراب سے مراد تراب قبر ہے یعنی موت کے سوا
 کوئی چیز ہوس کو نہیں بھر سکتی۔ شیخ سعدی نے اس کا خوب ترجمہ کیا ہے۔
 گفت چشم تنگ دنیا دار را یا قناعت پر کند یا خاک گور

موت کو ہوس کا پیر کرنے والا اس لئے کہا گیا ہے کہ اس سے ہوس منقطع ہو جاتی ہے۔ گو پوری اس وقت بھی نہیں ہوتی۔ مگر موت سے قطع ہر حال اضطراری ہے اور ایسے وقت میں قطع ہے کہ تم کو اس قطع سے نفع نہیں پہنچ سکتا مرنے کے بعد تو کفار بھی مومن ہو جائیں گے۔ مگر وہ ایمان کا لعدم اور غیر قابل اعتبار ہے۔ چنانچہ سنی تعالیٰ مرتے ہوئے ایمان لانے کے نافع نہ ہونے کی تصریح فرماتے ہیں۔

فلم یلب یفعم ایمانہم کہ عذاب کا معائنہ ہو جانے
لعداؤ باسنا۔ کے بعد ایمان نافع نہیں۔

اور یہی ایمان منہی سے امام صاحب کے اس جواب کا کہ امام صاحب سے ایک شخص نے سوال کیا تھا کہ اس شخص کے بارہ میں آپ کیا فرماتے ہیں جو کہتا ہے کہ جہنم میں کوئی کافر نہ جائے گا۔ امام صاحب نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ تم تو سب نے یہ کہا یہ شخص کافر ہے جو نص صریح کا منکر ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کیا اس کے قول میں کچھ تاویل نہیں ہو سکتی۔ لوگوں نے کہا اس میں کیا تاویل ہوگی۔ فرمایا ممکن ہے کہ اس نے کفر لغوی کا ارادہ کیا ہو، کفر شرعی مراد نہ لیا ہو اور کافر جب مرتا ہے تو خدا پر ایمان سے آتا ہے۔ لہذا لفظ وہ مومن ہے گو شرعاً جو تکہ یہ ایمان معتبر نہیں اس لئے کافر ہے۔ لہذا اس کا مطلب یہ ہے کہ جہنم میں جو بھی جائے گا وہ لفظ مومن ہوگا کافر نہ ہوگا۔

تو ایسے ہی مرتے ہوئے گو سب کی حرم منقطع ہو جائے گی مگر یہ نقصان

معتبر نہیں۔ اس لئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے علاج سے حرق قطع ہو گیا۔
گئی گو موت ہی کے وقت ہوئی۔

جواب یہ ہے کہ انقطاع آپ کے علاج سے نہیں ہوا بلکہ موت سے اضطراب ہوا۔ اس لئے یہ انقطاع مفید نہیں۔ پس یہ علاج ہی غلط ہے۔ اگر آپ گناہ کرنے سے حرق بھر جائے گی۔ ہرگز نہیں! بلکہ اس کو دینی ترقی ہوگی۔ کیونکہ فلسفی مسئلہ ہے کہ جس وقت وقت سے جتنا کام لیا جاتا ہے اتنا ہی وہ وقت زور پکڑتی ہے اور راسخ ہو جاتی ہے۔ پس نگاہ بد کرنے سے مرض نگاہ بد سکون نہ ہوگا۔ بلکہ اس کی جڑ اور مضبوط ہو گئی اور ایک بار گھور لینے سے جو سکون ہو جاتا ہے اس سے دھوکا نہ کھایا جائے کیونکہ یہ عارضی سکون ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے تمباکو کھانے والے کو جب تمباکو کی طلب ہوتی ہے، تو اس وقت ایک بار کھا لینے سے کچھ دیر کو سکون معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت اس کا اس وقت تمباکو کھالینا زیادت طلب کا سبب ہے۔ اس سے طلب میں کچھ کمی نہیں ہوتی بلکہ ہر دفعہ کے کھانے میں عادت اور بچھڑے جاتی ہے۔

گناہ اور طاعت کا کمال

اسی طرح ایک بار گھورنے سے بخوری کو عارضی سکون ہو جانا ہے مگر حقیقت میں عادت بچھڑے ہو رہی ہے۔ کیونکہ سکون کی وجہ روپیں ایک تو خروج علت سبب ہے کہ جو چیز پر لیشانی کی علت تھی وہ اندر سے باہر نکل جائے اور ایک سبب یہ ہے کہ وہ تہہ اور جڑ میں بیٹھ جائے۔ اس سے بھی قدرے سکون

ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے حوض میں ایک ڈھیلہ گریڈ پڑے جس سے حوض گزلا ہو جاتا ہے پھر وہ تہہ کے اندر بیٹھ جائے تو تھوڑی دیر میں پانی صاف نظر آنے لگتا ہے مگر وہ ایسا صاف ہے کہ جہاں کوئی ذرا حرکت ہوگا، تو حوض پہلے سے زیادہ گزلا ہو جائے گا۔

اسی طرح یاد رکھو کہ نگاہ بد کرنے سے مرض کو سکون نہیں ہوتا بلکہ قوت ہوتی ہے اور اس عارضی سکون کی ایسی حالت ہے کہ جیسے درخت کی جڑ میں جب پانی دیا جاتا ہے تو وہ تھوڑی دیر میں نظروں سے غائب ہو جاتا ہے مگر واقع میں غائب نہیں ہوا بلکہ اب وہ شاخوں اور پتوں میں رطوبت بڑھا کر ظاہر ہوگا اور جڑ کو پہلے سے زیادہ مضبوط کرے گا۔ پس جو لوگ مقتضائے تقاضا پر عمل کرتے ہیں، وہ حقیقت میں تقاضے کو کم نہیں کرتے بلکہ اس کی آبیاری کرتے ہیں۔

یہ میں جہلا صوفیاء کی غلطی بیان کر رہا ہوں کہ وہ یہ سچا ہتے ہیں کہ ہم کو دوسرے نہ آئے۔ گناہ کا خطرہ نہ آوے اور جب یہ بات حاصل نہیں ہوتی تو وہ اس کی یہ تدبیر کرتے ہیں کہ لاؤ ایک دفعہ اس خطرہ پر عمل کہ میں پھر سکون ہو جائے گا۔ یہ ان کی سخت غلطی ہے۔

اول تو یہ مطلوب ہی صحیح نہیں کہ گناہ کا خطرہ نہ آئے۔ اگر تم کو گناہ کا دوسرے اور خطرہ ہی نہ آئے تو پھر طاعت میں تمہارا کمال ہی کیا ہوگا۔ پھر تو تم دیوار کی طرح ہو جاؤ گے۔ کیونکہ اس کو بھی گناہ کا خطرہ نہیں ہوتا۔ لیکن دیوار اگر نہ

نہ کرے تو کیا کمال ہے۔ اندھا نا محرم کو نہ دیکھے تو کیا کمال ہے۔ بہر غیب
 نہ سنے تو کیا کمال ہے۔ صاحبو! اور اسی میں ہے کہ تم کو گناہ کا تقاضا ہو اور
 تقاضے کا مقابلہ کرو۔ گھورنے کو جی سچا ہے اور نگاہ بد کو روکو۔ پھر دیکھو قلب میں
 کیسا نور اور انشراح پیدا ہوتا ہے۔ حدیث میں اس کے متعلق وارد ہوا ہے۔
 وجد حلاوة الايمان کہ نگاہ کو روکنے سے حلاوت
 ایمان نصیب ہوتی ہے۔

بجلا یہ بات اس شخص کو کہاں نصیب جسے تقاضا ہی نہیں ہوتا۔ اسی لئے
 مولانا فرماتے ہیں۔

شہوت دنیا مثال گلخن است کہ از جام تقوی روشن است

اس تقاضے ہی سے تو تقوے کا جام روشن اور تقوے کا کمال ظاہر ہوتا
 ہے۔ پس اول تو اس کے نہ ہونے کی طلب ہی بہل ہے۔ پھر اس کا جو علاج کیا
 گیا ہے وہ بالکل الٹا علاج ہے بلکہ علاج صرف یہ ہے کہ تقاضے کا مقابلہ کرو
 اور گو مقابلہ تقاضا سے یہ تقاضا زائل نہ ہوگا مگر ضعیف ضرور ہو جائے گا جس
 کے بعد پھر متقاومت سہل ہو جائے گی اور یہ بھی بڑا نفع ہے کہ دشمن ضعیف
 ہو جائے۔

یہاں سے ایک حدیث سے اشکال رفع
 ہو گیا۔ وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے۔

ماہ رمضان اور شیطان

اذا دخل رمضان صدقت
 الشیاطین۔ کہ جب رمضان آتا ہے، تو
 شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر رمضان میں گناہ کیوں ہوتے ہیں۔ اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ سب قید نہیں ہوتے بلکہ بڑے بڑے شیاطین قید ہوتے ہیں جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض روایات میں صرحاً الشیاطین آیا ہے۔ تو چھوٹے قید نہیں ہوتے اور رمضان میں صدور معاصی انہیں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مگر میرے نزدیک اگر سب بھی قید ہو جائیں تب بھی کچھ اشکال نہیں کیونکہ معاصی کا سبب تقاضائے نفس بھی ہے پس شیاطین کے قید ہو جانے کے بعد جو گناہ ہوتے ہیں ان کا منشاء تقاضائے نفس ہے۔

مگر اب یہ سوال ہوتا ہے کہ جب چھوٹے شیاطین قول اولیٰ پر اور تقاضائے نفس قول ثانی پر گناہ کرانے کے لئے موجود ہیں تو پھر شیاطین کے قید ہونے سے کیا فائدہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی نفع ہے کہ چوروں کی جماعت کم ہو جائے رمضان سے پہلے اگر ہزار چور تھے تو اب سو رہ گئے اور دوسرے قول پر تو صرف ایک ہی رہ گیا اور ظاہر ہے کہ ایک چور کا ہونا ایک جماعت کے ہونے سے سہل ہے۔ اس کا مقابلہ آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان میں اور دنوں سے کم گناہ ہوتے ہیں تو جو شخص تقاضے کے ضعیف کرنے کے لئے اس کے معتقدانہ پر عمل کر رہا ہے وہ درخت کو پانی دے کر گریانا چاہتا ہے۔ حالانکہ پانی سے تو بڑا اور مضبوط ہوگی۔ اس کی صورت تو یہی ہے کہ اس کو بالکل سکھا دو۔ تاکہ جڑ کمزور ہو جائے۔ پھر وہ خود ہی گہرے گہرے گا۔ بس ان لوگوں کے علاج کی وہی حالت ہے جس کو طبیب روحانی کی حکایت میں مولانا فرماتے ہیں کہ اس نے دوسرے

طیبوں کے علاج کو سن کر کہا تھا ۔

گفت ہر وارو کہ ایشان کردہ اند

آن عمارت نیست یراں کردہ اند

بے خبر بودند از حال دروں

استعین الله معا لفترون

خود رانی کے علاج کی یہی گت ہوتی ہے کہ اس سے

خود رانی کا علاج

اٹھا مرض ہی بڑھتا ہے۔ اس لئے اس طریق میں دستگیری

کی ضرورت ہے۔ اپنے آپ پر راستہ طے نہیں ہو سکتا۔ مگر دست گیری سے

مراد ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت کرنا نہیں ہے بلکہ دست گیری سے مقصود یہ

ہے کہ ایک شخص راہ بنانے والا ہو اور تم اس کا اتباع لازم سمجھو۔ بیعت کی

ضرورت نہیں۔ دست گیری بدون بیعت کے بھی ہو سکتی ہے

دیکھو اگر کوئی اتدھا حافظ کسی لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلے تو

کیا وہ اس کا مرید ہو گیا۔ ہرگز نہیں۔ مگر لڑکا حافظ جی کا دست گیر ضرور ہے

کیونکہ راستہ دیکھنے کے فن میں وہ حافظ جی سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ وہ بصر ہے

اور حافظ جی ضرب میں یعنی اندھے۔ وہ ان کی دست گیری کر کے منزل پر

ضرور پہنچا دے گا۔

بشرطیکہ وہ ایسا دست گیر نہ ہو جیسے ایک حافظ جی دعوت کھا کر ایک

لڑکے کے ہاتھ واپس ہوا ہے تھے۔ راستہ میں کھائی یعنی خدق آئی تو لڑکے

نے کہا، حافظ جی کھائی۔ تو وہ فرماتے ہیں ہاں بیٹا خوب کھائی۔ اس نے پھر

کہا، حافظ جی کھائی۔ وہ یہی کہتے رہے ہاں بیٹا خوب کھائی۔ آخر کو لڑکے

میں گھر پڑے تو اس پر بڑے خفا ہوئے کہ تو نے بتلایا کیوں نہیں۔ اس نے

کہا کہ میں نے تو بار بار کہا تھا، حافظ جی کھائی۔ حافظ جی کھائی۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ تجھے یوں کہنا چاہئے تھا، حافظ جی خندق۔

تو ایسا دست گیر تو واقعی دھکے دے گا جو مخاطب کی حالت کو سمجھ کر اس کے موافق علاج نہ کرے اور اگر دست گیر کامل ہے تو وہ ضرور منزل پر پہنچا دے گا۔ اگر تم اس کا اتباع اور انقیاد کرتے رہے۔ باقی بیعت تو جھگڑا ہے۔ اصل بیعت تو انقیاد ہی ہے۔ چنانچہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب نے اس کو خوب سمجھا۔

حافظ محمد ضامن صاحب اور ہمارے حاجی صاحب
معادہ بیعت

میں یہ معادہ قرار پایا تھا کہ جہاں ایک صاحب بیعت ہوں وہ دوسرے کو خبر کر دیں۔ وہ بھی انہی بزرگ سے بیعت ہونگے پھر حضرت حاجی صاحب لوٹا رہی جا کر میاں جی صاحب سے بیعت ہو گئے اور حافظ صاحب سے تذکرہ کرنا بھول گئے۔ جب حافظ صاحب نے دیکھا کہ یہ بار بار لوٹا رہی جانتے ہیں تو دریافت کیا کہ آپ بار بار لوٹا رہی کیوں جایا کرتے ہیں۔ تب فرمایا کہ میں ایک بزرگ سے بیعت ہو گیا ہوں۔ فرمایا اول ہمارا تم سے تو معادہ بھڑا تھا کہ دونوں ایک ہی جگہ بیعت ہوں گے۔ آپ نے ہم سے کیوں نہ تذکرہ کیا۔ فرمایا میں بھول گیا تھا۔ اب چلے چلو۔ چنانچہ حافظ صاحب بھی ہمراہ ہو لئے۔ جب آپ لوٹا رہی پہنچے تو میاں جی صاحب نے دریافت فرمایا کہ حافظ صاحب کیسے آئے۔ عرض کیا حضرت بیعت کے ارادہ سے آیا ہوں۔ فرمایا بھائی میں تو بزرگ نہیں ہوں۔ ایک میاں جی ہوں

بچوں کو پٹھاتا ہوں۔ کسی بزرگ سے بیعت ہونا چاہئے۔ حافظ صاحب نے کہا کہ میں نے تو اپنا ارادہ عرض کر دیا۔ اگے آپ کو اختیار ہے۔ اس کے بعد حافظ صاحب ہمیشہ لوہاری آتے جاتے رہے۔ اور بیعت کے لئے پھر عرض نہیں کیا۔ آخر میانجی صاحب نے خود ہی ایک بار فرمایا کہ حافظ صاحب کیا اب بھی وہی خیال ہے۔ حافظ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں تو دل سے بیعت ہو چکا ہوں کیونکہ بیعت اعتقاد ہی ہے۔ باقی بزرگوں پر اصرار کرنا بے ادبی ہے۔ اس لئے صورت بیعت پر میں نے اصرار نہیں کیا فرمایا، اچھا وضو کر کے آ جاؤ اور بیعت ہو جاؤ۔

تو دیکھئے! حافظ صاحب نے صورت بیعت پر اصرار نہیں فرمایا پس اپنے اعتقاد و اعتقاد کو کافی سمجھا۔ پھر خود ہی شیخ نے بیعت کے لئے فرمایا۔ تو صورت بیعت بھی نصیب ہو گئی۔ مگر جیسے حافظ صاحب کو شیخ نے دیر سے بیعت کیا تھا ایسے ہی وہ بھی بہت دیر میں بیعت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے مریدوں سے اس کی کسر نکالی۔ چنانچہ عمر بھر میں آٹھ سے زیادہ آپ کے مرید نہیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ آپ نے حاملان عرش کی شمار پوری کر دی۔ وہ بھی آٹھ ہی ہیں۔ اور حضرت حاجی صاحب بہت جلد بیعت کر لیتے تھے کیونکہ آپ کو میانجی صاحب نے فوراً بیعت کر لیا تھا۔ حضرت حاجی صاحب پہلے شاہ نصیر الدین صاحب سے بیعت ہوئے تھے۔ پھر تکمیل سے پہلے ہی ان کا وصال ہو گیا تھا۔ تو حضرت کو دوسرے شیخ کی تلاش تھی اور اس تلاش میں بے چین تھے اور شاہ سلیمان صاحب

سے بیعت ہونے کا کبھی کبھی ارادہ ہوتا تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ مشہور تھے
 اسی عرصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یا اپنے مشائخ میں سے کسی کو (اللہ صنی)
 آپ نے خواب میں دیکھا کہ حضور کے ساتھ ایک بزرگ ہیں۔ اور حضور نے
 حاجی صاحب کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ یہ تمہارے شیخ ہیں۔ حاجی
 صاحب خواب سے بیدار ہوئے تو بڑے پریشان تھے کہ یا اللہ یہ کون بزرگ
 ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ کیونکہ خواب میں پتہ کچھ نہیں بتلایا گیا۔

آخر ایک دن کسی شخص سے میاں نجی صاحب کا تذکرہ سنا تو قلب کے
 اندر میاں نجی صاحب کی طرف ایک خاص کشش پائی۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ تو یہاں
 سے قریب لوہاری ہی ہیں رہتے ہیں۔ تو حضرت نے زیارت کا ارادہ کیا۔ اب
 حالت یہ تھی کہ جوں جوں لوہاری کی طرف بڑھتے جاتے اسی قدر دل میں کشش
 بڑھتی جاتی جیسے کوئی کھینچ رہا ہو۔ جب لوہاری پہنچے اور میاں نجی صاحب کی
 صورت دیکھی تو بعینہ وہی صورت تھی جو خواب میں دکھائی گئی تھی۔ اب تو
 حاجی صاحب کی اور ہی حالت ہوئی۔ قریب جا کر سلام عرض کیا تو میاں نجی صاحب
 نے در یافت فرمایا کہ صاحبزادے کیسے آنا ہو گیا۔ بس حاجی صاحب پر گریہ
 طاری ہو گیا اور جوش میں غرض کیا کہ کیا حضرت کو معلوم نہیں ہے رز معلوم اس
 وقت حاجی صاحب پر کیا حالت تھی، اس کے جواب میں میاں نجی صاحب نے
 ارشاد فرمایا کہ صاحبزادے خواب و خیال کا کیا اعتبار۔ اس میں خواب کی طرف
 اشارہ تھا۔ اب تو حاجی صاحب کو اور بھی یقین ہو گیا اور زیادہ گریہ طاری ہو گیا
 اب میاں نجی صاحب نے تسلی فرمائی کہ آپ گھبرائیں نہیں۔ جو تم چاہتے ہو، وہی

ہو جائے گا۔ چنانچہ فوراً بیعت فرمالیا۔

حضرت حاجی صاحب پوری اثر غالب تھا کہ طالب کو پریشان نہیں کرتے تھے مگر دونوں صاحبوں کی نیت بخیر تھی۔ حاجی صاحب کی نظر وسعت رحمت پر تھی۔ اس لئے فیض کو عام کر رکھا تھا اور حافظ صاحب کی نظر اس پر تھی کہ سلسلہ کی بے قدری نہ کرنا چاہئے بلکہ اچھی طرح طلب کا امتحان کرنے کے بعد بیعت کرنا چاہئے۔

الغرض صورت بیعت کی تو ضرورت نہیں مگر کسی کو رہبر بنانا لینے اور اس کے اتباع کرنے کی اس طریق میں بہت ضرورت ہے۔ اپنی رائے پر عمل کرنے اس طریق میں سخت مضر ہے کیونکہ دای العلیل علیل مولانا فرماتے ہیں۔

یار باید راہ را تنہا مرو

بے فلاؤرا اندر میں صحرا مرو

ہر کہ تنہا تا در این رہ را برید

یہ اپنی رائے ہی سے علاج کرنے کا نتیجہ ہے کہ بعض جاہل تقاضائے معصیت

ضرورت رہبر و دستگیر

کے مقتضایہ پر عمل کر کے اس کا علاج کرنا چاہئے ہیں۔

ایک سالک میرے ساتھ سفر میں بڑوت کے رستہ میں تھے۔ وہ ایک مریض میں مبتلا تھے کہ نظر بد کو مفید سمجھتے تھے تاکہ تقاضا فرود ہو جائے۔ پھر میں ان کو اس غلطی پر متنبہ کیا کہ اس طرح تو مرض دن بدن بڑھتا جائے گا۔ ہرگز سکوا نہ ہوگا۔

صاحبو! یہ الٹا علاج معصیت تو ہے ہی مگر اس میں کفر کا بھی اندیشہ ہے۔

کیونکہ یہ شخص معصیت کو مضر نہیں سمجھتا بلکہ مفید سمجھتا ہے اور اس کو طاعت کا مقدمہ بناتا ہے اور مقدمہ طاعت، طاعت ہے۔ تو اس نے گویا گناہ کو طاعت سمجھا اور یہ قریب کفر ہے۔ اسی لئے ایک بزرگ نے عوام کو خطاب کیا کہ فرمایا تھا کہ اگر تم غلطی کرتے ہو تو طاعات سے معاصی میں آئے ہو۔ اور ہم غلطی کرتے ہیں تو ایمان سے نکل کر کفر میں جاتے ہیں۔ اور جو اس کی یہ ہے کہ یہ طریق نہایت لطیف ہے اور غذا جتنی لطیف ہوتی ہے اتنی ہی جلدی سڑتی ہے اور سڑنے کے بعد اس میں کثیف غذا سے زیادہ نقص ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس طریق میں کسی کو رہبر اور دست گیر بنایا جائے ورنہ کفر تک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اور جس کو رہبر بنایا جائے اس کے اتباع کی ضرورت ہے۔ صرف بیعت کافی نہیں۔

مگر اب تو اس لئے بیعت ہوتے ہیں کہ آٹے دن مقدمات و امراض وغیرہ میں تعویذ و ان کی ضرورت ہوتی ہے اور تعویذ گندے والے ہر دفعہ میں طلب کرتے ہیں۔ تو انہوں نے ایک کو پیر بنا لیا تاکہ عمر بھر کے لئے مفت تعویذ لکھوانے کا ٹھکانا ہو جائے یا یہ نیت کرتے ہیں کہ مقدمات میں دعا کرنے کو اور اللہ میاں سے لڑنے بھڑنے کو ایک شخص کو پیر بنا لو۔ واقعی آج کل بہت لوگوں کا یہی خیال ہے کہ یہ مشائخ اللہ میاں کے رشتہ دار ہیں کہ بس جس بات کے لئے دعا کریں گے وہ ضرور ہو جائے گی اللہ تعالیٰ ان کے خلاف کر ہی نہیں سکتے۔ نعوذ باللہ!

شفاعت انبیاء اور پیر

بعض کا یہ خیال ہے کہ پیر آخرت میں ہمارے گناہ اپنے سر لاد لے گا۔ اور ہمیں بخشوا لے گا۔

پھر جو چاہو کرو۔ تو پھر پیر کیا ہوا بھنگی ہوا کہ تمہارا پاخانہ اٹھا لے گا۔ استغفر اللہ! اسے میاں! قیامت کے دن انبیاء کا تو پتہ پانی ہو جائے گا پیر بے چارہ کی تو کیا ہستی ہے۔ کیا تم کو شفاعت کی حدیث یاد نہیں کہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس اول جائیں گے کہ حق تعالیٰ سے اپنی اولاد کے لئے سفارش کرو دیجئے۔ وہ کہیں گے نفسی نفسی۔ مجھے اپنی ہی فکر ہے۔ مجھ سے ایک قصور ہو گیا تھا۔ اگر آج سوال ہو گیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ اس کے بعد پھر نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ تو سب نفسی نفسی کہیں گے۔ اور کچھ نہ کچھ عذر کریں گے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شفاعت کے لئے آنا وہ ہو جانا اور کوئی عذر نہ کرنا اس وجہ سے نہ ہو گا کہ آپ خدایا تعالیٰ سے ڈرتے نہیں ہیں واستغفر اللہ! آپ تو سب سے زیادہ خائف ہیں انا علمکم باللہ وانحشا کمر اللہ مگر آپ کو اشارہ اور اذن ہو جائے گا اس لئے آپ عذر نہ کریں گے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کے یہاں بدون اذن کے کوئی شفاعت نہیں کر سکتا۔ نفس موجود ہے۔ من والذی یشفع عندہ الا باذنہ۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ آپ اذن کے بعد شفاعت فرمائیں گے اور اذن کے بعد جو شفاعت ہوگی اس کی تو یہ حالت ہوگی۔

ہم دعاؤں تو اجابت ہم ز تو ایمنی از تو مہابت ہم ز تو

ناپو چنگیم و تو زخمہ مے زنی زاری ازمانے تو زاری مسکینی
 جب وہ خود کہہ دیں گے کہ تم شفاعت کرو ہم قبول کریں گے۔ تو پھر
 یوں کہنا چاہئے کہ وہ خود ہی بخشنا چاہتے ہیں۔ بخشوانے کا نام ہی نام ہوگا۔ باقی
 اگر وہ بخشنا نہ چاہیں تو انبیاء بھی کسی کو نہیں بخشوا سکتے۔ پھر بے چارہ پیر تو کس شمار
 میں ہے۔

پس یہ خیالات تو محض لغو ہیں اور اس نیت سے بیعت ہونا کچھ مفید
 نہیں بلکہ اس طریق میں شیخ کے وجود کی مصلحت یہ ہے کہ وہ غلطیوں پر تذبذب نہ کرے
 مقدمات میں دعا کرنے اور تعویذوں کے واسطے نہیں ہے۔ نہ وہ قیامت میں
 بخشوانے کا ذمہ دار ہے۔ ان خیالات کو قلب سے نکال دینا چاہئے۔ اور شیخ
 کو بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ نہ معلوم آخرت میں پیر مرید کو بچائے یا مرید پیر کو بچائے
 شیخ اپنے کو مریدوں سے بڑا نہ سمجھے۔ کیا معلوم خدا تعالیٰ کے یہاں کون بڑا ہے
 اس لئے شیخ کو بھی چاہئے کہ اپنے چھوٹوں سے مشورہ کرتا رہے اور معاملات
 میں ان سے رائے لیا کرے اور عام مسلمانوں سے دعا بھی کرائے۔

عرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم حرص کا صحیح علاج بتانے
حرص کا صحیح علاج ہیں۔ جس کے ساتھ ساتھ تمہارے علاج کی غلطی بھی

معلوم ہو گئی کہ زیادہ مال جمع کرنا حرص کو کم نہ کرے گا۔ اس سے تو مال کی حرص
 اور زیادہ ہوگی کم نہ ہوگی۔ دوسرے زیادہ مال ہونے سے پھر اس کی حفاظت
 کی حرص ہوگی۔ اور اس سے مال کے ساتھ تعلق بڑھے گا۔ ہر وقت اسی دھن
 میں رہو گے کہ اس روپیہ کو کہاں رکھوں کس طرح بڑھاؤں۔ پس زیادتی مال

سے تو پریشانی دن بدن بڑھے گی کم نہ ہوگی۔ مولانا فرماتے ہیں۔
 جان ہمہ روز از لکد کوب خیال پیشو و مجروح و خستہ و پائمال
 نے صفا میبانش نے لطف و فر نے بسوئے آسمان راہ سفر
 اور یہ تعلقات بندی کو تو بہت ہی مضر ہیں۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ذاب محمود صاحب ریش چھانڈی
 کو لکھا تھا کہ آپ مکہ میں بہ نیت ہجرت آنا چاہتے ہیں تو یہاں رہ کر اپنے لئے
 صرف اتنی رقم منگائے کہ انتظام کیجئے جو آپ کے خرچ کے لئے کافی ہو
 تقسیم کے واسطے نہ کوئی رقم ساتھ لانا نہ وہاں سے منگائے کہ انتظام کرنا۔
 حالانکہ یہ صدقہ تھا جو موجب ثواب ہے مگر بندی کو یہ بھی مضر ہے کہ اس
 جھگڑے میں پڑے کہ صدقہ کس کو پہنچا اور کون رہا اور رقم اب تک کیوں نہیں
 آئی۔ کہاں دیر ہوئی اور اپنے آپ کو دینے والا اور دوسروں کو اپنا محتاج
 سمجھے۔

ہاں حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے اقویار کو یہ تعلقات مضر نہیں ان
 کی نسبتیں راستہ تھیں۔ اس لئے ان تعلقات سے ان کی توجہ الی اللہ کم نہیں ہوتی
 تھی۔

حضرت خواجہ عبداللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بڑا ساز و سامان تھا۔
 سلطنت جیسے ٹھاٹھ تھے مگر مال سے بے تعلق کی یہ حالت تھی کہ ایک فقیر
 نے آپ کا امتحان لینا چاہا کہ دیکھوں ان کو مال سے کتنا تعلق ہے۔ اس نے
 ایک دن خواجہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت میرا جی چاہتا ہے کہ اس سال

آپ کے ساتھ حج کروں۔ اُس نے دل میں سوچا ہو گا کہ خواجہ صاحب انتظام ریاست کا عذر کیسے کچھ طویل میرا و مقررہ کریں گے۔ مگر وہاں کیا دیر تھی۔ خواجہ صاحب فوراً رونال جھاڑ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا بہت اچھا چلو۔ فقیر نے کہا، حضرت ریاست کا تو کچھ انتظام فرما دیجئے۔ فرمایا یہ تو خدا کا مال ہے، وہ خود اس کی حفاظت کر لیں گے میں تو ایک برائے نام محافظ ہوں۔ اگر میں نہ ہوں گا، تو وہ کسی دوسرے کو میری جگہ مقرر کر دیں گے۔ مجھے انتظام کی ضرورت نہیں اُس نے کہا، اچھا میں ذرا کمبل اور کپڑے گھر سے لے آؤں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا میں اسی پر اپنے کو دنیا سے بے تعلق سمجھتے ہو۔ مجھے تو اتنی بڑی ریاست کی بھی فکر نہ ہوتی اور تمہارا دل ابھی تک کمبل اور کپڑوں ہی میں اٹکا ہوا ہے۔ درویش اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ باوجود بیکہ سلطنت کرتے تھے مگر اس سے ایسے بے تعلق تھے کہ اپنے بعد کے لئے کسی کو خلیفہ بھی نامزد نہیں کیا۔ نہ اس کا مرنے ہوئے کچھ تذکرہ کیا۔ نہ یہ فکر ہوتی کہ میرے بعد سلطنت کا کیا حال ہوگا۔ صرف دو وصیتیں فرمائی تھیں۔

ایک یہ کہ خلافت چھ آدمیوں کے مشورہ پر ہے۔ یہ جس کو چاہیں، خلیفہ منتخب کر لیں۔

دوسرے یہ کہ عبداللہ بن عمر کا خلافت میں تو کوئی حق نہیں مگر خلیفہ کو اُن سے مشورہ کرتے رہنا چاہئے۔ لاشہ رجل صالح کیونکہ وہ نیک آدمی ہیں۔
تو جو شخص ان تعلقات میں مبتلا ہو کر اُن سے ایسا بے تعلق ہو اس کو تو

ضرر نہیں ہوتا۔ ورنہ عام طور پر تعلقات مضر ہیں۔ ان سے قلب میں ظلمت پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت تو یہ بات تقلیداً مان لی جائے۔ پھر جب آپ کو تعلق مع اللہ کے نور کا احساس ہوگا اس وقت ان تعلقات کی ظلمت کا بھی احساس ہو جائے گا۔ غرض حصر کا یہ علاج تو غلط ہے اور اس سے ہرگز ہوس نہیں بھرتی۔

اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ہم نے ایک دفعہ سو سو گناہ کے بعد جی بھر کر کے گناہ کر لیا تھا۔ پھر توبہ کر لی تھی تو پھر اس کے بعد واقعی ہم کو اس گناہ کی ہوس نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک دفعہ جی بھر کر گناہ کر لینے سے ہوس بھر جاتی ہے۔ تو وہ علاج غلط نہ ہوا۔

سوالین اس کا جواب کان کھول کر سن لیں کہ یہ نفع جی بھر کر گناہ کرنے کا نہیں بلکہ دلاں دوپہیزیں تھیں ایک جی بھر کر گناہ کرنا۔ دوسرے یہ ارادہ کرنا کہ پھر نہ کروں گا۔ تو یہ برکت اس عزم نزدیک کی ہے جس کو تم جی بھر کر گناہ کرنے کا اثر سمجھتے ہو۔ اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک دوا گلے سے نیچے نہ اترتی تھی۔ مریض نے پانی کے ساتھ اس کو نگل لیا تو گلے سے اتر گئی اور اس سے نفع ہوا۔ اب وہ بے وقوف یہ سمجھنے لگا کہ یہ نفع پانی سے ہوا ہے اور اسے مفید سمجھ کر خوب پینے لگا۔ تو ظاہر ہے ایک دن مرے گا اور اس بو وقوف سے ہر عاقل بھی کہے گا کہ میاں نفع تو دوا سے ہوا تھا۔ پانی کو اس میں کچھ دخل نہ تھا اس نے محض گلے سے اتارا تھا اور اگر تم ہمت کر کے ویسے ہی نگل جاتے جب بھی نفع ہو جاتا۔ تمہارا پانی کو مفید سمجھنا حماقت ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھنا

کہ یہ نفع محض عزم ترک کا ہے۔ گناہ کرنے کو اس میں کچھ دخل نہیں۔

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ کچھ ہی سہی مگر نفع تو ہوا اور جی بھر کے گناہ کرنے سے تقاضا تو رفع ہوا۔ چاہے عزم ترک کے ہی اقتراں سے سہی۔

تو میں تقسیم کہتا ہوں کہ اقتراں کو نفع میں کچھ دخل نہیں بلکہ محض عزم ترک ہی کو دخل ہے بلکہ اس عزم کے ساتھ گناہ کے منضم ہو جانے سے نفع دیر میں ہوا اگر گناہ منضم نہ ہوتا تو نفع جلدی ہوتا۔ بلکہ انضمام گناہ کے ساتھ عزم ترک سے کچھ

نفع ہو جانا ثنا و نادر ہے ورنہ زیادہ تریہ ہے کہ از نکاب گناہ سے پہلے تو عزم ترک بعض میں ہوتا ہے مگر گناہ کر لینے کے بعد باقی نہیں رہتا۔ گناہ سے

اکثر یہ عزم ضعیف و معدوم ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ثنا و پر کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ اگر کسی کو اتفاقاً زہر نقصان نہ دے تو اس سے زہر کو نافع نہیں کہہ

سکتے۔ خوب سمجھ لو

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازالہ حرس کا صحیح علاج بتاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے ویتوب اللہ علی من تاب اس میں توبہ کو علاج حرس بتلایا گیا ہے جس کے معنی ہیں توجہ الی اللہ۔ اور اس کا حرس کے لئے علاج ہونا ایک قاعدہ فلسفہ سے سمجھ میں آجائے گا۔ قاعدہ یہ ہے۔

المنفس لا تتوجه الی شئیین کہ نفس ایک وقت میں دو

فی آن واحد چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا

اور ظاہر ہے کہ حرس کی حقیقت توجہ اور میلان الی الدنیا ہے۔ اب اس توجہ کو کسی دوسری شے کی طرف پھیر دیا جائے تو توجہ الی الدنیا باقی نہ رہے گی

پھر جس چیز کی طرف توجہ کو پھیرا جائے اگر وہ طبعاً بھی محبوب ہو تو اس کی طرف توجہ اشد ہوگی اور اس سے توجہ الی الدنیا کا ازالہ بھی قوی ہوگا اور اگر ایسی شے کی طرف توجہ کی جائے جو طبعاً محبوب نہ ہو تو اس صورت میں یہ توجہ کمزور ہوگی

اب سمجھو کہ حق تعالیٰ سے ہر شخص کو فطری تعلق ہے اور ذات **تعلق باللہ** حق کی طرف ہر اک کو میلان طبعی ہے۔ فقط مسلمان ہی کو نہیں

بلکہ کافر کو بھی۔ کیونکہ انسان کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے تو کسی سبب سے ہوتی ہے اور وہ اسباب یہ ہیں۔ حسن و جمال یا جو دو نوال یا فضل و کمال۔ اور جس میں یہ اسباب قوی ہوں گے۔ اس سے محبت بھی قوی ہوگی۔ اور یہ معلوم ہے کہ یہ اوصاف بالذات حق تعالیٰ ہی میں ہیں۔ دوسری اشیاء میں بالعرض ہیں۔ پس یوں کہنا چاہئے کہ محبت اور میلان حقیقت میں خدا تعالیٰ ہی کی طرف ہوتا ہے اور دوسری اشیاء کی طرف میلان محض اس وجہ سے ہے کہ ان میں صفات حق کا ظہور ہو رہا ہے۔ لیکن ان چیزوں پر نظر کا منحصر ہو جانا اس لئے ہے کہ لوگوں کو یہ خبر نہیں ہے کہ یہ اوصاف حقیقت میں حق تعالیٰ کے اندر ہیں۔ جس وقت یہ معلوم ہوگا کہ حضرت حق ہی محسن و منعم ہیں اور وہی حسین و جمیل اور صاحب فضل و کمال ہیں اور مخلوقات میں محض ان کا ظل ہے اس وقت ہر شخص حق تعالیٰ ہی کی طرف مائل و متوجہ ہوگا۔

پس حضورؐ کے علاج کا حاصل یہ ہوا کہ اپنی توجہ کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیا اور چونکہ حق تعالیٰ سے طبعی تعلق ہے اس لئے یہ توجہ اشد و اکمل ہوگی تو جتنی توجہ الی اللہ کی طرف ہوگی اتنی ہی دنیا سے توجہ ہٹے گی۔ کیونکہ دو چیزیں

کی طرف منتوجہ نہیں ہو سکتا۔

مگر اس علاج میں ایک غلطی ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ جب بندہ حق تعالیٰ کی طرف منتوجہ ہوتا ہے تو عجب و ناز میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے کو صاحب کمال سمجھنے لگتا ہے کہ میں حق تعالیٰ کی طرف منتوجہ ہو کر کامل ہو گیا ہوں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح حدیث کے عنوان ہی سے کر دی ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے یہاں پر توجہ الی اللہ نہیں فرمایا۔ یتوب اللہ علی من تاب فرمایا ہے جس میں من تاب میں توجہ میں توجہ کا علاج مذکور ہے کہ توجہ الی اللہ اس کا علاج ہے۔ اور یتوب اللہ بڑھا کہ یہ بتلا دیا کہ محض تمہاری توجہ سے یہ مرض زائل نہ ہوگا بلکہ علت تامہ کا جزو اخیر ایک اور چیز ہے۔ وہ یہ کہ تمہاری توجہ کے بعد حق تعالیٰ بھی تم پر توجہ فرمائیں گے۔ تب یہ مرض زائل ہوگا اور جب خدا تعالیٰ کی توجہ علت تامہ کا جزو اخیر ہے تو اصل علاج خدا کی توجہ ہے محض تمہاری توجہ کافی نہیں۔ اس میں عجب و ناز کا علاج ہو گیا کہ اپنی توجہ اور طاعات پر ناز نہ کرنا کیونکہ اس سے کچھ نہیں ہوا بلکہ کام تو خدا کی عنایت سے بنا ہے اب اس مختصر حدیث میں چار مضمون بیان ہو گئے۔

ایک یہ کہ حرص مرض ہے۔

دوسرے یہ کہ اس کے مقتضا پر عمل کرنے اور اس میں زیادتی کرنے سے

تقاضا فرو نہ ہوگا بلکہ و ناز بڑھے گا۔

تیسرے یہ کہ اس کا علاج توجہ الی اللہ ہے۔

چوتھے یہ کہ اصل علاج خدا کی توجہ ہے جو عادت بندہ کی توجہ پر مرتب

و متفرع ہو جاتی ہے۔

توجہ الی اللہ | جب حرم کا صحیح علاج معلوم ہو گیا تو اب سمجھئے کہ توجہ الی اللہ کیا چیز ہے۔ بس اسی پر میں بیان ختم کر دوں گا۔ بعض نے تو

یہ سمجھا ہے کہ توجہ الی اللہ یہ ہے کہ نماز پڑھے، روزہ رکھے اور احکام شرعیہ بجالائے۔ ان لوگوں نے ظاہری اعمال پر اکتفا کیا۔ یہ لوگ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہونے کو ضروری نہیں سمجھتے۔ مگر پھر وہ سوچتے ہیں کہ باوجودیکہ ہم سب کچھ کر رہے ہیں لیکن اس میں برکت اور نورانیت کیوں نہیں پیدا ہوتی تقاضائے معصیت مضمحل کیوں نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ بہت سے نمازیوں کو گناہ میں مبتلا پائیں گے۔

بعض نے یہ کہا کہ توجہ الی اللہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہو۔ یہ لوگ ذکر و شغل اور مراقبات ہی کو لے بیٹھے۔ انہوں نے نماز روزہ اور تلاوت قرآن اور نظر بد کا بچانا وغیرہ سب چھوڑ دیا۔ مگر ان کو بھی برکت اور نورانیت حاصل نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ لوگ بھی معاصی میں مبتلا ہو جاتے اور دل میں گناہوں کا تقاضا شہید پاتے ہیں۔

تو سنو! کہ توجہ الی اللہ کی حقیقت تو یہی ہے کہ خدا کی طرف دل سے متوجہ ہو مگر ہر حقیقت کی ایک صورت بھی ہوتی ہے اور توجہ الی اللہ کی صورت وہی ہے جو شریعت نے بتلائی ہے۔ پس دونوں کو جمع کرنا چاہئے کہ دل سے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہو اور ظاہر سے اعمال شرعیہ کے پابند رہو۔ طاعات کو بجالاؤ اور معاصی سے بچنے کا اہتمام کرو۔ نگاہ کو روکو اور ناجحرموں کی باتیں

بھی نہ سنو۔ اس کے بعد بھی اگر نورا نیت حاصل نہ ہو تو ہم پر ہفتناہ اس وقت میں وہی کہتا ہوں جو ایک صاحب طریق نے کہا ہے۔

چشم بند و لب پر بند و گوش بند
گر نہ بینی نور حق بر ما بخت۔

اس وقت غلطی یہ ہو رہی ہے کہ بعض تو اعمال ظاہرہ کے تارک ہیں اور

بعض اعمال باطنہ کے تارک ہیں۔ اس لئے توجہ الی اللہ کامل طور سے حاصل نہیں ہوتی
دونوں کو جمع کرنا چاہئے۔ پھر انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔ اب میں دونوں کی قدر سے
تفصیل بتلاتا ہوں۔

اعمال ظاہرہ | اعمال ظاہرہ میں سب سے اہم نماز ہے۔ اس میں خصوصاً عورتیں بہت کوتاہی کرتی ہیں۔ بعض تو پڑھتی ہی نہیں ہیں اور

ایسی ہی زیادہ ہیں۔ اور بعض پڑھتی ہیں مگر ان کا قرآن صحیح نہیں ہے اور نہ تصحیح کا
اہتمام ہے۔ اور بعض کا قرآن بھی صحیح ہے لیکن وہ وقت کو بہت تنگ کر
دیتی ہیں۔ ظہر کی نماز عصر کے وقت اور عصر کی مغرب کے وقت پڑھتی ہیں (حالانکہ
مردوں کے لئے تو بعض اوقات میں تاخیر مسنون بھی ہے مگر عورتوں کے لئے

تو سب نمازیں اول وقت پڑھنا افضل ہے مگر یہ اول تو اول اخیر میں بھی نہیں
پڑھتیں بلکہ اکثر قضا پڑھتی ہیں) بعض ان نمازوں کو قضا نہیں کرتیں جو ہر مہینے میں
ان سے غسل کی تاخیر کے سبب فوت ہو جاتی ہیں۔ اگر احتیاط کریں اور مسئلہ کو

اچھی طرح معلوم کر لیں تو اول تو ایسی نوبت ہی نہ آئے اور جو غلطی سے ایسا
ہو جائے تو جلدی قضا کرنا چاہئے۔ عرض اعمال ظاہرہ میں نماز سب سے زیادہ
اہم ہے اس کی اچھی طرح پابندی کرنا چاہئے اور دل لگا کر نماز پڑھا کریں۔

جلدی جلدی سر سے بیگار نہ اتاریں۔

باقی روزہ میں تو عورتیں بڑی بہادر ہیں۔ چاہے بیماری ہو یا تکلیف ہو اور حکیم بھی افطار کی اجازت دے دے مگر یہ روزہ قضا نہیں کرتیں لیکن اس کے ساتھ روزہ میں غیبت بھی بہت کرتی ہیں۔ کیونکہ صبح سے شام تک کچھ کام تو ہوتا نہیں بس بیٹھی ہوئی ادھر ادھر کی باتیں بناتی رہتی ہیں۔ اس لئے ان میں وہ عورتیں بہت اچھی ہیں جن کو تمباکو کی عادت کی وجہ سے روزہ بہت لگتا ہے۔ اگرچہ تمباکو بڑا ہے۔ کیونکہ وہ روزہ کو الگ کر ایک طرف کونامیں سر ڈالے پڑی رہتی ہیں۔ ان سے بغیر بان کھائے بات تک نہیں ہو سکتی تو وہ ان قصوں سے یعنی غیبت شکایت سے محفوظ رہتی ہیں۔ مگر اب جاڑوں کے روزے آ رہے ہیں۔ اس لئے جن کو روزہ بہت لگتا ہے اب ان کو بھی کم لگے گا۔ بہر حال روزہ رکھنے کی توجیب دینے کی ان کو ضرورت نہیں۔ اس کو تو عورتیں خود بہت شوق سے کر لیتی ہیں البتہ روزہ کے حقوق ادا کرنے کی ہیں انکو تاکید کرتا ہوں کہ فضول اور گناہ کی باتوں میں روزہ کو برباد نہ کیا کریں بلکہ قرآن پڑھا کریں۔ بزرگوں کی حکایات دیکھا سنا کریں اور یہ بھی نہ ہو تو ایک طرف پڑ کر سورا کریں۔

ایک بات عورتوں کے متعلق یہ کہنے کی ہے کہ یہ پردہ میں احتیاط کم کرتی ہیں جن عزیزوں سے شرعاً پردہ ہے ان کے سامنے آتی ہیں۔ نیز کافر عورتوں سے جیسے بھنگن اور چاری وغیرہ سے بدن چھپانے کا اہتمام نہیں کرتیں حالانکہ شرعاً ان سے بھی پردہ ہے گو ایسا گہرا پردہ نہیں۔ جتنا مردوں سے ہوتا ہے۔ بلکہ کافر عورتوں کے سامنے صرف منہ اور ہاتھ گٹنوں تک اور پیر کھولنے کی اجازت ہے۔

باقی سر اور سر کے بال اور بازو اور کلائی اور پنڈلی وغیرہ کھولنا جائز نہیں اس کا بہت خیال کرنا چاہئے۔

ایک کوتنا ہی عورتیں رسوم کے بارہ میں کرتی ہیں۔ شادی وغیرہ کی رسوم میں بہت بے احتیاطی کی جاتی ہے۔ بے پردگی کی بھی اور فضول مال ضائع کرنے کی بھی اور تفاخر و نام و نمود چاہنے کی بھی۔ یہ وہ گناہ ہیں جن میں آج کل عورتیں بہت مبتلا ہیں۔ ان سے اچھی طرح احتیاط لازم ہے۔ باقی جن گناہوں میں آج کل مرد مبتلا ہیں ان سے عورتیں اکثر محفوظ ہیں۔ ان کی نگاہ بہت کم بہکی ہوتی ہے بلکہ اس بارہ میں ان کی وہی شان ہے۔ قاصدات الطرف کہ نگاہ کو اپنے شوہر تک منحصر رکھتی ہیں، جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے۔

اب بعض مستحبات کا بیان کرتا ہوں جن کی برکات بہت ہیں اور جن سے توہر الی اللہ کو قوت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ

مستحبات

نماز روزہ کے ساتھ کچھ ذکر اللہ بھی کرنا چاہئے۔ اس سے دل کو خدا تعالیٰ کے ساتھ لگاؤ ہوتا ہے اور نماز میں دل لگتا ہے۔ مگر عورتوں میں ذکر اللہ کا رواج بہت ہی کم ہے۔ اسی لئے ان میں کوئی شیخ نہیں ہے۔ اہل شیخزادیاں بہت ہیں مگر شیخ بمعنی پیر کوئی نہیں ہے۔ گو عورتوں نے کسی کسی عورت کو پیرنی کا لقب تو دے دیا ہے اگرچہ وہ شیطان کی بنائی کیوں نہ ہو۔ سو ایسی پیرنیوں کی ضرورت نہیں بلکہ ایسی عورتوں کا تو وجود ہی مفروض ہے۔ عرض یہ ہے کہ ضرورت شیخ کی ہے جو خدا کا راستہ بتلائیں۔ عورتیں اپنے مردوں کے ذریعہ سے کسی شیخ کامل سے ذکر کا طریقہ پوچھ کر آپس میں اس کا رواج دیں کیونکہ ان کی طبیعتوں کو ذکر اللہ سے بہت مناسبت

ہے اس لئے کہ ذکر اللہ کا اثر ان پر زیادہ ہوتا ہے جن کے قلوب میں سکون اور
یکسوئی کی حالت ہو اور عورتوں کو یہ بات خاص مددگار ہے۔ ان کے
قلوب میں تشدد و تفرق نہیں ہے اور یہ پردہ کی برکت ہے کہ عورتیں گھر کی چار
دیواریں میں مقید رہتی ہیں اس لئے ان کے قلوب میں یکسوئی بہت ہے مگر آج کل
کے حکمکنین اس کے دشمن ہو رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح
آزاد پھرا کریں اور وہی علوم پڑھیں جو مرد پڑھتے ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر عورتوں میں
یہ جمعیت و سکون نہ رہے گا۔ جو پردہ میں بیٹھ کر علوم دنیا سے بے خبر ہو کر اس
وقت حاصل ہے۔

ایک دفعہ کانپور میں میرا بیان ہوا تو میں نے کہا کہ بعض لوگ آج کل عورتوں
کو جغرافیہ پڑھاتے ہیں۔ میری سمجھ میں اس کی حکمت نہیں آئی۔ مردوں کو تو اس
کی اس لئے ضرورت ہو سکتی ہے کہ وہ ضروریات معاش کے لئے اصرار و سفر
کرتے ہیں تو مختصر شہروں کے حالات جاننے سے ان کو آسانی ہوگی۔ مگر عورتوں
کو جغرافیہ پڑھانے میں سوا اس کے کہ ان کو گھر سے بھاگنے کا رستہ بتانا ہے اور
کیا فائدہ ہے کیونکہ اب تک عورتیں گھر میں مقید ہیں۔ ان کو کچھ خبر نہیں کہ اپنے
شہر میں کتنی گلیاں اور کتنی سڑکیں ہیں اور اسٹیشن کس طرف ہے اور یہاں سے اگر
وہلی جانا چاہیں تو کس طرف کو جائیں۔ مگر جغرافیہ پڑھ کر یہ سب باتیں ان کو معلوم
ہو جائیں گی۔ تو اب وہ نہایت سہولت سے بھاگ سکتی ہیں۔
یہ مضمون میں نے ویسے ہی بطور عموم کے بیان کیا تھا۔ کسی خاص شخص کی
طرف اشارہ نہ تھا مگر اتفاق سے اس مجلس میں ایک صاحب ایسے موجود تھے

جو اس مرض میں مبتلا تھے بعد بیان کے وہ مجھ سے ملے اور کہنے لگے کہ جعفرانہ کے اس مفسدہ پر میری نظر نہیں گئی تھی میں نے یہ سمجھا تھا کہ یہ بھی ایک علم ہے اس کے پڑھانے میں بھی کچھ حرج نہیں اس لئے میں نے اپنی بیوی کو جعفرانہ پر شروع کرادیا تھا۔ لیکن اب مجھے آپ کے کہنے سے اس کے مفسدہ کا علم ہو گیا۔ انشاء اللہ اب نہ پڑھاؤں گا۔

واقعی عورتوں کو علوم جدیدہ کی تعلیم دینا ان کو تباہ و برباد کرنا ہے۔ میں ان کو تو قرآن شریف اور بقدر ضرورت مسائل وینیہ کی تعلیم دینا چاہتا ہوں۔ لکھنا بھی نہ سکھائیں تو اچھا ہے کیونکہ عورتوں کے لکھنے سے بعض جگہ قصے ہو گئے ہیں اور اگر لکھنا سکھایا جائے تو ان کی بہت نگہداشت رکھی جائے کہ وہ از خود کسی کو خط نہ بھیج سکیں بلکہ جہاں خط لکھیں پہلے گھر کے مردوں کو دکھلا لیا کریں اور پتہ وہ خود لکھیں بلکہ مرد اپنے قلم سے لکھے۔

مجھ سے ایک شخص امین جنڈیل سے ملے وہ اس نکتہ کو سمجھ گئے تھے۔ چنانچہ کہتے تھے کہ میں لڑکوں کو تو سب علوم پڑھاتا ہوں قدیم بھی اور جدید بھی مگر لڑکیوں کو قرآن و حدیث و فقہ کے سوا کچھ نہیں پڑھاتا۔ کیونکہ ان کے اندر جو صفات حمیدہ ہیں وہ انہی علوم سے محفوظ رہتی ہیں۔ علوم جدیدہ سے ان کی حالت بگڑ جاتی ہے عورتوں کے اندر یہ صفت یکسوئی اور سکون و جمعیت کی بہت ہی اچھی ہے جو محض پردہ کی برکت سے ہے۔ اس حالت میں اگر یہ ذکر اللہ کرنے لگیں تو بہت نفع ہو۔ اس لئے ان کو اس کا اہتمام کرنا چاہئے اور دل لگا کر ذکر اللہ کرنا چاہئے اور کچھ وقت تلاوت قرآن کے لئے بھی نکالیں۔ عورتیں قرآن کم پڑھتی ہیں حالانکہ

اس سے دل بہت صاف ہوتا ہے اور نیک کاموں کی طرف رغبت و شوق بڑھتا ہے۔ اس کا بھی اہتمام چاہئے۔ اور اس کے بعد ٹھوڑا سا وقت موت کی یاد کے لئے مقرر کریں جس میں اپنا ایک دن مرنا اور قبر میں دفن ہونا اور دنیا سے رخصت ہونا ذہن میں مستحضر کریں اور دنیا کے کاموں میں بھی موت کا دھیان کر لیا کر لیں پھر یہ حالت ہوگی کہ آدمی چلتا ہوا کام رکھے گا۔ زیادہ بکھیرا نہ رہے گا۔ یہ ہے کامل علاج حرم کا۔ اس کو کر کے دیکھیں۔ انشاء اللہ چند ہی روز میں حرم کم ہو جائیگی۔

حج اور تجارت

اب ایک یہاں طالب علمی شہید ہے اس کا جواب دے کر یہیں ختم کیئے دیتا ہوں۔ شہید ہے کہ اس حدیث سے

تو زیادت مال کے حرم کی مذمت معلوم ہوتی ہے اور نص قرآنی سے اجازت معلوم ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم۔ یہ آیت احکام حج کے متعلق ہے۔ جاہلیت میں لوگ حج کو ایک میلہ سمجھتے تھے۔ اس لئے حج کے زمانہ میں باہر کے لوگ تجارت کی نیت سے مکہ آیا کرتے تھے۔ جب اسلام آیا اور مسلمانوں کو خلوص کی تعلیم دی گئی تو صحابہ کو شبہ ہوا کہ شاید سفر حج میں مال تجارت کا ساتھ لے جانا خلاف خلوص ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اس میں کچھ گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا رزق جو تفسیر ہے فضل کی طلب کرو۔ جس میں تجارت کی بحالت حج اجازت دی گئی۔ حق تعالیٰ کی بھی کتنی بڑی رحمت ہے کہ خاص اپنے دربار کی زیارت کو آتے ہوئے بھی تجارت کی اجازت دے دی۔

بھلا اگر تم کسی بادشاہ یا ادنیٰ حاکم سے ملنے جاؤ اور ساتھ میں تجارتی مال

بھی لے جاؤ تو اس کو یہ بات معلوم کر کے کتنا ناگوار ہوگا۔ اس کے دل میں تمہاری ملاقات کی کچھ بھی وقعت نہ ہوگی۔ بلکہ کان پکڑنے کے دربار سے نکال دینے کے کہ تم ہم سے ملنے نہیں آتے تھے بلکہ سو و اگر می کو آتے تھے مگر حق تعالیٰ نے اجازت دے دی کہ سفر حج میں تجارت کرنا گناہ نہیں۔ یہاں تو اباحت ہی ہے مگر قواعد فقہ سے ایک صورت میں یہ تجارت مستحب بھی ہے جب کہ یہ نیت کہ اس سے رقم بڑھے گی تو سفر حج میں سہولت ہوگی فقرا کی امداد کریں گے۔

رہا یہ کہ اس صورت میں خلوص ہوگا یا نہیں اس کے جواب میں تفصیل ہے۔ وہ یہ اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو جس کی علامت یہ ہے کہ تجارت کا سامان ہوتا ہے جب بھی ضرورت حج کو جاتا۔ تو اس صورت میں خلوص محفوظ ہے اور ثواب حج کم نہ ہوگا۔ اور اگر حج اور تجارت دونوں کی نیت برابر ہے تو اس حالت میں تجارت سہاؤ ہے مگر خلوص کم ہوگا۔ اور جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ایک کے ساتھ ایک فعل مباح ہی کو منضم کیا ہے فعل جوام کو تو منضم نہیں کیا اور اگر تجارت اصل مقصود ہے اور حج تابع ہے تو اس صورت میں گناہ ہوگا اور یہ شخص یا نہ ہوگا کیونکہ یہ مخلوق کو دھوکا دے رہا ہے کہ جاتا ہے تجارت کے لئے اور ظاہر کرتا ہے کہ میں حج کو جاتا ہوں۔

رہا یہ کہ اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو تو اس صورت میں مال تجارت لے جانا افضل ہے یا نہ لے جانا افضل ہے۔ تو اگر زاویراہ بقدر کفایت موجود ہے تو افضل یہ ہے کہ تجارت کا سامان نہ لے جائے کیونکہ اس میں خلوص زیادہ ہے۔ اور اگر زاویراہ بقدر ضرورت ہی ہے بقدر کفایت نہیں اور نیت

تجارت تابع ہے تو اس آیت سے کہ سفر میں سہولت و اعانت ہوگی مال تجارت لے جانا موجب ثواب ہے۔

اب اصل سوال کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں اور اس آیت میں تو کچھ نہیں۔ کیونکہ حدیث میں طلب معاش سے منع نہیں کیا گیا جو مالوں سے لے کر بلکہ انہماک اور زیادت حرس سے منع کیا گیا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت میں طلب مال کی مطلقاً اجازت نہیں بلکہ قید سے اجازت ہے کہ وہ ابتغاء فضل کا مصداق بھی ہو اور ابتغاء معاش کا۔ فضل میں اسی وقت داخل ہو سکتا ہے جب کہ اس میں ابتغاء رضا بھی ہو جس کا قہر یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ابتغاء فضل کے ساتھ بعض جگہ ذکر اللہ کو بھی بڑھا دیا۔ سورہ جمعہ میں فرماتے ہیں۔ **وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ** واذکر اللہ کثیراً۔ **وَاذْكُرُوا اللَّهَ** کو بڑھا کر بتلا رہا ہے کہ طلب معاش کو ابتغاء فضل سمجھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے ساتھ ذکر اللہ ہو ورنہ وہ ابتغاء فضل نہیں بلکہ ابتغاء فضول ہے بلکہ طلب نقصان ہے۔ اور جو شخص طلب معاش میں ابتغاء رضا کر رہا ہے وہ گناہ کا مرتکب نہیں بلکہ ثواب کا کام کر رہا ہے اور حدیث میں اس طلب کی حمانعت ہے حد سے متجاوز نہ ہو۔ خوب سمجھ لو۔

پس اب میں ختم کرتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے حرس مال کی مذمت بیان فرمائی ہے اور حرس کے کم کرنے جو تدبیر غلط فہموں نے سمجھی تھی اس کی غلطی ظاہر فرمائی ہے۔ پس لوگوں کو چاہیے اس تدبیر کو استعمال نہ کریں۔ جیسے بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ذرا بیٹھے کی شادی یا

نکاح سے فراغت کر لیں تو پھر دنیا کے دھندوں کو الگ کر کے اللہ اللہ کرینگے
 اور فرماتے ہیں کہ اس طرح کبھی یہ حرم کم نہیں ہو سکتی بلکہ اور بڑھے گی یہی حالت
 کی جیسے شادش والا کہا کرتا ہے کہ ذرا سا کھجلا لوں پھر نہ کھجلاؤں گا۔ مگر وہ جتنا کھجلا
 ہے اتنی ہی شادش بڑھتی ہے۔ ایسے ہی آج تو آپ ایک بیٹی کی شادی کا بہانہ
 تھے ہیں۔ کل کو نہ معلوم کتنی بیٹیاں ہو جائیں گی اور تمہاری نہ ہوں تمہاری اولاد کی
 جائیں گی۔ تو یہ سلسلہ تو کبھی ختم نہ ہوگا۔ اور وہی حال ہو جائے گا۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترک این سو واکنم
 باز نیوں فردا شود امروز را فردا کنم

صاحبو! اس کا علاج وہی ہے جو اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ جس اسی
 ت ان دھندوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ اور اگر توجہ الی الدنیا
 کرنے پر اس وقت قدرت نہیں اور ان تعلقات کو نہیں چھوڑ سکتے تو پھر صورت
 ہے کہ اس سلسلہ کو بھی چلنے دو اور اس کے ساتھ دوسرا سلسلہ توجہ الی اللہ کا بھی
 شروع کرو۔ انشاء اللہ تعالیٰ ناکامی نہ ہوگی۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ صلے
 اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین و آخر دعوانا
 ان الحمد لله رب العلمین۔

نوٹ :- درمیان وعظ میں بارش آنے لگی تھی اس لئے حضرت مولانا اور
 اکثر سامعین باہر سے مکان کے اندرونی حصہ میں آگئے۔ پھر ذرا بارش کم ہوئی تو
 حضرت مولانا کی وجہ سے پھر باہر تشریف لے آئے۔ اس آمد و رفت کی وجہ

سے ذہن مشتوش ہو گیا۔ اس لئے بیان جلدی ختم فرما دیا۔ ۱۲ جامع

انشراف علی!

۱۲۔ رجب ۱۳۵۱ھ

وعظ امیر کھٹ

ہدی و ہوئی کے متعلق یہ وعظ ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ بعد مغرب
محلہ کوٹلہ امیر کھٹ میں فرمایا۔ ————— پارہ ۲ گھنٹہ میں ختم ہوا

خطبة بالورث

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله تجده ولستعينه ولستغفره ولو من به وتوكل
 عليه ولعوز بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا
 من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له
 ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد
 ان سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى
 عليه وعلى اله واصحابه وبارك وسلم آتاهم فاعوذ
 بالله من الشيطان الرجيم - بسم الله الرحمن الرحيم
 وإنا من خائف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى
 فان الجنة هي الماوى

طلب اور ذریعہ | یہ آیت سورہ والنازلحات کی ہے۔ اس میں حق سبحانہ تعالیٰ نے ایک ایسی چیز کے حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے جس کا ہر شخص خواستگار ہے جس کو ذرا بھی اطلاع اُس کی ہو جائے وہ مفتون ہو جائے۔

مگر پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ کسی چیز کی خواہش معتبر جب ہی ہوتی ہے کہ جب اُس کے ذرائع میں بھی سعی کی جائے۔ جو شخص کسی شے کا طالب ہو مگر اُس کے اسباب حاصل نہ کرے اُس کو اس شے کا طالب نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً کوئی مالدار ہونا چاہے مگر جب اُس سے کہیں اُن علوم کو حاصل کر جو اکتساب روپیہ کے لئے ضروری ہیں پھر کسی واقف کار کی صحبت میں رہ کہ ان علوم پر عمل یعنی اکتساب میں مہارت ہو پھر کوئی کام شروع کر اور آمدنی اور خرچ کا حساب رکھ کہ خرچ آمدنی سے کم رہے تاکہ کچھ پس انداز ہو اور حقوڑا حقوڑا جمع ہو کر ایک رقم ہو جاوے اور تمول حاصل

ہو تو کہتا ہے واہ صاحب مجھ سے علوم میں محنت نہیں ہوتی کسی کے نخرے
 کیوں اٹھائے جانے لگے۔ پھر پابندی کا بار خواہ مخواہ اپنے اوپر کیوں لوں اور
 نخرے کو محدود کیے کے دل کو کیوں ماروں۔ جتنا جی چاہے گا نخرے کو دل گا۔ اس شخص
 کو تو مل کا طالب نہیں کہتے۔ اس کو بواہوس کہتے ہیں۔

یا کوئی شخص جامع مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے
 ان راستوں کو نہیں اختیار کرتا جن سے جامع مسجد میں پہنچے اور قدم نہیں پڑھا
 یہ شخص جامع مسجد میں چلے پہنچے گا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ثواب کا طالب ہے
 یا کوئی شخص چاہتا ہے کہ غلہ اس کے پاس آجائے اور جب کہتے
 کھیتی کر زمین میں بیج ڈال، پانی دے، کھیت کی نگہداشت کر، تو کہتا ہے کون
 کھیتی کرے اور سچائی کس سے ہو سکتی ہے۔ کون مگر چھوڑ کر حفاظت کے لئے
 جنگل میں جا کر پڑے۔ مجھے تو غلہ چاہئے۔ یہ شخص احمق ہے اور غلہ کا طالب ہی
 نہیں ہے۔

یا جیسے کوئی اولاد چاہے اور جب کہا جائے نکاح کر اولاد ہو جائیگی تو
 کہتا ہے کون بکھیڑے میں پڑے۔ نکاح میں ایک رقم صرف کروں۔ پھر نان و
 نفقہ کا مطالبہ ہو۔ مکان چاہئے، مہر کی فکر ہو اور طرح طرح کی مصیبتیں کون مول
 لے۔ نکاح تو کرنے کا نہیں۔ بس میں تو لڑکا چاہتا ہوں۔ یہ احمق ہی ہے! اللہ میاں
 نے اس فعل خاص کو ولد کے لئے سبب قرار دیا ہے۔ اس کو اختیار کر و اولاد
 بھی مل جائے گی۔

یا جیسے کہ کوئی چاہے کہ پیٹ بھر جائے اور جب کہیں کھانا کھاؤ، لقمہ

کو چھاؤ اور ننگو پیٹ بھر جائے گا، تو کہتا ہے کہ صاحب میں تو یہ کرنے کا نہیں۔
ظاہر ہے کہ محض احمق ہے۔

توضیح کے لئے یہ کئی مثالیں دی گئیں تاکہ یہ مقدمہ ذہن نشین ہو جائے۔ میں
آگے انشاء اللہ ان سے کام لوں گا۔ عرض طالب اگر ذرائع کو اختیار کرے، تو
طالب ہے ورنہ بوا لہوس ہے۔ ایسا آدمی ضرب المثل ہو جاتا ہے۔ دیکھنے اور
سننے والے کہا کرتے ہیں کہ آدمی تو معقول ہیں مگر ضبط ہو گیا ہے۔ دیکھتے پڑھ لکھ
کہ دماغ خراب ہوا ہے۔ نکاح تو کیتے نہیں اور اولاد کی وجہ سے۔ کیسا افسوس
ہے۔ وجہ یہی ہے کہ مسلم ہے کہ اگر سچی نہ کرے ذرائع میں تو پاگل ہے۔ پس اب
تعجب یہ ہے کہ یہ قاعدہ دنیاوی امور میں تو ہر کس و ناکس، عالم جاہل، بڑے اور
چھوٹے سب کے نزدیک تسلیم کیا ہوا ہے۔

جب دین کا معاملہ آپڑتا ہے تو بڑے بڑے
عقلا احمق بن جاتے ہیں وہاں مقصود کی زبانی طلب

اسباب وراثت

کوہی طلب کہتے لگتے ہیں اور اطمینان رہتا ہے کہ بڑے طالب ہیں اور اس
طلب پر نتیجہ ضرور مرتب ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو زبان سے اولاد اولاد کہنے والے
کو بھی طالب ولد کہنا چاہئے اور امید رکھنی چاہئے کہ اس کے اولاد ہوگی معلوم
نہیں کس طرح ہوگی۔ شاید مرو کے بچے ہوگا،

معلوم نہیں کیا بات ہے فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ دنیا میں تو اسباب کو دخل
ہو اور آخرت میں نہ ہو بلکہ معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے کہ دنیاوی اسباب کو اتنا
دخل اپنے مقاصد میں نہیں ہے جتنا کہ آخرت کے اسباب کو مقاصد آخرت

میں ہے۔ یہ بات ظاہر مشکل معلوم ہوتی ہوگی کیونکہ ذہن نشین یہی ہوتا ہے کہ دنیوی کام تو اختیاری ہیں اور آخروی نہیں۔ جو لوگ ذرا عقلمند ہیں وہ اتنا اور کہہ لیتے ہیں کہ ہوتا تو سب کچھ تقدیر ہی سے ہے مگر اسباب حق تعالیٰ نے مقرر فرما دیئے ہیں مسئلہ تقدیر کو سمجھا مگر غلط سمجھا۔ چاہے فاسق ہوں یا قاجر ہوں۔ اگر تقدیر میں جنت ہے تو ہمیشہ ہی گے۔ دنیا میں بھی یوں ہی کیوں نہ کہا کہ اسباب کو حاصل کریں یا نہ کریں اگر تقدیر میں مسبب لکھا ہے تو ملے ہی گا۔ نہ کوئی پیشہ کریں نہ کھیتی کریں نہ کھائیں۔ اگر قسمت میں ٹوٹل اور غلہ اور پیٹ بھرنا لکھا ہے تو ہو ہی جائے گا۔

بلکہ جیسا یہ خیال ہے کہ فسق و فجور کر کے اطمینان سے بیٹھے ہیں کہ جنت ملے ہی گی۔ غلطی یہی ہے کہ دنیا کو اختیاری سمجھا اور آخرت کو نہیں۔ یا تو دونوں کو اختیاری سمجھا ہوتا یا دونوں میں تقدیر پر بیٹھے رہے ہوتے۔ ذرا غور سے سمجھیں آجائے گا کہ واقعی بات کیا ہے۔

عقائد کا مسئلہ ہے کہ ہر سبب پر جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ باذنہ تعالیٰ ہے جلالاً، آگ کا لگانا اثر و امٹی اور متفق علیہ ہے مگر جب تک اذن نہ ہو اثر ناق مرتب نہیں ہو سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں نے نہایت تیز آگ میں ڈالا۔ مگر باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے کہہ دیا ٹھنڈی ہو جا کچھ بھی صدمہ نہ پہنچا اور احترامی مرتب نہ ہوا۔ اگر یہ اثر آگ کے لئے ذاتی ہوتا یا جزو ماہیت یا لازم ماہیت ہوتا تو کیوں منقک ہوتا۔ کیا آگ نہ رہی اور یہی قصہ اعمال صالحہ میں بھی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ کوئی اپنے عمل کی

وہ جسے جنت میں نہ جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ عمل تاثیر بالذات نہیں کہ کسی کو جنت میں لے جائے۔ مشیت ایزدی شرط ہے۔ دین کا مطلب یہ سمجھ رکھا ہے کہ عمل دخول جنت میں کچھ بھی دخل نہیں رکھتا، عمل کو وہی دخل ہے و دخول جنت میں جو آگ کو ہے احراق میں۔ آگ کے احراق کے لئے بھی مشیت شرط ہے اور دخول جنت کے لئے بھی۔ بہر حال ایک آیت اور ایک حدیث سے ثابت ہو گیا کہ کسی چیز میں تاثیر بالذات نہیں ہے اگرچہ اثر کیسا ہی یقینی اور دائمی ہو مگر ذات میں کسی چیز کی داخل نہیں کہ اثر کرے۔ سب مشیت باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ حق تعالیٰ کے مرتب کرنے سے سب مرتب ہوتا ہے۔ تو اب اس کی تحقیق باقی ہے کہ آیا اسباب دنیویہ پر مرتب کرنے کا حق تعالیٰ نے یقینی وعدہ کیا ہے یا اسباب اخرویہ پر اس کے مرتب کرنے کا یقینی وعدہ کیا ہے۔ تو نصوص و واقعات دونوں سے دیکھئے کہ دنیوی اور دینی دونوں اسباب میں سے کس پر ترتیب اثر یقینی ہونے کا وعدہ ہے باری تعالیٰ کا اور تجربہ سے کبھی کون یقینی ہے۔ سو کہیں نہیں فرمایا گیا نصوص میں کہ اسباب دنیوی پر اثر ضرور مرتب ہوگا اور تجربہ واقعات سے بھی یہی نکلتا ہے۔ بسا اوقات کھینتی کرتے ہیں اور ایک، دانہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اسباب اور اثر | یہی حال جاہ و ثروت کا ہے۔ بہت سی تدبیریں کی جاتی ہیں مگر عمر گزر جاتی ہے اور غربت ہی رہتی ہے اور کبھی بے تدبیر مالدار ہونے جاتا ہے۔ اگر آپ خود کریں گے تو کبھی نہ کہیں گے کہ جاہ و ثروت تدبیر پر ہے۔ میں نے خود ایسے واقعات دیکھے ہیں کہ جن کی اوقات کسی وقت

میں دو آنے کی تختی آج وہ لاکھ پتی ہو گئے۔ اگر آپ کہیں کہ انہوں نے تدبیر سے اس قدر مال حاصل کیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ ان کے پاس جائیے اور اول سے آخر تک ان کی سوانح عمری لکھئے اور ان کی کل تدبیریں بھی لکھئے کہ پہلے ان کے پاس دو آنے تھے اس کا انہوں نے فلاں سودا خریدا اور صبح سے شام تک پھیری کر کے بیچا۔ اس میں ایک آنہ نفع ہوا۔ ایک آنہ میں سے نصف کھایا اور نصف اصل میں شامل کر دیا۔ اگلے دن اڑھائی آنے کا سودا لے کر پھیری کی۔ ساڑھے تین آنے یا چار آنے ہو گئے۔ اسی طرح راس المال بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب تعداد انوں سے نکل کر روپوں میں آگئی تو کچھ پس انداز کرنے لگے۔ جب ایک کافی رقم جمع ہو گئی تو جائیداد خرید لی۔ پھر اس کی آمدنی کو بقدر ضرورت خرچ کیا اور کچھ داخل خزانہ کرتے گئے۔ یہاں تک کہ خزانہ بڑھتے بڑھتے لاکھ تک پہنچ گیا۔ لکھ پتی ہو گئے۔ اس کو مفصل لکھئے بلکہ تمام تغیرات کو تاریخ وار قلمبند کیجئے۔ اب اگر یہ تدبیر سبب ہے ان کے جاہ و ثروت کی تو آپ بھی ایسا ہی کیجئے۔ جیسا انہوں نے کیا کہ دو آنہ کا سودا لیجئے اور پھیری کیجئے اور نفع کو شامل راس المال کرتے جائیے بعد چندے کچھ پس انداز کیجئے اور جائیداد خرید لیجئے۔ پھر خزانہ بڑھائیے یہاں تک کہ لکھ پتی بن جائیے۔ میں کہتا ہوں کہ کبھی بھی تو ان تدبیروں سے آپ ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔ کیا وجہ ہے کہ تدبیر سے اس نے حاصل کیا اور تم نہیں کر سکتے وجہ یہی ہے کہ سب کچھ باری تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اسباب دنیا پر ہمیشہ اللہ اثر ممتزب نہیں فرماتے۔

میرے دعوے کا ایک جز ثابت ہو گیا کہ اسباب دنیوی پر تدبیر کا ممتزب

ہونا ضروری اور دائمی نہیں۔ رہا دوسرا جزو یعنی آخرت سو دیکھئے فرماتے ہیں۔

من اراد الاخرة وسعى لها سعيها وهو مؤمن فأولئك

كان سعيهم مشكورا

یعنی جو کوئی آخرت کا طالب ہو اور کوشش کرے تو اس کی سعی ضائع نہ جائے گی۔ بلکہ فرماتے ہیں نزولہ فی نحو شہ یعنی اس کا نتیجہ بقدر عمل ہی نہیں زیادہ دیا جائے گا۔ دیکھ لیجئے وعدہ کے یقینی ہونے سے نتیجہ مترتب ہونا ضروری اور یقینی ہوا یا نہیں۔

میرا دعا ثابت ہو گیا کہ اسباب دنیوی پر اثر مترتب ہونے کا کہیں وعدہ نہیں اور اسباب آخروی کے لئے وعدہ ہے۔ پھر تعجب ہے کہ دنیا میں جس چیز کا ارادہ کرتے ہیں وہ اکثر جتنا چاہتے ہیں نہیں ملتی مگر پھر اکتساب ذرائع سے کوئی غفلت نہیں کرتنا اور غفلت کرنے والا احمق سمجھا جاتا ہے اور آخرت میں اس قدر ملتا ہے جس کا ارادہ بھی نہیں کیا جاتا اور پھر اکتساب ذرائع سے غفلت ہو اور غفلت کرنے والے کو کوئی احمق نہ کہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

فلا تعلم نفس ما أخفى لهم من قرة أعين۔

حادث قدسی میں فرماتے ہیں۔ اعدوت

عبادى الصالحين مالا عين رات و

طلب جنت کا ذریعہ

لا اذن سمعت ولا خطر قلب لشعری میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیز تیار کی ہے کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی نہ کسی کے دل میں اس کا خیال تک گزرا۔ حالانکہ خیالی بڑی وسیع چیز ہے۔ مگر بروئے حدیث

وہ چیزیں اسبابِ آخرت پر متفرع ہوتی ہیں جو خیال میں بھی نہ آسکیں۔ اب سوچئے کہان تک سوچیں گے۔ جمال، باغ، نہریں، خادوم، ماکولات و مشروبات وغیرہ جہاں تک بھی آپ کا خیال پہنچے۔ پھر ایک مرتبہ ایسا نکالئے کہ خیال سے بھی باہر ہو اور عقل اُس کے ادراک سے قاصر ہو مگر وہاں ملے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اگر فضل ہوا آخرت میں ترتیب اثر تو کیا اس اثر کا وعدہ ہے کہ سبب سے اور اُس سے کچھ نسبت بھی نہیں۔ جمال اور باغ وغیرہ میں بھی ایسے مراتب نکل سکتے ہیں کہ خیال سے باہر ہوں اور بعض نتیجے وہاں کے وہ ہیں کہ اُن کا صرف لفظ ہی سنا ہے ماہدیت تو عقل میں بھی نہیں آتی۔ وہ رویت الہی ہے۔ عرض ترتیب اثر یقینی ہوا کیونکہ وعدہ فرمایا ہے باری تعالیٰ نے کہ اثر ہم ضرور متفرع کریں گے تم ذرائع کو حاصل کرو۔

لوگوں کے خیال میں یہ جا ہوا ہے کہ آخرت بے اختیاری ہے اور دنیا اختیاری ہے۔ اسی نے لوگوں کو بٹھا دیا۔ کچھ نہیں کہتے اور دنیا کے معاملات میں یہ حال ہے کہ جب چاہتے ہیں دنیا حاصل کرنا اسباب کو جمع کرتے ہیں حالانکہ بارگاہِ اسباب کے تخلف کو بھی مفاد سے دیکھ چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ جن اسباب کو دخل نہیں وہ تو جمع کئے جائیں اور جن کو دخل ہے اُن کو نہ اختیار کیا جائے۔ کیسے کہا جائے کہ ایسا شخص جنت کا طالب ہے۔ اسی کو فرمانے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعجب ہے جنت سے کہ اُس کا طالب کیسے ہوتا ہے۔

اس سے اور مابقی سے ثابت ہو گیا کہ جو اسباب کو حاصل نہ کرے اُس

اُس کے دماغ میں خلل ہے۔ طلب صرف معتبر نہیں بلکہ طلب صادق ضروری ہے اور اُس کے لئے کسب ذرائع لازم ہے جیسا کہ بسط کے ساتھ اب تک بیان کیا گیا۔ سو اس آیت میں اللہ میاں نے جنت کے طلب کا ذریعہ بتایا ہے جس کے سب لوگ مشتاق ہیں۔

حال و کمال | یہاں ایک بات اور قابل تحقیق ہے۔ وہ یہ کہ اس آیت سے جنت کا مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ میں بعض ایسے گزرے ہیں جن کے کلام میں یہ مضمون پایا جاتا ہے کہ نہ ہم کو جنت کی طلب ہے نہ دوزخ کا خوف ہے تو یا تو جنت مطلوب نہیں یا وہ لوگ مخالف قرآن ہیں۔

جیسے ایک صاحب حال کی نقل ہے یہ فقہ حضرت رابعہ بصریہ کا ہے کہ ایک روز علیہ سالی میں ایک لائق میں آگ اور ایک لائق میں پانی لے کر نکلیں۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت یہ کیا۔ کہا تمام عالم کو جنت اور دوزخ ہی کے خیال نے تباہ کر دیا۔ میرے مالک کا نام کوئی نہیں تھا۔ آج میں فیصلہ کئے دینی ہوں۔ پانی سے دوزخ کو ٹھنڈا کروں گی اور آگ بہشت میں لگاؤں گی۔

سو بات یہ ہے کہ یہ اقوال و حکایات اہل حال کے ہیں اور علیہ حال سے ان کو معذور سمجھا جاوے گا۔ ہم سوالوں کو تو ان لوگوں کے اقوال کو نقل کرتے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ایسی بات جذب میں کوئی کہہ جائے باقی قصدا کہنا یا اُس کو کمال سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ خوب یاد رکھئے کہ جذب کوئی کمال نہیں اور نہ وہ اختیار ہی چیز ہے۔ جو لوگ اختیار سے ایسے لفظ کہتے ہیں سائناء و کلا

جو اعلیٰ و ادنیٰ کسی درجہ میں بھی وہ شمار ہوں۔ غلبہ کے تو معنی ہی بے اختیار اور
 کے ہیں پھر بے اختیاری کا اختیار سے ہونا کیا معنی۔ آج کل لوگوں نے اسی کو
 کمال سمجھ رکھا ہے۔ جو کوئی وہی تھا ہی کلمات پیدیا کا نہ بکتا ہوا اُس کو بڑا پہنچا ہوا
 سمجھتے ہیں کہ فلاں بزرگ مسرت ہیں۔ سو خوب سمجھ لیجئے کہ جن بزرگوں سے
 ایسے کلمات منقول ہیں اُن کے لئے بھی یہ حالت کچھ کمال کی نہ تھی۔ ہاں علیہ حال
 کی وجہ سے معذور تھے۔ کوئی الزام اُن پر عائد نہیں ہوتا۔ اور رہے فقال سو وہ
 تو کسی طرح معذور ہی نہیں ہو سکتے۔ اُن کے اقوال کے دعوئے کے ساتھ نقل
 سخت یہ ہو گی ہے۔ عرض اُن لوگوں کی یہ ایک حالت معذوری کی تھی ورنہ جس چیز
 کا مطلوب ہونا قرآن سے ثابت ہو اور جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
 طلب فرماویں۔ اللہم انی اسالک الجنة وما تحب الیہا من فعل او عمل
 اُس کی نسبت دوسرے کا کیا منصب ہے کہ ایسا کہے۔ آیات و احادیث
 میں صاف طور پر طلبِ جنت کی فضیلت آئی ہے۔ اہل حال معذور تھے حال کی
 وجہ سے اور اب تو لوگوں میں حال ہی نہیں رہا۔ نقل ہی نقل رہ گئی۔ اسی کو فرماتے
 ہیں مولانا

حرفِ رویتناں بدرد و مردونہ تاہر پیش جاہلان خواہد فزوں

جن میں کچھ ہے نہیں وہ اُن کے دعووں کی نقل کر کے جاہلوں میں بزرگ

بنتے ہیں۔

مجھ کو ایک شخص اسی سفر میں ملے کہ وہ کچھ مالی اعانت چاہتے تھے اور
 ادھر کی باتوں میں اپنی محویت بھی ظاہر کی لمبی لمبی باتیں کرنے لگے۔ کیا یہ وہ ہے

جنت کی اور کیا خیال ہے ووزخ کا۔ میں نے کہا میاں بیٹھے بھی رہو۔ چارہ و پیہ کے لئے تو گھر چھوڑے پھرتے ہو جنت کی طرف التفات بھی نہ کرو گے۔ ان نقالوں میں رنگ البتہ اصل سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ سو ہر چیز میں تجربہ کر لیجئے کہ اصلی میں نقلی کی سی آب و تاب نہیں ہوتی۔ رنگ و روغن کو دیکھ کر شیفتہ ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ اس شخص نے اصل چیز نہیں دیکھی اور محض نا واقف ہے غرض اہل حال تو بحث سے مستثنیٰ ہی نہیں اور جنت کا مطلوب ہونا بحالہ باقی رہا

البتہ یہ ضرور ہے کہ مشہور تقسیم میں اس کے مطلوب ہونے کی دو صورتیں ہیں اور میرے

حصول جنت کے طریقے

تذویک ایک تیسری صورت اور بھی ہے۔

ایک تو یہ کہ اس کی نعمتوں کو مقصود سمجھ کر کھانے کو، پینے کو، باغوں کو، مکانا کو، نہروں وغیرہ کو غرض اصلی جان کر طلب کیا جائے۔ مذاق مختلف ہوا کرتے ہیں کسی کو مکانات کا شوق ہے کسی کو دلکش فضاؤں کا، کسی کو بچوں کا، کسی کو حسن و جمال کا، کسی کو ماکولات و مشروبات کا اور جنت میں سب کچھ ہے۔ تو جو چیز جس کو مرعوب ہوئے گی۔

حدیث تشریف میں ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ ایک شخص تمنا کرے گا کہ وہ کھنتی کرتا۔ اللہ میاں فرمائیں گے ابن آدم کا پیٹ ہی نہیں بھرتا اور دم کے دم میں سب چیز موجود ہو جائے گی۔ بات کہنے میں ہرا بھرا کھیت، پھر انبار کے انبار غلہ تیار ہے تو کتنی کھیتی چاہئے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ بچہ طرح طرح کی صدیں کیا کرتا ہے۔ اور سب پوری کی جاتی ہیں۔ والدین

جانتے ہیں کہ باوقی صدیق ہیں مگر جو مانگتا ہے دیتے ہیں۔ تو بعض لوگ جنت کو اس لئے طلب کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے لوگ ہیں جو جنت کو اللہ میاں کی تقاضا کے لئے طلب کرتے ہیں۔ یہ لوگ طالب درحقیقت اللہ میاں کے ہیں مگر ان کو معلوم ہوا ہے کہ لوش اور رضا خاص جنت میں ہوگی۔ اس لئے چاہتے ہیں کہ جنت میں پہنچ جائیں تاکہ مقصود اصلی حاصل ہو۔ غرض نعمت کے طالب نہیں بلکہ ممنعم کے ہیں۔

مثال اس کی یہ ہے کہ ایک محبوب نے باغ میں لوگوں کو بلایا جس میں ہر قسم کا عیش و نشاط موجود ہے۔ جو میوے کہیں نہیں ہیں وہ وہاں موجود۔ وہ مکانات جن کا نقشہ تک کسی کے خیال میں نہ گزرا ہو۔ وہاں تیار نہریں، حوض، دلکش فضا میں، خادم، غلام غرض جملہ چیزیں موجود ہیں۔

بعض جاننے والے ایسے ہوں گے جو غسل کرنے اور حوضوں میں غوطہ لگانے کی غرض سے جائیں گے اور بعض تازہ تازہ ہواؤں کا لطف اٹھانے کے لئے اور بعض میووں سے لذت حاصل کرنے کے لئے و علیٰ ہذا۔ اور ایک جاننے والے وہ ہیں کہ اس محبوب پر عاشق ہیں اور باغ میں اس واسطے جاتے ہیں کہ اللہ کو معلوم ہوا ہے کہ ہمارا محبوب باغ میں ہے۔ یہ سن لیا ہے اور باغ کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل باغ کو نہیں ڈھونڈتے، باغ والے کے شہدائی ہیں اس وقت چونکہ محبوب باغ میں ہے۔ اس واسطے باغ کی طرف جاتے ہیں اور وہ اگر جنگل میں آجائے تو باغ کا خیال بھی ان کے ذہن میں کبھی نہ گزرے۔ باغ کی طرف جاننے والے یہ دو قسم کے لوگ ہوتے۔ ایک وہ کہ نفس باغ کے طالب

ہیں دوسرے وہ کہ نہ انہیں باغ کا خیال ہے نہ جنگل کا۔ محبوب کی طرف نگاہ ہے۔

مشہور قسمیں طالبانِ جنت کی تو یہی دو ہیں اور میرے نزدیک تیسری قسم اور ہے لیکن ذرا دقیق ہے۔ وہ یہ کہ طالب تو نعمت کے ہیں لیکن نہ حظ کی وجہ سے بلکہ اپنے نذل اور عبدیت کی وجہ سے اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ بلا واسطہ طالبِ منعم کے ہوں۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اس کے کوچہ کا ایک گوشہ مل جاوے۔ یہ تیسری قسم ہوتی ہے۔ پس طالبِ نعمت کا بتدی ہے اور طالبِ منعم کا متوسط ہے اور طالبِ نعمت للعبادیتہ کا کہ واقع میں طالبِ کامل منعم کا ہے غنیمت ہے اور صاحبِ حال بحث سے خارج ہے۔

خلاصہ یہ کہ لوگوں کا خیال مطلقاً یہ ہے کہ طلبِ جنت سے عدمِ طلب کا درجہ بڑھ کر ہے۔ حالانکہ خور کرنے سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے کہیں آیات و نصوص میں اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ عدمِ طلب کوئی شے حسن ہے۔ بہت سے بہت یہ کہہ سکتے ہیں کہ عدمِ طلب والا معذور ہے۔ سو معذوری میں فضیلت کہاں!

خلاصہ یہ کہ طالبِ جنت کی تین قسمیں ہو گئیں کہ یا بتدی ہے یا متوسط یا غنیمتی۔ سو متوسط کا حال تو اکثر ممتاز ہوتا ہے لیکن بتدی اور غنیمتی کا حال بہت متشابہ ہوتا ہے لکہ واقع میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بتدی ایک کام میں لگا ہوا ہے کہ حقیقت نہیں پہچانتا مگر آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے کبھی حقیقت شناس بھی ہو جائے گا۔ ذرا سی بات میں وجد میں آجانا، ڈھاریں مارنا منعلوبوں کا کام ہے

جو صاحب کمال ہے وہ حال پر نہ افسوس ٹپکا سکتا ہے نہ حال اس کے بدن کی
حرکت پیدا کر سکتا ہے۔ نہ حال اس کی زبان سے بیجا نکتہ کلمات نکلا سکتا ہے۔
شاہ عبداللہ رحمدلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

”منصور بچہ پو کہ از یک قطرہ بفریاد آمد۔ این جابر و انا نند کہ دریا را
فر و بند و آرد و رخ نزنند۔“

منتہی کی حالت بالکل مبتدی کی سی ہوتی ہے مگر چونکہ منتہی راستہ طے
کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس واسطے ہر مقام پر اس کے افعال سے واقفیت
ٹپکا کرتی ہے اور مبتدی مقلدانہ چلتا ہے۔

اسی طرح جنت کے مانگنے والوں میں جو مبتدی یا منتہی ہیں ان میں فرق
ہے کہ مبتدی طالب ہے مزہ کے لئے اور منتہی مزہ سے گزرا ہوا ہے۔ پھر
جنت کی طلب جو کرتا ہے سو وہ محبوب کے حکم سے ہے۔ گویا منتہی عبدین
ظاہر کرتا ہے کہ جو حکم ہو اس کی تعمیل کے لئے تیار ہوں اور مبتدی کی فمائیں
مکی ہے۔ اس کا انتظام مزہ کی طرف ہنوز باقی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایسی چیز
طلب کا حکم ہوتا کہ مزہ اس میں نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ اس صورت میں مبتدی
پیراکھڑ جاتے اور منتہی جما ہوا ہے اس کی لغزش کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ مزہ کا طلب
یہی نہیں جس کے رہنے نہ رہنے پر اس کی طلب کا دار و مدار ہو۔ چونکہ طلب کا
پایا ہے اس واسطے تعمیل کر رہا ہے۔ فلینا من المتناسون امر کا صیغہ ہے
شخص زبان حال سے کہہ رہا ہے۔

چوں طمع خواہد ز من سلطان دین خاک بر فرق قناعت بعد ازین

جب اُدھر سے ہی طلب کا حکم ہے تو طلب نہ کرنا عدول حکمی ہے۔
 بطبع اطاعت میں ایسا محو ہوتا ہے۔ جیسے کسی کو شراب پلا دیں شراب دو ہیں
 حلال اور حرام شراب محبت حلال ہے۔ شراب پی کر اُدھی سب طرف سے
 بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو بندہ ہے وہ انتقال امر میں محمور ہوتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ محویت بخودی نہیں ہے۔ بعض
 ناواقف اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اگر نماز میں محویت
 ہو جائے تو رکوع و سجود کیسے ہوں۔ محویت کے معنی یکسوئی کے ہیں۔ صرف
 باری تعالیٰ کی طرف خیال ہوتا ہے۔ اس صورت میں عبادت بطریق احسن ہوگی
 رکوع و سجود نہ ہونا کیا معنی۔

عام لوگ محویت اس کو سمجھتے ہیں کہ کچھ واہی تباہی کلمات زبان سے
 نکال دیں یا آئندہ کی باتوں پر دعویٰ کے ساتھ حکم لگا دیا کریں۔ اس کو بڑا کمال
 سمجھتے ہیں اور کہا کرتے ہیں اللہ میاں پر ایسا ناز ہے کہ جو منہ سے نکل گیا، پورا
 ہو کر رہتا ہے۔ یہ مسلم سہی کہ دعا قبول ہوتی ہے مگر ہر چیز کو مانگ بیٹھنا اور دعویٰ
 سے حکم لگا دینا۔ انہیں سے ہو سکتا ہے جو بے خود ہیں۔ یہ محویت محمور نہیں محویت
 محمور میں حق سبحانہ تعالیٰ سے نہایت قرب ہوتا ہے اور جتنا جس کو قرب ہونا
 ہے اتنا ہی عظمت کا اس پر ظہور ہوتا ہے۔ اور اتنا ہی اپنے نفس کا تذلل کھل
 جاتا ہے۔ پھر جس پر محبوب کے اعلیٰ درجہ کی عظمت اور اپنی ذلت کھل گئی ہو
 اس کی نسبت کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جہاں چاہے بے دھڑک قدم اٹھا بیٹھے
 گا۔ بادشاہ کہ دو بیٹے ہیں ایک ناسمجھ اور ایک سمجھ دار۔ ناسمجھ تو جب آتا ہے

سیدھا گو دین جگہ لیتا ہے۔ نہ آداب مجلس کی کچھ خبر نہ اراکین کا لحاظ نہ بادشاہ کا ادب نہ شاہی پوشاک کا خیال۔ پیر صاف ہیں یا خاک آلودہ آئے اور زانو پر چڑھ بیٹھے۔ اور ہوشیار بچہ جو ب آتا ہے تو بیچی نگاہ کئے ہوئے۔ چہرہ پر اراکین کا لحاظ ظاہر۔ مجلس کا رعب چھایا ہوا اور نہایت ادب سے پاؤں پکڑ کر حاضری کی اجازت مانگ کر موڈ ب کھڑا ہوتا ہے۔ و بھری ہے کہ سمجھ دار کو عظمت شاہی کی خبر ہے اور نا سمجھ کو نہیں۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ نا سمجھ بادشاہ کے نزدیک زیادہ مرتبہ رکھتا ہے کہ اس قدر قرب اس کو حاصل ہے کہ شاہی پوشاک پر میلے پیروں سے جا چڑھتا ہے اور جو الٹی سیدھی ضدیں کرتا ہے پوری کی جاتی ہیں۔ نہیں! قرب زوری اس کو حاصل ہے اور قرب حقیقی سمجھ دار کو اگرچہ سمجھ دار گو دین نہیں ہے اور کسی قدر فصل سے کھڑا ہے۔ میلے پیروں سے کپڑوں پر جا چڑھنا اور الٹی سیدھی ضدیں کہ ناگستاخی ہے باعث فضیلت نہیں زائد سے زائد یہ ہے کہ بچہ ان حرکات میں معذور سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح اہل حال کہہ اٹھتے ہیں کہ نہ دوزخ، نہ بہشت نہ اُس کا خوف ہے نہ اُس کی خواہش۔ ان دونوں میں سے کسی کی خبر ہی نہیں۔ یہ کامل نہیں ہیں ان پر ابھی عظمت کا انکشاف پورا نہیں ہوا۔ اس وجہ سے اتنی جرات ہے کہ قرب کے اعلیٰ درجہ کا دعویٰ ہے۔

دیکھئے ایک نہایت ذلیل شخص کسی عایشناں محبوب کی طرف جانا چاہتا ہو تو ا دل تو برہین سچا ہے۔ اس کو کشش کے لئے کہ کسی طرح راستہ کے موافق رفع ہوں۔ دربان و چوہدار و غیرہ سے ساز ہو جائے تب توقع کی جائے کہ

اُن کی درخواست محبوب تک پہنچ سکے گی۔ اگر اس میں کوشش اُن کی چل گئی کہ درخواست محبوب تک پہنچ گئی اور پھر قسمت کی یاوری سے محبوب نے بہت ہی لطف فرمایا کہ حاضری کی اجازت دے دی۔ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ دربار میں جاتے وقت اُن کی بڑی سی بڑی آرزو کیا ہوگی۔ یہ تو کبھی خیال بھی نہ جائے گا کہ مجھے محبوب بنالیں۔ بڑا حوصلہ یہ ہوگا کہ چوکھٹ کو بوسے دینے کی اجازت مل جائے۔ اس کا یہ حوصلہ کرنا کیا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ چوکھٹ کا طالب ہے بلکہ اپنی حالت کو دیکھ کر اس سے زیادہ کی ہمت نہیں کرتا حتیٰ کہ اگر اس کو چوکھٹ سے بڑھانا چاہیں تو پیروں میں رعشا پڑ جائے گا۔ سو منتهی اسانک الجنة کہے گا۔ نہ اس واسطے کہ جنت کا طالب ہے بلکہ طالب محبوب حقیقی ہی کا ہے مگر اس سے بڑھ کر حوصلہ اپنی ذلت اور اُن کی عظمت کو دیکھ کر نہیں کر سکتا۔

معلوم ہو گیا ہوگا کہ طالب تین قسم کے ہیں بلندی
بلندی اور منتهی کا فرق | یعنی طالب جنت کے حفظ کے لئے اور منتهی یعنی

طالب جنت عظمت محبوب کی وجہ سے اور متوسط الحال۔ بلندی اور منتهی میں فرق مشکل ہے اور متوسط الحال کا حال ممتاز اور ظاہر ہوتا ہے۔ حال سے مغلوب ہوتا ہے۔ گویا مغلوب نہ ہو کہ حد شرع کی حفاظت نہ کر سکے۔ کیونکہ ایسا شخص تو جیسا اوپر عرض کیا گیا مباحث سے خارج ہے لیکن مغلوب ہونے سے صرف اس قدر مراد ہے کہ ذرا بات پر رونے لگتا ہے۔ ذرا بات پر دھرا جاتا ہے۔ زبان سے بے اختیارانہ کلمات نکلنے لگتے ہیں۔ اس کو

عوام کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کمال نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ مجال پر غالب آجائے اور مجال کوئی تغیر اس میں نہ پیدا کر سکے۔ ایسے شخص کے پہچاننے کے لئے بڑی بصیرت چاہئے۔ اس کی حالت بالکل مبتدی کی ہی ہوتی ہے۔ عام لوگ دونوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ غنہی کا پہچانا کچھ آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متوسط اولیا کو تو لوگوں نے پہچان لیا اور اولیاء کاملین اور انبیاء علیہم السلام کو نہ پہچان سکے۔ قالوا ان الله لا يشعشعنا. متوسط اولیاء میں تو جوش و خروش دیکھتے ہیں اور اولیائے کاملین اور انبیاء علیہم السلام کی حالت بالکل معمولی سی معلوم ہوتی ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

جملہ عالم زین سبب گمراہ شد	کم کسے از سہ سخن آگاہ شد
گفت اینک بالبشر ایشان بشر	ما و ایشان بستہ خوابیم و خود
این تداستند ایشان از عملے	در میاں فرقے بود بے غنہا
این خورد گرد و پلیدی ز وجدا	وال خورد گرد و ہمہ نور خدا

کارِ پاکان را قیاس از خود بگیر
گر چہ ماند در نوشتن شیر و شیر

مگر ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ پہچاننے جائیں۔ صاحب کمال کو ایک عجیب استغنا ہوتا ہے۔ دنیا کا ذرا سا کمال کسی کو حاصل ہو جاتا ہے تو کسی کی طرف التفات نہیں کرتا۔ یہ لوگ تو وہ کمال رکھتے ہیں کہ اس کی ماہیت بھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ قصداً اظہار تو کہاں ان کو تو غیرت آتی ہے کہ کسی پر اظہار ہو کیما کہ کبھی اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ شگ ابنتہ کمالات دکھاتے

پھرتے ہیں۔ پھر دیکھ لیجئے کہ یہ کمالات شعیب سے ہی ہوتے ہیں جس کے اندر کچھ سے وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا اور جو دکھاتا پھرتا ہے اس میں کچھ ہے نہیں۔ ان لوگوں کو تو کبھی اپنے آپ سے بھی غیرت آجاتی ہے۔ قلذررہمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

غیرت از چشم برم رُوئے تو دیدن نہ ہم
گوشن را نیز حدیث تو شنیدن نہ ہم

میری آنکھ آپ کی طرف دیکھے۔ میرا کان آپ کی بات سنے۔ یہ لوگ امثال امر میں لگے ہوتے ہیں۔ کوئی ان کو پہچاننے یا نہ پہچاننے کچھ پروا نہیں۔ بیگی کر اور دریا میں ڈال۔ اپنی طرف سے کبھی اظہار کا تصور نہیں کرتے۔ لا اللہ میاں کبھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس وقت یاد رکھنے کی بات ہے کہ اخفاء بے ادبی ہے کیونکہ اطاعت تعمیل حکم اور رہنا ہے جس طرح رکھیں بندہ کو اسی طرح رہنا چاہئے جب کہیں خاموش رہو خاموش ہو جائے اور جب کہیں کھل جا تو بلا تامل کھل جائے یہ کھل جانا بھی طاعت ہے۔ اس وقت اخفا اتباع نفس ہے۔ اس وقت اس کو اظہار میں وہی لذت ہوگی جو پہلے اخفا میں تھی۔

عرض صاحب کمال اپنے قصد کو کبھی دخل نہیں دیتا نہ اخفا میں نہ اظہار میں۔ بس فنا ہوتا ہے تعمیل حکم میں۔ اور جو کوئی بالقصد اپنے آپ کو ظاہر کرنا پھرتا ہے وہ اب تک فنا ہی نہیں ہوا۔ جب صاحب کمال سرتا پا محو ہوا امثال امر میں تو اس کو اس طرف توجہ ہی نہیں ہوتی کہ میں ظاہر ہوں یا نہ ہوں بلکہ معمولی سی حالت ہوتی ہے۔ اگر طلب کا حکم نہ ہوتا تو طالب بھی نہ کرتا۔ مگر حکم ہے اس لئے بغرض اس کی تعمیل کے طلب کرتا ہے۔ بندی بھی طلب کرتا ہے اور منتہی بھی

خادم کو پیش آئے گی کہ ایک فہرست بنائے گا جس میں یہ سب نام درج ہوں اور
 ہر آنے والے سے نام پوچھ کر اوپر سے نیچے تک ساری فہرست میں تلاش کریگا
 کہ یہ نام اسمائے مندرجہ فہرست میں سے ہے یا نہیں۔ ہر بار ساری فہرست
 دیکھنی پڑے گی۔ نیز کسی قدر وقت آنے والوں کو ہوگی کہ ہر شخص کو اتنی دیر ٹھہرنا
 پڑے گا کہ جب تک وہ تمام فہرست کو دیکھے۔ سہولت اسی میں ہے کہ مختصر سی
 بات بتا دی جاوے کہ جس کو تو پہچانتا ہو اس کو آنے دینا۔ اس سے نہ فہرست
 کی ضرورت رہے گی نہ کچھ اور دقت پیش آئے گی۔ اسی کو گویا کہتے ہیں۔

جنت کے حصول کے لئے بہت سے طریقے ہیں جن کا فردا فردا یاد رکھنا
 نہایت دشوار تھا۔ اس لئے حق سبحانہ تعالیٰ نے ایک ایسا امر بتا دیا کہ جب اس
 کی رعایت رکھی جاوے تو جو فعل بھی کیا جائے گا وہ وہی ہوگا کہ اس کو کچھ نہ کچھ
 دخل ہے جنت میں۔ اللہ میاں کے کلام کی قدر اسی کو اتنی ہے جو طالب ہے
 جب کسی کے جنت پیش نظر ہو تو انتہا درجہ کا شوق پیدا ہوگا اور جب بتایا جاوے
 کہ اس کی طلب کے فلاں فلاں طریق ہیں اور چونکہ جنت بڑی چیز ہے اس کے
 طرق بھی کثیر ہی ہوں گے، ان کی کثرت کو دیکھ کر یہ شخص گھبرا اٹھے گا۔ مگر چونکہ
 شوق انتہا درجہ کا پیدا ہو چکا ہے، اس لئے یہ تو ہوگا نہیں کہ چھوڑ بیٹھے بلکہ ایک
 حالت سخت اضطراب کی پیدا ہوگی۔ اس شخص کے سامنے اگر کوئی قاعدہ کلیہ
 پڑھ دیا جائے جو جامع ہو تمام طرق کو تو ہر کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کی کیا حالت
 ہوگی۔ وجد کی سی کیفیت ہو جائے گی۔ اس کو قدر آئے گی کہ کلام باری تعالیٰ
 کیا چیز ہے۔ اس کو فرماتے ہیں۔

واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى

اس میں دو کام فرماتے ہیں جو تمام طرق کو جامع ہیں۔ ایک اپنے مالک

کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف۔ دوسرا ونهى النفس عن الهوى

الف لام عوف مضاف الیہ ہے اے عن ہواہا نفس کو اس کی خواہشوں

سے روکنا۔ یہ دونوں عمل جملہ طرق حصول جنت کو جامع ہیں۔

ہر چیز کہ یہ دونوں عمل افراد بہت سے رکھتے ہیں اور تفصیل کرتے وقت

افراد میں کچھ کمی نہ ہوگی مگر اس اختصار کی منفعت یہ ہے کہ جب یہ دونوں مضمون

ذہن نشین ہو جائیں تو ہر فرد عمل میں اس کی رعایت رکھنے سے نیک و بد میں تیز

سہولت سے ہو جائے گی۔ گمراہی میں بھی ہوا کرتا ہے کہ افراد کم نہیں ہو جاتے

صرف طریق شناخت میں اختصار و سہولت ہو جاتی ہے۔

دیکھئے کتنی سہولت ہو گئی۔ جب آدمی کے دل میں خوف ہوگا کہ مجھے

ہر عمل پر حق سبحانہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہوگا تو ہر کام کو تامل کے ساتھ

کرے گا اور خیالی رکھے گا کہ یہ کام کہیں خلاف مرضی باری تعالیٰ نہ ہو۔ اس سے

ایک بصیرت پیدا ہو جائے گی کہ ہر برے عمل کو پہچان لے گا۔ اور اس سے

پہچ جائے گا۔ اور جو سمجھ میں نہ آوے گا اس خوف کی وجہ سے اس کو علما سے

پوچھے گا۔ اس طرح سے کوئی فرد معصیت اس کی نظر سے نہ چھوٹ سکے گا۔

وردہ جنت جسی بڑی چیز کے لئے کثرت سے ذرائع ہونی چاہئیں۔ ظاہر ہے

ان کا ابتداء ذہن میں منضبط کرنا امکان سے بھی باہر معلوم ہوتا ہے۔

افراطِ خوف اور کفر | آپ نے جان لیا کہ طریق طلبِ جنت کا حامل دو امر ہیں۔ اب یا تو ایک دونوں میں سے اصل

ہے اور دوسرا معین یا دونوں اصل ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے اپنے مذاق سے کہ اصل نہیں انقبض ہے اور خوف اُس کے لئے معین ہے۔ میں یہ اپنے دل سے نہیں کہتا ہوں بلکہ اُس حدیث سے کہ نَسْأَلُكَ فِي خَشْيَتِكَ مَا تَحُولُ بِهِ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيكَ۔ دعا مانگتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ اے اللہ ہم مانگتے ہیں خوف میں سے اس قدر کہ حامل ہو جاویں آپ اُس سے ہم میں اور معصیت میں۔

تعلیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ خَشْيَتِكَ مَعْصِيَتِكَ سے بچنے کے لئے مطلوب ہے بالذات مقصود نہیں ورنہ نَسْأَلُكَ خَشْيَتِكَ مَطْلَقًا فرماتے کسی چیز کی حد مقرر کرنے سے صاف یہی بات مفہوم ہوا کرتی ہے کہ اس سے زیادہ مطلوب نہیں۔ خوف کی حد فرمادی کہ اس قدر چاہتے ہیں کہ معصیت سے مانع ہو۔ معلوم ہوا کہ اگر خوف اس سے زیادہ ہو جائے تو محمود نہیں۔ خوف مع الیہ جارہی ہے اور اگر خوف ہی خوف ہو کہ رہا نہ رہے اور نا امیدی تک ذہن پر پہنچ جائے تو یہ کفر ہے اس سے معصیت چھوڑتی نہیں بلکہ آدمی یہ سمجھ کر کہ طاعت سے کیا ہوگا زیادہ معصیت میں پڑ جاتا ہے۔ میں نے خود دیکھا ایک مغلوب کو تہب معلوم ہوا کہ شریعت میں جو توسط ہے اُس میں یہ مصلحت ہے۔

ایک وکیل صاحب گھنٹے نماز روزہ کے خوب پابند تھے۔ خوف غالب

ہوا تو عجیب حالت ہوئی پریشان ہو گئے۔ ایسی حالت تھی کہ زبان سے بات ٹھیک نہیں ادا ہوتی تھی۔ قریب تھا کہ نماز بھی چھوڑ دیں اور یہ سب کچھ ہوا تھا ایک کتاب کو دیکھ کر۔

کتابوں کو بطور خود دیکھنے میں یہ تخریبی ہے۔ لوگ کہتے ہیں استادوں کے نخرے کون اٹھائے۔ عبارت اردو ہوتی ہی ہے اس کے سمجھنے میں کیا وقت ہے کیونکہ اردو ہماری زبان مادری ہے۔ اگرچی بات ہے، تو ہر شخص جس فن کا چاہے بلا استاد پورا عالم بن سکتا ہے۔ کتابیں ہر فن کی موجود ہیں حالانکہ مشاہدہ اور تجربہ اس کے خلاف ہے۔

جائے استاد خالی است

وہ یہ ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کتاب میں ایک جگہ نہیں لکھی جاسکتیں۔ ہر بات علیحدہ علیحدہ لکھی جاتی ہے۔ ابواب و فصول اسی لئے متفرق کئے جاتے ہیں اور اگر ایک جگہ متفرق باتیں لکھ دی جائیں تو کتاب کی ترتیب میں فرق آجائے اور ڈھونڈنے والوں کو بڑی وقت پیش آئے۔ کوئی خاص مضمون کہاں تلاش کریں۔ مثلاً نماز و روزہ و زکوٰۃ کے مسائل کتب فقہ میں بلا تفصیل ابواب کی تقسیم جمع کر دیے جائیں تو کس قدر وقت ہو جائے کہ ایک ذرا سے مسئلہ کی ساری کتاب پر نظر ڈالنی پڑے۔ جملہ علوم و فنون میں یہی حالت ہے کہ کتاب میں متفرق مضامین ایک جگہ نہیں لکھے جاسکتے۔ تو بطور خود کتاب دیکھنے والے کو اگر کوئی شبہ واقع ہو تو اگرچہ حل اس کا کتاب میں کہیں مذکور ہو مگر چونکہ اس کو اطلاع نہیں ہے کہ وہ حل کہاں مذکور ہے اس لئے دل میں وہ اشکال

جم جاتا ہے اور ایسا اوقات یہ خیال ہو جاتا ہے کہ کتاب میں غلط لکھا ہے مصنف خود نہیں سمجھا۔ حالانکہ کتاب میں غلطی نہیں ہے سمجھ کا تصور ہے۔ جو شبہ ذہن میں آیا ہے وہ کسی دوسری بحث کے مناسب کتاب میں اس باب میں اس کا حل ہوگا۔ اور پڑھانے والا تمام کتاب پر حاوی ہوتا ہے۔ منتعلم کے شبہ کرنے سے یا از خود تنبیہا ہر موقع پر اس کی ضروریات کو بتاتا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں سبقاً سبقاً پڑھنا چاہئے اور فنون کی کتابوں سے زیادہ تصوف میں خاص کہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بلا استاد کبھی مطالعہ نہ کرے۔ دیگر فنون میں تو یہ ہے۔ بہت سے بہت بطور خود دیکھنے سے وہ فن نہ آئے گا اور تصوف

میں خطرہ ہے کہ آدمی ہلاکت میں پڑ جائے اور ایمان جاتا رہے۔

گر وہی صد سال در راہ طلب

راہبر نبود سیرہ حاصل زان تعب

گر ہوائے این سفر واری ولا

وامن رہبر بگیر و پس برآ

در ارادت باش صادق ارے فرید

تا بیابی گنج عرفان را کلید

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق

عمر بگذشتت او نہ شد آگاہ عشق

ان ویل صاحب نے احیاء العلوم کی کتاب الخوف کو دیکھا تھا اور ایک

مقام کو نا تمام سمجھے اس سے ایسا خوف دل میں بپٹھا کہ بات نہ کر سکتے تھے

اور پینداڑ گئی۔ مگر یہ خیریت تھی کہ آپ ہی آپ کوئی رائے قائم نہیں کی جیسا کہ

آج کل عادت ہے کہ بزرگوں کے اقوال کتابوں میں دیکھ کر کسی واقف کار

سے ان کے سمجھنے کی کوشش تو کرتے نہیں، اپنی طبیعت سے جو چاہتے ہیں

حکم لگا دیتے ہیں حتیٰ کہ اُن بزرگوں سے بد عقیدہ ہو جاتے ہیں اور وہی تباہی
 کلمات بکنے لگتے ہیں یا اس کے موافق غلط عقیدہ رکھ کر خراب ہوتے ہیں۔ میرٹھ
 پاس آئے کہ کچھ امید نہیں کچھ ہی کرے کہ جنت ملے گی۔ تمام عمر گوشش کرے
 اور دنیا کو تلخ کر دے مگر کتاب کا لکھا ہوا اگر پرچ ہے تو خاتمہ ذرا میں بگڑ سکتا ہے
 جس وقت میرے پاس کتاب لے کر آئے تو یہ حالت تھی کہ ہاتھ کانپتے تھے
 زبان لڑکھڑاتی تھی۔ کتاب کی عبارت نہ پڑھی جاتی تھی۔ جیسے کسی کو پھانسی کا
 حکم سنا دیا جائے۔ اس وقت یہ بات سمجھ میں آئی کہ حد سے زیادہ غلبہ خوف
 اچھی چیز نہیں۔ میں نے اور مقام اسی کتاب کے دکھلائے۔ بھلا اللہ! اُن کے
 سب شے حل ہو گئے اور قلب کو سکون ہوا۔ کہنے لگے آپ نے مجھے بچا
 لیا۔ جانے کیا ہوتا میری جان نہ رہتی یا ایمان جاتا۔ لکھا کتاب ہی میں سب کچھ
 ہے مگر دوسرے سے مدد لینے کی ضرورت سے۔ لکھنے والوں نے حتیٰ الامکان
 سہولت اس قدر کر دی ہے کہ اکثر جگہ شبہات بھی حل کر دیئے ہیں لیکن پھر
 بھی استاد کی ضرورت باقی ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات کسی حقیقت کا زیادہ

خوف محمود

انکشاف بھی مضر ہو جاتا ہے۔ جیسا اُن وکیل صاحب پر استغناء

حق زیادہ متعلیٰ ہوا اور یہ حالت ہوگی۔ اسی واسطے بزرگان دین نے فرمایا ہے
 کہ جیسے تجلی رحمت ہے استنار بھی رحمت ہے۔ واللہ! اگر تجلی تام ہو جائے تو
 قوائے عالم ہو جائے یا جان جاتی رہے یا ایمان جاتا رہے۔ میں نے خود
 دیکھا وکیل صاحب کو کہ قریب تھا کہ نماز تک چھوڑ دیں۔ وہ یہ کیا تھی صرف غلبہ خوف

اس واسطے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خشيتك ما تحول به بيننا وبين معاصيك۔ صرف اتنا خوف چاہتے ہیں کہ معصیت کو مانع ہو اتنا نہیں چاہتے کہ ہم مشغول نہ ہوں۔ معلوم ہوا کہ خوف محمود وہی ہے جو معصیت سے روکے اور جو خوف خود باعث معصیت ہو جائے وہ معصیت کی طرح بُرا ہے۔

اسی واسطے لکھا ہے کہ بڑھا پلے میں امید غالب رکھے اور جوانی میں خوف بڑھے آدمی سے ویسے ہی کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر اور خوف غالب ہو جائیگا تو وہ سبھی مانتھ پیر پھول جابیں گے اور امید میں کچھ نہ کچھ کٹے رہی جائے گا اور جوانی میں قوت ہوتی ہے خوف کا تحمل ہو سکتا ہے جتنا خوف زیادہ ہوگا نفس کو تنبیہ ہوگی۔ معصیت سے اجتناب ہوگا۔ اور اعمال حسنہ کی کوشش کرے گا۔ ہر وقت کے واسطے تدبیر جایا گا نہ ہے۔ باطن طب بھی ظاہری طب کی طرح ہے۔ کبھی دوا سرد دیتے ہیں کبھی گرم۔ کبھی تنقیہ کرنا پڑتا ہے کبھی تقویت۔ اسی طرح باطنی امراض کی تدبیریں بھی مختلف ہیں۔

معلوم ہو گیا ہوگا کہ خوف معین ہے اور ترک خواہشات اصل۔ اب صاف ہے کہ خاف مقام ربہ ذریعہ ہے اور مقصود نفی النفس ہے۔ ذریعہ اسی حد تک محمود ہوتا ہے کہ مقصود تک پہنچائے اور اگر ذریعہ کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ مقصود فوت ہونے لگے تو یہ مذموم ہے کیونکہ ذریعہ ذریعہ نہ رہا۔ خوف اسی قدر چاہئے کہ نفس کو تنبیہ ہو۔ پس خلاصہ طریق کا ترک ہوا ہے اور خوف اس کا معین اور یہی حاصل ہے اس کے رکنا۔

ضرورت غور و فکر

اب دیکھو کہ نوکر کو یہ بتا دینا کہ ناشناسا کو اندر نہ لائے
دینا کہتے ہیں ذرا سا ہے کرنے میں بہت ہے جو

کام کہ فہرست بتانے سے نکلتا وہی اس سے نکلتا ہے بلکہ فہرست میں
افراد محدود ہو جاتے۔ اگر ان کے سوا کوئی ناشناسا آنے والا ہوتا تو اس کو منع
کر سکتا اور اس لفظ کے بعد ایک کے منع سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور
کسی تعداد تک ناشناساؤں کی حد نہ رہی۔ اسی طرح حق سبحانہ تعالیٰ نے گھر بنا
کہ اگر سوچے تو ولی ہو جائے۔ ایک فرد بھی نافرمانی کا اس سے خارج نہیں
دیکھئے نافرمانی ہوتی کیوں ہے۔

مثلاً نماز پڑھی یا تاخیر کر کے پڑھی یا بے توجہی ہوئی۔ حضور قلب کے
ساتھ ادا نہ ہوئی۔ اگر غور کیا جائے تو سبب اس کا ضرور ایسا نکلے گا کہ منجملہ افراد
خواہش نفسانی کے ہوگا۔ فرض کیجئے کہ نماز نہ پڑھنے کا سبب یہ ہو کہ نیند آ رہی
تھی۔ عشاء کا وقت ہوا مگر آرام میں خلل گوارا نہ ہوا۔ سو کہ صبح کر دی۔ آرام اور تازگی
پوری خواہش نفسانی ہی ہے۔ تاخیر بھی اکثر جب ہی ہوتی ہے کہ آدمی دوسرے
کسی کام میں لگا ہوا ہو۔ اس کام کے اوصاف میں رہ جانے سے نقصان مال
اندیشہ ہوتا ہے اس نقصان کو گوارا نہ کیا اور نماز میں تاخیر کر دی۔ یہ سبب
ہے کہ منجملہ خواہشات نفسانی ہے۔ اسی طرح نماز میں بے توجہی بھی جتنی ہو
کہ جب تو خبر دوسری طرف ہو۔ توجہ کا ایک طرف نہ رہنے دینا بھی نقصان ہی
کام ہے۔ اس کی خواہش سے ہوتا ہے۔
غرض کسی نے ترک طاعت کیا یا از کتاب معصیت تو صرف نفسانی

خواہش سے۔ اس کے اندر سبھی کچھ آگیا۔ ہر چیز میں خیال رکھے کہ نفس کی خواہش ہے یا نہیں۔ جب اس پر کوئی محافظت کرے گا تو ممکن نہیں کہ اس سے معصیت ہو سکے۔ کھوڑے دونوں عادت ڈالنے سے اس کا نفع معلوم ہو سکتا ہے۔ ہر کام کو کرتے وقت سوچ لیا کیجئے کہ اس میں نفس کو لذت آتی ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ ضرور ایک فریب معصیت کا ہے۔ پھر اس لذت سے مغلوب نہ ہو جاویئے اور اس کی مصرت کو پیش نظر رکھئے۔ اکثر گناہوں میں سب جانتے ہیں کہ مصرتیں ہیں مگر پھر خواہش نفسانی سے مغلوب ہو کر اس کو کرتے ہیں۔

مثلاً غیبت کرنے والا جانتا ہے کہ اگر اس شخص کو نمبر پہنچ گئی تو مجھ سے لڑائی ضرور ہوگی اور بہت سے نقصان پہنچیں گے۔ نفع تو کوئی مرتب نہ ہوگا مگر پھر کرتا ہے اور کرنے سے طبیعت کو سکون ہوتا ہے جیسے کسی سے بدلا لے لیا۔ یہ خواہش نفسانی ہی ہے جس کے سامنے مصرت کا خوف بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ ایسے بھی پرہیزگار ہیں کہ خود غیبت نہیں کرتے مگر سنے میں مزہ آتا ہے بہت کیا تو جب کسی نے غیبت کی، رفع الزام کے لئے کہہ دیا، میاں جانے دو اور پھر غبت کے ساتھ سُن رہے ہیں، دل میں سمجھ رہے ہیں کہ میں غیبت سے محفوظ ہوں۔ بہت احتیاط کرتا ہوں۔ دوسرے کو بھی منع کر دیتا ہوں زنا تو نبی برتاؤ اللہ میاں سے، جناب اللہ میاں کو دل کی بھی خبر ہے۔

کاربا اور راست باید داشتن رایتِ اخلاص و صدقِ افراشتن

فرب نفس اور اتباع نفس | فقط زبانی باتوں سے کیا کام چلتا ہے اگر ان کے باپ کو کوئی گالیاں دینے لگے

تو کیسے لڑنے لگیں گے۔ ممانعت اس کو کہتے ہیں۔ اس وقت یہ نہ ہو گا کہ ایک دفعہ اُسے منع کر دیں اور پھر بیٹھے سنتے رہیں۔ حضرت اس منع سے برائت نہیں ہوتی۔ غیبت میں یہ بھی شامل ہے۔ دیکھئے کہ بعد ممانعت کے اگر وہ خاموش ہو جائے تو اُن کے دل میں اشتیاق و انتظار رہتا ہے۔ ظاہر غیبت نہ کی سہی، ظاہر بینیوں کی نگاہ میں پرہیزگار بن جائیں مگر باطن میں تو یہ مرض موجود ہے۔ نفس نے جو خواہش کی تھی اُس کا ظاہر تک اثر نہ آیا سہی قلب میں تو اُس سے التذاذ اور اُس کی طرف میلان عزم کے ساتھ موجود ہے۔ یہی اتباع نفس ہے۔ عرض سوچنے والا سمجھ سکتا ہے کہ معصیت کس حد تک ہوگی۔ جہاں تک خواہش نفسانی پائی جائے۔ یہ ایسا جامع لفظ ہے۔ کوئی فرد معصیت اس سے باہر نہیں جاسکتا۔ جب کوئی معصیت ہوگی خواہش نفسانی سے۔ بُرائی باوجودیکہ ظاہر ہے مگر نفس کی چال میں بڑے بڑے ہوشمند آجائے ہیں۔ کوئی چیز نہشت میں مثلاً ہلنے لگے تو نفس ضرور بتاتا ہے کہ فلاں فلاں کام تجھے کرتے ہیں اُن کے لئے اتنے خرچ کی ضرورت ہے اور ساتھ ساتھ تاویل ذہن میں آتی ہے کہ یہ شخص خوشی سے دیتا ہے اور تجھے ضرورت ہے ہی اس وقت لے لینا چاہئے۔ پھر اللہ میاں کہیم ہیں یہ ضرورتیں بھی رفع ہو جائیں گی اور پھر تو بہ سے گناہ بھی نہ رہے گا۔ کیسی اچھی بات ہے۔ حضرت یہ سب تدبیریں ہیں جن سے نفس چال میں پھانستا ہے اور اس تاویل کی ضرورت اُس وقت ہوتی ہے کہ جب دل میں خوف ہوتا ہے ورنہ تاویل کی بھی کون سی ضرورت ہے اور اتنی دیر کب گوارا ہے۔ گروں پکڑ کر حکم دے دیا کہ رقم ہرگز جانے نہ پائے

بس اس کی تعمیل ہو گئی۔ ماں جن کو محتاط پاتا ہے اُن کے لئے خواہ مخواہ کی ضرورتیں پیدا کر دیتا ہے اور سمجھا دیتا ہے کہ ان کو پورا کرنا ہے۔ حالانکہ یہ اسراف ہے مگر ضرورتیں ایسی تلاش لیتے ہیں کہ اس کو اسراف بھی نہیں سمجھتے آج کل کے عقلمند اس مرض میں بہت مبتلا ہیں۔

مجھے ایک شخص ملے اور خوش خبری سنائی کہ لڑکا نائیب تحصیلدار ہو گیا میں نے کہا بڑی اچھی بات ہے اب ذرا صاحبزادہ کو یہ تہنید کیجئے کہ اسراف نہ کریں۔ کہا جناب کچھ سامان تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی آمدورفت ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چار بھلے مانس آکر بیٹھیں اور میز کریسی لیمپ وغیرہ گھنٹیا رکھے ہوں یا مکان شاندار نہ ہو

اسراف اور فیشن یہ اسراف ہے جسے ضروری سمجھ رکھا ہے حالانکہ ضرورت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک واقعی اور ایک فرضی۔ واقعی ضرورت کی تو انتہا ہو سکتی ہے اور فرضی ضرورت کی کہیں انتہا نہیں ظاہر ہے کہ فرضی میں بے انتہا گنجائش ہے۔ فرض میں محالات تک بھی آ سکتے ہیں۔ جب فرضی ضرورت کی کوئی انتہا نہیں تو اس کے رفع کے لئے کون سی رقم کافی ہو سکتی ہے۔ دنیا میں جو بھی رقم لی جائے گی تنہا ہی ہوگی۔ پھر تنہا ہی لا تنہا ہی کے برابر کیسے ہو سکتی ہے۔ اسراف معصیت تو ہے ہی اور وبال آخروی تو آخرت میں ہوگا مگر دنیا میں بھی اس کا نتیجہ دیکھ لیجئے کہ خاندان کے خاندان اس کی بدولت تباہ ہو گئے۔ ایک شادی بھی جس نے کی اس میں فرضی ضرورتیں پوری کیں تو نقدی اور جائداد اور مال و متاع سب اس کی نذر کر دیا

اور پھر بھی پورا نہ ہوا قرض لے کر مشکل آبرو بچائی۔ پھر اس قرض کے بعد چندے
 آبرو بھی گئی۔ ذرا سا خلتہ سے یا بسم اللہ ہے اور اس کے لئے ایک بڑی رقم
 کی ضرورت ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں سے آنی چاہئے خواہ رشوت لے کر ہو یا
 سودی قرض لے کر ہو یا گھر بیچ کر۔ ایسا نہ ہو کوئی رسم رہ جائے۔ یہ سب
 فرضی ضرورتیں ہیں۔ بیوی کے کان میں پانچ سوکانہ لودہ ہو خواہ میاں کی اوقات
 وہ ہی پیسہ کی کیوں نہ ہو۔ کہیں سے پانچ سو لاؤ تب منہ دکھاؤ۔ میرزہ سی پوٹاک
 سب قاعدے ہوں۔ ایسا نہ ہو کوئی بڑا آدمی انہیں چھوٹا کہہ دے۔ حضرت
 بڑے آدمی کو یہ بھی تو معلوم ہو گا کہ میاں کی اوقات صرف پچاس ہی روپیہ کی
 ہے پھر بڑا کیسے کہہ دے گا۔ یہ ضرورت نہیں صرف فیشن ہے۔
 لطف یہ ہے کہ علماء و سمول کو منع کرتے ہیں تو یہ لوگ ان کے شریک
 ہو جاتے ہیں اور بڑے شکر گزار ہوتے ہیں کہ صاحب یہ تو آپ بڑا کام کہتے
 ہیں کہ فضولیات کو چھوڑ اتے ہیں۔ کیا ضرورت ہے کہ اتنا سونا لاد لیا جائے
 جس سے کان کٹ پڑیں۔ یہ روپیہ کسی ایسے کام میں کیوں نہ لگایا جائے جس
 سے اس المال محفوظ رہے اور چار پیسے اور ملنے لگیں۔ تجارت کی جائے یا
 جائد اور خرید لی جائے۔ شادی کی رسمیں مطلقاً چھوڑ دی جائیں۔ اس روپیہ سے
 لڑکی کے لئے کوئی صورت بسرا اوقات کی کیوں نہ کر دی جائے۔ آتشبازی
 وغیرہ سے ذرا سی دیر کا حفظ نفس نہ ہو انہی سے ہی۔ عرض علماء کی تائید کرتے ہیں البتہ
 پرانی وضع کے لوگوں کو ضرور شاق ہوتا ہے۔ اور ان نئے فیشن کے لوگوں کو
 جب ترک دین آسان ہو تو رسم دنیا کیا۔ یہ لوگ ساخڑ دیتے ہیں اور بھولے

سیدھے لوگ خوش ہوتے ہیں کہ یہ بھی علماء کے ہم خیال ہیں۔ بڑی باتوں سے منع کرتے ہیں۔ چوری ان کی پکڑی گئی کہ رسموں سے بیوی کو روکتے ہیں اصلاح میز و کرسی کے لئے نہ اس کے لئے کہ اسراف نہ ہو یا روپیہ کسی منفعت کے کام لگے۔ بلکہ اس لئے کہ ادھر سے روپیہ بچے تو اپنے فیشن کو درست کریں میز و کرسی سے کمرہ سجائیں۔ مار مو نیم باجا منگائیں کوئی نیلام سے خالی نہیں جاتا بیوی پر تو تقاضا ہے کپڑا کم پہنو۔ سال بھر کے لئے صرف دو جوڑے کافی ہیں اپنے گھر میں سب طرح بسر ہو سکتی ہے۔ بہت کرو کہیں جانے کے لئے ایک اجلا جوڑا بنا لو۔ زیور جو کچھ میکہ سے لائی ہو وہی کیا کھوڑا ہے۔ بہت ہوں اچھی نہیں ہوتی۔ سادگی کے بھی خلاف ہے۔

ایک صاحب نے بیوی سے کہا ہم کمانے کمانے مرے جانتے ہیں اور تمہیں ذرا خیال نہیں۔ جتنا آتا ہے سب خرچ ہو جاتا ہے ایک پیسہ نہیں بچتا۔ خرچ میں کمی نہیں کرتی۔ بیوی نے کہا، میرے یہاں کوئی بازار کی چاٹ نہیں آتی۔ کوئی چیز ضرورت سے زائد نہیں منگاتی۔ کسی کو ایک پیسہ تمہاری بلا اجازت میں نہیں دیتی۔ جو کچھ خرچ ہے تمہارا ہی ہے۔ میں کس چیز میں زیادہ خرچ کرتی ہوں۔ اور کون سے خرچ میں کمی ہو سکتی ہے۔ کہا نہیں تم نے خرچ بڑھا ہی رکھا ہے۔ اگر مانتہ رکھو تو اس کی تنخواہ اور خوراک بچے یا نہیں۔ ہم ایک چکی خریدیں خود میں لیا کر و اور روز کی پسینہاریوں کی وقت نہ رہے اور پسائی کے دائم بچیں اس میں تمہارا ایک اور بھی نفع ہے کہ تندرستی اچھی رہے گی۔ ریاضت کرنا آدمی کے لئے بہت ضروری اور مفید ہے۔ گھر کی لیب پوت بھی خود کر لیا کر و ذرا

ذرا سے کاموں کے لئے مزدور ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ ان سب ترکسپول سے
ایک کافی رقم بچ سکتی ہے۔ مختور رہی مختور کر کے بہت ہو جاتا ہے مگر حسب
تمہیں خیال ہو۔

غرض بیوی کو سب مددوں میں تحفیف کی تدبیریں بتانی جاتی ہیں۔ وہ بیوی
بیچاری گلا گھونٹنے کے لئے ہے۔ ہر طرح بسر کر سکتی ہے۔ مگر تمہاری کسی تدبیر
ذرا بھری نہ ہو۔ مگر وہ میں معمولی لیمپ سے کام نہ چلے برقی لیمپ ہونا ضروری
اور وہ بھی بقدر ضرورت نہیں بلکہ دس پانچ رکھے رہیں۔ نازک چیز سے شاید کوئی
ٹوٹ جائے تو دوسرا موجود ہے۔ اور ان میں بھی آج ایک نئی ایجاد ہو جائے
تو پہلے خریدے ہوئے سب ردی ہیں۔ اب نئے طرز کے خریدنے سے
و علی ہذا۔

بیوی کے لئے تو زیادہ بھی اسراف ہے اور آپ کے لئے کوئی چیز
بھی اسراف نہیں۔ بیوی کا اسراف ایک طرح کا ہے پرانے فیشن کا اور میاں
کا اسراف دوسری طرح کا ہے نئے فیشن کا۔ دونوں کو چھوڑو و نرکت اللات
والعزیزے جمیعاً۔ یہ سب فضولیات ہیں جن کو نفس ضروری بتا کر طلب کرتا
ہے۔ ان کی تکمیل خواہش نفس کی تعمیل ہے جس میں بڑے بڑے عقلمند گرفتار
ہیں۔ معلوم نہیں عقل کس طرح روار کھتی ہے کہ اپنے آپ کو دشمن کے ہاتھوں
دے دیا جاوے جس کی دشمنی دنیا میں بھی ظاہر ہو چکی۔ اسراف کے نتائج
آپ نے دیکھے ہی لئے۔ مسلمان کا کام تو یہ تھا کہ ہر کام میں پوچھتا کہ حق تعالیٰ
کا کیا حکم ہے بجائے اس کے ہر کام میں شیطان اور نفس سے پوچھتا جاتا

کہ سرکار کا کیا حکم ہے اور جو اس نے کہہ دیا ہے وہ صحرک کر ڈالا خواہ اللہ کے خلاف
یا رسول کے۔

احسانات اور کفران نعمت | مسلمانوں کیا جواب ہوگا اگر پوچھا جائے گا
الما عہد الیکم یا بنی آدم

ان لا تعبدوا الشیطان انہ لکم عدو و بین و ان عبدونی

هذا صراط مستقیم و لقد اضل منکم حیلاً کثیراً ان لم

تکونوا تعقلون هذه جہنم الیٰ کنتم بہ توعدون

پوچھیں گے اے نبی آدم کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ

شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا دشمن ہے۔ میری عبادت کرنا

یہ بیدعا راستہ ہے اور دیکھ چکے تھے کہ بہتوں کو اس نے گمراہ

کر دیا تھا۔ کیا تمہیں عقل نہ تھی اب یہ ہنم موجود ہے۔

میں کہتا ہوں اگر صرف پوچھا ہی جائے اور دوزخ نہ بھی ہو تو یہ کیا ٹھوڑا

ہے کہ کہا جائے کیوں صاحب ہمارا عہد یاد ہے۔ ہم سے تعلق قطع کر کے

باوجودیکہ ہم ہر وقت مہربان بنتے اس سے جوڑا جو ہر وقت دشمن تھا۔ اس کا

جواب کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ نجالت اٹھانی پڑے۔ دنیا میں تو

قاعدہ مسلمہ ہے کہ بھلائی کا بدلہ بھلائی مگر اللہ میاں کے ساتھ معاملہ برعکس کیا جاتا

ہے۔ جس قدر اس طرف سے احسانات زیادہ ہوتے ہیں اسی قدر اس طرف

سے کفران نعمت ہوتا ہے جس قدر ادھر سے ساتھ دیا جاتا ہے اسی قدر ادھر

سے قطع کیا جاتا ہے اور بمقابلہ محسن کے دشمن کی پیروی ہوتی ہے۔ دشمن نے

۱۲
 جس چیز کا حکم کر دیا اس کو کہا جلتا ہے کہ اس کی ضرورت ہے اور اللہ میاں نے
 جس کا حکم کیا وہ قدرت سے باہر ہے اور ترقی سے روکنے والا ہے۔ حضرت
 یہ چیزیں جن کو نفس ضروری ثابت کرتا ہے ان میں انہماک سے حق تعالیٰ
 سے بعد بڑھتا ہے اور غفلت پیدا ہوتی ہے۔

عاقبت ساز و ترازیں بری این کن آرائی و این کن پروری
 باہواؤ آرزو کم یا ش دوست چوں بفلک عن سبیل اللہ دوست
 تا ہوا تازہ است ایماں تازہ نیست
 چوں ہوا جز نقل آل دروازہ نیست

دیکھو ایک جگہ کیا شکایت فرماتے ہیں۔ ارایت من اتخذ اللہ ہوا
 اس شخص کو بھی دیکھا تم نے جس نے اپنا مجبوری خواہش نفسانی کو بنایا۔ ہم کو چھوڑ کر
 اپنے دشمن کی اطاعت اختیار کی۔ تعجب ہے کہ اللہ میاں نے انبیاء علیہم السلام
 کو بھیجا احکام کی مصلحتیں بتائیں اور سمجھایا اور خاک نہ سنا۔ اور نفس نے اندر
 سے ایک شہرہ چھوڑ دیا کہ افعول بگذا۔ بس ایسی بیعت کی ہے کہ کوئی ضرورت
 نہیں دل کی اور کچھ حاجت نہیں مصلحت دریافت کرنے کی جو حکم ہوا، فوراً
 تعمیل۔ اللہ میاں کے احکام میں کبھی ہر ہر بات کی علت و مصلحت ہی جاتی
 ہے اور اس کی مصلحت پوچھی جاتی ہے۔ حالانکہ شرائع میں علل اور مصالح ضرور
 ہیں مگر ہر شخص کی عقل نارسا کی رسائی تو وہاں تک نہیں۔ پھر ہم کو علت نکالنے
 کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب دلیل صحیح سے ثابت ہو گیا عمل کر لیا۔ کبھی اس
 میں گنجائش نکالی جاتی ہے کہ کیوں صاحب اس کے خلاف کرنے میں کچھ

اسلام سے تو خروج نہیں ہوتا۔ پس جب اسلام سے خروج نہیں ہوتا اور نفس کا حکم خلاف پر ہے ہی جس کو ضرورت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، پھر کیوں نہ کیا جائے۔ یہ حالت بھی ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام کا کسی قدر پاس ہے اور دعویٰ ہے کہ ہم شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہتے۔ رخصت شریعت شاید منحصر فرد واحد ہے یعنی وہ عمل جس میں خروج عن اسلام ہی لازم آجائے۔ اور جو لوگ کہ پورے آزاد ہیں ان کو تو دلیل غیر دلیل سے بحث ہی نہیں۔ ان کے نزدیک گویا خود احکام کا خلاصہ ہوا ہے نفس ہی ہے اللہ میاں کے احکام کوئی چیز ہی نہیں۔

جو لوگ اسلام کا پاس رکھتے ہیں ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیوں صاحب جس قدر جتنیں اللہ میاں کے احکام میں ہوتی ہیں اگر نفس کے حکم میں ہوتیں تو کیا حرج تھا۔ اتنی حجت تو کیا اگر نفس سے خواہش کے وقت صرف اتنا ہی پوچھ لیا کریں کہ اس میں کیا مصلحت ہے جس کی وجہ سے اختیار کیا جائے اور پھر مصلحت میں غور کر لیا کریں کہ واقعی ہے یا فرضی تب بھی تو بہت سی برائیوں سے حفاظت ہو جائے۔ مگر کہاں، اس کے تو ہاتھ میں ایسی باگ دی ہے کہ جب وہ کہے چل چلنا پڑتا ہے اور جب کہے ٹھہر ٹھہرنا پڑتا ہے۔ نفس اگر خندق میں گرے تو خندق ہی میں گرنا پسند ہے اور اگر آسمان پر چڑھ جائے تو آسمان پر چڑھنا قبول ہے اللہ میاں نے ایک حکم کیا کہ اس میں مصلحت تھی۔ اس کو نہ کیا اور نفس نے ایک خواہش کی جس میں سراسر مضرت تھی اس کو کر ڈالا۔

ایک تاجر سے کوئی سوکا مال بچیں اوپر سو کو خریدتا تھا مگر نہ دیا اور دیا کہا

جہاں بچیں اور کم ملے۔ نہ معلوم اول خریدار سے اس کو اتنی منافرت کیوں ہے۔ اس کو اتنا خیال کچھ نہیں زیادہ دیتا ہے گویا اپنا نقصان کرتا ہے کہ تجارت میں کچھ اس کے پلے پڑ رہے اور ان کو ایسی ضد کہ اپنا مال بھینکیں گے اور خسارہ ہی دیں گے مگر تمہاری مخالفت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ افسوس!

معصیت کی دنیاوی مضرتیں

خواہش نفسانی وہ بڑی چیز ہے کہ دنیا کی بھی خرابی اور دین کی بھی صدمہ

معصیتیں ہیں کہ ان میں دنیاوی نقصان ہیں۔ معصیت میں دنیا کی بھی مضرتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ میاں ساٹھ چھوڑ دیتے ہیں۔ آدمی اسباب کو جمع کرتا ہے مگر وہ اسباب مودی الی السبب بہت کم ہوتے ہیں۔ ہر کام میں پریشان رہتا ہے بعض آدمی ذرائع کم رکھتے ہیں اور کام زیادہ نکلتا ہے۔ اس کے برعکس اس کو ذرائع زیادہ رکھنے پڑتے ہیں اور کام اتنا بھی نہیں ہوتا۔

ایک یہ کہ رزق میں تنگی ہوتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ ہم پر تو تنگی نہیں میں کہتا کہ رزق سے مقصود کیا ہے، اطمینان! یہ معصیت کے ساٹھ حاصل نہیں ہوتا۔ اطمینان فراغ قلب کا نام ہے۔ ناجائز طریق سے کتنا ہی مال حاصل کر لیجئے مگر جو نشاط اور بے فکری قلب کو ٹھوڑے حلال کے مال سے ہوتی ہے وہ ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسی بات ہے کہ تجربہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے و جہانی سی بات ہے۔

پرسید کیے کہ عاشقی حبیبت گفتیم کہ چو ماشوی بدانی

عین محض کو کتنا ہی سمجھاؤ کہ عورت کی یہ لذت ہوتی ہے مگر وہ ہرگز

نہ سمجھے گا اور اٹاٹھ نہیں کو بیوقوف بنائے گا۔ اگر اُس کو سمجھانے کی کوئی تدبیر ہے تو بس یہ کہ اُس کا علاج کرو۔ جب وقت رجولیت پیدا ہو جائے گی آپ بیوقوفی اور عقلمندی کو سمجھ لے گا۔ معصیت کو چھوڑ کر طاعت اختیار کرو۔ دیکھو قلب میں کیا بات پیدا ہوتی ہے۔ آشکارا ہو جائے گا کہ اطمینان یہ چیز ہے۔

اس پر دلیل فلسفی بھی ہے۔ وہ یہ کہ معصیت کرنے والا غیر اللہ کا طالب ہے۔ اور اس تک پہنچ جانا اور اُس کو پالینا ضروری نہیں اور مطیع طالب ہے اللہ میاں کا اور وہ ہر وقت اس کے پاس ہیں۔ ادھر سے ذرا سی کوشش چاہئے اور اُس سے خود کرم فرماتے ہیں غیر اللہ کی طلب پر۔ چونکہ نتیجہ کا ترتیب ضروری نہیں اس لئے کامیابی نہیں ہوتی اور دل کو فراغ حاصل نہیں ہوتا اور اللہ میاں کی طلب پر نتیجہ مرتب ہو جاتا ہے اس لئے قلب کو راحت ملتی ہے۔ اسی کا نام اطمینان اور فراغ ہے۔ طاعت وہ چیز ہے کہ اُس کی لذت وہی جانتا ہے جو پاتا ہے۔ ساہا تو سنگ بودی دل خراش آزمون ایک نہ مانے خاک باش اے غافل پتھر تو برسوں رہا ہے امتحان کے لئے ذرا دیر خاک ہو کر بھی دیکھو۔

پھر تو پتھر ہونے کا نام بھی نہ لے گا۔ خاک ہونا وہ چیز ہے کہ خاک ہو کر پتھر ہونا کسی نے قبول نہیں کیا۔ اور پتھر بہتر سے خاک ہو گئے۔ طاعت وہ چیز ہے کہ جب تک کسی نے کی نہیں سمجھی تک وہ علیحدہ ہے۔ جہاں چھوڑی سی بھی کی پھر طاعت خود اس کو نہیں چھوڑتی۔ وہ چھوڑنا چاہتا ہے مگر یہ دوڑ دوڑ کر

لیتی ہے۔ کر کے دیکھو۔ امتحان ہی سہی۔

طاہر کا اثر | میں کہتا ہوں امتحان کرنے سے تو اثر کیا بھولے سے
بھی طاہر اگر ہو گئی تو اثر ضرور کرے گی۔ کپڑا بھولے

سے رنگ میں گر جائے تو گو وہ بات نہ آئے گی کہ اگر کوئی قصداً رنگتا مگر وجہ
تو ضرور ہی پتہ جائیں گے۔ تجربہ ہوا ہے کہ لوگوں کو دھوکے سے طاہر ہو گئی اور
اثر ہو گیا۔

قصہ مشہور ہے کہ ایک چور بادشاہ کی لڑکی پر عاشق تھا۔ ایک دن کہیں
چوری کے ارادہ سے بادشاہ کے یہاں پہنچ گیا۔ وہاں بادشاہ اور بیگم میں اسی لڑکی کی
شادی کی نسبت گفتگو تھی بادشاہ کہہ رہے تھے کہ میں تو اس کی شادی کسی ایسے
شخص سے کروں گا کہ نہایت عابد و زاہد اور متقی ہو۔ یہ چور صاحب چوری تو بھول
گئے اور بہت غنیمت سمجھا کہ آج خوب کام بنا۔ وہاں آکر ایک مسجد میں جا بیٹھے
اور دن رات عبادت کرنا شروع کی۔ تہجد بھی، اشراق بھی، چاشت بھی، غرض عبادت
ہی سے کام تھا۔ لوگوں میں شہرہ ہوا کہ ایک بڑے عابد صاحب تشریف لائے
ہیں۔ رفتہ رفتہ تمام شہر میں ان کی شہرت ہو گئی۔ ادھر بادشاہ نے آدمی تعینات کر
رکھے تھے کہ دیکھو شہر میں سب سے زیادہ عابد و پیر ہیزگار کون ہے۔ ان مخبروں
نے خبر دی کہ ایک عابد صاحب فلاں مسجد میں قیام رکھتے ہیں۔ ان سے زیادہ
متقی و پیر ہیزگار کوئی نظر نہیں آتا۔ بادشاہ نے خاص وزیر کو ان کے پاس پیغام
دے کر بھیجا۔ اور یہاں کام ہو چکا تھا۔ انہوں نے التفات بھی نہ کیا۔ خبر وزیر
نے نہایت ادب سے پیغام شاہی منایا۔ کہا دراصل نیت تو میری فاسد تھی اسی

عزمن سے عبادت شروع کی تھی مگر حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا۔ اب مجھے نہ آپ کی بیٹی کی ضرورت ہے نہ آپ کے جاہ و حشم کی۔ بس تشریف لے جائیے اور میرا وقت ضائع نہ کیجئے۔

طاعت ایسی ہی چیز ہے کہ بعض اوقات گواہی میں عرض صالح نہ ہو۔ مگر انجام کار اسی سے درستی ہو جاتی ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ بہت لوگ اعراض فاسد سے اسلام قبول کرتے ہیں لیکن آخر کو وہی اسلام کامل ہو جاتا ہے۔ ایسوں کے اسلام کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہئے۔ بعض لوگ نوافل تاوان کہتے ہیں کہ ان بھکاریوں کو مسلمان نہ کرنا چاہئے۔ ان لوگوں نے پیشہ کر لیا ہے۔ ان کے مسلمان کرنے کا نتیجہ ہی کیا ہے۔ سوائے اس کے کہ مسلمانوں سے روپیہ ٹھگتے پھریں۔ کوئی کہتا ہے کہ میرے ذمہ اتنا فرضہ تھا۔ مسلمان لوگ مل کر ادا کر دیں۔ کوئی کہتا ہے مجھے روزہ نماز سیکھنے کے لئے فلاں فلاں کتاب کی ضرورت ہے مسلمان لے دیں اس میں اسلام کی بدنامی ہے کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں۔

مجھ سے ایک صاحب یہی فرماتے تھے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ اگر ایسی بدنامی کی وجہ سے اخراج عن الاسلام کریں، تو آپ میں بھی ایسے عیوب ہیں جن سے اسلام بدنام ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے آپ کو اسلام سے کیوں نہ نکال دیں۔ نیا مسلمان تو خواہ بنید بغدادی ہی ہو یا موروثی شیطان بھی ہو تو پروا نہیں ہے۔

میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ بعض اوقات مسلمان کسی طرح سے ربا اور عبادت ہوتا ہے۔ مال کی طرح ہو یا اور کسی چیز کی۔ مگر اسلام وہ چیز

ہے کہ خود دل میں جگہ کر لیتا ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے۔

تعلمت العلم بخیر اللہ
فابی العلماء ان یكون اللہ
میں نے علم سیکھا تو تھا غیر اللہ
کہ لئے مگر علم نے خود نہ مانا
اللہ ہی کا ہو کر رہا۔

آگ بجلاؤ اور یہ قصد نہ کرو کہ لکڑی جلے۔ مٹھوڑی دیہ میں لکڑی راکھ ہو جائیگی
آگ میں یہ اثر کہ لکڑی خود گھس جاتی ہے، آپ کے قصد پر موقوف نہیں۔ کسی
بزرگ سے کسی نے کہا دیکھیے صاحب فلاں آدمی دکھلاوے گا ذکر کیا کرتا ہے
کہا تو دکھلاوے گا بھی نہیں کرتا۔ وہ دکھلاوے گا کرتا ہے مگر کرتا تو ہے۔ کبھی نہ
کبھی ذکر اس کے دل میں جگہ کر ہی لے گا اور تجھے کیا امید ہے۔

ہمارے حضرت فرماتے تھے عبادت اول ریا ہوتی ہے۔ چند روز
میں عادت ہو جاتی ہے۔ پھر عبادت اور اخلاص۔ واقعی یہ بات بالکل صحیح ہے
دیکھ لیجئے کہ بچپن میں آدمی نماز پڑھتا ہے اس وقت کیا حالت ہوتی ہے۔ پھر
سن شعور میں اور کیفیت ہوتی ہے اور بڑی عمر میں کچھ اور ہی بات پیدا ہو جاتی
ہے۔ بچپن میں استاد یا والدین کے خوف سے پڑھی جاتی ہے۔ اگر کسی وقت
ان کی نگرانی نہیں ہوتی تو ٹال بھی دی جاتی ہے یا بلے و صنو ہی اڑا دیتے ہیں یہ ریا
ہی ہے۔ پھر پڑھتے پڑھتے سن شعور میں پہنچ کر طبیعت مانوس ہو جاتی ہے اور
جیسا کہ اور امور ضروری کا تقاضا ہوتا ہے ایسا ہی نماز کا ہونے لگتا ہے تا وقتیکہ
ادا نہ کر لی جائے طبیعت پر بار رہتا ہے۔ اگر نفس کبھی ٹالنا چاہتا ہے تو زائد
سے زائد تاخیر کی نوبت آتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ قصداً کر دیں۔ یہ مرتبہ عادت کا

ہے۔ اس کے بعد تو بعد اللہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ بلا نماز پچھن ہی نہیں پڑتا یہ مرتبہ اخلاص کا ہے۔

عرض عبادت ابتداء کسی کیفیت کے ساتھ ہو مگر کبھی نہ کبھی خود دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے۔ اس کا تجربہ مدرسہ میں رہ کر اچھی طرح ہوا۔ بہت سے طلباء کو دیکھا کہ اول ان کی نیت اچھی نہیں ہوتی مگر فارغ ہوتے ہی مخلص بن جاتے ہیں بالکل حالت پدٹ جاتی ہے۔ وہ پورے ہی ہے کہ اول اگر پورے نیت ٹھیک نہ تھی مگر شروع ایسی چیز کو کیا ہے کہ وہ خود ٹھیک کر لیتی ہے۔

یہی بات ہے کہ اس کو جو لوگ نہیں جانتے ہیں وہ طالب علموں کی ابتداء حالت دیکھ کر طرح طرح کے اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ بالکل مہل ہوتے ہیں۔ دنیا سے تو نا آشنا ہیں ہی دین میں کیا کمال پیدا کیا۔

میں کہتا ہوں ابھی ان کی حالت کیا دیکھتے ہو۔

پڑھتے رہو۔ انہیں میں مقتدا لوگ ہوں گے اور

انہیں میں غزالی وقت بھی ہوں گے۔ طالب علموں سے اگر ذرا سا قصور ہو جائے تو تمام شہر میں سن لیجئے اسلامی مدرسہ والوں نے یوں کیا۔ کس قدر مٹاؤت اس لفظ سے ٹپکتی ہے۔ آپ کو ان سے تعلق رکھنا چاہئے یا قطع کرنا۔ یہ تمہارے دین کے حامل ہیں۔ ان سے قطع کرنا کس سے قطع کرنا ہے۔ آپ کو ان سے تعلق ہی رکھنا چاہئے۔

اگر آپ کا بچہ بازار میں کسی سے لڑائے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو جائے کہ سراسر زیادتی اسی کی تھی تو آپ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے اگر لڑائی

کے وقت آپ پہنچ جائیں گے تو لڑکے کی زیادتی اور عدم زیادتی کی طرف
 تو خیال بھی نہ ہوگا۔ اس وقت تو اسی کی حفاظت کریں گے اور جس طرح ممکن ہوگا
 اس کی بات نیچی نہ ہونے دیں گے۔ پھر اس عرصہ کے فرو ہونے کے بعد علیحدگی
 میں بچہ کو فہمائش کریں گے کہ آئندہ ایسی زیادتی نہ کرنا دیر بھی جب ہے کہ آپ
 بہت ہی حق پسند ہوں ورنہ باطل ہی کی پیروی ہوگی اور اس کو کچھ ملامت وغیرہ
 نہ ہوگی) اور اگر کوئی غیر آدمی پوچھے گا کہ میاں کیا بات تھی تو یا تو اپنے بچہ کو
 بے قصور کہیں گے اور اگر بالکل ہی صریح خطا ہوگی تو کہہ دیں گے کچھ نہیں بازار میں
 ایک آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ لڑکائی مزاج ہے، دوتا کسی سے ہے نہیں
 بات بڑھ گئی۔

اپنے بچہ کے عیب کو کیوں مشہور نہ کیا۔ اس کا عیب عیب نہیں ہے
 وہ یہ ہے کہ اس سے آپ کو طبعی تعلق ہے۔ اس کی بدنامی اپنی بدنامی ہے
 بچہ سے طبیعت کے حکم سے تعلق ہے، طالب علم سے حق تعالیٰ کے حکم سے
 تعلق رکھا ہوتا۔ اس کے قصور کو بھی اپنے بچہ کے قصور کی طرح دبا یا ہوتا۔ بچہ کی
 بدنامی میں اپنی بدنامی سمجھی تھی، طالب علم کی بدنامی میں اپنے دین کی بدنامی سمجھی ہوتی
 بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اگر ان کے قصور نہ پکڑے جائیں تو ان کو تنبیہ کیوں کہ
 ہو۔ میں کہتا ہوں اپنی طبیعت سے ہی انصاف کر لو کہ جس طرح اپنے بچہ کو تنبیہ
 کرتے ہو اسی طرح طالب علم کو کرتے ہو یا نہیں۔

فرض کر لو کہ تمہارا بچہ اس قدر شریر ہو کہ یا وجود فہمائش کے بھی نہ مانے اور
 بد سے بدتر حرکتیں کرے جس سے خاندان بھر پر دھبہ آجائے۔ تنگ و ناموس

کو بٹ لگ جائے تب آپ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں۔ کیا اس سے بالکل قطع تعلق کر دیتے ہیں۔ قطع نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی قطع بھی کر دے، تو دل پر وہ صدمہ رہتا ہے کہ موت سے بدتر ہے۔ باوجود قطع کے تمام عمر یہی چاہتے ہیں کہ کاش یہ اچھن اپنی سڑکتیں چھوڑ دے۔ خود سمجھانے سے جب اثر نہیں ہوتا تو جن کا وہ لحاظ کرتا ہے ان سے فہمائش کرائی جاتی ہے۔ طالب علم کے کسی بڑے بڑم پر تو کیا ایک چھوٹے سے تصور پر بھی میں پوچھتا ہوں کہ اسی طرح مشفقانہ تنبیہ ہوتی ہے یا اجنبیانہ۔ اگر اسی طرح مشفقانہ تنبیہ آپ کرتے ہیں تو الحمد للہ وہاں مقصود اور اگر ایسا نہیں ہے تو میں پھر کہتا ہوں کہ ان سے آپ نے قطع کیوں کیا۔ کیا وہ آپ کے دین کے محافظ نہیں ہیں یا آپ کے ذمہ دین کی حفاظت نہیں ہے۔ ایک کے تصور پر آپ سب کو بدنام کرتے ہیں کیا آپ کے سب بچے ایک ہی سے صالح ہوتے ہیں یا بچپن ہی سے آپ کے بچے تمیز دار ہوتے ہیں۔ ان میں بھی اگر ایک کم سمجھ ہے تو بڑے بڑے سمجھ دار بھی تو ہیں۔ آج اگر یہ کم استعداد ہیں تو کل امام وقت اور غزالی وقت بھی تو انہی میں سے ہوں گے۔ ابتدائی حالت دیکھ کر ان پر اعتراض نہ کر و یہ طاعت کی ابتدائی حالت ایسی ہی ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ طاعت ہونی چاہیے خواہ کسی طرح ہو پھر طاعت آدمی کو خود درست کر لیتی ہے اور طاعت ایسی چیز ہے کہ اس میں دینی اور دنیاوی دونوں نفع ہیں۔ رزق میں کشائش ہوتی ہے۔ اگرچہ آدمی چنداں مالدار نہ ہو، مگر طاعت کے ساتھ عجیب طرح کا اطمینان اور فراخ قلب ہونا ہے اور برعکس

اس کے معصیت سے رزق میں تنگی ہوتی ہے اور اطمینان قلب نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اور بھی مضریتیں ہیں جو معصیت پر متفرع ہیں۔

ایمانداری کی مثال

غرض فرمانبرداری سے ہمیشہ مسرت ہوتی اور معصیت سے مصرت اور یہ تو لازمی مضریتیں ہیں۔ اکثر مضریتیں

متعدی ہو جاتی ہیں جیسے کہ غیبت کہ جب ایک آدمی کسی کی غیبت کرے گا تو دوسرے کو خبر پہنچے ہی گی پھر وہ کیوں نہ کرے گا۔ بلکہ اس سے زیادہ کیسے کہ اس سے دونوں میں عداوت پیدا ہوگی۔ پھر عداوت وہ چیز ہے کہ جب دو میں پڑ جاتی ہے تو دونوں کا نماز روزہ سب عداوت ہو جاتی ہے۔ اسٹھنے میں، بیٹھنے میں، سونے میں ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کو نقصان پہنچے۔ نیت نماز کی باندھ رکھی ہے اور دل میں دوسرے کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچی جا رہی ہیں۔ یہ کیا نماز ہوئی شغل قلب ہوا اور کما ہے سے حرام چیز ہے۔ منہ میں روزہ ہے اور زبان دوسرے کی غیبت سے آلودہ ہے۔ دل میں خوش ہیں کہ روزہ ہے۔ یہ خبر نہیں کہ روزہ میں ان چیزوں کو تو چھوڑا جو فی نفسہ حلال تھیں یعنی کھانا پینا اور جو چیز ہمیشہ حرام ہے اس کو نہ چھوڑا تو کیا روزہ ہوا۔

غرض یہ عداوت اسی غیبت کی بدولت ہوتی اور عداوت وہ چیز ہے کہ قلب کو ایک ہی طرف کا کر لیتی ہے اور صرف ایک کام کا رہ جاتا ہے مصرت رسائی۔ آپ جانتے ہیں کہ چھوٹا سا لفظ کس قدر شر کو جامع ہے تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اظہر من الشمس ہے۔ یہ اتحاد کا ضد ہے۔ جتنی چیزیں نبوی و دینی اتحاد میں ہے اتنا ہی شر بمقابلہ اس کے اس میں ہے۔ یہ سب کا ہے سے ہوا صرف ذرا ہی

غیبت سے یہ معصیت کی متعدی مضرت کی مثال ہوئی۔ یہ بھی خواہش نفسانی کا ایک فرو ہے۔

خواہش نفسانی کی ایک اور خوابی سینٹے میرا اور آپ کا جائداد پر مقدمہ ہے ہر شخص کی خواہش ہوئی کہ مجھ کو ہی پورا مل جاوے۔ بس لڑائی ہو گئی۔ اگر دونوں یہ کہتے کہ ہمیں کچھ نہیں چاہئے تو طویل کا ہے کو کھچتا۔ مقدمہ بازی کی نوبت کیوں آتی اور باہمی نفاق اور عداوتیں کیوں پیدا ہوتی ہیں۔

چنانچہ حدیث شریف میں ایک قصہ ہے راحم سابقہ میں بھی بڑے بڑے اچھے لوگ ہوتے ہیں، ایک شخص نے دوسرے کے ہاتھ ایک مکان بیچا مٹھی سے جب دخل لیا تو اس میں ایک گھڑا سونے کا بھرا ہوا پایا۔ وہ گھڑا لے کر بائع کے پاس آیا کہ لو اپنا گھڑا لے لو۔ تمہارے مکان میں سے نکلا ہے۔ اس نے کہا میں تو مکان کی قیمت لے چکا۔ میرا اس میں کیا ہے۔ اس نے کہا میں نے تو قیمت مکان کی دی ہے۔ اس پر عقد ٹھہرا ہے۔ یہ گھڑا عقد میں شامل نہیں میں کیسے لے لوں۔ ایمانداری اسے کہتے ہیں۔ اگر آج کل گھڑا نکل آئے، تو مزہ آجائے۔

کانپور میں دو آدمیوں نے کہیں سن لیا تھا کہ شبِ برات میں جو کچھ دعا مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے۔ شبِ برات کو دونوں ایک مٹی کا بڑا ڈھیلے کر بیٹھے اور اس پر ایک روٹیاں ڈھانک دیا اور دعا مانگنی شروع کی کہ یا اللہ یہ مٹی سونا ہو جائے تمام رات جاگے اور اسی دعا میں رہے جوں جوں صبح قریب ہوتی تھی اشتیاق بڑھتا جاتا تھا کہ اب یہ سونے کا ہو جائے گا۔ بمشکل صبح بکری

اور جلدی سے اس کو کھولا دیکھا تو وہی مٹی۔ ساری آرزو میں خاک ہو گئی اور
 دل مر گیا کہ شرب قدر بھی خالی گئی جس پر بڑا اعتماد تھا۔ طرح طرح کے شیطانی
 خیال دل میں آئے کہ دعا کو ویسے بھی سنا کرتے تھے کہ قبول ہوتی ہے اور
 آج تو شرب قدر تھی۔ اسی نزد میں بیٹھے تھے تیریت ہوئی کہ بندہ خدا ایک
 درزی آگیا۔ یہ کچھ اہل علم کی صحبت پائے ہوئے تھا۔ اس نے پوچھا، کیسے
 سست ہو۔ انہوں نے سارا قصہ بیان کیا۔ کہا بھائی شکریہ کرو۔ اسی میں کچھ حکمت ہوگی
 ایک ذرا سی بات تو مجھے معلوم ہوتی ہے کہ اللہ میاں تمہارے بدخواہ نہیں ہیں
 تم نے تو یہ سمجھا کہ مٹی سونا بننے میں تمہارا نفع ہے مگر تھا نقصان۔ ابھی جب صبح
 تم نے ڈھیلے کو کھولا اگر وہ سونے کا نکلتا تو تم دونوں میں لڑائی تو ابھی ہوتی
 پھر جانے کہاں تک طول کھینچتا۔ ممکن ہے کہ ڈھیلے کسی تیسرے کا ہو جاتا اور تم
 دونوں میں لڑائی محنت میں بندھ جاتی۔ آدمی سمجھ دار تھے دونوں کی تسکین ہوگی
 موہوم سونے کے لئے تو اتنی محنت کی کہیں سونے کا گھڑا نظر پڑ جائے تو جانے
 کیا ہو۔ اس کو دیکھئے کہ گھڑا مالک مکان کو دینے آیا اور مالک کو دیکھئے کہ لینے
 سے انکار کر دیا۔ وہ لوگ ایسے تھے۔

صحابہ کا ایک قصہ کتاب میں آتا ہے کہ ایک
 غزوے میں بہت سے آدمی شہید ہوئے۔ چند

ایشیاری کی نادر مثال

آدمی نزع کی حالت میں تھے۔ موت کے وقت تشنگی کا غلبہ ہوتا ہے۔ ایک
 شخص نے آواز دی کہ کوئی میرے حلق میں ذرا سا پانی ڈال دے تو بڑا کام
 کرے! ایک بندہ خدا کا سہ میں پانی لے کر پہنچے اور چاہتے تھے کہ ان کے

منہ میں ڈالیں کہ اتنے میں ایک طرف سے اور آواز آئی کہ ذرا سا پانی کوئی پلاتا
 انہوں نے پڑے پڑے کہا کہ پہلے اُن کو پلاؤ، پھر مجھے پلاتا۔ یہ شخص پیالہ لے
 کر اُن کے پاس پہنچے۔ پلاتا ہی چاہتے تھے کہ اسی طرح اور ایک آواز آئی۔
 عرض مقتل میں چھ سات جگہ اسی طرح پانی لئے پھرے اور سب یہی کہتے رہے
 کہ پہلے میرے بھائی کو پلاؤ۔ اخیر میں جن کے پاس پہنچے اُن کو پلانے کی نوبت
 نہ آئی تھی کہ دم آخر ہو گیا۔ یہ شخص واپس ہوئے اور پہلوں کے پاس پانی لائے
 جس کو دیکھا دم آخر ہو چکا ہے۔ ایک نے بھی پانی نہ پیا اور پیالہ بھرا ہوا لے کر
 چلے آئے۔ ایشارہ اس کو کہتے ہیں۔

پانی وہ چیز ہے کہ سفر ج میں دیکھا ہے کہ باپ بیٹے کو پیاس میں چھوڑ
 دیتے ہیں۔ موت کے وقت کی پیاس کا کیا حال ہوگا۔

اتباع ہوا | عرض ہم میں جو بجائے ایشارہ کے کشاکشی اور نزاع و جدال ہے
 اس کی وجہ ہی اتباع ہوا ہے۔ یہی باہم اتفاق نہیں ہونے دینا
 آج کل سب نے یاد کر لیا ہے، اتفاق اتفاق۔ یہ خبر نہیں کہ اتفاق کا ہے سے
 ہوتا ہے۔ اتفاق ہوتا ہے خواہش نفسانی کو روکنے سے۔ وہ شخصوں میں جب
 جھگڑا ہو گا کسی ایسی چیز پر ہو گا کہ ہر ایک ان میں سے اس کی خواہش رکھتا ہو گا
 اگر وہ دونوں اپنی خواہش کو روک لیں اور اس چیز کی طلب چھوڑ دیں تو پھر جھگڑا
 کیسا اور نا اتفاقی کہاں۔ اتفاق اتفاق کہتے رہتے اور نفس کو روکنے نہیں تو اس
 سے کیا ہوتا ہے۔

عرض جملہ شرور کی جڑ اگر ہے تو خواہش نفسانی ہی ہے۔ خواہش نفسانی

روکنے کی چیز ہے۔ دیکھئے اگر روکا نہ جائے نفس کو تو کیا انجام ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو سب ہی نے سمجھا حتیٰ کہ حکام میں سے ان لوگوں نے جن کو مذہب سے علاقہ بھی نہیں۔ حاکم کیا کرتا ہے بعض افعال سے روکتا ہے اور بعض کی اجازت دیتا ہے۔ جن افعال سے روکتا ہے وہ وہی تو ہیں جن کو لوگ کرنا چاہتے ہیں مگر اس کے نزدیک باعث مفرت ہیں۔ معلوم ہوا کہ دنیاوی مصلحتوں کا مقتضا بھی یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت نہ دی جائے اگر حاکم ان افعال سے نہ روکے تو دیکھئے کیا ہو۔ ڈاکوؤں کو ڈاکہ ڈالنے دے، چوروں کو چوری کرنے دے، زبردستوں پر زبردستوں کو ظلم کرنے دے، غرض ہر شخص کو محلے بالطبع کہے دے کہ اپنی خواہش کے موافق جو چاہو کرو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس حالت میں کس لطف سے زندگی بسر ہوگی۔

قانون کیا ہے ملک کے افعال کی ایک حد قائم کرنے والی چیز ہے یا کوئی اور۔ جو کوئی حد سے گزرے اس کو جزا و سزا ہوتی ہے۔ جب اس گزرنے میں کچھ برائی سمجھی گئی ہے تب ہی تو اس پر جزا اور سزا ہے۔ سب کو محلی بالطبع کیوں نہ چھوڑ دیا گیا۔ فرض کیجئے کسی کو روپیہ کی ضرورت ہے یا ضرورت نہیں بھی ہے یوں ہی کسی سے چھیننے کو جی چاہتا ہے تو اس کو کیوں منع کرتے ہو اور اگر چھین لے تو چالان کیوں ہوتا ہے۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے ضرورت ہے یا میرے جی کو کیوں مار تے ہو۔ خواہش پوری کرنے دو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اجازت دینے میں کوئی ایسی مفرت ہے کہ اس کے مقابلے میں ضرورت کا بھی خیال نہیں کیا جا سکتا۔

عجبت الہی اور مصلحت دنیوی | دنیاوی انتظاموں کو بھی دیکھ کر یہ بات صاف نکلتی ہے کہ خواہش نفسانی روکنے

ہی کی چیز ہے۔ اگر خواہش نفسانی روکنے کی چیز نہیں ہے تو اپنے گھوڑوں بی بی کو کیوں روکتے ہو۔ اس کو تو طرح طرح سے سمجھاتے ہو زیادہ زیور فضول ہے پوشاک میں زیادہ تکلف سے کیا فائدہ مگر اپنے نفس کو نہیں روکتے۔ اگر آزادی ہی پسند ہے تو بی بی کو بھی آزادی دو جس طرح چاہے خرچ کرے اور اگر آزادی میں نقصان ہے تو جس طرح بی بی کو بے فائدہ کاموں سے روکتے ہو اپنے نفس کو بھی پابند کرو۔ مگر دونوں کے آزاد ہونے کو تو کوئی پسند نہ کرے گا تو لامحالہ دوسری ہی شق رہ گئی کہ دونوں پابند ہوں۔ پابندی وہ چیز ہے کہ کسی کو اس سے بچا رہ نہیں۔ فرق اتنا ہے کہ جو عقلمند ہیں بالاختیار کرتے ہیں اور کم عقل ہنر اور قہر پابند بنا رہتے ہیں۔ آپ نفس کو بالکل آزاد کسی طرح نہیں کر سکتے اگر قانون خداوندی سے آزاد کر دیا اور اللہ میاں نے دنیا میں کچھ نہ کہا، تو قانون دنیاوی پابند بنانے کے لئے موجود ہے اور دست بدست سزا تیار ہے بہت سی خواہشیں ہیں کہ قانون کی وجہ سے چھوڑ دینی پڑتی ہیں کیونکہ ان پر عمل کرنے سے سزا ہوتی ہے۔

اے مسلمانو! قانون کی وجہ سے تم نے خواہش نفسانی کو چھوڑ دیا اور اللہ رسول کے حکم سے نہیں چھوڑتے۔ کیا غضب کی بات ہے۔ اگر قانونا لغت ہو جائے تو ایک بھی جیلہ باقی نہ رہے اور اللہ میاں اگر کسی کام کی ممانعت کریں تو اس میں جیلے نکالے جائیں اور ایسی ایسی تاویلیں کی جائیں کہ تاویل کے

مرتبہ سے نکل کر نحر لیف تک پہنچ جائیں اور اگر بالکل ہی مرتزح حکم ہو تو اس کے مقابلہ ضرورت سے کیا جاتا ہے کہ حکم تو یہی تھا مگر اب ضرورت سے قانون کے مقابلہ میں یہ ضرورتیں کہاں چلی جاتی ہیں۔ افسوس محبت الہی مصلحت و نبوی کے برابر بھی نہ ہوئی۔

عشق مولیٰ کے کم از پیلے بود گوئے گشتن بہر او اولے بود

ایک مروار عورت اگر کہے رات بھر کھڑے رہو تو کہ گزریں اور اللہ میاں کے حکم سے عشا کی نماز بھی بھاری ہے۔

ایک شخص کا قصہ ہے یہ ایک بزرگ ہیں۔ پہلے حالت ایسی ہی تھی بعد بڑے شخص ہوئے ہیں، ایک عورت سے عشق تھا۔ بڑی ٹنڈوں کے بعد ایک دن کہیں شام کو بات کرنے کا موقع مل گیا اور صورت یہ تھی کہ کھڑکی کے نیچے بات کرنے کھڑے ہوئے تھے۔ ایسے محو ہوئے کہ تمام رات اسی طرح گزر گئی۔ عشا کی نماز بھی فوت ہوئی۔ جب مؤذن نے صبح کی اذان دی تو حضرت کیا کہتے ہیں۔

اتباع حق کی ضرورت

میں نے آج ہی عشا کی اذان سویرے کہنی رہ گئی تھی۔ کسی نے کہا، جناب خبر بھی ہے صبح ہو گئی۔ صبح کی اذان ہے۔ منہ پھیر کر دیکھا تو واقعی صبح ہے۔ دل پر اثر ہوا بہت روئے۔ ایک عورت کے خیال میں حق سبحانہ تعالیٰ کا فرض قضا ہوا۔ ایک بزرگ کے ہاتھ پر توبہ کی اور اس خیال کو چھوڑا۔ پھر صاحب کمال ہوئے اور سمجھی کچھ ہوا۔

ایک عورت کی محبت میں یہ حالت ہوتی ہے۔ عورتیں تو آج کل

احکام الہی کی اتنی بھی تو قدر نہیں جتنی کہ ایک کسی کے احکام کی۔ احکام الہی خواہ کیسے ہی سہل ہوں اور سراسر مفید اور حکمت ہی حکمت ہوں مگر شائق ہوتے ہیں اگر کسی الہی احکام کو کہے جن کو اللہ میاں نے فرمایا تو کچھ تکلیف نہ رہے بلکہ اگر کبھی ان احکام کو بھی کہے جو اللہ میاں کے خلاف ہیں تب بھی کچھ شائق نہ ہوں معلوم ہوا کہ احکام فی نفسہ شائق نہیں صرف محبت کی کسر ہے۔ مسلمان کی شان تو یہ تھی کہ اللہ میاں کے سامنے کا قلم فی ید الکااتب ہوتا اور غیر کے سامنے لو ہے اور پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا۔ انصاف کی بات ہے کہ اللہ میاں کی طرف سے بندہ پر کس قدر انعام و انفضال ہر وقت ہوتے ہیں اور غیر اللہ کی طرف سے ناک بھی نہیں ملتا۔ پھر اپنے منعم کے سامنے نرم ہونا چاہیے یا اپنے جیسے عاجز بلکہ دشمن کے سامنے ظاہر ہے کہ منعم ہی کے سامنے ہونا چاہئے۔

چونکہ برمیخت بہ بند و بستہ باش چون کشاید چاکہ بر جنتہ باش
ہمچو کلکم در میان اصبعیں نیستیم در صف طاعتین بین

مسلمان کو اللہ میاں کے سامنے ایسا ہونا چاہیے جیسے کاتب کی انگلیوں میں قلم کہ اس کو کچھ عذر نہیں۔ کاتب کو اختیار ہے جس طرف چاہے چلائے اور چلائے یا نہ چلائے۔ کیا غضب ہے کہ اللہ میاں کے ہاتھ میں تو ایسے نہ ہوں اور ہوں کس کے ہاتھ میں نفس کے۔ بت پرستی کو منع کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہر شخص کی بغل میں بت ہے۔ ظاہر کی بت پرستی پر تو طرح طرح کے طعن کئے جاتے ہیں اور ان کو احمق بتایا جاتا ہے اور اپنے آپ بالنی بت

پرستی میں مبتلا ہیں اور عقلمندی کا دعویٰ ہے کسی نہ ایک بت کو پوجا کسی
 نے دوسرے کو کیا فرق ہے لات کو پوجنے والے میں اور عزی کو پوجنے
 والے میں۔ جہاں ظاہری بت پرستی چھوڑی ہے باطنی بھی چھوڑو۔ اپنی باگ
 نفس کے ہاتھ میں مرت دو۔ حق تعالیٰ اپنے منعم حقیقی کے تصرف میں ہمہ تن
 اپنے آپ کو دے دو۔ احکام الہی کے سامنے سر جھکاؤ۔ اتباع تو وہی ہے
 کہ آدمی اپنے ارادے کو چھوڑ دے اور دوسرے کے ارادے کے
 تابع ہو جائے۔ دیکھ لیجئے قانون کے سامنے کیا حال ہوتا ہے کہ اپنی خواہش
 چھوڑنی پڑتی ہے اور حاکم کے حکم کو ماننا پڑتا ہے۔ اب لوگوں نے حق سبحانہ
 تعالیٰ کے حکم کا اتباع تو بالکل چھوڑ ہی دیا اور وہی کا اتباع اختیار کر لیا۔

اتباع کی چیزیں

اتباع کے کرنے کی دو چیزیں تھیں۔ عقائد اور اعمال
 اعمال میں توبہ گنجائش نکالی گئی ہے کہ ہم مجبور ہیں
 اور یہ احکام مصلحت وقت کے موافق نہیں۔ مگر اب عقائد میں بھی خواہش نفسانی
 کو ترجیح ہونے لگی ہے۔ اعمال کو پہلے ضروری تو سمجھتے تھے مگر تکلیف سمجھ کر
 ان کے ادا میں تصور کرتے تھے۔ اب ان کی ضرورت ہی ذہن سے اڑ گئی اور ان
 اعمال کو تو چھوڑا تکلیف کی وجہ سے مگر ان کے وجوب کے عقیدہ میں کیا تکلیف
 تھی۔ ہاں اس میں بھی ایک تکلیف تھی۔ وہ یہ کہ نفس نے دیکھا اگر پھر میں نے ادا
 اعمال سے روک دیا مگر تا وقتیکہ ان کے وجوب کا عقیدہ اس کے ذہن میں ہے
 ممکن ہے کہ پھر کبھی ادا پر مستعد ہو جائے۔ اس وقت پھر مجھے کوئی تدبیر اس کے
 روکنے کی کرنی پڑے گی اور احتمال ہے کہ روکنے سے نہ روکے۔ اس لئے

اس احتمال کے قطع کرنے اور اپنی بار بار کی تکلیف بچانے کے لئے نفس نے یہ تدبیر نکالی۔ سرے سے ان کے وجوب کا عقیدہ ہی اڑا دینا چاہیے۔ عقائد اعمال کے لئے بمنزلہ جڑ کے ہیں۔ جڑ کاٹ دینے سے احتمال ہی نہیں رہتا کہ شاخیں پھر پھری ہوں گی۔ عقائد کے بدلنے سے نفس بہت سی تکلیفوں سے بچ گیا۔

ایک صاحب فرمانے لگے کہ دین میں جو کچھ خارج ہے وہ نماز ہے غیر مذہب کے بہت سے آدمی اس وقت اسلام میں آنے کو تیار ہیں مگر یہ خیال مانع ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد نماز پڑھنی ہوگی۔ پانچ وقت کی پابندی سر پڑے گی۔ مولوی لوگ نماز کی قید اٹھا دیں تو آج ہی دیکھئے کتنے کافر مسلمان بنتے ہیں اور مسلمانوں کی جماعت کتنی بڑھ جاتی ہے۔ نماز ایسی مولویوں کی ہے کہ معاف کر دیں!

ایک صاحب کہتے ہیں سود کی ممانعت سے افلاس آ گیا اور قومیں سود ہی کے ذریعہ سے ترقی کرتی جاتی ہیں۔ عرض جو جس کی سمجھ میں آتا ہے احکام الہی میں اصلاح دینے کو تیار ہے۔ گویا اللہ میاں کو یہ بات بتائی جاتی ہے کہ ہم سے رائے لے کر کیوں احکام مقرر نہ کئے تھے۔ کثرت رائے پر کیوں فیصلہ نہ کیا۔

ہم لوگوں کا کیا حال ہے۔ عقائد میں یہ حال، اعمال میں یہ حال۔ صورت میں آزادی۔ آمدنی میں حلال حرام کی خبر نہیں۔ زمینداروں نے طرح طرح کے ناجائز ابواب باندھ رکھے ہیں۔ بیع و شراعت میں عقد کے صحت و بطلان کی پروا نہیں۔ آم کی بہار بکتی ہے حالانکہ آم کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ یہ بیع باطل ہے۔ بیع باطل میں

مال مشتری کی ملک نہیں ہوتا۔ اس کا رو واجب ہے۔ یکے بعد دیگرے جہاں تک سلسلہ چلا جائے کسی کی ملک نہ ہوگا۔ گناہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ غرض معاملات کی صفائی کی طرف اصلاً خیال نہیں۔

زبان غیبت میں اور طعن میں مبتلا۔ قلب حرص میں اور طمع میں گرفتار۔ اونٹ سے کسی نے پوچھا، اونٹ

صحیح طریق تعلیم

رے اونٹ تیری کون سی کل سپاہی۔ کہا کوئی بھی نہیں۔ ایسی ہی ہم لوگوں کی ہے۔ ظاہر کی طرف دیکھتے وہ ٹھیک نہیں، باطن کی طرف نظر کیجئے وہ درست نہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے صرف احکام ہی نازل نہیں کئے بلکہ ایک اتنا بڑی نبی بھیج کر یہ بھی بتا دیا کہ اس نمونے کے ہو کر آؤ۔

تعلیم کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی شے کی پیمائش زبانی بتادی جائے اور کہہ دیا جائے کہ اتنی لائیں اتنی چوڑی اتنی موٹی بنا کر لاؤ۔ اور ایک طریقہ ہے کہ اس کا ناپ تول بتانے کے ساتھ بنا ہوا نمونہ بھی دکھا دیا جائے کہ آخری صورت ایسی پیدا ہونی چاہئے۔ یہ نہایت ابلغ ہے۔

نوٹشورس لکھنے والوں کو بتاتا ہے کہ الف تین قسط کا لکھو اور اوپر کی نوک، ایسی ہو اور نیچے کی ایسی۔ مگر یہ بتانا کافی نہیں۔ لکھنے والوں کو ہرگز الف بنانا نہیں آسکتا تا وقتیکہ استاد اس کی صورت بھی اپنے ہاتھ سے کھینچ کر نہ دکھائے۔ اگر ہاتھ سے لکھ کر دکھانے کی ضرورت نہ ہوتی تو استاد کے خنجرے اٹھانے کی کیا ضرورت رہتی۔ کتابوں میں سب حروف کی پیمائش لکھی ہے، اسی کو یاد کر خوش نویس بن جائے حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ سو احکام

ظاہر و باطن کی تحدید کا نام ہے جس سے ظاہر و باطن کی ایک خاص صورت پیدا ہوتی ہے جس طرح کہ تین نقطے سے الف کے طول کی حد قائم ہو اور نصف قطریا کلم و پیش سے اس کے عرض کی انتہا مقرر ہو کر ایک خاص صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ممکن تھا کہ اللہ میاں صرف احکام نازل فرما دیتے جو ظاہر و باطن کی ناپ نول ہیں اور یہ فرما دیتے کہ یہ ناپ نول ہیں۔ ان کو پورا پورا درست کرو یہاں تک کہ وہ صورت پیدا ہو جائے جو ہماری مرضی کے موافق ہو اس وقت معلوم ہوتا کہ ہم لوگ کس قدر حرج میں پڑ جائے اور کسی کسی وقتیں پیش آئیں۔ تمام عمر احکام کی پابندی کرتے اور پھر اطمینان نہ ہوتا کہ وہ صورت پیدا ہو گئی جو حق تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہے۔

مگر نہیں حق سبحانہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ احکام بھی نازل فرمائے اور محض اپنی رحمت سے نمونہ بھی دکھا دیا کہ اصلاً نزدیک نہ رہے کہ احکام کی پوری پوری تعمیل ہو گئی یا نہیں۔ اپنی صورت کو نمونے سے ملا کر دیکھ لو۔ ذرا سا بھی فرق ہو تو معلوم ہو جائے گا کس حکم کی تعمیل میں کسر رہ گئی۔ مگر اس رحمت کی کیا قدر ہوئی۔ ہم کس قدر نمونہ کے موافق بن کر آئے۔

اگر درزی کو اپن سینے کو دو اور وہ ساری اپن بہت ٹھیک اور خوبصورت بدن کے موافق سینے۔ کہیں جھول تکسانہ رہے۔ سلامتی کہیں ٹھیک نہ ہو۔ عرض سب طرح ٹھیک ہو۔ صرف ایک آستین کو چار انگل چھوٹا کر لائے تو کیا آپ اس کو لے لیں گے اور کیا یہ بات اس کی سن لیں گے کہ جناب ساری اپن تو ٹھیک ہے۔ آستین بھی دو ہیں۔ صرف ایک آستین چار انگل کم رہ گئی تو

کیا ڈر ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ اس اچکن کو آپ اس کے ہر دے ماریں گے اور اس نے قصداً ایسا کیا ہے تو قیمت واپس لینے پر بھی اکتفا نہ ہوگا۔ کچھ جرم بھی لیا جائے گا۔ حالانکہ نمونہ سے صرف چار انگل مخالفت ہے۔

یہاں نمونہ سے چار انگل بھی مطابقت نہیں۔ اللہ میاں کا حکم تھا کہ نمونہ کے مطابق ہو۔ ان کنتہ تجبون اللہ، فاتبعونی یحببکم اللہ، جان علیہ واصحابی۔

افسوس مسلمانوں نے ہر بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیا جو وضع بتائی اس کے خلاف

نئی تراش خراش

وضع تراشی، نکاح نیا تراشا، اخلاق نئے اختیار کئے، اب عقائد میں بھی تراش خراش ہونے لگی۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ دعویٰ ہے اتباع کا معلوم نہیں کہ اتباع کس چیز کا نام ہے۔ اگر کوئی ایسے لوگوں کو دیکھے تو کیا کہہ سکتا ہے کہ یہ قوم اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گروہ سے ہے۔ گروہ میں ہونے کے لئے کسی بات میں بھی مطابقت نہیں بلکہ جان بوجھ کر مخالفت کی جاتی ہے اس گروہ میں ہونا تو کہاں اب تو اس گروہ کے لوگوں سے ملنا بھی نہیں چاہئے کیونکہ اس گروہ میں ترقی نہیں ہے۔

ایک شخص نے مجھ سے گفتگو میں بیان کیا کہ آج کمیٹی ہوئی جس میں ان اسباب پر بحث کی گئی جو مسلمانوں کو ترقی سے روک رہے ہیں۔ بہت سے اسباب بیان کئے گئے۔ آخر میں یہ خطہ ہوا کہ مذہب مانع ہے ترقی سے۔ اس کو چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ نوبت پہنچ گئی ہے۔

اس لائق ہی ترقی ہی نے خرابی ڈالی ہے جو کچھ ڈالی ہے۔ کہیں اس ہوس کی انتہا بھی ہوگی۔ حالانکہ یہ ترقی ہرگز اطاعت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی کیونکہ اطاعت میں کچھ نہ کچھ پابندی ضرور کرنی پڑے گی اور یہ ترقی مطلق العنانی کو چاہتی ہے۔ یہ ترقی وہی حاصل کر سکتا ہے کہ نہ یہ دیکھے کہ روپیہ حق سے آیا نہ یہ دیکھے کہ ناحق سے آیا۔ چوری سے وہ نڈر ہے ظلم سے اسے خوف نہ ہو۔ روپیہ حاصل ہو جس طرح ہو۔ حالانکہ قطع نظر خلاف دین ہونے سے ایسا مال دنیا ہی میں فلاح نہیں دیتا، بلکہ جس راہ سے آیا تھا اسی راہ جاتا ہے۔ اس میں برکت مطلق نہیں ہوتی۔ رشوت کے ہزار اور حلال کے سو برابر ہیں۔

جو عرض ہے روپیہ سے وہ حاصل نہیں ہوتی جیسا کہ بیان کیا گیا، تو اب سوچو اپنے اوپر ایسی چیزیں کیوں لازم کر لیں جن کے لئے کوئی تعداد روپیہ کی کافی نہیں ہوتی اور کسی مرتبہ ترقی پر بس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ چیزیں لازم کس نے کہیں۔ اسی ہوائے نفس نے۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے اسی کا علاج بتایا ہے اب میں اس پر بیان کو ختم کرتا ہوں۔

غرض سارا فساد خواہش نفسانی سے ہوا ہے
خواہش نفسانی کا علاج سو علاج کیا ہے کہ نفس کو خواہش سے روکو

مرض کا علاج یہی ہوتا ہے کہ اس کے مادہ اور سبب کو قطع کیا جائے جب سبب جاتا رہے گا مرض بھی نہ رہے گا۔ مسلمانو! نفسانی خواہشوں کو چھوڑو اور حق سبحانہ تعالیٰ کی اطاعت کرو۔ کیا اللہ میاں کا کچھ حق نہیں ہے آپ لوگوں

پر۔ دیکھئے اللہ میاں ایسے ایسے امراض کا علاج بتاتے ہیں جن کو تم اپنے آپ کسی طرح سمجھ نہ سکتے اور وہ اندر ہی اندر تمہارا کام تمام کر ڈالتے۔ تعجب ہے کہ طب اکبر کی قدر ہو مگر احکام الہی کی قدر نہ ہو۔ جانتے ہیں کہ طب اکبر کے خلاف کریں گے تو صحت محفوظ نہ رہے گی اور مرض گھیر لے گا۔ صاحبو! طب اکبر پر عمل کرنے سے صحت جسمانی میں خرابی آتی ہے اور احکام الہی پر عمل نہ کرنے سے قلبی اور روحانی صحت برباد ہوتی ہے۔ پھر جو شرف قلب اور روح کو جسم پر ہے وہی اس کی صحت کو اس کی صحت پر اور اس کے محافظ کو اس کے محافظ پر ہونا چاہئے۔ اس سے سمجھ لیجئے کہ احکام الہی کی کیا عظمت ہونی چاہئے۔

اللہ میاں کا بتایا ہوا علاج کس قدر قابل قدر چیز ہے۔ وہ علاج یہی ہوتا ہے نفس کا چھوڑنا ہے۔ اس کا آسان طریق میں بتلائے دیتا ہوں۔ چند روز کرنا پڑے گا۔ بہت ہی تھوڑے دنوں میں انشاء اللہ تعالیٰ نفع معلوم ہوگا۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ ہر کام ابتداً تکلیف سے ہوتا ہے پھر کرتے کرتے اس میں ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے۔ سو آپ اس کا التزام کر لیجئے کہ کوئی قول کوئی فعل معادل میں آئے ہی نہ کر ڈالا کیجئے کہ وہ خواہش نفس کے موافق ہوگا بلکہ ہر کام سے پہلے ذرا سوچنا چاہئے۔ اس کی عادت ڈالنی چاہئے کہ جو کام کیا جائے پہلے سوچ لیا جائے کہ یہ کام حق تعالیٰ کے خلاف تو نہیں۔ یہ میرے لئے مفید ہے یا مضر ہے دھڑک ہو کہ کام کرنے کی عادت بالکل چھوڑ دی جائے۔ اول اول یہ ذرا شاق ہوگا مگر تھوڑے دنوں

میں عادت ہو جائے گی۔ اس کا ہر کام میں خیال رکھو۔ یہ حالت ہو جائے کہ
 بات منہ سے نکالتی ہے مگر رک گئے کہ حق تعالیٰ کا امر کیا ہے اور نفس کی
 خواہش کیا ہے۔ جس بات میں نفس کی خواہش پائی اس کو زبان سے نہ نکالو نہ
 اس پر عمل کیا۔

یہی بات کہ تمیز کیوں کر ہو، حق تعالیٰ کے امر نفس کی خواہش میں اس
 کے لئے علم دین کی ضرورت ہے۔ مخلوط اعلم ضرور چاہئے کہ کتاب نہیں پڑھ
 سکتے ہو تو پوچھ لو۔ چند روز یہی عادت ڈالو۔ اس سے کسی قدر آپ کے
 بولنے میں کمی ہوگی اور کسی قدر آپ کے کھانے میں کمی ہوگی۔ مگر جس وقت
 لذت اس کی حاصل ہوگی تو آپ پھر مخلوط سے کو بہت پر ترجیح دیں گے۔
 مخلوطی چیز ہو اور اچھی ہو وہ بہتر ہے۔ اس سے کہ بڑی ہو اور بہت ہو غلبہ
 کتنا ہی ہو ایک چھچھیری پر اس کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ جب طاعت میں کسی کو
 لذت آنے لگتی ہے تو معصیت کی خفارت اس کے ذہن میں بیٹھ جاتی
 ہے۔ پھر معصیت کا کرنا اس سے زیادہ دشوار ہونے لگتا ہے جتنا کہ پہلے
 طاعت کرنا تھا۔ (مسلمان پر طاعت کرنے میں عادی ہونے سے پہلے بھی
 جو بار ہوتا ہے وہ ایک کلذت ہوتی ہے کہ نیا کام کرنے میں محسوس ہوتی ہے
 جیسا کہ دیگر امور عادی میں تغیر ہونے سے معلوم ہونے لگا کرتے ہیں اور نہ طاعت
 کو کر کے تو مسلمان کو ہمیشہ نشاط اور شریعت ہی ہوتی ہے) عادی ہو جانے
 کے بعد تو معصیت سے نفرت ہو جاتی ہے اور اگر احیاناً معصیت ہو بھی
 گئی تو طبیعت کسرت رہتی ہے اور کسی طرح چین نہیں آتا تا وقتیکہ استغفار

نہ کرے۔

طاعت کی لذت

طاعت میں محبت لذت ہے کہ آدمی لاکھ روپیہ پر ایک نماز کو ترجیح دیتا ہے۔ کوئی

بات تو ہے کہ اگر مسلمان سے کہیں کہ لاکھ روپیہ لے لے اور آج ظہر کی نماز نہ پڑھ تو روپیہ نہ لے گا اور ظہر پڑھے گا۔ ضرور کوئی ایسی چیز پاتا ہے کہ لاکھ روپیہ سے زیادہ ہے۔ حالانکہ ہماری نماز کچھ نماز نہیں۔ اقل سے اخیر تک کوئی رکن بھی قابل اعتبار نہیں۔ نیت نماز کی باندھ رکھی ہے اور دل ادھر ادھر ہے۔ زبان سے قرأت کر رہے ہیں مگر مطلق منبر نہیں کہ اللہ میاں سے کیا کہہ رہے ہیں۔ نیریت یہ ہے کہ زبان الفاظ پر حاوی ہو گئی۔ آپ ہی آپ قرأت کر لیتی ہے ورنہ باعتبار احکام ظاہری بھی عدم صحت کا فتویٰ دیا جاتا اور اعادہ واجب ہوتا۔ سر سجدہ میں ہے مگر خیال اور ہی کہیں ہے۔ اس حالت پر بھی آدمی لاکھ روپیہ سے زیادہ کوئی چیز اس میں پاتا ہے کہ لاکھ روپیہ پر اس کو ترجیح دیتا ہے اور اگر نماز نماز ہو جائے تو اندازہ کر لیجئے کہ کیا اثر رکھے۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند صاف گر باشد نداغم چوں کند

واقعی طاعت وہ چیز ہے اگر اس میں ایک لمحہ کا لطف بھی ملے ہو جائے تو آدمی دنیا و مافیہا کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ خواہش نفسانی کا تو دشمن ہو جائے۔ نفس کے پھندے میں آدمی جب ہی تک آتا ہے جب تک کہ طاعت کی لذت سے واقف نہیں ہوا۔ عادت ڈالنے پھر لذت آنے لگے گی اور کچھ کلفت نہ رہے گی۔ ابتدا میں کسی قدر کلفت ضرور ہوتی ہے

عزیز یہ عادت ڈالنی چاہئے کہ ہر کام کو سوچ کر کرے۔ اگر وہ کام خواہش نفس سے ہو تو نہ کیا۔ اس طرح معصیت چھوٹ جائے گی اور طاعت ہی طاعت رہ جائے گی۔ اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ نرک ہوا سے نفس کے لئے معین ہے خوف۔ اور یہ ظاہر بھی ہے۔ جس کام سے بھی کوئی باز رہتا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف خوف سے باز رہتا ہے۔ جہاں نرک کا خوف ہو یا مال کے نقصان کا یا ہم چشموں میں سبکی کا یا جس چیز کا بھی ہو مگر ہوگا خوف ہی۔ ڈاکو ڈاکہ کیوں نہیں ڈالتا، سزا کے خوف سے۔ بچہ نثرارت سے کیسے رکتا ہے پٹنے کے خوف سے۔ بہت سے جرائم سے لوگ باز رہتے ہیں جہاں نہ کے خوف سے محفل میں آدمی تہذیب سے کیوں بچتا ہے اور خلاف متانت حرکات سے کیوں باز رہتا ہے سبکی کے خوف سے وحلی ہذا۔ خوف ہی تو اٹھ جاتا ہے جو ملک میں امن قائم نہیں رہتا اور قدر ہو جاتا ہے۔ خوف ہی ہے کہ جملہ برائیوں کی جڑ کاٹنے والا ہے۔ خوف ہی ہے کہ جملہ طاعت کا ذریعہ ہے۔

البتہ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ خوف تو ہر مومن کو ہے پھر کیا وجہ کہ ہوا سے نفسانی نہیں چھوٹی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خوف کا استحضار نہیں اور استحضار نہ ہونے کی وجہ صرف ایک ہے عذاب کا نہ سوچنا پس غتہائے معالجہ یہ سوچنا ہوا۔ اس سے خوف کا غلبہ و استحضار ہوگا جو نرک ہوا کے لئے کافی ہو جاویگا۔ اب صرف اس کا طریق سہل بتائے دیتا ہوں

طاعت کی تدبیر کہ سوچنا شروع کیجئے اور اس کے لئے ایک

وقت مقرر کیجئے۔ مثلاً سونے کا وقت۔ اس وقت آپ کے کسی دنیا کے کام میں بھی حرج نہ ہوگا۔ دنیا کے لئے تو سارا وقت دیا ہے اللہ میاں کے لئے نکما ہی وقت دو۔ اتنا تو کرو۔ اللہ میاں اس میں تمہارا کام بنا دیں گے۔ وہاں تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں کہ بندہ ذرا ادھر کو منہ کرے اور رحمت کے انبار اس پر پھر دیں۔ بندہ بس منٹ دیر میں سوئے لیٹ کر یا بیٹھ کر یاد کیا کیجئے کہ آج کیا کیا گناہ کئے۔ فہرست گناہ تیار کیجئے۔ پھر دل میں خیال جمائیے۔ گویا میدان قیامت موجود ہے اور میزان کھڑی ہے۔ اپنا دگوار کوئی بھی نہیں۔ دشمن ہتھے ہیں۔ جیلہ کوئی چل نہیں سکتا۔ زمین گرم تانبے کی طرح کھول رہی ہے۔ آفتاب سر پر دوزخ سامنے ہے اور ان گناہوں کا حساب ہو رہا ہے۔ کوئی جواب معقول بن نہیں پڑتا۔ یہ سب حالات پیش نظر ہوں گے تو بے اختیار ہاتھ جوڑ کر حاکم کے روبرو معذرت کرے گا کہ بے شک خطا وار ہوں۔ کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر کچھ سہارا ہے تو صرف حضور کے رحم کا۔ اسی کو استغفار کہتے ہیں۔ بات کو یہ کیجئے پھر صبح اٹھ کر یاد رکھئے کہ کل فلاں فلاں گناہ کئے تھے اور رات ان سے استغفار اور عہد کیا ہے۔ سو آج وہ گناہ نہ ہونے پائے۔ اس سے اگر اسی دن تمام گناہ بیک لخت نہ چھوٹ جائیں گے تو کمی تو ہو ہی جائے گی۔ اور چند روز میں تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ گناہ رہ سکیں۔ یہ ایسی تدبیر ہے کہ چند ہی روز کرنے سے آدمی معاصی سے بالکل محفوظ ہو جاتا ہے اور دل میں گناہ کے وقت خود ایک ہراس پیدا ہو جاتا ہے۔

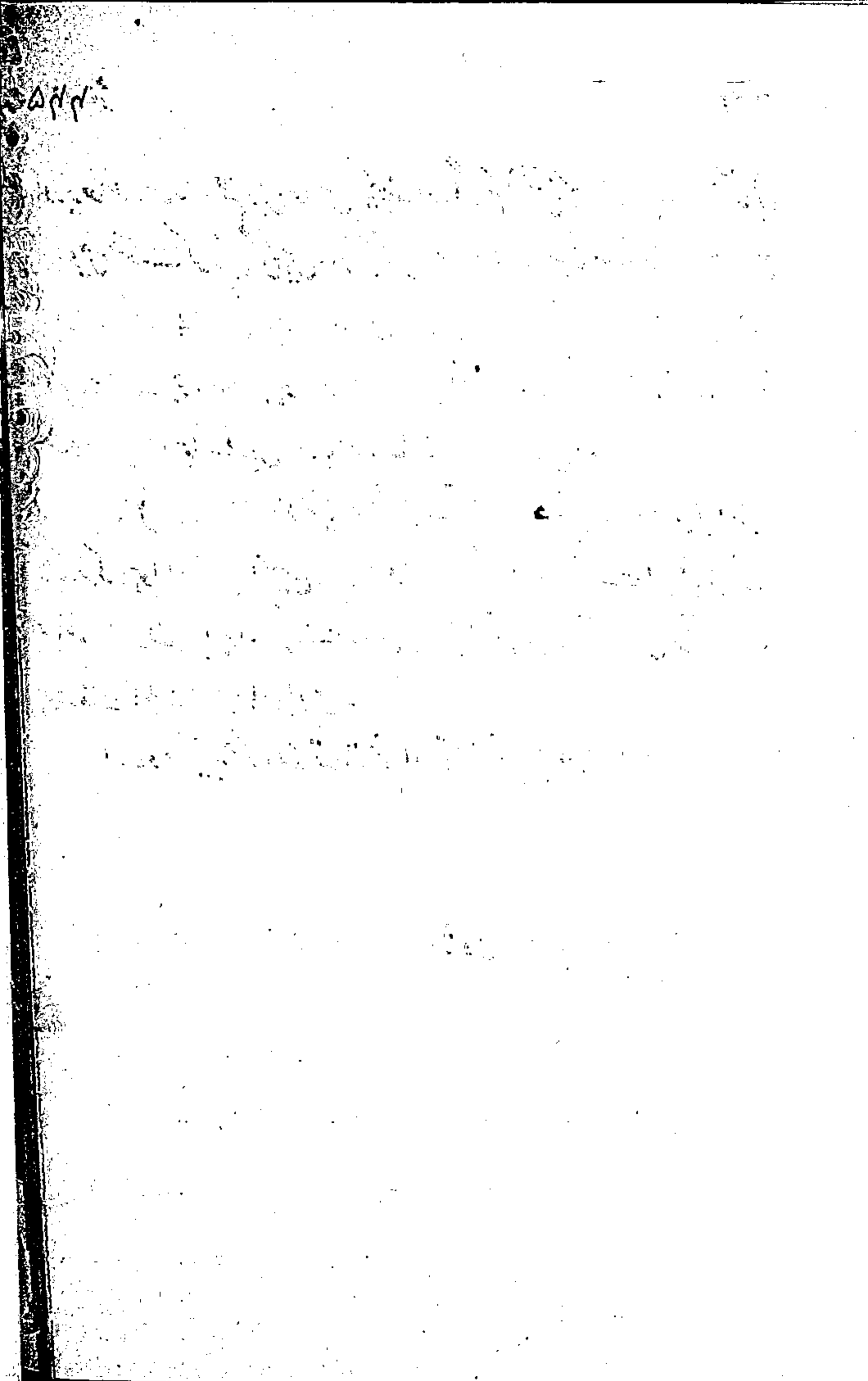
پھر اس کے لئے علم کی ضرورت ہوگی کہ معلوم ہو یہ کام معصیت ہے

اور یہ طاعت۔ سو علم دین حاصل کیجئے اور اگر کم فرصتی کا عذر ہے تو چند کتابیں
 اردو میں منتخب کر دی گئی ہیں۔ ان کو کسی سمجھ دار سے سبقاً سبقاً پڑھ لیجئے۔ یہ
 ضرورت کے لئے کافی ہے۔ کتابوں کو خود نہ پڑھئے کہ اس سے طبیعت
 میں پہلے سے جو اشکال ہوتے ہیں وہ حل نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات نئے
 اشکال پیدا ہو جاتے ہیں اور باعث مضرت ہوتے ہیں۔

حاصل سارے وعظ کا یہ ہوا کہ جنت مطلوب ہے اور اس کا ذریعہ
 ہے ترک ہوا اور اس کا معین ہے خوف اور اس کا طریق ہے مراقبہ۔ جب
 مراقبہ کیا خوف پیدا ہوا۔ اس سے خواہش نفسانی چھوٹ گئی۔ اس پر نتیجہ مرتب
 ہوا۔ فان الجنة هي العادي۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم اور توفیق عمل کی عطا فرماویں۔

اشرف علی!



2

وعظ الجلیلی

آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے کے متعلق یہ وعظ ۱۲ رجب ۱۳۳۷ھ
 کو مولوی محمد انوار الحسن صاحب دہلی کا کوری ضلع بکھنو کے مکان
 پر تحت پر بیچھ کر فرمایا۔ سامعین تخمیناً ایک ہزار مستورات کا
 مجمع بھی تھا۔ ۲ گھنٹہ میں ختم ہوا۔ حکیم محمد یوسف بجنوری نے قلمبند
 کیا

خطبة ما توره

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله ونحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونشرك
 عليه ونعوذ بالله من شرورنا وشرورنا وشرورنا وشرورنا
 من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له
 ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد
 ان سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله صلى الله تعالى
 عليه وبارك وسلم انا بعد فاعوذ بالله من الشيطان
 الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم بل توثرون
 الحيوۃ الدنيا والاخرة خيراً والبقا۔

فلاح کا طریقہ | اس آیت کے اختیار کرنے کی وجہ جیسے یہ ہے کہ اس میں ایک ضروری مضمون مذکور ہے ایسے ہی اختیار کرنے کا معنی یہ امر بھی ہے کہ قریب ہی زمانہ ہوا کہ اس کے قبل اس سے پہلے کی آیات کے متعلق بیان ہو چکا ہے چونکہ یہ اسی سلسلہ میں ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس مضمون کو پورا کر دیا جائے۔ اس لئے اس وقت اس آیت کو اختیار کیا گیا۔ حق تعالیٰ نے اس آیت میں ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے اور اس کے قبل بھی ایک ضروری مضمون بیان ہو رہا ہے جو مرتبط اس جملہ سے ہے۔

وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے اس کے قبل فلاح کا طریقہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاح کامل کا طریقہ یہ ہے کہ ایک نو تزکیہ ہو کہ اس کو بڑے عقائد اور اخلاق ذمہ سے پاک کرے۔

دوسرے ذکر ہو کہ خدا تعالیٰ کا نام لیا کرے اور ذکر زبان کی عبادت ہے جیسے کہ تزکیہ عقائد فاسدہ اور اخلاق ذمیرہ سے قلب کی عبادت ہے تیسرے صلوات ہے کہ اس کو مع اس کے حقوق کے ادا کرے کیونکہ نماز کامل وہی ہے جو مع حقوق کے ادا کی جائے۔

عرض تین چیزیں ہیں۔ فلاح کا طریقہ، قلب و نفس کا پاک کرنا اور زبان سے ذکر کرنا اور جوارح سے اعمال کرنا اور اگر زبان کو جوارح سے مانا جائے تو دو چیزیں نکلیں گی۔ ایک قلب و نفس کا پاک کرنا جو باطن کے متعلق ہے۔ دوسرے جوارح کو اعمال ظاہری سے آراستہ کرنا۔ یہ ظاہر کے متعلق ہے خلاصہ یہ کہ ظاہر و باطن دونوں کو درست کرنا۔ یہ ہے فلاح کا طریقہ۔

اس مضمون کا مفصل بیان ہو چکا ہے۔ اس لئے اب بقیہ مضمون جو اس آیت کے اندر مذکور ہے بیان کیا جاتا ہے تاکہ اس مضمون کی تکمیل ہو جائے۔

میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے۔ بل توشرون الحیوة الدنیا بل اس میں اضراب کے واسطے ہے جس کے معنی ہیں اعراض کرنا ایک بات سے دوسری بات کی طرف۔ جیسے بچوں کہیں جاؤ زید بل عمرو۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ زید کی طرف جو نسبت آنے کی تھی اس سے رجوع کر کے نسبت عمرو کی طرف کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فلاح کا طریقہ تو وہ ہے جو بتلا یا گیا۔ تمہیں اسی طریقے کو اختیار کرنا چاہئے تھا۔ اس کے اختیار کرنے سے فلاح حاصل ہوتی مگر اس کو اختیار نہیں کرتے۔ بل توشرون حیوة

الدنیا۔ بلکہ تم اس سے اعراض کر کے اور اس کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار
کرتے ہو۔ جس سے فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس میں مدعیان عقل کی غلطی بیان کر رہے ہیں کہ فلاح کا طریقہ وہ ہے
جو ہم نے بیان کیا ہے نہ وہ جس کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ یوں فلاح تو
سب کو مطلوب ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں مقصود اصلی سب کا یہی ہے
باقی اس کے طریقے میں اختلاف ہے۔ مدعیان عقل تو فلاح کا طریقہ اور
بتاتے ہیں اور حق تعالیٰ دوسرا طریقہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اور بتلاتے ہیں
کہ اس طریقہ کو اختیار کرے گا تو فلاح ہوگی۔ نہ اس طریقہ سے جس کو تم نے اختیار
کر رکھا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ فلاح تو مطلوب عام ہے یعنی سب اسی کو چاہتے
ہیں۔ کسی کو بھی اس میں تردد نہیں مگر اس کے طریقہ تعیین میں غلطی واقع ہوتی ہے
اس آیت میں دو دعوے ہوئے ایک تو یہ کہ تم لوگ
ذکر اللہ اور دنیا ترجیح دے رہے ہو دنیوی زندگی کو آخرت پر دوسرے
یہ کہ اس سے فلاح حاصل نہ ہوگی۔ پہلا دعویٰ تو بدیہی بلکہ حسی ہے۔ چنانچہ
لوگوں کے معاملات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مثبت روز دنیا ہی میں
منہمک اور اسی کی دُمن میں لگے ہوئے ہیں۔ یہاں تک دین سے بے تعلق
ہے کہ اگر دین کو بھی اختیار کرتے ہیں تو اس میں بھی دنیا کی آمیزش ہوتی ہے
حالانکہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ دنیا میں بھی دین ہی کی شان ہوتی
چنانچہ اہل ایمان کی شان کو ایک موقع پر حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ

لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله وإقام الصلاة
 وإيتاء الزكاة

یعنی ان کی یہ شان ہے کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے
 غافل نہیں کرتی۔

تجارت تو اس کو کہتے ہیں جو بڑا معاملہ ہو اور بیع چھوٹے اور بڑے
 معاملہ دونوں کو شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ بڑا معاملہ ان کو ذکر اللہ سے
 غافل کرتا ہے اور نہ چھوٹا معاملہ غافل کرتا ہے۔ سو یہ شان ہوا کرتی ہے اہل
 ایمان کی اور اس پر کچھ تعجب نہ کیجئے کہ ذکر اللہ اور دنیا میں اجتماع کیسے ہو
 سکتا ہے کیونکہ اس کے نظائر موجود ہیں۔

مثلاً کسی کو کسی سے محبت ہو جائے اور مدت کے بعد اس کی تمنا
 پوری ہو کہ محبوب اُس سے ملنے کے لئے بلائے تو وہ چاہے گا کہ ایسا بن کر
 جاؤں کہ اُس کے نزدیک بے قدر نہ ہوں۔ آدمیوں کی شکل سے جاؤں کیونکہ
 اس میں محبوب کی بے قدری ہے کہ چہاروں کی طرح اس کے سامنے چلا جائے
 نظر ہے کہ جب محبوب کے سامنے انسانیّت کی شکل اور ادمیت کے جامہ
 میں ہو کر جانا چاہے گا تو اول تھپ بنوائے گا۔ غسل کرے گا۔ خط بنا کر پاک
 صاف ہو کر اور اچھے کپڑے پہن کر تب اُس کے سامنے جاوے گا۔ پس وہ
 صورتہ تو غیر محبوب میں مشغول ہے مگر حقیقتاً محبوب ہی کی یاد میں مشغول ہے۔
 اس واسطے کہ وہ سارے کام محبوب ہی کے واسطے کر رہا ہے۔ جو شخص
 ناواقف ہے وہ یوں خیال کرے گا کہ یہ عاشق نہیں ہے اور کہے گا کہ یہ

کیسا عاشق ہے۔ اگر واقعی عاشق ہوتا تو جب محبوب نے بلایا تھا فوراً دوڑ پڑتا
 ذرا بھی تاہل نہ کرتا۔ اس کی کیا حالت ہے کہ محبوب کو چھوڑ کر سنگار میں مصروف
 ہے۔ اور یوں کہے گا کہ شاید یہ محبوب کو بھول گیا اسے محبوب کا دھیان
 نہیں رہا۔ اس پر محبت کا غلبہ نہیں۔ لیکن اس بات کو عاشق جانتا ہے کہ وہ
 ہر حالت میں محبوب ہی کی یاد میں لگا ہوا ہے۔ شرط بنوارا ہے تو وہ بھی محبوب
 ہی کے واسطے اور غسل کر رہا ہے تو وہ بھی محبوب ہی کے لئے۔ اور سنگار
 کر رہا ہے تو وہ بھی محبوب ہی کی خوشی کے واسطے۔ عرض ہر فعل اس کا محبوب
 ہی کے لئے ہے۔ ہر کام میں اس کی یاد ہے۔ کوئی کام اس کا اپنے نفس
 کے لئے نہیں۔ اس کا تو کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں کہ جس میں یہ کہہ سکیں کہ یہ شخص محبوب
 سے غافل ہے۔ گویا ہر میں وہ ایسے کام کر رہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ
 یہ محبوب سے غافل ہے۔ لگہ واقع میں ذرہ برابر بھی اس کو محبوب سے غفلت
 نہیں ہے۔

جب یہ بات اذنی سے عشق میں ٹھکن ہے کہ نہ خط بنوانا محبوب کی یاد
 سے غافل کرتا ہے نہ غسل اور سنگار کرنا غافل بناتا ہے۔ پھر کیا تعجب کی بات
 ہے کہ حق تعالیٰ کے عاشق کو تجارت اور بیع اس کی یاد سے غافل کرے
 خدا تعالیٰ کا عاشق تجارت کرتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے واسطے اور بیع کرتا
 ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے واسطے۔ جیسے عاشق مجازی ہر کام محبوب کے تعلق سے
 کرتا ہے اسی طرح یہ بھی ہر کام محبوب حقیقی کے تعلق سے کرتا ہے۔ یہ کوئی کام
 اپنے نفس کے لئے کرتا ہی نہیں۔ پس اس کی تو نظیر دنیا میں موجود ہے۔ بہر حال

مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ دنیا کا کام کرے تو اس میں بھی دین ہی ملحوظ رہے ہو۔

نیت کی اہمیت | ایک حکایت ہے کہ کسی بزرگ کے ایک

مرید نے مکان بنوایا تھا۔ جو ب بن کر تیار ہو گیا تو شیخ کو مکان دکھانے لے گئے۔ اس مکان میں روشندان کھلے ہوئے تھے۔ شیخ نے پوچھا کہ یہ روشندان کس عرض سے رکھے گئے ہیں۔ مرید نے کہا کہ یہ اس واسطے رکھے ہیں کہ مکان میں روشنی آیا کرے۔ شیخ نے ایک آہ کھینچی اور کہا کم سخت اگر بنانے کے وقت یہی نیت کر لیتا کہ ان سے اذان کی آواز آیا کرے تو تیرا مقصود تو جب بھی حاصل ہو جاتا۔ کیونکہ روشنی کا آنا تو اس کی نیت کرنے پر موقوف نہیں ہے اور اس کے ساتھ جو ب تک روشندان باقی رہتے ابتر بھی پڑتا۔

آخر یہ کیا بات تھی جو یہ بزرگ روشنی کی نیت سے روشن دان بنانے پر نکتا ہوئے۔ بات یہ ہے کہ مسلمان کو دنیا میں بھی دین ہی مطلوب ہونا چاہئے واقعی اگر دنیا میں دین مطلوب ہو تو اس سے منافع و نیوی منقطع تھوڑا ہی ہو جاوینگے کہ دنیا کے وہ منافع تو حاصل ہوتے ہی ہیں مگر نیت درست ہونے سے دین کا بھی بھلا ہو جاتا ہے۔

مثلاً نکاح دنیا کا قصہ ہے اور کوئی اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے دین محض تو وہ ہے جو اہل اسلام کے ساتھ مخصوص ہو اور نکاح کافر و مسلم دونوں میں مشترک ہے۔ بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف دنیا کا قصہ ہے

مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نیت یہ ہونا چاہیے کہ اس سے
عفت محفوظ رہے اور طبیعت منتشر نہ ہو اور بھصیت خاطر کے ساتھ عبادت
ہو سکے۔ اگر اس نیت سے کریگا تو نکاح عبادت ہو جاوے گا۔

اس سے بڑھ کر اور لیجئے۔ کھانا پینا اور پہننا ہے دنیا ہی کا کام کافر
بھی کھاتے پیتے اور پہنتے ہیں۔ اس میں دنیا ہی کا تو نفع ہے مگر اس میں بھی مسلمان
کی شان وہ ہونی چاہیے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو یہ نیت
رکھنا چاہیے کہ میں اس لئے کھاتا پیتا ہوں کہ طاعت پر قوت ہو۔ حق تعالیٰ
کی نصرت کا تذکرہ ہو۔ پس اس نیت سے کھانا پینا بھی عبادت ہو جاوے گا
اسی طرح سے جتنے دنیوی امور ہیں ان سب میں دین کی نیت ہو سکتی ہے۔

اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کسب الحلال
فرضاً بعد الفرض یعنی جو فرض شرعیہ میں نماز روزہ وغیرہ ان کے بعد
کسب حلال بھی فرض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کو فرض فرماتے
ہیں تو پھر یہ دین کیسے نہ ہوگا۔

فرض کا تو دین کے اندر سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ دین کے اندر بہت
سے درجے ہیں واجب اور سنت اور فرض۔ ان سب میں فرض اعلیٰ درجہ ہے
لہذا کسب حلال اعلیٰ درجہ کی فرد ہوتی دین کی۔ جب کہ اس میں نیت ہو کہ اہل
و عیال کی خدمت کریں گے۔ حقوق کو ادا کریں گے۔

حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ انسان جو بی بی کے پاس جاتا ہے
اس سے بھی ثواب ملتا ہے۔ کسی نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو

اپنی خواہش کا پورا کرنا ہے۔ اس پر کیوں ثواب ملتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر اپنی خواہش کو بے محل صرف کرنا تو گناہ ہوتا یا نہیں۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ نے فرمایا تو جب حلال موقع میں صرف کرتا ہے تو ثواب بھی ملتا سچا ہے۔

عرض مسلمان اس بنا پر دنیا دار ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے یہ عوارض چھوڑ دینا سچا ہے کہ ہم دنیا دار ہیں مسلمان تو دنیا دار ہی ہے۔ مسلمان کی دنیا بھی دین ہی ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ نیت کر کے اس کو دین بنانا چاہئے

یہی اس سے زیادہ کہیا کہ کون ہو گا جس کو تانبے کا سونا بنانے کی ترکیب بتا دی گئی ہے۔ متعارف کہیا میں اولیٰ تو حکما کا بھی اختلاف ہے کہ تانبے کا سونا بنانا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ پھر اگر ممکن بھی ہو تو اس کا حاصل ہونا دشوار ہے۔ مگر یہ کہیا کیسی کستی اور آسان ہے کہ دنیا کا تانبہ تھوڑی سی اہرنج جس کا نام نیت ہے سونا بن جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایسی کہیا عطا فرمائی ہے۔ مگر انیسویں ہے کہ ہم اس سے نفع نہیں ہوتے۔ ایسی بات میں ہم دنیا کو دین بنا سکتے ہیں۔

ہماری شان تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ ہر امر میں دین ہی مقصود ہوگا۔ مگر حالت یہ ہے کہ ہم دین کو بھی دنیا بنا رہے ہیں۔ بڑی چیز سے علم اور عبادت۔ ہم عالم اور عابد ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو اگر نیت سے کہ ہماری آبرو اور عزت ہو۔ ہماری طرف لوگوں کا احتقاد ہوا۔ یہی اللہ اللہ کرنے والے سب سے بڑے طبقہ میں شمار ہیں جن کو صوفیاء

دنیا کی دھن

لقب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں بھی کثرت سے وہ لوگ ہیں جن کو کیفیات مقصود ہوتی ہیں۔ کیفیات کیا ہیں اغراض دنیویہ ہی تو ہیں۔ بس عام طور پر یہی حالت ہے کہ دین کو دنیا بنا رکھا ہے۔

بہر حال میں نے یہ تقریح اس پر کی ہے کہ مسلمانوں کو یہ محاورہ چھوڑ دینا چاہئے کہ ہم دنیا دار ہیں۔ مسلمان تو دنیا دار ہو ہی نہیں سکتا۔ دنیا دار تو اور ہی لوگ ہیں۔ اویہ نہیں سے اس شعر کے معنی بھی حل ہو گئے کہ

اہل دنیا کا فسران مطلق اند۔ روز و شب رزق رزق اور بنی بن اند

ظاہراً تو یہ بہت سخت حکم معلوم ہوتا ہے کہ سارے دنیا دار کافر ہیں۔ کیونکہ اکثر مسلمان بھی تو دنیا دار ہیں۔ پس اس سے لازم آتا ہے کہ وہ بھی کافر ہوں۔ مگر ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں جو لوگ سمجھتے ہیں۔ لوگوں نے اس شعر کی ترکیب سمجھنے میں غلطی کی ہے کہ اہل دنیا کو بننا اور کافران مطلق کو خبر فرار دیا ہے بلکہ اس کی ترکیب برعکس ہے یعنی کافران مطلق بننا اور اہل دنیا خبر مقدم ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اہل دنیا کون لوگ ہیں کافر مطلق ہیں۔ اہل دنیا کا مصداق بس کفار ہی ہیں۔ مومن چاہے کیسا ہی ہو وہ حقیقتاً اہل دنیا نہیں۔ اس معنی کا فریبہ خود آگے موجود ہے کہ فرماتے ہیں

روز و شب رزق رزق اور بنی بن اند

کیونکہ یہ نشان تو کفار ہی کی ہے کہ دن رات دنیا کی رزق اور بنی بنی میں مبتلا ہیں اور شب و روز دنیا ہی کی ان کو دمن ہے۔ کسی وقت بھی خدا کی یاد ان کی زبان اور دل میں نہیں آتی۔ چنانچہ تجربہ سے دیکھ لیجئے کہ جب ذکر کرینگے

تو تجارت اور دنیا ہی کے جھگڑوں کا ذکر کریں گے۔ ریلوں میں دیکھئے تو یہی دنیا کے فتنے لے کر بیٹھیں گے کہ تمہارے یہاں گیموں کیا بھاؤ ہیں فلاں چیز کا نرخ کیا ہے۔ یہی باتیں ہر وقت زبان پر رہتی ہیں اور اس کے سوا کوئی ذکر ہی نہیں اور مسلمان چاہے کیسا ہی ہو اس کی یہ حالت ہرگز نہیں ہوتی۔ اس کی کوئی نہ کوئی ساعت ایسی ضرور ہوگی کہ جس میں وہ حق سبحانہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوگا۔ مسلمان کسی نہ کسی وقت ضرور گھبرائے گا اور خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا۔ اگر نہ بان سے نہیں تو قلب میں تو ضرور خدا کو یاد کرے گا۔

طاعون میں دیکھئے کیا حالت تھی۔ حق تعالیٰ اور آخرت کی طرف کسی توجہ تھی۔ اگر مسلمانوں کے دل میں آخرت بسی ہوئی نہیں ہے تو اس کی یاد کیسے ہوتی ہے۔ بہر حال دنیا دار کسی مسلمان کو نہیں کہہ سکتے۔ مسلمان تو اہل دین ہی ہوگا۔

راحت قلب
 لال اہل دین کے مراتب مختلف ہیں کوئی کم کوئی زیادہ جیسے عربی مدرسہ میں طلبا ہوتے ہیں۔ کوئی میزان پڑھنے والا ہے۔ کوئی مشکوٰۃ پڑھتا ہے، کوئی شمس باز غمگین سب عربی پڑھنے والے۔ پس جتنے اہل اسلام ہیں سب اہل دین ہیں۔ کوئی کم کوئی زیادہ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ دنیا کو بھی دین ہی بنائے مگر ایسا کرتے نہیں۔ چنانچہ اپنی حالت کے نتیجے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کام بھی ہم کرتے ہیں اس میں کوئی نہ کوئی آمیزش دنیا کی ہوتی ہے اور اس میں زیادہ مقصود دنیا ہی ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی یہ حالت کر رکھی ہے اور اس کو کبھی

یہ ہے ہیں کہ یہی طریقہ ہے فلاح کا۔ جب ہی تو رات دن دنیا میں کھپ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کسی کو سلطنت حاصل ہو جائے۔ اعلیٰ درجہ کی ترقی ہو کہ بادشاہ ہو جائے مگر حقیقت میں جس کا نام کامیابی ہے وہ اس کو بھی میسر نہیں۔ ان اللہ والے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو کامیابی میسر ہے۔

میں مختصراً کامیابی کا ذکر کئے دیتا ہوں کہ وہ ہے کیا چیز۔ اول مقصود کا نعتین پورا نا چاہئے کہ مقصود کیا چیز ہے۔ تب معلوم ہوگا کہ وہ کس کو حاصل ہے تو وہ کامیاب ہے اور کس کو نہیں۔ سو وہ مقصود میں ایک چیز ہے۔ وہ کیا ہے راحت۔ جو بھی کوشش کرتے ہیں کامیابی کی اس سے مقصود سب کا راحت قلب ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو اب مشاہدہ کر بیجئے۔ بادشاہ کی حالت دیکھ لیجئے۔ ان کو راحت بھی نصیب ہے یا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان کو راحت میسر نہیں ہے۔

راز اس کا یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مقاصد متعین کر رکھے ہیں جن کے کچھ تو اسباب ہی اختیار میں نہیں اور بعض کو اختیار ہی تو ہیں مگر ان پر مقاصد کا تو تب یقینی نہیں کہ جب وہ پاسے جائیں تو مقصود بھی ضرور پایا جائے بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اسباب کو جمع کرتے ہیں مگر ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔ سو وہ لوگ چونکہ اپنے خیال میں اول ایک ثمرہ متعین کر لیتے ہیں کہ ایسا کرنے سے یہ ثمرہ حاصل ہوگا اور اس کی توقع پر ان اسباب کو مہیا کرتے ہیں اور پھر اکثر اس توقع کے خلاف پیش آتا ہے اور ان کی امید پوری نہیں ہوتی اس لئے پریشان ہوتے ہیں۔ کیونکہ پریشانی کا حاصل کیا ہے۔ امید کا پورا نہ ہونا پس

جب وہ امید پوری نہیں ہوتی تو قلعن ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے ان لوگوں کی بیشانی کی۔ بخلاف اہل دین کے کہ ان کا اصلی مقصد صرف آخرت ہے سو وہ ان کے اسباب مہیا کرتے ہیں اور اس کے بچنے اسباب ہیں وہ سب یقینی ہیں کہ عثرہ کا ان پر مرتب ہونا لازمی ہے۔ تخلف ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی نماز پڑھے اور خدا تعالیٰ خوش نہ ہوں۔ یا کوئی اسلام لائے اور جنت نہ ملے یہی یہ بات کہ شاید اسلام پر خاتمہ نہ ہونے کی وجہ سے جنت نہ ملے۔ سو یہ اس کے یقینی ہونے کے منافی نہیں۔ کیونکہ متافقات اس وقت ہوتی ہیں جب کہ اسلام تو پایا جاتا اور پھر جنت نہ ملتی اور اس صورت میں تو اسلام ہی نہ رہتا اور وہ بھی اپنے اختیار سے۔ کیونکہ اسلام اس وقت تک نہیں جاتا جب تک کہ خود ہی ان کو نہ چھوڑے۔ چونکہ اسباب آخرت پر عثرہ کا ترتیب یقینی ہے اس لئے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کی امید پوری نہ ہو۔ پس ان کو بیشانی کیوں ہوگی کیونکہ بیشانی کی حقیقت ملتی امید کا پورا نہ ہونا اور اس کا یہاں احتمال ہی نہیں اور اگر کسی موقع میں ان کو دنیا بھی مقصود ہوتی ہے تب بھی ان کو بیشانی نہیں ہوتی کیونکہ گو اس کے عثرہ کا تخلف اسباب سے ممکن ہے مگر ان کا مذاق یہ ہے کہ وہ اس پر مہر نہیں ہوتے کہ اسباب پر عثرہ ضرور ہی مرتب ہو جائے اگر عثرہ مرتب نہ ہو تو وہ اس پر بھی راضی رہتے ہیں۔

ان کی حالت یہ ہے کہ وہ جس وقت کسی مریض کا علاج کرنے میں تو وہ گویا چاہتے ہیں کہ اچھا ہو جائے مگر قلب کو اس کے ساتھ ایسا متعلق نہیں کرنے کہ اگر صحت نہ ہو تو بیشان ہو جائیں۔ اگر صحت نہ بھی ہو تب بھی وہ راضی ہی

رہتے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ یہ رضا عقلی ہے یا طبعی۔ تو سمجھ لیتا چاہئے کہ رضا طبعی تو ضروری نہیں۔

اہل حال و اہل مقام

الغیرہ رضا عقلی ضروری ہے۔ ان حضرات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مریض کی صحت پر بھی راضی ہوتے ہیں اور عدم صحت پر بھی۔ اگر مریض مر بھی جائے تو طبعاً تو ایک قسم کا حزن ہوتا ہے مگر عقلاً اس پر بھی راضی ہوتے ہیں اور بعضوں کو طبعاً بھی کچھ اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ بعض اولیاء اللہ کی حکایت سنی ہے اور کتابوں میں موجود ہے کہ وہ اولاد کے مرنے پر ہنس دیتے۔ ان کو اس میں لذت ہوتی۔

میں نے خود ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا تھے۔ کسی نے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے۔ تو اس کو سن کر ہونٹوں پر تبسم تھا اور یوں کہا کہ خدا تعالیٰ کا شکر ہے۔ ہنستے تھے۔ حالانکہ سخت تکلیف میں مبتلا تھے۔

بعض اہل حال کی یہ حالت بھی ہوتی ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا کہ ایسے لوگوں کو اعلیٰ ترقی ہو گئی ہے بلکہ ان سے آگے اور مرتبہ کے لوگ ہیں جو ان کے مرتبہ کو پہنچ کر ادا گئے بڑھ گئے ہیں۔ گواہان کی ظاہری حالت بڑھی ہوئی نہیں معلوم ہوتی اور عوام ان کو کچھ نہیں سمجھتے۔

اس کو ایک مثال میں سمجھئے کہ ایک دریا بڑے عظیم الشان ہے اور اس کے اس کنارے پر ایک شخص ہے۔ اور ایک شخص اس کنارے پر اتر گیا ہے اور ایک نمبر شخص دریا کے درمیان میں ہے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ زیادہ کمال کون ہے۔ عبور اور عدم عبور کے اعتبار سے مقام کس کا بڑھا ہوا

ہے۔ ظاہر ہے کہ جو دریا کو عبور کر گیا ہے وہ بڑھا ہوا ہے اور کامل السیروی ہے جو دوسرے کنارے پہنچ گیا ہے۔ بتدی کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اس کنارہ پر کھڑا ہے۔ اور اہل سال کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو دریا کے پیر میں ہے۔ یہ شخص متوسط الحال ہے اور اہل مقام کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دریا سے پار ہو گیا ہے۔ یہ شخص منتہی ہے۔ بظاہر تو بتدی کی حالت میں اور اس کی حالت میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کی حالت یکساں معلوم ہوتی ہے جو شخص ناواقف ہو گا وہ اس شخص کو جو پار اتر گیا ہے اس کنارے والے کی مثال سمجھے گا۔ کیونکہ جیسے یہ کنارہ پر ہے ایسے ہی وہ بھی کنارہ پر ہے اس لئے ممکن ہے کہ اسے یہ گمان ہو کہ وہ اس کنارہ پر آنا چاہتا ہے اور جو شخص واقف ہے اور جانتا ہے کہ وہ دریا سے گزر کر اس جگہ آیا ہے تو وہ اس کو افضل سمجھے گا۔

بس تین قسم کے لوگ ہوئے۔ بتدی، متوسط، منتہی۔ منتہی کی حالت ظاہر میں بتدی کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس لئے عوام کو دونوں میں امتیاز نہیں ہوتا اور اہل سال کی حالت ہے ممتاز۔ اس لئے عوام ان کو بہت بڑا سمجھتے ہیں حالانکہ وہ ابھی درمیان میں ہیں۔ چونکہ منتہی کی حالت مشابہ ہوتی ہے بتدی کے اس لئے جیسے بتدی کو بیٹے کے مرنے سے رونا آتا ہے منتہی کو بھی آتا ہے گو کہ اس کے رونے اور اس کے رونے میں زمین آسمان کا فرق ہے مگر ظاہری صورت دونوں کی یکساں ہوتی ہے۔

و یکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صاحبزادہ حضرت ابراہیم

کے انتقال پر روئے اور جب بعض صحابہ نے اس پر تعجب کیا تو فرمایا کہ یہ رونما
 تو رحمت ہے۔ ترجم اور شفقت سے رونما آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل ہوگا اور آپ کی حالت یہ تھی کہ آپ کو
 صاحبزادہ کے انتقال پر رونما آیا پس معلوم ہوا کہ رونما کمال کے منافی نہیں جو
 کامل ہوتا ہے اس کو ایسے واقعات میں ضرور رونما آتا ہے اور یہ شخص صاحب
 مقام ہوتا ہے۔

البتہ صاحب حال نہیں روتا۔ عوام اہل حال کو کامل سمجھتے ہیں مگر واقع
 میں کامل وہی شخص ہے جو بیٹے کے مرنے پر روتا ہے۔ بظاہر تو اس کا
 رونا بتدی کے مشابہ ہے مگر واقع میں مشابہ نہیں۔ بتدی کا رونا تو محض داعیہ
 نفس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بتدی کا رونا ترجم کی وجہ سے ہوتا ہے اس کے
 اور اس کے رونے میں بہت فرق ہے اور صرف رونے ہی میں نہیں بلکہ
 اس کے اور اس کے کھانے پینے اور ہر بات میں بہت فرق ہے۔ گو
 ظاہری صورت دونوں کی یکساں ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے عوام نے انبیاء کو نہیں پہچانا اور ان کو
 ظاہری نظر سے اپنے ہی مثل سمجھے۔ کیونکہ ان کی ظاہری حالت کوئی ممتاز نہ
 تھی۔ اسی واسطے تو حضرت ہود کے بارہ میں ان کی قوم نے کہا تھا۔
 ما هذا الا بشر مثکم یا کل مما تاکلون منه ولینوشوا
 مما نشربون۔

نہیں ہیں یہ نگر ایک بشر تمہاری مثل۔ وہی کھانے میں جو تم کھاتے

ہو اور وہی پلٹتے ہیں جو خم پلٹتے ہو۔

عرض کہ اہل حال کو اہل مقام سے افضل سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ پس اہل حال کی رضا طبعی ہوتی ہے اور اہل مقام کی رضا عقلی۔ رضا ان میں بھی ہوتی ہے مگر وہ طبعی رضا سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ پس یہ درجہ میں اہل حال سے زیادہ ہیں۔

تفویض اور راحت | یہاں ایک شبہ اور ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ جب اہل حال کو رونا نہیں آتا اور اہل مقام کو رونا آتا ہے تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل حال طبیعت کی پاکیزگی میں اہل مقام سے بڑھے ہوئے ہیں کہ قضاء حق سے ان کی طبیعت پر بھی ناگواری نہیں ہوتی۔

بات یہ ہے کہ اہل حال کی طبیعت چونکہ حال کے غلبہ کی وجہ سے بالکل مغلوب ہو جاتی ہے اس لئے ان کی طبیعت نہ واقعات کا پورا ادراک کرتی ہے اور نہ ان سے متاثر ہوتی ہے اور اہل مقام پر چونکہ حال کا غلبہ نہیں رہتا اس لئے ان میں امور طبعیہ پھر عود کرتے ہیں مگر عقلی قوت ان کی طبعی قوت سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے بمقتضائے طبع ان کو رونا آتا ہے مگر اذ جارفتہ نہیں ہوتے۔ حد کے اندر رہتے ہیں۔ اور جب ان کی طبیعت مغلوب نہیں ہے تو پھر رونا کیوں نہ آوے۔ طبیعت تو اسی واسطے ہے کہ اس کو ادراک ہو اور ادراک نہ ہونا یہ تو اس کا نقص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام واقعات سے متاثر ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ادراک کامل ہوتا ہے

یہ معلوم ہوا کہ لطافت طبع میں بھی اہل مقام ہی بڑھے ہوئے ہیں کہ ان پر اتفاقاً
کا اثر ہوتا ہے۔ اور اہل سماں کی طبع میں چونکہ اس درجہ لطافت نہیں اس لئے
ان پر اثر نہیں ہوتا۔ اہل مقام نے تو دوحق ادا کئے۔ طبیعت کا حق بھی ادا کیا وہ
یہ کہ ان کو رونائیا اور عقل کا بھی حق ادا کیا کہ حد سے تجاوز نہیں کیا، اس لئے
یہ اہل سماں سے زیادہ ہیں۔

بہر حال یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ ان کو
اصرار نہیں ہوتا کسی مشرہ پر کہ فلاں عمل کا مشرہ مرتب ہو ہی۔ اگر مشرہ مرتب نہ بھی
ہو تو بھی راضی ہیں۔ البتہ الحاج سے دعا کریں گے کہ یا اللہ ایسا کر دیجئے اور
یہ اس وجہ سے ہے کہ حق تعالیٰ ہی کا ان کو ارشاد ہے۔

ان اللہ یحب المتحین فی
الدعاء
والوالوں کو دوست لکھتے ہیں۔
کہ اللہ میرا دعا میں ہٹ کرنے

اس وجہ سے وہ الحاج کے ساتھ دعا کرتے ہیں۔ مگر نہ اس طرح کہ اگر
دعا قبول نہ ہو تو وہ ناراض ہوں بلکہ وہ اس وقت بھی راضی ہی رہتے ہیں اس سے
معلوم ہوا کہ ان کو مشرہ پر اصرار نہیں ہوتا۔ ہاں اصرار بایں معنی ہوتا ہے کہ ان کی
ساجدیت ہے۔ اس کو پیش کرتے ہیں۔ اظہار عبدیت کے لئے حق تعالیٰ کے
سامنے مچلتے ہیں کہ ہم فروریں گے۔ جس کی دو وجہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ
کی رضا اس میں سمجھتے ہیں۔ دوسرے اس میں عبدیت کا اظہار ہے۔ اس سے
وہ اپنی عبدیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ سوالن کا اصرار اس معنی کر ہے۔

باقی اصرار کی نفی جو کی ہے کہ ان کو مشرہ پر اصرار نہیں ہوتا تو وہ اس معنی

کہ ہے کہ ان کو شرہ نہ ملنے سے پریشانی نہیں ہوتی۔ یہ نہیں ہوتا کہ اگر شرہ نہ ملے
 تو وہ ناراض ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شکائتیں پیدا ہونے لگیں کہ سمجھاؤ
 تھا اور ہو گیا کچھ۔ ان کی دعا تو یہ ہوتی ہے کہ ادھر ان کو دعا کے قبول نہ ہونے
 کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ معاً ہی ان کے قلب میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ خیر شہی
 ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے واقع ہوا۔ گو کہ ہم ان کے خلاف کو خیر سمجھے
 ہوئے تھے۔ بس یہ سمجھ کر وہ اسی پر خوش ہو جاتے ہیں جو اللہ کی طرف سے
 ہوتا ہے۔ ایسی حالت نہیں ہوتی جیسی کہ اہل دنیا کی ہوتی ہے کہ کوئی مر جائے
 تو یہ رمان کرتے ہیں کہ اگر چار برس اور زندہ رہتا تو لڑکے کی تعلیم پوری ہو جاتی
 اور یہ کام ہو جاتا اور وہ ہو جاتا۔ یہ رمان اللہ والوں کو پیدا نہیں ہوتے۔ قسم
 کھا کہ کہتا ہوں کہ وہ ایسے رمان سننے کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے کسی سے کفر کا
 کلمہ سنیں۔ انہیں یہ بات اتنی گراں معلوم ہوتی ہے۔ جیسے کسی نے ان کے کان
 میں کفر کا کلمہ ڈال دیا۔ گو مروت کی وجہ سے وہ اس کو ظاہر نہ کریں مگر ان کو
 اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ میں اس امر کا یقین کیسے دلاؤں۔ اگر
 کہنے والے کو آپ سچا سمجھیں تو اس کا یقین کر لیجئے۔ ان کی حالت تو تفریق
 کی ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے لٹے کچھ تجویز ہی نہیں کرتے کہ بس یہ کام اسی طرح
 ہو۔

اور اس سے بڑھ کر لیجئے ان حضرات کی تفریق اس قدر کامل ہوتی
 ہے کہ اگر اس میں راحت معلوم ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ کہیں اس میں نفس کا
 شائبہ نہ ہو۔ وہ اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ تفریق راحت کی وجہ سے کی جائے

یہ چاہتے ہیں کہ خالص تفویض ہو اور کسی نفسانی غرض کا شائبہ بھی نہ ہو۔
 خلاصہ یہ ہے کہ اہل اللہ میں تفویض ہوتی ہے اور تفویض کے اندر ایک
 راحت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب کوئی شے بھی مقصود نہ رہے گی تو اب جو
 بھی واقع ہوگا، اُس پر یہ راضی ہوں گے تو پھر پریشانی کہاں۔ پس تفویض کے
 اندر بڑی راحت ہے کہ تمام پریشانیوں سے نجات ہو جاتی ہے مگر تفویض
 سے اُن کو راحت بھی مقصود نہیں ہوتی۔ بعض لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں وہ
 یہ کہ مابھی نیت سے خدا تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں کہ اس میں چین ہے۔ گویا
 مقصود ان کا تفویض سے چین ہے، ایسے لازم کو ملزم کہہ لیتے ہیں اور راحت تو
 تفویض کے لئے لازم ہے۔ یہ نیت کر کے اس کو ملزم اور مقصود بنا لیتے ہیں،
 یہ بڑی غلطی ہے۔ محققین اس کو شرک سمجھتے ہیں۔ وہ تو یوں کہتے ہیں کہ تفویض خدا
 تعالیٰ کا حق ہے۔ پس اس کو محض رضا حق کے لئے کرنا سچا ہے اور یہ شخص اس
 کو اپنی غرض کے لئے کرتا ہے۔ سو اُس نے حق تعالیٰ کے ساتھ اپنی غرض کو
 شامل کر لیا۔ یہی شرک ہے۔ اس لئے محققین اس کو بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ ایسی
 تفویض سے پناہ مانگتے ہیں۔ وہ تو یوں سمجھتے ہیں کہ ہم بندے ہیں اور حق تعالیٰ
 مالک ہیں۔ اُن کے حقوق عظمت میں سے ایک حق تفویض بھی ہے۔ وہ حق
 عظمت سمجھ کر تفویض کرتے ہیں۔ نہ اس غرض سے کہ راحت ہو۔ وہ تو اگر اس
 کا شائبہ بھی ہو تو پناہ مانگتے ہیں۔

یہ لوگ کس درجہ کے ہوتے ہیں کہ عبادت کے اندر راحت کی
 نیت سے بھی بیچتے ہیں۔ غرض کہ اصلی نیت تو اُن کی خدا تعالیٰ کی عظمت کا حق

ادا کرتا ہے۔ ہاں راحت اس کو لازم ہوتی ہے مگر وہ اس طرف التفات نہیں کرتے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص دھوپ میں جا رہا ہو اور اس نے کسی جانور کے سایہ کو زمین پر دیکھا اور وہ اس کو پکڑنا چاہتا ہے۔ اب وہ اس کے پیچھے دوڑتا ہے مگر ہاتھ نہیں آتا۔ کسی عاقل نے اسے بتلایا کہ کم بخت یہ کیوں نہیں کرتا کہ جانور کو پکڑنے کے لیے سایہ خود تیرے پاس آجائے گا۔ نادان ہے وہ شخص جو سایہ کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اس کو چاہئے کہ پرند کو پکڑنے کے لیے۔ سایہ تو خود اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص پرند کو پکڑنے کے لیے سایہ کی طرف التفات نہ کرے گا۔ لیکن سایہ خود اس کے ساتھ ہوگا۔

تو جیسے اس شخص کے ہاتھ میں پرند ہے اور باوجود سایہ کی طرف التفات نہ ہونے کے سایہ اس کو لازم ہے۔ اسی طرح تفویض کے لئے راحت لازم ہے۔ تفویض کو اختیار کرو۔ اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کا حق عظمت ادا ہو۔ پھر راحت تو خود ہی حاصل ہو جاوے گی۔ نادان ہے وہ شخص جو راحت کی غرض سے تفویض کو اختیار کرے۔ عرض یہ کہ جس شخص میں تفویض ہو اس کو کسی طرح پریشانی نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی پریشانی تو کیا چیز ہے جو اصلی وقت ہے پریشانی کا جس کا نام فزع اکبر ہے اس میں بھی ایسے لوگوں کو پریشانی نہ ہوگی۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لا یجزئہم الفزع الا کبر۔ اس دن میں ان لوگوں کو ذرہ برابر رنج نہ ہوگا۔ پھر دنیا کی پریشانی تو کیا چیز ہے وہ تو ان کے نزدیک

کھیل اور دل لگی ہے پس ایسا شخص دنیا میں کیا رنجیدہ ہوگا۔

اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ اہل سلطنت
کو بھی راحت نصیب نہیں ہو سکتی۔ کسی جگہ

نعمتِ نیا و آخرت

پناہ ڈھونڈے نہ ملے گی۔ اگر پناہ ہے تو اس میں ہے جس کو حق تعالیٰ ارشاد
فرماتے ہیں۔

الابدن کر اللہ تطمنن قلوبہ کہ دلوں کو راحت اللہ کے فکر

ہی سے نصیب ہوتی ہے۔

میرے بیان سے معلوم ہو گیا کہ فلاح اور کامیابی کا کون سا طریقہ ہے
کامیابی کا وہی طریقہ ہے جو خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے نہ وہ جو ہم لوگوں نے
اختیار کر رکھا ہے۔ اسی واسطے لفظ بل لاکر فرمایا بل تو تشرودن الحیوة
الدنیاء کہ جو حقیقتہً طریقہ فلاح ہے اس کو چھوڑ کر تم نے دوسرا طریقہ اختیار کیا
ہے کہ آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہو۔ سو یہ طریقہ نہیں فلاح کا بلکہ دوسرا طریقہ
ہے۔ پس ہم لوگوں میں جو یہ مرض ہے کہ حیات دنیا کو آخرت پر ترجیح دے
رہے ہیں۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے۔ یہ مرض ہمارے
اندر عام ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اس وقت اس آیت کو لیا ہے۔
چنانچہ ہر وقت ہمیں یہی لگتا ہے کہ کسی طرح سے دنیا ہو۔ مال و دولت بڑھے
دنیا کا طرح طرح کا ساز و سامان ہو۔ دن رات اس میں مبتلا ہیں۔ ہماری یہ حالت
ہے۔

چو میر و مبتلا میر و چو خیز و مبتلا خیز و

جس وقت دیکھو یہی دمن ہے یہی فکر ہے۔ آگے وجہ شکایت کی بیان فرماتے ہیں۔

والاخوة خیر والبقی کہ آخرت بہتر اور البقی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان حیات دنیا کو ترجیح دیتا ہے حالانکہ آخرت بہتر اور باقی تر ہے۔ ترجیح اس کو دینا چاہئے اور زیادت دو قسم کی ہوتی ہے کما اور کیفاً۔ اس لئے خیر سے تو آخرت کا کیفاً زائد ہونا بیان کیا ہے اور البقی سے کما زائد ہونا مطلب یہ ہے کہ آخرت دنیا سے کما بھی زائد ہے اور کیفاً بھی زائد ہے۔

کما تو اس لئے کہ آخرت چونکہ زمانہ کے اعتبار سے البقی ہے اور اس کی شان ہے لا تقف عند حیل کہ وہ غیر محدود ہے کہ اس کی نہایت ہی نہیں اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا کب تک رہے گی ظاہر ہے کہ غیر محدود چیز کا اندازہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے وہ کما زائد ہے اور کیفاً اس لئے زیادہ ہے کہ نعمائے آخرت اور نعمائے دنیا میں لذت وغیرہ کے لحاظ سے بھی کوئی نسبت نہیں۔ حاصل یہ کہ آخرت دونوں اعتبار سے بڑھی ہوئی ہے مگر تم پھر بھی دنیا کو ترجیح دے رہے ہو۔ یہ وجہ ہے شکایت کی۔

ترجیح دنیا کی مذمت | اس مضمون کو سن کر لوگوں کو یہ شبہ ہوا کرتا ہے کہ مولوی بھی عجیب ہیں کہ دنیا کو چھڑانا چاہتے

ہیں۔ ایک تو مسلمان مفلس ہیں ہی سوا ہی ان کے پاس نہیں بگھران کے پاس نہیں۔ یہ اور بھی تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ مثل مشہور ہے مرستے کو مارے شاہ مدار

یہ چاہتے ہیں کہ اور بھی مفلس ہو جائیں۔ میں نے اس وجہ سے بھی اس مضمون کو اختیار کیا ہے تاکہ یہ بتلا دوں کہ شارع علیہ السلام کا مقصود کیا ہے۔ آیا دنیا کا چھوڑنا مقصود ہے یا کچھ اور مقصود ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو اس مقام پر نو ثرون ارشاد فرمایا تطلبون یا تکسبون ارشاد نہیں فرمایا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا بل تطلبون الحیوة الدنیا کہ تم حیات دنیا کو طلب کرتے ہو یا تکسبون الدنیا کہ تم دنیا کماتے ہو بلکہ یہ فرمایا کہ تم ترجیح دیتے ہو حیات دنیا کو۔ سو اور الفاظ کو چھوڑ کر جو ثرون فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا چھوڑانی نہیں جاتی۔ دنیا کمانے کو منع نہیں کیا جاتا۔ قرآن شریف میں تو خود ہی ایسا لفظ موجود ہے جس سے اشارہ ہو گیا اس طرف کہ دنیا کا طلب کرنا مذموم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو مدت کر رہے ہیں تو دنیا کی ترجیح دینے پر کر رہے ہیں۔ نہ دنیا کی طلب اور اس کی تحصیل پر۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص ہے جس نے جیب میں گنیاں اور پیسے بھر رکھے ہیں۔ سو اس پر تو اس کو ملامت نہ ہوگی کہ پیسوں کو گنیوں کے ساتھ کیوں جمع کر رکھا ہے۔ اب سمجھئے کہ اس نے یہ کیا کہ جیب میں سے گنیاں تو پھینکنی شروع کر دیں اور اس کی بجائے اور پیسوں کو بھر لیا۔ اس پر اس کو ملامت نہ کی جائے گی۔ پس اس نے جو گنیوں کے ہوتے ہوئے پیسے حاصل کئے اس پر ملامت نہ ہوگی بلکہ ملامت اٹھا رہے ہوگی کہ گنیوں کو تو چھوڑا اور پیسوں کو حاصل کیا۔ بس اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ دنیا طلب کرنے اور کمانے پر

ملا مرت نہ ہوگی۔ بلکہ دین کی گنیوں کے پھینک دینے اور دنیا کے پیسوں کو اختیار کر لینے پر ملا مرت ہوگی۔ حق تعالیٰ نے ٹوٹروں کا لفظ ارشاد فرمایا کہ اس شبہ کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

حاصل یہ کہ دنیا کے ارادہ کرنے کے دو درجہ ہیں۔ ایک ایثار اور ایک محض طلب ایثار جائز نہیں۔ یہ ہی طلب اس میں حرج نہیں۔ اگر دنیا کا طلب کرنا ہی مذموم ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیوں فرماتے کہ طلب الحلال فریضة بعد کہ طلب کرنا حلال کا فرض ہے بعد اور فرائض کے۔

دوسرے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے بلیغ الفاظ سے ارشاد فرمایا ہے۔

حب الدنيا اس کل خطیئة کی جڑ ہے۔ کہ دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی جڑ ہے۔

یوں نہیں فرمایا کہ کسب الدنيا اس کل خطیئة کہ دنیا کمانا تمام خطاؤں کی جڑ ہے۔ کسب کا لفظ چھوڑ کر حب کا لفظ اختیار کیا۔ اس کی وجہ اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ حب دنیا اور چیز ہے اور کسب دنیا اور چیز۔ اگر کسی کو کسب دنیا کی ضرورت پیش آئی اور اس نے اسباب اختیار کر لئے تو کوئی حرج نہیں۔

علامت حرب اللہ مگر ایک شرط ہے کہ اس کی محبت غالب ہو بلکہ محبت حق تعالیٰ ہی کی غالب ہو۔

کی علامت یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہے کہ تعارض کے وقت یہ شخص کیا کرتا ہے
 آیا دین کو ترجیح دیتا ہے یا دنیا کو۔ اگر دین کو ترجیح دیتا ہے تو سمجھا جاویگا
 کہ حُب دین غالب ہے اور اگر دنیا کو ترجیح دیتا ہے تو سمجھا جائے گا کہ
 حُب دنیا غالب ہے۔

مثلاً کوئی شخص تجارت کرتا ہے اور اس میں کوئی معاملہ خلاف شرع
 پیش آیا اور اس کے کرنے سے اس کو دنیا کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر
 شریعت اس کو منع کرتی ہے تو اب تعارض ہوا دین میں اور دنیا میں اب
 اگر اس نے نفع دنیا پر خاک ڈال دی اور دین کو اختیار کیا تو سمجھا جائیگا
 کہ محبت الہی اس میں غالب ہے۔ اور اگر دنیا کو لے لیا اور شریعت کو
 پس پشت ڈال دیا تو سمجھا جائے گا کہ حُب دنیا غالب ہے۔

اب اپنی حالت کو دیکھئے کہ جب دنیوی معاملات واقع ہوتے
 ہیں تو ہم کیا کرتے ہیں۔ بعض لوگ تو دنیا کو ترجیح دیتے ہیں خواہ آخرت کا
 نقصان ہو جائے۔ یوں کہتے ہیں کہ ہم گنہگار ہیں۔ ہم دنیا دار ہیں۔ یہ پوسہ ہم
 سے نہیں ہو سکتا۔ بس باتیں بنا کر اور تاویلیں کر کے دنیا کو ترجیح دیتے ہیں،
 دین پر یہ علامت ہے اس کی کہ یہ لوگ محب دنیا ہیں۔ گو معتقد دنیا نہیں
 معتقد تو دین ہی کے ہیں۔ ورنہ اپنے کو گنہگار کیوں کہتے۔ مگر نرا اعتقاد
 اطاعت کے لئے کافی نہیں۔ جب تک محبت نہ ہو۔ اسی کو تو عرفی
 کہتے ہیں۔

منار و قندس و ارین نمائی کہ درازد و در دیدم رہ و رسم پاپی

رہ قلندر کے معنی ہیں وہ محبت۔ رہ قلندرا اور رہ پارستانی میں جو لوگوں کی نسبت ہے نہ یہ کہ رہ قلندر رہ پارستانی کا تباہ ہے۔ جیسے آج کل لوگ قلندری اسی کا نام سمجھتے ہیں کہ احکام شریعت سے بالکل آزاد ہو جائے میں مطلب یہ ہوا کہ رہ قلندر جو جامع ہو محبت اور پارستانی کو وہ مجھ کو دکھا کیونکہ بدون محبت کے صرف رہ پارستانی دور و دراز ہے۔ جب تک محبت نہ ہو پارستانی ہو ہی نہیں سکتی۔ واقعی محبت ایسی چیز ہے۔

دیکھئے بادشاہ کی ایک اطاعت تو ہوتی ہے قانونی کہ قانون کی رو سے جتنا کام ذمہ تھا اس کو پورا کر دیا اور ایک بادشاہ کا عاشق ہے او وہ محبت کی وجہ سے اطاعت کرتا ہے۔ اس میں اور پہلے شخص میں بڑا فرق ہے سو یہ مطلب ہے اس شعر کا۔ نہ وہ جیسا کہ بعض نے غضب ڈھا یا ہے کہ نماز روزہ بالائے طاق اور وارٹھی اور مونچھ صفا چٹ کر کے بیٹھ گئے ہیں اور اپنے آپ کو قلندر سمجھتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اس میں انتہا کم ہے تمام شریعت کا خلاصہ یہ ہے کہ بدون محبت نہ اعتقاد کافی نہیں تو بس دنیا داروں کو نہ اعتقاد ہے محبت نہیں۔ اور محبت نہ ہو تو پھر طاعت اس قسم کی ہوتی ہے کہ بطواف کعبہ رستم بصرم رہم نہ اوند تو بڑن در چہ کر دی کہ درون خانہ آئی بنی میں چو سجدہ کردم زند میں نہ ابر آمد کہ مرا خراب کر دی تو بسجدہ ریائی یعنی بدون محبت کے کامل اطاعت نہیں ہوتی اور جس کو محبت ہوگی وہ طاعت میں تو کیا ملی کرے گا وہ تو مصائب سے بھی نہ گھبرائے گا۔ کوئی مصیبت اس کو پریشان نہیں کر سکتی۔ اس کی تویہ حالت ہوگی جیسے کہ عراقی

کہتے ہیں۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغیت

سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یعنی وہ عبادت سے تو کیا گھبراتا وہ تو ہلاکت سے بھی نہیں گھبراتا۔ سو

یہ کلمہ کا اثر ہے۔ محبت ہی کا تو ہے۔ پس طریق محبت ایسی چیز ہے اور

چونکہ ان لوگوں کو آخرت کی محبت نہیں ہے اس لئے دنیا کو ترجیح دیتے ہیں

آخرت پر۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت بل قوشرون۔ الخ میں ترجیح کی مذمت

ہے اور جہاں دنیا کے ارادہ پر مذمت آئی ہے تو اس سے مراد خاص ارادہ

ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

من كان يريد العاجلة عجلنا له فيها ما نشاء لمن

نريد ثم جعلنا له جهنم.

یعنی جو دنیا کا ارادہ کرتا ہے تو ہم اس کو جس قدر چاہیں اسے

دیتے ہیں۔ پھر ہم اس کا ٹھکانا جہنم کو بناتے ہیں۔

اس آیت میں مطلق ارادہ مراد نہیں بلکہ ارادہ خاص مراد ہے کیونکہ آگے

فرماتے ہیں۔ ومن اراد الاخرة۔ الایہ۔ پس معلوم ہوا کہ وہ ارادہ دنیا ہے

جو مقابل ہے من اراد الاخرة کے۔ یعنی جس میں ارادہ آخرت نہ ہو۔ پس

ارادہ دنیا کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ ارادہ دنیا جس کے ساتھ لہ لہو لہو

الاحرة ہو۔ پس اس آیت میں پہلا ارادہ مراد ہے۔ ایک اور موقع پر ہے

من كان يريد حرث الآخرة نزوله في حرثه ومن
 كان يريد حرث الدنيا لوقتتها منها وماله في الآخرة
 من نصيبا .

یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ من کان یرید حرث الدنیا ولم یسجد
 حرث الآخرة۔ تقابل قرینہ ہے اس کا۔ اگر کسی مقام پر قرینہ مذکور ہو تو اس
 کو بھی اس آیت سے مقید کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد ہے
 من کان یرید الحیوة الدنیا وزینتها لوفنا الیہم اعمالہم
 فیہا وہم فیہا لا ینجون اولئک الذین لیس لہم فی
 الآخرة الا النار وحبطما صنعوا فیہا وبکل ما کانوا
 یعملون۔

گو کہ یہاں لفظوں میں تقابل نہیں مگر اس کو بھی دوسری آیت کی وجہ سے
 مقید کریں گے کہ مراد یہ ہے من کان یرید الحیوة الدنیا وزینتها ولم
 یجد الآخرة۔ پس یہ معلوم ہو گیا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دینا مذموم ہے اور کس
 دنیا مذموم نہیں۔ سو جن صاحبوں کا یہ گمان ہے کہ مولوی دنیا ہی کو چھوڑا نا جائز
 ہیں میرے بیان سے ان کے خیال کا غلط ہونا ثابت ہو گیا۔
 میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دنیا کے ہم اتنے معتقد ہیں کہ معتقدین
 اتنے معتقد نہیں۔ آپ تو دنیا کو جائز ہی کہہ رہے ہیں اور ہم اس کو ضروری
 کہتے ہیں۔ لہذا ہم آپ سے دنیا کے زیادہ معتقد ہوئے۔ مگر ضروری
 ہونے کے ساتھ دوسرا مسئلہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ ضروری بقدر اقدار

کہ ضروری چیز بقدر ضرورت اختیار کی جاتی ہے۔ سو دنیا ہے ضرورت کی چیز
 مگر بقدر ضرورت ہی اس کو اختیار کرنا چاہئے۔ پس بقدر ضرورت اس کو حاصل
 کر لو۔ اس کو کون منع کرتا ہے اور زینت میں کوئی ضرورت ہے نہیں اس لئے
 وہ قابل ترک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ طالب ہیں زینت کے تو وہ
 دنیا کو ضرورت سے زیادہ چاہ رہے ہیں جو قاعدہ مذکورہ کی بنا پر قابل ترک
 ہے۔ آیت میں بھی دینتھا کا لفظ جو بڑھا یا ہے اس سے بھی اس کا مذموم
 ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس پر وعید فرمائی ہے۔

پس طلب کے دو درجے ہوئے ایک طلب بقدر ضرورت یعنی دنیا
 کی طلب اس قدر جس سے ضرورت رفع ہو جاوے اور ایک طلب زینت
 یعنی دنیا کی طلب اس قدر جو ضرورت سے زائد ہو۔ سوا اول کی ذمہ نہیں،
 ثانی کی ذمہ ہے کیونکہ اصلی مقصود رفع ضرورت ہے۔ اب جو دنیا اس
 کے لئے حاصل کی جائے گی وہ مقصود بالغیر ہوگی اور جو اس سے آگے بڑھیں
 تو وہ مطلوب بالذات ہوگی اور دنیا کو مطلوب بالذات بنانا ہی قابل
 ذمہ ہے۔

اعمال کی حقیقت | اس بیان سے ایک روایت کی تفسیر نہایت
 پاکیزہ ہوگئی۔ قرآن شریف میں اُحد کے واقعہ

کو بیان کیا ہے۔ اس واقعہ میں بعض صحابہ سے لغزش ہوگئی تھی کہ وہ غلطی بہت بڑی
 تھی۔ صحابہ کو اپنے اوپر تباہی نہ کیجئے۔ یہ گمان نہ کیجئے کہ جیسے ہم لوگ قصداً
 مخالفت کرتے ہیں، وہ بھی قصداً مخالفت کرتے تھے۔ وہ حضرات حضور کے

مجھے محب تھے۔ گو زبان سے محبت کے دعوے زیادہ نہ کرتے تھے مگر ان میں اطاعت کامل و درجہ کی تھی۔ اور ہم لوگ زبان سے تو محبت کے بہت دعوے کرتے ہیں مگر ہم میں اطاعت خاک نہیں۔ ہماری اور ان کی محبت میں یہ فرق ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ تفسیر زبان روشن گرسدت لیک عشق بے زبان روشن ترست

عشق زبان کو روشن کر اور عشق بے زبان کو روشن تر فرما رہے ہیں۔ کامل وہ ہے کہ اپنے دعوئے عشق کو بھی فنا کر دے کیونکہ فنا عشق کے لوازم سے ہے۔ محبوب کے سامنے دعوے کو فنا ہی کر دینا چاہئے۔ سو محبت ہی ہے جس میں فنا ہو اور دعویٰ نہ ہو۔ صرف دعوے کرنے کا نام تو محبت نہیں ہے۔ آخر اس کی کوئی علامت بھی ہے۔ کیا عشق کی یہ علامت ہے کہ محبوب ایک راستہ پر لے چلے اور یہ دوسرے راستہ پر چلے۔ ہرگز نہیں۔ عاشق تو وہ ہے کہ محبوب کے راستہ پر ہو لے۔ پس ہم لوگ جو عشق کا دعوے کرتے ہیں اور حضور کے طریقہ پر نہیں چلتے۔ سو یہ کیسا عشق ہے۔ عاشق کو تو محبوب کے سامنے مرٹ جانا چاہئے۔

اس کی تو یہ حالت ہوگی جیسے کہ ایک عابد کی حکایت ہے کہ وہ کسی صومعہ میں رہتے تھے۔ شب و روز عبادت میں مشغول تھے۔ ایک دن آواز آئی کہ تمہاری عبادت قبول نہیں خواہ کچھ بھی کرو۔ مگر وہ پھر بھی عبادت ہی میں مصروف رہے۔ ان کے ایک مرید نے کہا کہ تمہیں کیا مصیبت آ رہی ہے کہ وہ تو رخ پھیرتے ہیں اور تم اس قدر مشقت اٹھاتے ہو۔ وہ تو دفعہ

ہیں اور تم لپٹے جانتے ہو۔ آخر غیرت بھی کوئی چیز ہے۔ اس پر وہ رونے لگے اور کہا کہ یہ تو میں جب کروں کہ اور کوئی درد ہو کہ اس درد کو چھوڑ کر دوسرے درد پر چلا جاؤں ہے

تو انہ کے دل پر داغ تھن کہ دانی کہ بے او تو ان سا تھن اب تو میرا یہ مذہب ہے ہے

زندہ کنی عطا تے تو ور بکشی رضا تے تو

جاں شدہ بتلا تے تو ہر چہ کنی رضا تے تو

خلوص و صدق خالی ٹھوڑا ہی جاتا ہے۔ بس فوراً آواز آئی ہے

قبول ست گر چہ ہمز نسبت کہ جز ما پنا ہے و گر نسبت

جواب بھی دیا اور اس میں ایک چہرہ کہ محبوبانہ بھی لگا دیا کہ گو تم اس قابل

تو ہو نہیں مگر خیرا جاؤ۔ واقعی یہ ہے کہ ہمارے اندر کمال ہی کون سا ہے۔ ہماری

کوئی حالت کمال ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمارے پاس بڑی چیز اعمال ہیں۔ سو اول تو ان

میں ویسے ہی ہزاروں نقصان ہیں۔ پھر اگر کمال بھی ہوئے تو یہ دیکھئے کہ وہ پیدا

کہاں سے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ فوت ارادہ سے پیدا ہوئے ہیں اور وہ ان

ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ ماتھ پاؤں اور جتنی چیزیں اعمال کے لئے شرط ہیں

وہ بھی ان ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ ہماری ہے ہی کیا چیز!

ان اعمال کی ایسی مثال ہے۔ جیسے ایک شخص ہو ا کھیت بھی اسی کا، لڑکے

بھی اسی کے، پانی بھی اسی کا، زمین بھی اسی کی، بیج بھی اسی کا، غلہ بھی اسی کا۔

یہاں تک کہ کھیتی پیدا ہوئی۔ اب کوئی دعویٰ کرنے کہ کھیتی کا میں مالک ہوں

تو کیا ان کا یہ دعویٰ صحیح ہوگا۔ مانگے ہی کہے گا کہ یہ تبتلاؤ کہ تم کون سے قاعدہ سے مانگے ہو۔ ظاہر بات ہے کہ غلہ اسی کی ملک ہے جس کے اسباب ہیں اسی طرح آپ صاحب تبت ہیں۔ آپ کے ہاتھ پاؤں جو بمنزل نوکر اور غلام کے ہیں خدا کی ملک ہیں۔ آپ کی قوت ارادہ حق تعالیٰ کی ملک ہے۔ اس مجموعہ سے جو ثمرہ ہوگا وہ دیکھ لو کہ اس کی ملک ہوگا۔ اگر ہمارے اعمال کامل بھی ہوتے تو ان میں ہمارا کیا کمال ہوا۔ اس لیے ان پر جو انعام ہم کو ملے گا وہ مبادلہ محض اسی ہوگا۔ مبادلہ کے معنی تو ہیں کہ ان کی چیز لے لیجئے اور اپنی دے دیجئے اور یہاں اپنا کچھ ہے ہی نہیں پھر مبادلہ کیسا۔ فرمائیے کہ پھر کوئی کیا ناز کر سکتا ہے کہ میں کچھ کر سکتا ہوں۔

اس لئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ کوئی

عبدیت اور رسالت

شخص عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا

اس پر حضرت عائشہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور آپ بھی نہیں یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا کہ میں بھی عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جاؤں گا۔ ہاں اگر حق تعالیٰ اپنی رحمت میں مجھ کو ڈھانپ لیں اور اس میں یہ بھی تصریح فرمادی کہ میں بھی خدا تعالیٰ کی رحمت کا محتاج ہوں اور آپ کا یہ کمال ہے اور جتنا افتقار آپ کا خدا تعالیٰ کی طرف ثابت کیا جائے گا، اسی قدر آپ کی فضیلت ہوگی۔ ایاز کے واسطے ہی فضیلت ہے کہ محمود سے وابستہ رہے اس کی طرف حاجت مندر ہے حتیٰ کہ جتنے کمالات بھی ہیں سب عبدیت کی فرع ہیں۔ بڑا کمال عبدیت ہے۔ اسی لئے جس قدر عبدیت کامل ہوگی اسی قدر رسالت کامل

ہوگی کیونکہ عبدیت کی فرع رسالت ہے نہ کہ رسالت کی فرع عبدیت عبدیت تو فطری ہے اور رسالت اس پر مرتب ہے۔ رسالت سے پہلے بھی آپ میں نشان مٹی اطاعت اور عبدیت کی۔ آپ خدا تعالیٰ کے ایسے عاشق تھے کہ جس وقت تک کچھ تبدیل یا بھی نہ کیا تھا اس وقت بھی آپ مطیع تھے۔ اسی عبدیت کا ملکہ کے صلہ میں آپ کو رسالت ملی تھی۔

عمل اور حجت

کوئی یہ سن کر کہ اعمال کی وجہ سے حضور جنت میں نہ جائیں گے یہ نہ سمجھ لے کہ حضور کے اعمال میں کچھ نقصان تھا۔ بات یہ ہے کہ عمل کی وجہ سے جنت میں جانا یہ اعلیٰ درجہ نہیں ہے بلکہ رحمت کی وجہ سے جانا یہی اعلیٰ درجہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ شرع تابع سبب کے ہوتا ہے۔ اگر سبب ناقص ہے تو شرع بھی ناقص ہوگا۔ اور اگر سبب کامل ہے تو شرع بھی کامل ہوگا۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب سمجھ لے کہ عمل عامل کا کتنا ہی بڑا ہو اور کتنا ہی کامل ہو مگر وہ محدود ہی ہوگا۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ خدا کی رحمت کا کتنا ہی حصہ لے لیا جاوے وہ غیر محدود ہی ہوگا۔ غیر متناسی کا نصف بھی غیر محدود ہی ہوگا۔ رحمت حق کا اول تو تجزیہ ہو نہیں سکتا لیکن اگر بالفرض کسی درجہ میں کسی نسبت سے تجزیہ ہو بھی تو وہ بھی غیر متناسی ہوگا کیونکہ اگر اس کو متناسی مانا جاوے تو اس سے مجموعہ کا متناسی ہونا لازم آئے گا کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ مرکب متناسی سے جرات متناسی متناسی ہوتا ہے۔ پھر حال نصف وغیرہ بھی غیر متناسی کا غیر متناسی ہوتا ہے اور پہلے میں مقدمہ عرض کر چکا ہوں کہ سبب سبب کے تابع ہوتا ہے یعنی سبب ناقص

کو مشرہ بھی ناقص اور سبب کامل تو مشرہ بھی کامل ہے سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ جنت میں اگر آپ کے عمل کی وجہ سے ہوگا، تو قتنا ہی ہوگا۔ کیونکہ عمل قتنا ہی ہے اور اگر رحمت کی وجہ سے ہوگا، تو غیر قتنا ہی ہوگا کیونکہ رحمت غیر قتنا ہی ہے۔ اس لئے رحمت کی وجہ سے جانا ہی اعلیٰ درجہ ہے۔

عزیز آپ کا عمل محدود تو ہوگا مگر نعوذ باللہ ناقص نہیں پس عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں کوئی نقصان ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ سے بڑھ کر کسی کا بھی عمل نہیں۔ حضور کے اعمال ہر طرح کامل ہیں مگر چونکہ رحمت حق کی وجہ سے جنت میں جانا اعلیٰ درجہ ہے۔ اس لئے آپ کے اعمال کو سبب نہیں بتایا گیا دخول جنت کا۔ بلکہ اعمال تو کسی حال میں بھی دخول جنت کا سبب نہیں ہو سکتے، چاہے کیسے ہی کامل ہوں کیونکہ خود اعمال کا کمال بھی تو رحمت حق ہی پر مرتب ہے پس جب اعمال کا کمال بھی اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت کا مشرہ ہوا تو پھر بندہ کا کیا کمال ہوا جس کی وجہ سے وہ جنت میں داخل کیا جاوے۔ پس کسی کو کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے۔

خیال تو فرمائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا درجہ ہے مگر پھر بھی آپ یوں فرما رہے ہیں کہ میں بھی جنت میں اپنے اعمال سے نہ جاؤں گا تو پھر ہمارا کیا منہ ہے کہ چاروں نماز پڑھ کر یہ سمجھنے لگیں کہ ہم جنت کے مستحق ہو گئے۔

خلاصہ یہ کہ بندہ کے اندر کوئی کمال نہیں ہو سکتا اگر اعمال بھی کامل ہوں

تسبیحی بندہ کا کوئی کمال نہیں کیونکہ وہ اعمال بھی خدا تعالیٰ ہی کی رحمت پر مرتب ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں ہے۔

لولا اللہ ما احدثنا کہ اگر اللہ میاں رحمت نہ

فرماتے تو ہم ہدایت نہ پاتے۔

ہاں سے معلوم ہوا کہ اگر خدا تعالیٰ کی رحمت نہ ہوتی تو نہ نماز کی توفیق ہوتی نہ روزہ کی۔ ہم ہیں ہی کیا چیز۔ جب یہ ہے تو ہم اس عمل پر کیا ناز کر سکتے ہیں۔ بس رحمت ہی ہے کہ ہمیں عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ یہ مضمون تو استفساراً بیان ہو گیا۔

اصل میں بیان یہ ہو رہا تھا کہ جب ہم حضور

محبت اور اطاعت

کے طریقہ پر نہیں چلتے تو ہمارا کیا منہ ہے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ کریں۔ بلکہ اگر کسی قدر ہم کو محبت بھی ہے تو وہ آپ ہی کی محبت کا عکس ہے۔ دیکھئے ہماری کوئی رات ایسی نہیں کہ درود شریف پڑھنے میں ختم کی ہوتی بخلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ ہمارے لئے ساری ساری رات گھڑے رہتے اور ہماری بخشش کی دعا کرتے تھے ہماری محبت کا تو صرف یہ حاصل ہے کہ زبان سے دعویٰ ہے محبت کا اولہ ویسے نافرمانی کرتے ہیں۔ صحابہؓ کی محبت ایسی نہ تھی۔ وہ زبان سے نہ کہتے تھے مگر کرتے تھے۔ صحابہؓ کو جب حضورؐ کے ساتھ یہ محبت تھی تو اگر صحابہ سے جنگ اُحد میں لغزش ہو گئی تو ضرور وہ اہتہادی غلطی ہوگی۔ قصداً ہرگز نہ ہوگی واقعہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس آدمی نیرانا ناز نگہبانی کو

گھائی پر مقرر کر دیئے باقی لشکر لڑنے لگا۔ جب ان تیر اندازوں نے فتح اور غلبہ کی
 تو چاہا کہ اس جگہ سے چلے آویں اور فتح میں شریک ہوں اور غنیمت لوٹیں۔ ان
 کے امیر نے اس سے منع کیا وہ نہ مانے۔ وہاں صرف تھوڑے سے آدمی رہ
 گئے۔ پس کافروں کی فوج پیچھے سے آپڑی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو شکست ہوئی
 اس میں خطا اجتہادی ان کی یہ تھی کہ وہ لوگ اس مورچہ پر کھڑے رہنے کے حکم
 کو اس وقت تک محدود سمجھے کہ جب تک غلبہ نہ ہو۔ جب مسلمانوں کا غلبہ ہو گیا
 تو وہاں سے ہٹ گئے۔ اس وجہ سے کہ اب تو غلبہ ہو ہی گیا ہے اب یہاں
 کھڑے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ غلطی اجتہادی ان سے ہوئی۔ خدا تعالیٰ
 نے اس قصہ کو بیان کیا ہے اور پھر فرمایا ہے۔ منکدر من یرید الی دنیا
 منکدر من یرید الاخرۃ۔ یہ قرآن کا جملہ ہے اس پر شبہ ہوتا ہے کہ بعض
 صحابہ دنیا کے بھی طالب تھے۔ اس کے علماء نے بہت سے جواب دیئے
 ہیں۔ مگر سب سے اچھا جواب ابن عطار اسکندری کا ہے۔

وہ یہ کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ بعض صحابہ دنیا کے طالب تھے تو جواب
 ہے کہ ارادہ دنیا مطلقاً مذموم نہیں۔ ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادہ دنیا
 للدنیا اور ایک ارادہ دنیا للآخرت۔ پہلا ارادہ مذموم ہے دوسرا مذموم نہیں۔
 چنانچہ حضرت مولانا جامی کا قصہ ہے کہ وہ خواجہ عبید اللہ احرار کی خدمت
 میں بیعت کے ارادہ سے گئے۔ خواجہ صاحب کے پاس بڑی ثروت
 مولانا جامی چونکہ طالب تھے اور طالب بیباک ہوا ہی کہتا ہے۔ اس وجہ سے
 ان کی یہ حالت دیکھ کر مولانا جامی نے یہ مصرع پڑھا۔

نہ مروست آنکہ دنیا دوست وارد

اور واپس چلے آئے اور مسجد میں آکر سو رہے۔ خواب میں دیکھا کہ میدان
خستہ رہا ہے۔ اسی حالت میں کسی صاحب معاملہ نے آکر ان کو پکڑ لیا اور کہا
دو پیسے لاؤ۔ فلاں معاملہ میں دنیا میں تمہارے ذمہ رہ گئے تھے۔ اب یہ ہر چند
پچھا چھڑاتے ہیں وہ چھوڑتا نہیں۔ اتنے میں دیکھا کہ خواجہ صاحب کی سواری آئی
آپ نے فرمایا کہ فقیر کو کیوں تنگ کر رکھا ہے۔ ہم نے جو یہاں خزانہ جمع کیا
ہے وہ کس واسطے ہے ان کے ذمہ جتنا مطالبہ ہے اس میں سے ادا کرو۔ ان
کے کہنے سے انہیں رہائی ملی۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا خواجہ صاحب کی
سواری آ رہی ہے۔ اب یہ بہت ہی محبوب ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ
وہ مصرعہ تو پڑھو جو تم نے پڑھا تھا۔ اب یہ شرم کے مارے پڑھتے نہیں اصرار
کرنے پر پڑھا۔

نہ مروست آنکہ دنیا دوست وارد

آپ نے فرمایا کہ ابھی یہ ناتمام ہے۔ اس کے ساتھ یہ اور ہونا چاہئے
اگر وارد ہر آئے دوست وارد

دنیا اگر ہو بھی تو اپنے واسطے نہ ہو دوست کے واسطے ہو۔ ایسی دنیا
میں کہا حرج ہے۔ ان حضرات کے پاس جو دنیا ہوتی ہے وہ حق تعالیٰ ہی کے
لئے ہوتی ہے۔ انہیں کے حکم سے اس کو اپنے پاس رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ
اس میں مالکانہ تصرف نہیں کرتے بلکہ جہاں ان کا حکم ہوتا ہے وہاں صرف
کرتے ہیں۔ آپ کچھری میں جا کر دیکھیں۔ وہاں خزانچی کا عہدہ ہے۔ اس کے

پیردستخانہ کی حفاظت ہے وہ مالک نہیں۔ خزانہ میں سے بلا اجازت لے
 نہیں سکتا۔ اگر وہ خزانہ کو قفل نہ لگائے اور چوری ہو جائے تو اس پر مقدمہ قائم
 ہو۔ اسی طرح ان حضرات میں سے بعض کو دنیا کی مال و دولت حق تعالیٰ کی طرف
 سے سپرد کی جاتی ہے۔ اگر وہ اس کو انتظام سے نہ رکھیں تو حق تعالیٰ ان
 سے ناراض ہوں اور بعض کو یہ حکم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اپنے پاس نہ
 رکھیں۔ اہل اللہ کی نشانیں مختلف ہوتی ہیں۔

بگوشہ گل چہ سخن گفتہ کہ خداں است
 بہ عند لیب چہ فرمودہ کہ نالان است

ہر ایک کے ساتھ حق تعالیٰ کا جو معاملہ ہے۔ اسی طرح ہر نبی کی شان
 جدا ہے۔ کسی کو کسی صفت سے کام لینے کا حکم ہے۔ کسی کو کسی صفت سے
 کام لینے کا حکم ہے۔ باقی ان کے اندر تمام صفات ہوتی ہے۔

آج کل بعض نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں
کمالاتِ انبیاء کتاب لکھی ہے اور آپ کو جامع اوصاف کمالات

قرار دے کر اس کو آڑ بنایا ہے دوسرے انبیاء کی توہین کا۔ آپ کے تو
 کمالات ظاہر کئے ہیں اور دوسرے انبیاء پر حملہ کیا ہے۔ ان کی تنقیص کی ہے
 لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں سیاست تھی، حکومت تھی، ترجمہ تھا باقی
 اور انبیاء میں سے کسی میں سیاست نہ تھی، کسی میں ترجمہ نہ تھا۔ کسی میں یہ صفت
 نہ تھی اور کسی میں وہ صفت نہ تھی۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو اپنے نزدیک
 مدح کی اور دوسرے انبیاء کی تنقیص کی۔ ان لوگوں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے بھائیوں کے ساتھ یہ معاملہ ہے۔

اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ہم باپ کی تو تعظیم کریں اور اس کو راضی کریں اور اس کے بھائی کی تو ہین کریں۔ تو ایسی مدح سے حضور کب خوش ہو سکتے ہیں۔ اپنے دعوے کی شہادت پیش کی ہے۔ دیکھو نوح میں ترجم نہیں ترجم کا مادہ کم تھا۔ عیسیٰ میں سیاست کا مادہ کم تھا۔ ورویشناہ زندگی کھتی میرے سامنے یہ کتاب لائی گئی۔ کاغذ اس کا نہایت عمدہ سفید قیمتی۔ خط نہایت نفیس پُر رونق۔ ظاہر تو اس کا ایسا اور اندر اس میں یہ خرافات بھری ہے کہ لہجہ میں ترجم نہ تھا۔ عیسیٰ میں سیاست نہ تھی۔ کس قدر بے ادبی ہے انبیاء کی شان میں۔ اسے صاحبو! یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان انبیاء میں یہ مادے نہ تھے۔ کیا مادہ کے لئے ظہور بھی لازم ہے۔

اگر ایک شخص کی بابت معلوم ہوا کہ بڑا سخی ہے۔ آپ اس کے پاس گئے۔ اس وقت دیکھا کہ وہ کچھ بھی نہ خرچ نہیں کر رہا تھا۔ بس آپ نے حکم لگا دیا کہ یہ جھوٹ ہے کہ وہ بڑا سخی ہے۔ اس کو یہی کہا جاوے گا کہ جس وقت آپ گئے ظہور کا موقع نہ ہو گا۔ ظہور سخاوت کے موقع پر جا کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ کتنا بڑا سخی ہے۔

جیسے ہی انبیاء میں سب کمالات موجود ہوتے ہیں مگر خدا تعالیٰ جس کے ظہور کا حکم فرماتے ہیں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ نوح تو ایسے رحیم تھے کہ

لے پیرۃ البنیۃ اس کا نام ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف ہے۔

نوسو پچاس برس تک قوم کے ہاتھ سے مصائب اٹھانے رہے مگر بددعا
 نہیں کی۔ اس سے زیادہ اور کیا ترحم ہوگا۔ کیا تغیر ہو سکتی ہے اس ترحم کی۔ پھر
 بددعا اُس وقت فرمائی جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آگیا۔

انہن یومن من قومک کہ تمہاری قوم میں سے اب

الامن قدامن۔ کوئی اور ایمان نہیں لائے گا۔

معلوم ہوا کہ ان میں دونوں مشینیں تھیں۔ نوسو پچاس برس تک ترحم کی
 مشین چلائی اُس کے بعد حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ دوسری مشین کو بھی چلا دو اب
 جدھر اللہ تعالیٰ اُدھر وہ۔ دیکھو تو لوح میں ترحم کیسا تھا کہ نوسو پچاس برس تک
 قوم کی تکلیف پر صبر کیا اور بددعا نہیں کی۔

ایک حضرت عیسیٰ مصنف صاحب کے تعلقہ مشق بنے ہیں۔ کہتے ہیں

کہ بس وہ تو فقیر اور صوفی تھے۔ ان میں تمدن اور سیاست کہاں تھی۔ ان کی تو
 یہ تعلیم تھی کہ اگر کوئی ایک کلمہ پر طمانچہ مارے تو دوسرا سامنے کر دو مصنف
 صاحب نے حضرت عیسیٰ کا یہ حق ادا کیا ہے۔

اول تو میں کہتا ہوں کہ مصنف صاحب مدعی ہیں ان کے ذمہ دلیل ہے

اور کیا دلیل ہے اس کی کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا۔ عدم ظہور سے تو

عدم وجود لازم نہیں آتا۔ دوسرے حدیث سے ثابت ہے کہ اخیر زمانہ

میں حضرت عیسیٰ سلطنت کریں گے۔ ان کے سامنے ساری سلطنتیں مرٹ

جائیں گی۔ سارے عالم کا انتظام ان کی مسطحی میں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب

تک سیاست کا مادہ نہ ہو یہ بائیں ان سے کیسے ہو سکتی ہیں۔ کون کہہ سکتا

ہے کہ ان میں سپاست کا مادہ نہ تھا۔

حضرت یہ حالت ہو رہی ہے جو جس کے جی میں آتا ہے لکھنا ہے
خوب سمجھ لیجئے کہ انبیاء میں سارے کمالات ہوتے ہیں مگر جس مادہ سے
کام لینے کا حکم ہوتا ہے اسی کو کام میں لاتے ہیں۔

اسی طرح اولیاء اللہ کی حالت ہے۔ ہر ایک کی جدا شان ہوتی
شان اولیاء

ہے جیسے دنیا کے عہد سے ہیں۔ کوئی اہل قلم میں سے ہے
اور کسی کو اہل سیف میں سے کیا ہے۔ اسی طرح اولیاء اللہ میں شائیں مختلف رکھی
ہیں۔ کسی کو عزیز اور کسی امیر بنا یا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہوتی ہے
بعض اولیاء اللہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا دسترخوان بہت وسیع ہوتا تھا اور
بعض تنگ دست ہوتے ہیں۔ ہر زمانہ میں ہر شان کے بزرگ پیدا کر دیتے ہیں
اگر مختلف شائیں نہ ہوں تو کام نہ چلے۔

راز اس کا یہ ہے کہ طالبین مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے لئے
اس کے مناسب حال شیخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے مولانا
فضل الرحمن صاحب کی نسبت مجھ سے کہا کہ وہاں تو کچھ قدر نہیں ہوتی۔ ایسا پیر
بتلاؤ جہاں قدر ہو۔ وہاں تو جا کر غلامی کرنی پڑتی ہے۔ سو طالب اس شان کے
بھی ہوتے ہیں۔ اگر سارے بزرگ ایسی ہی شان کے ہوں تو بتلائیے ایسا شخص
کہاں جائے۔ اس لئے ضرورت ہے مختلف قسم کے بزرگوں کی۔ یہ تو خدا

تعالیٰ کا باغ ہے۔ اس میں ہر قسم کے پھول ہیں۔
ہر گلے دار رنگ و بوئے دیگرست

کسی کو کسی سے مناسبت ہے اور کسی کو کسی سے۔ کسی کی گردن ایسی جگہ
 جھکتی ہے جہاں نشان و شوکت ہو، اس لئے راہیے مشائخ کی بھی ضرورت ہے
 چنانچہ آج کل اکثر مشائخ کے یہاں بہت نرمی کی جاتی ہے اور میرے یہاں گونہ
 سختی کی جاتی ہے پس جس کو جو نسا مذاق پسند ہوتا ہے وہ وہ ٹال چلا جاتا ہے
 ایک شخص ایک بزرگ کی نسبت کہتے تھے کہ کیا اچھی شان ہے کہ ان کے
 یہاں کھانے کو خوب ملتا ہے۔ ایک شخص ایک بزرگ کی نسبت کہتے تھے
 کہ اگر ان کے یہاں لوگوں کا کھانا وغیرہ ہوتا تو میں ان کے یہاں کبھی نہ آتا۔ بس یہ
 سمجھتا کہ لوگ پیٹ کی خاطر یہاں ان پرٹے ہیں۔
 غرض کہ اہل اللہ مختلف رنگ کے ہوتے ہیں کسی کے اندر مارت کی نشان

لے اسی طرح دوسرے مشائخ کے یہاں نہ بیعت میں تنگی ہے نہ مریدین
 کے افعال پر گرفت ہے نہ معمولات اور قواعد معین ہیں اور حضرت والا
 کے یہاں یہ سب باتیں ہیں اور ان کی ضرورت بھی ہے بعض طبائع
 کو یہ باتیں ناگوار ہوتی ہیں اور وہ اس کو سختی سمجھتے ہیں اور ناقدری خیال
 کرتے ہیں حالانکہ ان باتوں میں راحت ہی راحت ہے اور خانقاہ
 کی یہ حالت ہو گئی ہے۔

بہشت آجما کہ آزار سے نماند کسے رابا کسے کار سے نماند
 ان امور کی قدر وہی جان سکتا ہے جس نے وہاں رہ کر دیکھا ہو۔ ان
 باتوں کے جو فوائد ہیں وہ بیان میں نہیں آسکتے مشاہدہ کے متعلق ہیں
 (بقیہ حاشیہ بر ص ۵۸۹)

ہوتی ہے اور کسی کے اندر فقر کا رنگ ہوتا ہے۔ بس اصل مشترک یہ ہے کہ غنا ہو تو وہ خدا تعالیٰ کے لئے اور فقر ہو تو وہ خدا تعالیٰ کے لئے۔

حضرت سلیمان اور سلطنت

حضرت سلیمان کے بارہ میں ارشاد ہوا۔
هَذَا عطاؤنا فامتن ارامنا

بغیر حساب۔ یہ ہماری عطا ہے چاہے کسی کو دیجئے یا نہ دیجئے۔ آپ سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ آپ مواخذہ کے خوف سے جاہ و ثروت اور سلطنت سے گھبراتے تھے۔ اُس پر یہ ارشاد ہوا۔ هَذَا عطاؤنا۔ الخ کہ تم سلطنت سے گھبراؤ نہیں۔ تم سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ آپ کو سلطنت دینے میں خدا تعالیٰ کی حکمت تھی۔ وہ یہ کہ اس وقت میں یڑے بڑے متکبرین اور جاہریادشاہ تھے ان کی گروین پست کرنے کے لئے آپ کو ایسی سلطنت دی کہ سب کی گروین پست ہو گئیں۔ سب کے دعوے کو توڑ دیا۔ سلطنت تو آپ کا مجزہ تھا۔ سو دیکھئے آپ کے ساتھ یہ برتاؤ تھا کہ آپ تو سلطنت سے گھبراتے تھے اور ادھر سے ولاسا دے دے کہ سر کی جاتی تھی۔ بس جس کے لئے ہو مٹا سب ہوتا ہے اُس میں اُس کو مقید کر دیتے ہیں۔

بہر حال دنیا اگر حد کے اندر ہو تو مذموم نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادہ دنیا اور دوسری ارادہ دنیا لاکھرت۔ تو جو ارادہ

دقیقہ حاشیہ از صفحہ ۵۸۸ جب کہ عقل سے بھی کام لیا جائے ورنہ ظاہر میں

تو سختی ہی سمجھے گا۔ ۱۲۔ جامع

دنیا آخرت کے لئے ہوا اس میں کیا حرج ہے۔

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے حق تعالیٰ

ایمان اور ترو

سے دعا مانگی کہ جتنا رزق تمام عمر کے اندر میری قسمت

میں لکھا ہے وہ مجھے ایک دم سے مل جاوے۔ اس پر خطاب ہوا کیا ہمارے وعدہ پر وثوق نہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ وثوق تو پورا ہے مگر شیطان پریشان کرتا ہے۔ جب عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو کہتا ہے کہ تو کھائے گا

کہاں سے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ دے گا۔ تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو بیخ ہے کہ اللہ دے گا مگر یہ تو معلوم نہیں کہ کب دے گا۔ وہ مجھے پریشان کرتا ہے اس

لئے میں چاہتا ہوں کہ ساری عمر کا ایک دم سے مل جاوے تو اس کو کھڑی میں منتقل کر دوں۔ جب شیطان کہے گا کہاں سے کھائے گا فوراً کہہ دوں گا کہ

اس کو کھڑی کے اندر سے کھاؤں گا۔ بس پھر وہ وسوسہ نہ ڈالے گا۔ وہ بزرگ عقلاً تو غالب تھے شیطان پر بسکین طبعاً غالب نہ تھے۔

اس حکایت کو سن کر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ کیسے بزرگ تھے کہ ان کو

حق تعالیٰ پر اطمینان نہ تھا۔ یہ بات تو بزرگی کے خلاف ہے۔ مخلوق کے وعدہ

پر تو ایسا وثوق ہو جاوے کہ وسوسہ بھی نہ آوے اور خدا تعالیٰ کے وعدہ پر

اتنا بھی وثوق نہ ہو۔ یہ تعجب کی بات ہے۔ اور یہی شبہ اکثر واعظوں کی زبان

پر عام مسلمانوں کے حق میں دائر ہوتا ہے کہ کوئی دعوت کر جاوے تو کیسے بھروسا

کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے وعدہ پر ایسا بھروسا نہیں۔ مگر سمجھ لیجئے کہ

یہ الزام ہے مسلمانوں پر۔ وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے وقت معین نہیں

ہے اور ابہام میں خاصیت طبعیہ ہے بے اطمینانی نہ کہ بے یقینی اور مخلوق کی طرف سے وقت معین ہوتا ہے اور تعین میں خاصیت طبعیہ ہے اطمینان چنانچہ اگر مخلوق کی طرف سے بھی وقت متعین نہ ہو۔ مثلاً کوئی اس طرح دعوت کرے کہ ہم جب دل چاہے ایک وقت کا کھانا کھیں گے تو ان کے وعدہ سے بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ مخلوق کی طرف سے تو اطمینان ہو جاتا ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔ یہ کوئی الزام کی بات نہیں۔ یہ تو امر طبعی ہے۔ ان اگر حق تعالیٰ کا وعدہ معین ہوتا پھر اگر کوئی یقین نہ کرتا تو الزام تھا۔ پس چونکہ خدا تعالیٰ کے وعدہ میں تین قسم کا ابہام ہے ایک یہ کہ کب ملے گا۔ ایک یہ کہ کس درجہ سے ملے گا۔ ذراعت سے یا تجارت سے یا اور کسی طریقہ سے۔ ایک یہ کہ کتنا ملے گا پیٹ بھی بھرے گا یا نہیں۔ چنانچہ کبھی کم ملتا ہے اور کبھی زیادہ ملتا ہے۔ اس واسطے تردد ہوتا ہے کیونکہ طبعی بات ہے کہ ابہام سے تردد ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ حق تعالیٰ پر وثوق نہیں اور یہ تردد ایمان کے منافی نہیں بلکہ کمال ایمان کے بھی منافی نہیں۔

سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کا ایمان ہے۔ وہ سب سے زیادہ کامل الایمان ہیں مگر حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں ہے کہ وہ عرض کرتے ہیں۔ لیکن لیطمئن قلبی۔ آخر لیطمئن کا کیا مطلب ہے خود واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کو کسی درجہ کا تردد تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ میں دیکھ لوں۔ فرمایا ہے کہ ابراہیمؑ کو کون سا تردد تھا۔ ظاہر بات ہے کہ وہ تردد تو ہو نہیں سکتا جو منافی ایمان ہو۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مطلق تردد منافی ایمان

کے نہیں۔ ایک فرد تروڈو کی وہ بھی ہے جو منافی ایمان نہیں۔ تروڈو کی بہت سی
 قسمیں ہیں۔ یہ تروڈو جو حضرت ابراہیم کو تھا ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ اقل
 تو ابراہیم کی شان ایسی ہے کہ ان کی نسبت یہ گمان ہو ہی نہیں سکتا کہ ان میں
 ایسا تروڈو تھا جو کہ ایمان کے منافی ہے اور پھر قرآن میں اس کی تصریح بھی موجود
 ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ اولم تو من کہ کیا تمہارا اس پر ایمان نہیں تو
 انہوں نے جواب دیا کہ بلی یعنی ایمان کیوں نہیں۔ میں تو صرف اس لئے یہ
 درخواست کرتا ہوں کہ تم میرے قلب کو اطمینان ہو جاوے۔ اس سے معلوم
 ہوتا ہے کہ یقین آپ کو پورا تھا، شک ذرا بھی نہ تھا۔ ہاں تروڈو کا وہ زمانہ
 تھا جو اطمینان کے مقابل ہے اور وہ منافی ایمان نہیں۔

قرآن اور ترجمہ
 اطمینان عربی کا لفظ ہے جس کے معنی سکون ہیں
 یہ یقین کا مرادف نہیں ہے البتہ اردو میں اطمینان بمعنی
 یقین مستعمل ہے۔ ممکن ہے کہ قرآن شریف کے کسی ترجمہ میں اطمینان کا لفظ دیکھ
 کر اس سے دھوکا ہوا ہو۔ اور آج کل تو ایسے ترجمے بھی ہو گئے ہیں کہ ان کے
 اندر ایسے دقیق فرقوں کا لحاظ نہیں کیا گیا یہی تو وجہ ہے کہ قرآن شریف
 کے ترجمہ میں بہت علوم جاننے کی ضرورت ہے کہ ہر شخص کو ترجمہ دیکھنا
 بھی نہ چاہئے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ ان آیت کے متعلق مجھ کو
 پوچھنا ہے مگر اول اس کا ترجمہ کر دیجئے۔ ووجدك ضالاً فهدى وہ
 سمجھے ہوئے تھے کہ میں ضالاً کا ترجمہ گمراہ کروں گا۔ اور گمراہ فارسی میں تو

عام ہے۔ اس کو بھی جو واقفیت نہ رکھتا ہو اور اس کو جو واقف ہو کر راہ سے
 ٹھسکا ہو۔ لیکن اردو میں گمراہ اسی کو کہا جاتا ہے جو قصداً راہ سے الگ ہو گیا ہو
 کسی مترجم نے ضالاً کا ترجمہ لفظ گمراہ سے کر دیا ہے۔ بس اس کو دیکھ کر دل
 میں اعتراض آیا ہوگا۔ میں نے کہا سنتے ترجمہ یہ ہے۔ پایا اللہ تعالیٰ نے آپ
 کو ناواقف پھر واقف بنا دیا۔ اس کو سن کر چپکے ہی تو ہو گئے۔

اسی وجہ سے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن میں بہت سے علوم کی ضرورت
 ہے۔ ترجمہ کے مطالعہ کے لئے صاحب کثاف نے مفسر کے لئے چودہ
 علوم کی ضرورت لکھی ہے۔ میں نے ایک موقع پر (فتح پور کے وعظ میں) ثابت
 کر دیا تھا کہ اگر نخوتہ بجاتا ہوگا تو ترجمہ میں یہ غلطی کرے گا اور فلاں علم سے
 واقف نہ ہوگا تو یہ غلطی کرے گا۔ خوب واضح طور سے ثابت کر دیا تھا کہ
 اتنے علوم کی ضرورت ہے قرآن شریف کے ترجمہ کے لئے آج کل ہر شخص
 اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے جیسے کہ لفظ گمراہ ہے، اسی طرح لفظ اطمینان بھی ہے
 یہ اردو میں تو مرادف سے ایمان کا مگر عربی میں اس کا مرادف نہیں بلکہ عربی میں
 اس کے معنی ہیں سکون قلب اور اس کا مقابل ہے نردو یعنی اضطراب قلب یعنی
 قلب میں حرکت سکون کی قسم کے خلاف ظاہر ہونا۔

مطلب یہ ہے کہ اس کا تو یقین ہے کہ آپ
 زندہ کرنے پر قادر ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ کیسے

وساوس اور اسباب

کریں گے۔ یہ دیکھا دیجئے۔ جیسے حضرت ذکریا علیہ السلام نے عرض کیا تھا اخی
 یکنون علی غلام کہ یہ تو یقینی ہے کہ آپ پیدا دینے پر قادر ہیں مگر یہ بتا دیجئے

کہ کس طرح ہوگا۔ ابراہیم میاں بیوی جوان کئے جاویں گے یا اسی حالت میں ہوگا۔ انی استبعاد کے لئے نہیں انی بمعنی کیفیت یعنی سوال عن کیفیت کے لئے ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ عرض کرتے ہیں۔ رجب ارنی کیفیت تھی الموقی کہ آپ کس کیفیت سے مردوں کو زندہ کریں گے۔ اس کی کوئی نظیر دکھا دیجئے۔ اس پر حکم ہوا۔ فخذ اربعۃ من الطیر۔ الخ ان کو بلا لو پھر ذبح کر کے خوب ان کا تقیمہ کر لو اور چار حصے کر کے چار جگہ رکھ دو۔ پھر ان کو پکارو سب دوڑے چلے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور پکارا۔ بس سب زندہ ہو کر ان کی طرف چلے آئے۔ ابراہیمؑ نے اپنی آنکھ سے نمائشاد بھیجا بس اس سے معلوم ہو گیا کہ مطلق تزدو نہ ایمان کے منافی ہے اور نہ کمال ولایت کے۔

یہ سائلین کے کام کی بات ہے ان کو بعض اوقات وسوسے سے گھرتے ہیں تزدو پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے سمجھتے ہیں کہ پہلی حالت کی طرف جو رہو ہو گیا ہم مردو ہو گئے۔ یہ غلطی ہے بلکہ بات یہ ہے کہ وساوس کے آنے میں بھی حکمت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ پہلے اطمینان کی حالت پیش آگئی تھی۔ اس وقت ناز ہونے لگا تھا۔ حق تعالیٰ اس کی اصلاح کیواسطے تزدو میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ تزدو خطرات و سوا اس مطلق منافی نہیں کمال کے۔ یہ علامت ضعف کی نہیں۔

خیر ان بزرگ کی حکایت یہ ہوئی کہ انہوں نے حق تعالیٰ سے عرض

کیا کہ یا اللہ مجھے ساری عمر کا رزق ایک دفعہ دے دیجئے تاکہ وسواس سے نجات ہو جاوے۔ تو یہ حضرت جمعیت قلب کے لئے اسباب دنیا اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سال کا وظیفہ عیال کے لئے جمع کر لیتے تھے۔ آپ نے ہماری تعلیم کے لئے ایسا کیا۔ آپ کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ امت کے ضعف کی رعایت فرمائی۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو امت یوں سمجھتی کہ جائز تو ہے مگر کمال کے خلاف ہے۔ آپ نے عمل کر کے تہلا دیا کہ یہ کمال کے بھی خلاف نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مذاق کے خلاف امت کے مذاق کی رعایت فرمائی۔ اگر آپ اسباب کو ترک فرما دیتے تو باوجود جائز ہونے کے بھی ذخیرہ رکھتے ہوئے بہت سے قلعین کی طبیعت رکھتی۔ کیا ٹھکانا ہے اس شفقت کا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بڑا فصیح ہو اور وہ بچہ کی رعایت کر کے تو تلا بولنے لگتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ضعف کی رعایت فرمائی۔ اسباب کو اختیار نہ فرماتے تو آپ کا کوئی ضرر نہ تھا۔ بس صرف شفقت تھی جس کی وجہ سے ایسا کیا۔ مگر آپ نے اسباب کو ایک حد کے اندر رکھا ہے۔

اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ بہت تن اسی کی طرف مصروف ہو جاویں۔

فضیلتِ آخرت

اور ان کو دنیا میں انہماک کا ایک بہانہ ہو جاوے۔ جیسا مشہور ہے کہ ایک

شخص نے کسی سے پوچھا تھا کہ تمہیں قرآن میں کون سا حکم پسند ہے تو کہا کھلوا
 واشح لوبا کہ کھاؤ اور پیو۔ پھر پوچھا تو کون سی پسند ہے، تو کہا ربنا انزل
 علینا ما سدا عن السماء۔

اسی طرح بہت سے نئے تعلیم یافتوں کو صحابہ میں سے وہی حضرات
 پسند آئے ہیں جو مالدار تھے جیسے عبدالرحمن بن عوف، حضرت عثمان غنیؓ، یہاں
 مال جمع کرنے کی مذمت ہوتی ہے تو فوراً کہہ دیتے ہیں کہ مال حاصل کرنا
 تو اچھی چیز ہے۔ دیکھئے یہ حضرات کیسے مالدار تھے اور جو مالدار نہ تھے وہ
 ان کو پسند نہیں۔ تو بات کیا ہے وہ ان کے مذاق کے موافق ہیں اس لئے
 پسند ہیں۔

غرض یہ کہ ہمارے اندر کثرت سے بل تو شرف الحیوة الدنیا
 کا قصہ ہو گیا ہے خاص کر عورتوں میں۔ میں تو عورتوں سے کہا کہ تمہوں کہ
 کبھی سوچیں گھنٹے میں کسی وقت تمہیں خدا تعالیٰ بھی یاد آتے ہیں۔ گوٹے پٹھے
 زیور کی دھن میں دن رات رہتی ہیں۔ یہ حالت ہے کہ آج ایک زیور بنایا
 ہے۔ کسی عورت کے پاس دوسرے نمونہ کا دیکھ لیا اب اس کو مہیاں سے
 ضد کر کے نوڑوا رہی ہیں اور دوسرے نمونہ کا بنوا رہی ہیں۔ وہ سمجھتا تا
 بھی ہے مگر ایک سمجھ میں نہیں آتی۔ جب تک بنوانہ لیں چین ہی نہیں آتا خاوند
 کا ناک میں دم گر رکھا ہے۔ ان میں غالب دنیا کی محبت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کو تزیین و تیار یہ شکایت کی بات ہے کہ دنیا
 کو طلب کرنا۔ اسی لئے یوں ارشاد فرمایا بل تو شرف الحیوة الدنیا

اور یہ نہیں فرمایا۔ بل تطلبون الدنیا۔ آگے فرماتے ہیں والآخرۃ خیر و
القبلی یعنی تم دنیا کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت خیر بھی ہے اور القبلی بھی
اس کو ترجیح دینا چاہئے نہ دنیا کو کیونکہ آخرت دو درجہ سے دنیا پر فضیلت
رکھتی ہے۔

ایک تو اس درجہ سے کہ خیر یعنی بہتر ہے دنیا سے کہ محل اعلیٰ درجہ
کے باغ، نہریں بہتی ہوئی جن کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا، نہایت شیریں
عرض پر نعمت اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔

دوسرے اس درجہ سے کہ القبلی ہوگی کہ یہ تمام نعمتیں ہمیشہ ہمیشہ کے
لئے ہوں گی۔ کبھی زائل نہ ہوں گی۔ نذرستی ایسی کہ کبھی سر میں درد تک نہ
ہوگا۔

اگر ایک محل ہو نہایت ہی اچھا کہ جتنی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ وہ سب
اس میں پائی جاتی ہیں مگر ہو ایک دن کے لئے تو وہ کچھ بھی نہیں اور ایک
مکان ہو عمدہ نفس اور ہو بھی عمر بھر کے لئے تو وہ بڑی دولت ہے۔ تو
آخرت میں دونوں صفت جمع ہیں۔ خیر بھی ہے اور باقی بھی۔ واللہ دنیا اور
آخرت میں اتنی نسبت بھی نہیں جتنی ایک قطرہ اور سمندر میں نسبت ہے
قانی اور باقی میں نسبت ہی کیا۔

سو حق تعالیٰ نے شکایت اس کی فرمائی ہے کہ آخرت کو تو اختیار
نہیں کرتے ہو اور دنیا کو اختیار کرتے ہو یہاں سے فیصلہ ہو گیا اس کا کہ دنیا
کے طلب کرنے کی شکایت نہیں بلکہ دنیا کو ترجیح دینے کی شکایت ہے۔

مومن اور دنیوی متاع

اب میں مخاطبین کو متوجہ کرتا ہوں کہ اپنا اپنا امتحان کر لیجئے۔ سب امتحان کر دیکھ لیجئے

کہ مال و دولت اور دنیوی مشاغل میں آپ سے اشرقت ترک ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر ترک ہوتی ہے تو ایسی دنیا قابل احترام ہے اور اگر ترک نہیں ہوتی تو وہ حال ہے جیسے شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

گرت مال و زرہست زرع و تجارت

چو دل باخدا یست خلوت نشینی

غرض دنیا کو قلب میں سے نکالئے، ہاتھ سے دنیا کو نہ نکالئے۔

ہاتھ سے نکالنے کو ہم نہیں کہتے۔ مولانا نے مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

آب و کشتی ہلاک کشتی سرت آب اندر ز کشتی پستی سرت

کیا عجیب مثال ہے۔ پانی اگر کشتی کے نیچے ہو تو اس کے جاری ہونے

کا سبب ہے اگر وہ نہ ہو تو چل نہیں سکتی۔ اور جو کشتی کے اندر پہنچ جائے

تو ہلاک کر دے۔ مال کی مثال پانی کی سی ہے۔ اگر دل سے باہر رہے تو

دین میں معین ہے اور جو دل میں گھس جائے تو باعث ہلاکت ہے۔ مومن کو

دنیوی متاع کی بھی ضرورت ہے مگر جب کہ باہر رہے قلب سے ایسی کی

بابت مولانا فرماتے ہیں۔

مال را گر بہر دین باشی جموں نعم مال صالح گفت آن رسول

حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے نعم المال الصالح للرجل

الصالح۔ مال سے مدد لینا سکتا ہے۔ مساکین کی خدمت، طلباء کی اعانت

کر سکتا ہے، حقوق ادا کر سکتا ہے دوسری قوم کے مقابلہ میں اپنی قوم کی اس سے مدد کر سکتا ہے۔ کتنے نفع کی چیز ہے۔ کون کہتا ہے کہ مال مضر ہے البتہ حُربِ مال مضر ہے پس ہاتھ میں رہے قلب میں نہ رہے۔ یہ حالت ہو کہ دل بیارہ دست بکار۔

حاصل یہ ہوا کہ وہ شخص دنیا دار نہیں جس کے قلب میں تو محبت ہو خدا اور رسول کی اور ہاتھ میں مال رکھتا ہو۔ جس کی علامت یہ ہے کہ اگر لاکھ روپے ملتے ہوں اور دین کا نقصان ہوتا ہو تو وہ دین کے مقابلہ میں لاکھ روپے پر لات مار دے۔ سو ایسا شخص وہی ہو سکتا ہے کہ جس کے دل سے دنیا کی محبت نکل جائے۔ جب محبت دنیا کی دل سے نکال دے گا تو پھر دنیا دار نہ ہوگا۔

تاریک الدنیا اور متروک الدنیا | اب اس مضمون کی تکمیل کی ضرورت ہے کہ دنیا کی محبت دل سے

نکالے کیسے تاکہ ہر مسلمان اسی طریقہ کو اختیار کرے۔ جہاں بی، اے، ایم، اے کے پاس کرنے کی ضرورت ہے، اس دوسرے بی، اے، ایم، اے کا بھی سامان کرنا پڑے گا۔ بس ایک پاس اور کرنا ہوگا۔ اگر کوئی کہے کیا فقیر بناؤں میں کہتا ہوں کہ آپ فقیر تو اب ہیں۔ اس وقت فقیر نہ رہو گے۔ اب یہ کیفیت ہے کہ مال تو ہے مگر چین نہیں۔ یہ کیا امارت ہے۔ ہم ایسا امیر بنائیں گے کہ العنی عنی النفس اس وقت حقیقی امیر ہو گے۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غریب تھے۔ آپ کے بارہ

میں جو مسکین کا لفظ آیا ہے اس کے یہ معنی نہیں جیسے آج کل غریب مسکین میں
 کیا غریب کی یہ شان ہوتی ہے کہ قربانی میں سواونٹ ذبح کر دے۔ سو سوا
 اونٹ مسکین کو تقسیم کر دے۔ غریب اسے کہتے ہیں کہ لینے پر مرتنا
 پھرے اور نہ ملے۔ نہ یہ کہ ملتے ہوئے کو چھوڑ دے۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منجانب حق پوچھا گیا کہ اگر آپ کہیں تو
 آپ کے لئے احمد پہاڑ کو سونا کر دیں اور آپ کے ساتھ ساتھ راکہ سے
 حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے اللہ مجھ کو تو یہ اچھا معلوم ہوتا
 ہے کہ جس وقت ہو تو کھا کر آپ کا شکر بجالاؤں۔ اور جب نہ ہو تو آپ
 سے مانگوں۔ غریب متروک دنیا ہوتا ہے آپ تارک الدنیا تھے۔ حضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں سلطنت تھی۔ آپ کو سلطنت کے اختیارات
 تھے۔ سو اس کو غریب نہیں کہتے۔

غرض کہ آپ کو فقیر ہونے کو نہ کہا جاوے گا۔ یہ غلط ہے کہ مال و
 متاع دنیا کا ترک کرایا جاتا ہے۔ نہیں کمائے کھائے۔ ہاں طلب دنیا
 مذموم طریقہ سے نہ ہو۔

یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ حُب حق آپ کے
حُب حق اندر غالب ہو جہاں سب چیزیں حاصل کی ہیں ایک
 حُب حق بھی حاصل کرو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حُب حق آپ کے اندر بالکل نہیں
 آپ میں حُب حق ہے مگر بہت کمزور ہے۔ اس وقت آپ کی ایسی مثال
 ہے جیسے چراغ میں تیل بھی ہے، مگر بہت کمزور ہے۔ سارا مصالحہ بھی موجود ہے مگر

اُس کو ابھارنے کی ضرورت ہے۔ ذرا ابھار دو گے تو روشنی ہو جائے گی
 آپ کے پاس کی نہیں کسی چیز کی۔ آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ کسی اور سے
 لینے کی ضرورت نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں :-

یک سبد پر نال تزا بر فرق سر تو بھی جوئی لب نال در بدر
 سب کچھ ہمارے پاس ہے مگر اُسے بڑھانے کی ضرورت ہے
 سو آپ میں حُبِ حق تو ہے مگر غالب نہیں۔ حُبِ حق کا غلبہ ہونا چاہئے اسکی
 ضرورت ہے۔ شاید آپ یوں خیال کریں کہ تسبیح لینے کو یا مرید ہونے کو
 کہے گا۔ میں اس کو نہیں کہتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ٹھوڑی سی مشقت کی ضرورت
 ہونگی۔ یہ نہیں کہ تکلیف ہوگی۔ آپ کا کھانا یا ہونا چھوڑا یا جائے گا۔ مشقت
 یاں معنی ہے کہ نفس ایک بات کو نہیں چاہتا اور یہاں اُس کو کرنا پڑے گا
 پس مشقت صرف یہ ہے کہ نفس کے خلاف کرنا ہوگا۔

میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں جس سے اس کام کے اختیار کرنے
 میں آسانی ہوگی۔ وہ یہ کہ آپ نے کبھی مسہل لیا ہوگا۔ اگر خود نہ لیا ہوگا تو
 دیکھا تو ہو ہی گا۔ طبیب ٹھوڑے دنوں پر ہیز کرانا ہے۔ منضج پلاتا ہے
 پھر مسہل دیتا ہے۔ جس دن مسہل دیتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ گھر میں بیٹھے
 چلے پھر بیٹھے نہیں۔ مسہل میں نہ بائیں کی و نہ سنو، نہ سوؤ۔ اگر ایسا کیا تو دست
 نہیں آئیں گے۔ بس تم اس تصور میں بیٹھے رہنا کہ اب آیا دست، اب
 آیا دست۔ وہ اس قدر پابندی کراتا ہے پھر بھی صحت کے بعد اُس کا
 شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اُس سے یہ بھی نہیں کہتے کہ اب مفدمات کا وقت

ہے۔ اب فلاں کام درپیش ہے بلکہ سب چھوڑ چھاڑ کر اس کے تابع ہو جاتے ہیں اور اس کی مخالفت نہیں کرتے۔

پس اسی طرح مشائخ مسہل دیتے ہیں۔ تعجب ہے کہ اس مسہل کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور اس کو ضروری نہیں سمجھتے۔ طبیب مسہل میں کھوڑی دیر کے لئے مشورہ خلوت کا بھی دیتا ہے۔ اس کو بجان و دل منظور کرتے ہیں اور اگر شیخ اس کو کہے تو دم نکلتا ہے۔ طبیب تو بڑے بڑے پرہیز کرنا ہے اور یہاں شیخ کھوڑے سے پرہیز کا مشورہ دیتا ہے۔ یعنی معاصی کا پرہیز کرنا ہے۔ مگر ان کے ساتھ لوگ الجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لوجی اتنے دن اپنے پاس رہنے کو ہی تہلا دیا۔ کوئی اتنی فرصت کہاں سے لائے۔ اتنے دنوں کی خلوت اور خاموشی تجویز کر دی۔ کوئی کہاں تک خاموش رہے۔ ان کی تجویزوں پر لوگ الجھتے ہیں اور طبیب کی تجویز پر کوئی نہیں الجھتا۔ طبیب کی تجویز پر بھی تو الجھنا چاہئے کہ میں جی ہم باز آئے علاج سے مگر وہاں کسی کو شبہ نہیں ہوتا۔ یہاں شہادت پیدا ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو کام طبیب کرتا ہے وہی شیخ کرتا ہے۔ مگر شیخ کو تو الزام دین اور طبیب کے معنیوں ہوں۔ کیسے تعجب کی بات ہے اگر کوئی کہے کہ تم ساری عمر گھٹتے ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کھوڑے دنوں پرہیز بنلائیں گے۔ ساری عمر نہ رگڑیں گے۔ پھر تو خود ہی جاٹے ایسی پڑھاؤ سے گی کہ چھوٹے ہی گی نہیں اور نیز جیسے کہ اپنی اصلاح ضروری ہے بچوں کی بھی ضروری ہے۔ پس خود اپنی بھی اصلاح کرو اور اپنے بچوں کی اصلاح کرو۔

کی بھی ابھی سے فکر کرو۔ کیونکہ بچپن میں اخلاق زیادہ درست ہوتے ہیں اب اس کا طریقہ کیا ہے وہ میں بتلاتا ہوں۔

طریق اصلاح | وہ طریقہ ایک ہی چیز ہے۔ وہ کیا ہے صحبت اہل اللہ۔ اگر کوئی کہے کہ بچوں کے لئے اتنا خرچ کہاں سے آئے کہ اہل اللہ کے پاس بھیجیں اور وہاں ان کو رکھیں۔ میں کہتا ہوں کہ کیا بچہ کے لئے اتنا نہیں رکھتے۔ ماسٹر کو تنخواہ نہیں دیتے۔ اس کے لئے بائیکل نہیں خریدتے۔ لندن نہیں بھیجتے۔ کیا سینکڑوں روپے خرچ نہیں کرتے۔ جہاں اور تمام باتوں کا انتظام کرتے ہو اللہ والوں کی صحبت کا بھی انتظام کر دو۔

اس کی صورت بہت ہی آسان ہے کچھ مشکل نہیں۔ وہ یہ علاج روحانی کے لئے و عمل کی ضرورت ہے جس میں ایک جزو یہ صحبت بھی ہے ایک تو یہ کہ روزانہ کوئی وقت لے لو جس میں کسی کام کا حرج نہ ہو۔ تو سب سے زیادہ بیکار وقت سونے کا ہے یہی لے لو۔ بس اس میں سے تھوڑا سا وقت اس کام کے لئے لے کر اس میں یہ کرو کہ کوئی کتاب دین کی بچہ کو دیکھو کہ وہ خود پڑھے یا آپ اس کو سنا دیں۔ کوئی دن اس سے خالی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ کبھی کبھی دو دن چار دن جب زمانہ چھٹی اور اسکول کی تعطیل کا ہو صحبت اہل اللہ اختیار کریں بلکہ اگر تمام زمانہ چھٹی کا اس میں خرچ نہ کریں تو یوں کریں کہ اسکول میں ہفتہ بھر کی چھٹی ہوتی ہے اس کے دو حصے کریں۔ ایک حصہ کھیل کود میں گزاریں اور ایک حصہ اہل اللہ کی صحبت میں۔ مگر یہ ضرور ہے

کہ پہلے انتخاب کسی محقق کا کر لیجئے اور وہ محقق ایسا ہوگا کہ ان پر کچھ تشدد نہ
 کیے گا۔ حتیٰ کہ نماز وغیرہ کو بھی ان سے نہ کہے گا۔ وہ ایسا طرز اختیار کرے گا
 کہ بلا کہے تمام باتوں کی اصلاح ہو جاوے گی۔ اس کے پاس بیٹھنا ہی سب
 باتوں کی اصلاح کے لئے کافی ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ روزانہ کا عمل تو وہ ہے کہ کتاب خود پڑھا کریں یا
 آپ سنایا کریں اور کبھی کبھی کا عمل یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں
 اول ہی سے ان بچوں کے لئے اس طریق کا التزام کر لیجئے۔ پس اس طریق کے
 اندر دو چیزیں ہوتیں۔ ایک یہ کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں۔ دوسرے
 مسائل دین اور احکام دین کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں۔ پس اس کا التزام کیجئے
 اور ابتداء ہی سے کیجئے۔ ابتداء سے کریں گے تو وہ آسانی سے پابند ہو
 جاویں گے۔ اور اس کے ساتھ عمل کی بھی نگرانی رکھیں۔ مثلاً اگر غیبت کریں تو
 روک دیجئے اور کہئے کہ بڑی چیز ہے۔ ان کو نفرت دلائیے۔ ان سے کبر
 کی نشان ظاہر ہو تو روک دیجئے اور بتلائیے کہ اس میں یہ خرابی ہے۔ جھوٹ
 بولے تو اس کی خرابی بتلائیے۔ جماعت کی نماز کے ترک پر تنبیہ کیجئے اگر سکول
 میں جماعت کی پابندی نہ ہو تو تعطیل کے ایام میں تو ضرور ہو۔

اب تو خود مساجد کی حاضری ہی امر میں متروک
 ہو گئی ہے جس کی ایک کھلی خرابی یہ ہے کہ ان

بچوں کی تربیت

حضرات کو مسجد کی ضروریات تک کی خبر نہیں رہتی۔

میں شاہجہان پور گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک مسجد میں گیا تو دیکھا کہ مسجد میں

مٹی کے تیل کی ڈبیاء رکھی ہوئی ہے۔ اور اس کے دھوپوں سے تمام مسجد کالی ہو رہی ہے۔ اور مسجد کے قریب ہی ایک رئیس صاحب رہتے تھے اس وقت ان کے یہاں میری دعوت تھی۔ ان کے یہاں جو گیا تو بجلی کی روشنی تھی۔ میں نے ان کو اس پر شرم دلائی۔ ان کے ہاں تو بجلی کی روشنی ہے اول مسجد میں ڈبیاء جلتی ہے۔ تب انہوں نے تیل کا انتظام کیا۔

دوبہ یہ ہے کہ مسجد میں جانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ نماز اپنے گھر پڑھتے ہیں۔ جب یہ حالت ہے تو مسجد کی طرف تو بہ کیسے ہو۔ کسی چیز پر نگاہ پڑھنے سے بہت خیال ہوتا ہے۔

ایک رئیس صاحب تھے۔ میں نے ان سے مسجد میں نماز پڑھنے کو کہا تو کہتے لگے کہ صاحب مسجد کی تو یہ حالت ہے کہ نہ فرش ہی ٹھیک ہے نہ وضو ہی کرنے کا انتظام ہے۔ مسجد میں کیا جاویں۔ میں نے کہا کہ یہ اعتراض تو اپنے ہی اوپر ہے۔ یہ تصور تو آپ کا ہے۔ آپ مسجد کی خبر نہیں رکھتے تو بچوں کو ابنا رہی ہے اس کا پابند کیجئے کہ مسجد میں جماعت سے نماز پڑھا کریں۔ اسی طرح بچوں میں بچپن سے یہ بات پیدا کیجئے کہ ان کو مسلمانوں سے اجنبیت نہ ہو۔ ان کو غربا سے اختلاط کی تعلیم دیجئے۔ صاحبو! غربا کے ساتھ اختلاط میں دنیوی جاہ بھی ہے۔ ان سے ملو گے تو وہ قدر کریں گے اور امیروں کے ساتھ اختلاط میں کچھ عزت نہیں ہوتی کیونکہ امراء تو خود ہی ایلٹھ مروڈ میں رہتے ہیں۔ ان کی نظر میں کسی کی وقعت نہیں ہوتی۔ پس یہ مادہ بچپن ہی سے پیدا کرو کہ غربا سے نفرت نہ ہو۔ یہ

باتیں بچپن سے پیدا ہوں گی بڑے ہونے کے بعد پھر ذرا دشوار ہے اسی طرح بچوں کو اس کی تاکید بھی کیجئے کہ لباس خلاف شرح نہ پہنیں۔ دوسری قوموں کی وضع نہ اختیار کریں۔ بعض لوگ تشبہ کے مسئلہ میں کلام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صاحب غیر قوموں کے ساتھ تشبہ میں حرج کیا ہے۔ کیا کافروں کے ساتھ مشابہ ہونے سے کافر ہو جاویں گے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی مرد زنانہ لباس پہنے تو اس کو کیا کہو گے۔ اگر تشبہ میں خرابی نہیں تو تشبہ بالنساء کیوں نہیں کرتے۔ کوئی عورت کا لباس پہن کر دکھا تو دسے عورتوں کا لباس پہننے سے بھی تو عورت نہ ہوگا۔ پھر کیوں نہیں پہنتے۔ بس کچھ بھی نہیں دین کو اپنے تابع بنا رکھا ہے۔ یہ بھی تو نہیں کہ اس کے پہننے پر عہدے موقوف ہوں۔ بعض اسلامی روٹن پر ہیں مگر بڑے بڑے عہدے ان کو ملے ہوئے ہیں۔

حاصل یہ کہ بچوں کے لئے صحبت اہل اللہ کا بھی انتظام کیجئے اور تعلیم دین کا بھی سلسلہ رکھئے اور پھر اس پر عمل بھی کرائیے۔ یہ اجمالی تدبیر ہے اصلاح کی نہ یہ تمام عمر کے لئے دستور العمل ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے کہ

اہل اللہ کی صحبت

جاوے کہ اس میں اہل اللہ کی صحبت متصل طیبہ ہو جاوے تو یہ بہت ہی نافع ہے۔ سال بھر نہ ہو تو چھ ماہ سہی۔ یہ بھی نہیں تو چالیس ہی دن سہی۔ حد میں اس حد کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اسی کو حافظ شیرازی فرماتے ہیں

شندیم کہ ہر روز در سر زینے ہمیں گفت این معنی باقرینے
کہ اسے صوفی شراب آنگہ بود صاف کہ در شیشہ بماند ار بعینہ
ہیں چالیس دن نکال کر کسی شیخ کامل کے پاس رہ پڑے۔ مگر گھر بار
اور جتنے تعلقات ہیں سب کا بند و بست ایسا کر کے جائے کہ قلب کو
تشویش نہ ہو۔ نوکری میں رخصت لے لے۔ غرض بے فکری سے رہے۔
چالیس دن کے لئے اپنے کو بالکل شیخ کے سپرد کر دے۔ شیخ دو کام کریں گے
کچھ تو اعمال بتلائیں گے کچھ اور ادب اور اس سے بے فکر رہے کہ تحمل سے
زیادہ نہ بتلائیں گے۔ اور وہاں کسی سے تعلق مرت رکھو۔ کسی سے بلا ضرورت
شدید لو بھی مرت۔ اصل کام ذکر اللہ اور اطاعت الہی رکھو۔ چالیس دن
میں جو مادہ خبیث آپ کے اندر ہے حسد، عفتہ، کیر، حُب دنیا وغیرہ وہ
سب نکل جائے گا۔ اور جو شبہ یا جو حالت پیش آئے بے تکلف شیخ کے
سامنے پیش کر دو اور اطلاع کے بعد اپنے کو شیخ کے سپرد کر دو کہ جو ان کی
سمجھ میں آئے وہ کریں۔ علاج مشکل ہو یا آسان سب کو برداشت کرو
ہوگا تو آسان ہی مگر اول اول دشواری معلوم ہوگی۔ پھر کوئی دشواری نہ معلوم
ہوگی۔

چنانچہ میں نے بھی ایک صاحب کا علاج کیا ہے۔ ویسے وہ عالم و
فاضل ہیں۔ مگر مجھ کو آثار سے معلوم ہوا کہ ان میں کبر ہے۔ میں نے علاج
یہ تجویز کیا کہ خانقاہ والوں کی جو تیاں جھاڑ کر سپیدھی کر کے رکھا کریں تاکہ
ان کو پہننے میں سہولت ہو۔ اس کو سن کر ان کی یہ حالت ہوئی جیسے گولی مادی

اور خیال ہوا کہ اُنہوں نے یہ کیا کام بنلایا مگر مجبور تھے کہ تاپڑا۔ جو تپیاں سیدھی
تو کیں مگر عشنا کے وقت کہ کوئی دیکھے نہیں۔ یہ نفس کی خباثت تھی۔ پھر دن
کو جو تپیاں سیدھی کرنا شروع کیں۔ یہ حالت ہو گئی کہ اول تو وہ شرما تے تھے
اب لوگ شرمانے لگے۔ بعض لوگ اُن کو منع کرتے۔ میں نے کہا کہ ان سے
تعرض مت کرو۔ جیسے کریں کرنے دو۔ چند روز تک تو یہ رہا۔ اس کے بعد
میں نے کہا کہ نمازیوں کو وضو کے لئے پانی بھر دیا کرو۔ یہ بھی کیا۔ جب
ایک زمانہ گزر گیا تو میں نے کہا کہ بس چھوڑ دو۔ پہلے تو کرتے ہوئے تکلیف
ہوتی تھی اب یہ حالت ہو گئی کہ چھوڑتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے ایک
تو اس لئے کہ اُن کو اس سے ایک مناسبت ہی ہو گئی تھی۔ دوسرے نفس
کہتا تھا کہ سب کے سامنے ظاہر تو ہو ہی گیا اور لوگ بزرگی کے معتقد
بھی ہونے لگے۔ اب یہ کام چھوڑا یا جاتا ہے۔ نفس نے کہا کہ اب اگر
چھوڑوں گا تو لوگ سمجھیں گے کہ اب پھر انہیں تکبر ہو گیا۔ اب چھوڑنے میں
ذلت ہے جیسے پہلے کرنے میں ذلت تھی۔ نفس چھوڑنے میں بڑے رنگ
لایا۔ کہنے لگے کہ مجھ کو چھوڑنے کا حکم نہ ہو۔ میں نے کہا کہ بس اب اس کو
چھوڑ دو۔ اب یہ کہو کہ نہ کسی سے بلو جلو، نہ بات کرو۔ تنہا حجرہ میں دروازہ
بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ پہلے تو کہتے تھے کہ اُنہوں نے یہ کیا کیا کہ جو نے سیدھے
کرنے کو کہہ دیا۔ مگر پھر قسم کھا کر کہتے تھے کہ حجہ کو اس عمل سے اتنا بڑا
نفع ہوا کہ سال یا سال میں بھی نہ ہوتا۔ جس کے اندر کبر ہو یہ تو اس کا علاج ہوا۔ اب فرض کرو کہ کسی

زینت بہت ہے۔ مانگ پٹی میں ہر وقت لگا رہتا ہے۔ اس کو اس سے فرصت ہی نہیں ہوتی۔ شیخ اس کا علاج یوں کرے گا کہ جھاڑو یا تختہ میں دیکھا اور کہے گا شرک پر جاؤ اور جھاڑو دو۔ مسلمانوں کو آرام پہنچے۔ اس عمل کے کرنے سے وہ شخص زینت کو چھوڑ دے گا۔

پہلے بزرگ اس طرح کہتے تھے۔ وظیفہ زیادہ نہ بتلانے تھے وظیفہ ثواب ہوئے ہیں کہ جہاں طالب نے کسی مرض کی شکایت کی بس ایک وظیفہ بتلا دیا۔ امراض کہیں وظیفوں سے جاتے ہیں۔ ان کا ازالہ تو اسی طرح ہوتا ہے۔ یا کسی میں حسد کا مادہ ہے تو شیخ محسود کے یاؤں دبانے کو کہے گا۔ سائنس کی رو سے اس کا لازمی ہے کہ اس سے محسود کے دل میں اس کی محبت ہونگی۔ تو پھر اس کو بھی ہوگی اور جب اس کو اس کے ساتھ محبت ہو جاوے گی تو پھر حسد جاتا رہے گا۔ سو اس طریقہ سے ازالہ ہوتا ہے ان امراض کا۔

اب لوگ ان کے مذموم ہونے کے صرف علم کو کافی سمجھتے ہیں کہ جب ان کی بُرائی معلوم ہوگی تو خود ہی چھوٹ جائیں گے۔ خوب سمجھ لو کہ اصلاح کے لئے تنہا علم کافی نہیں۔ دو دو جملے کے سننے سے اصلاح نہیں ہوتی بلکہ عملی صورت سے اصلاح ہوتی ہے۔ اسی کو تو کہتے ہیں۔

صوفی نشو و نما تادرنہ کشد ساجی بسیار سفر باید تا پختہ نشود خامی
اخلاق کی درستی تو خبیث مادہ کے نکلنے ہی سے ہوگی۔ دیکھئے پس
کی نا اتفاقی سب جانتے ہیں کہ ساری خرابیوں کی جڑ ہے مگر پھر بھی اس کو نہیں

چھوڑتے و جب یہ کہ مذموم ہونے کا علم صرف کافی نہیں۔ اس کے مادہ کو اپنے اندر سے نکالنے کی ضرورت ہے۔ پس سوچنا چاہئے کہ اس کا مادہ کیا ہے جس سے یہ نا اتفاقی پیدا ہوتی ہے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کبر سے پیدا ہوتی ہے۔

حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ لوگ اتفاق اتفاق تو کہتے ہیں مگر ان کو اس کی بڑھ معلوم نہیں۔ اس کی بڑھ ہے تو اضع۔ وہ یہ کہ ہر شخص اپنے کو دوسرے سے کم سمجھے۔ پس اتفاق ہو جائے گا۔ آج کل جو اتفاق نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اتفاق کے معنی سمجھ رہے ہیں کہ دوسرا میرے تابع رہے۔ میں تابع نہ ہوں۔ یہ حالت ہے کہ باپ بیٹوں میں لڑائی بلکہ پیر مرید میں لڑائی۔ یہ اسی وجہ سے ہے کہ ہر شخص اپنے کو بڑا بنانا چاہتا ہے۔ پس اس کی بڑھ کبر ہے۔

ان خصائل کو بڑا تو سب کہتے ہیں مگر ان کو مٹاتے ہیں اہل اللہ ان کے ازالہ کا علاج پس انہیں کو آٹنا ہے۔ ان کی تجویز پر عمل کرنا چاہئے۔ وہ ان اخلاذ و مہمہ کو نکالیں گے۔ یہ ذرائع مٹ گئے تو ساری سعادت کی کنجی ہاتھ میں آگئی۔ عرض یہ کہ ایک تو وہ یہ کام کریں گے اور دوسرے اور او میں مشغول کریں گے۔ وہ بھی ایسے جو آپ سے ہو سکیں۔ اللہ کا نام لینے سے نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلق طبعی ہو جاوے گا اللہ سے۔ اس میں یہ خاصیت ہے۔

خلاصہ یہ کہ نفس و قلب کی اصلاح ہو جاوے گی۔ اس کے بعد حدود سے تجاوز نہ کرو گے۔ معصیت سے ایسی نفرت ہو جاوے گی۔

جیسے پانخانہ سے۔ اس وقت گناہ چھوڑنا مصیبت ہے اس وقت گناہ کرنا مشکل ہوگا۔ بس کسی قدم پر نافرمانی نہ ہوگی۔ اگر مال بھی ہوگا تب بھی یہ حالت ہوگی کہ جیسے کوئی محبوب اپنے عاشق کو کارخانہ سپرد کرتا ہے۔ عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کے انتظام میں پھرتا ہے اور اس کے اندر وہی تصرف کرتا ہے جس سے محبوب خوش ہو۔ اس کی مرضی کے خلاف اس میں کوئی تصرف نہیں کرتا۔ خاص کر جب کہ یہ علم ہو کہ محبوب دیکھ بھی رہا ہے۔ ساری دنیا اس کے پاس ہوگی مگر قلب میں سوائے محبوب کچھ بھی نہ ہوگا۔ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ ان کے پاس بڑے بڑے کارخانے ہیں مگر وہ صغیرہ بھی نہیں کرتے۔ سوا اصلاح کا ایک تو یہ اثر ہوگا کہ معاصی سے نفرت ہو جاوے گی۔ دوسرے اس کا یہ بھی اثر ہوگا کہ خلق کی نظریں جاہ بڑھے گا۔

ایک اور عجیب بات ہے کہ اس سے قوت جسمانی بھی

اہل اللہ کی قوت قلبیہ و جسمانیہ

بڑھتی ہے۔ اہل اللہ میں قوت جسمانیہ بھی زیادہ ہوتی ہے۔ گو کہ ان کی ظاہری حالت یہ ہوتی ہے کہ راتوں کو جاگنے اور مجاہدہ کرنے سے دبلے پتلے ہوتے ہیں مگر روح میں افسردگی نہیں ہوتی۔ ہر وقت تازہ رہتے ہیں اور راز تازگی کا یہ ہے کہ ان کو معیت ہے محبوب حقیقی سے۔ آپ محبوب مجازی کو دیکھ کر زندہ ہو جاتے ہیں۔ جب ادنیٰ سے محبوب کی معیت میں یہ اثر ہے، تو پھر خدا تعالیٰ کی معیت میں کیوں نہ اثر ہو۔ اسی واسطے وہ ہر حال میں خوش

رہتے ہیں۔ وہ خبر یہی ہے کہ اُن کو معیت ہے حق تعالیٰ سے۔
 ہر کجا یوسف لے خیر باشد چوماہ جنت است آن گریہ باشد و عجز
 ہر کجا دلبر بود خستد مانشین فوق کرد و دل است لے قنریں
 باتو دوزخ جنت است لے جانفزا
 بے تو جنت دوزخ است لے دلربا

یہ راز ہے اُن کے خوش رہنے کا اور خوش رہنے سے جسمانی قوت
 زیادہ ہوتی ہے۔ نیز چونکہ اُن کو معیت ہوتی ہے محبوب سے ان کا قلب
 بھی قوی ہوتا ہے۔ آپ ایک ہزار کے جانتے رہنے سے و گیر ہوں اور
 وہ لاکھ روپے کے بھی جانتے رہنے سے نہ ہوں۔ یہ حالت ہوتی ہے
 اُن کے قوت قلب کی بلکہ ان میں جو غریب ہیں اُن کی بھی یہ حالت ہوتی

ہم نے ایک غریب کو دیکھا کہ وہ کھیتی کرتے تھے۔ ان کو روپے کی
 ضرورت ہوئی لیکن کہیں سے بلا سود نہ ملتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں سودی شکر
 نہ لوں گا چاہے کچھ بھی ہو۔ اب اُن کی اولاد ہے۔ اُن کا بھی وہی طریقہ ہے
 مٹھوڑی سی زمین میں کھیتی ہوتی ہے مگر اس قدر غلہ پیدا ہوتا ہے کہ اولاد کسی
 یہاں اس سے زیادہ زمین میں بھی نہیں ہوتا۔ انہوں نے ایک خراب زمین
 خریدی تھی۔ وہ ایسی اچھی ہو گئی کہ قصبہ میں ایک زمین بھی ویسی نہیں۔ انہوں نے
 اپنی اولاد کو یہ بھی نصیحت بھی کی تھی کہ دودھ کا جانور نہ رکھا جائے کیونکہ اس
 کی وجہ سے جماعت نہیں ملتی۔ جو جماعت کا وقت ہوتا ہے وہی دودھ دوتا ہے۔

کا ہوتا ہے۔

ان ہی کی قوم میں ایک رسم یہ بھی تھی کہ لڑکیوں پر روپیہ لیا جاتا تھا۔ ان کو اپنے لڑکے کی شادی کرنی تھی۔ انہوں نے ایک جگہ پیغام دیا وہاں سے روپیہ کی طلب ہوئی۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ شرح میں ایسا روپیہ لینا حرام ہے۔ اس لئے میں ہرگز نہ دوں گا۔ چاہے شادی ہو یا نہ ہو۔ غصہ سے ہی دن گزرے تھے کہ ان کی قوم کے لوگ لاکھ بھڑکتے آئے اور

کہا لڑکیاں موجود ہیں ہم روپیہ نہیں لیتے۔

لوگ ہر بات کی صائنٹس ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ یہاں پر بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ صاحب! اگر دین کے مقابلہ میں دنیا کے فائدہ کو چھوڑ دیا کریں گے تو دنیا کا کام کیسے چلے گا۔ میں کہتا ہوں کہ ہر بات میں خدا کو کیوں نہ دیکھو! انہیں بزرگ کو دیکھ لو کہ انہوں نے دین کے مقابلہ میں دنیا پر لات مار دی تو خدا تعالیٰ نے ان کا کام کس طرح چلا یا۔

خلاصہ یہ کہ جو دستور العمل میں نے بیان کیا ہے اس پر عمل کیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس وقت آپ کی یہ حالت ہوگی کہ اگر دنیا کا زیادہ کاروبار بھی کریں گے تو دل اس کے اندر مشغول نہ ہوگا۔ اس وقت تو آپ کو قدرت نہیں ہے کہ لمبے پیمانہ پر کام کریں اور قلب اس کے اندر مشغول نہ ہو۔ اور جب اصلاح ہو جاوے گی تو پھر بڑے پیمانہ پر بھی کام کرو گے تب بھی قلب مشغول نہ ہوگا۔ پس اہل اللہ کے پاس رہنے کے لئے چالیس دن تو ضرور نکالنے چاہئیں۔ اس کے بعد کبھی کبھی کی صحبت کافی ہے

یہ ایسا آسان طریقہ ہے کہ ہر کسی کو موقع مل سکتا ہے۔ اس کے بعد اب گنہگار
 نہیں رہی، اس عذر کی کہ ہم دنیا میں مشغول تھے ہم دین کا کام کیسے کرتے
 چنانچہ لوگوں کا آج کل یہی گمان ہو گیا ہے اور واقع میں مذاق بگڑ گیا ہے کہ
 ہیں کہ اگر دین حاصل کریں گے تو بھوکے مریں گے۔ یہ واقعات میں نے
 بیان کئے ہیں۔ اس طرز میں یقینی کامیابی ہے۔ اب وہ لوگ بتلائیں تو یہی
 کہ میں نے کون ہی نوکری چھڑائی۔ کون ہی مشقت کے کام لئے۔ اس طریقہ
 پر عمل کرنے میں کون سی دشواری ہے۔ پس اب ہمت کر کے اس پر عمل شروع
 کر دیجئے۔ جب تم اس طریقہ پر عمل کرو گے تو یقیناً کامیابی ہوگی اور پھر
 ثواب الحیوة الدنیا کے مسداق نہ بنو گے۔

اب ایک چھوٹی سی بات اس آیت کے متعلق
حیاتِ آخرت | عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ قرآن شریف میں دنیا

کے ساتھ تو لفظ حیات لائے۔ مثلاً فرمایا الحیوة الدنیا اور آخرت کے
 ساتھ لفظ حیات نہ لائے۔ یوں نہیں فرمایا وحیونہ الاخرة خیر والقر
 یہ کیا بات ہے؟

سو اس میں یہ بتلایا ہے کہ آخرت حیات ہی حیات ہے وہاں کام
 کا کچھ کام نہیں۔ پس اس میں حیات کا لفظ لانے کی ضرورت ہی نہیں۔ حیات
 آخرت تو جب کہا جاوے گا جب کہ اس میں غیر حیات کوئی اور شے
 ہو۔ پس جو کہ حیاتِ آخرت ایسی چیز ہے اور لوگ پھر بھی اس کی طلب
 نہیں کرتے۔ تو اب میں کہہ سکتا ہوں کہ لوگوں نے آخرت کو پہچانا ہی نہیں

وردہ اس کی طرف توجہ تمام کرتے بلکہ دنیا کو بھی نہیں پہچانا ورنہ اس کی طرف
 رخ بھی نہ کرتے۔ دنیا ہی کو پہچان لو۔ اسی کو سوچو۔ اگر اس کی پوری تحقیقت
 سمجھو تو اس مردار کا نام بھی نہ لو۔ تم جو دنیا کے عاشق ہوئے ہو۔ ذرا اس کو دیکھو
 تو سہی۔

اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کسی بد ہیئت عورت نے پوڈرل رکھا
 ہو اور دو چار چہرے اُس پر عاشق ہو جاویں۔ حضرت دنیا کی بالکل ایسی حالت
 ہے۔

حال دنیا را پر پر سیدم من از فسردانه !

گفت یا خوابے ست یا بادیے ست یا افسانہ

باز گفتم حال آنکس گو کہ دل درشے ست

گفت یا غولے ست یا دیوے ست یا دیوانہ

حقیقت میں دنیا کی ایسی مثال ہے۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے شکایت

فرمائی ہے۔ بل تو شرور الحیوة الدنیا والآخرۃ خیر والبقی کہ دنیا ایسی

رزق چیز کو ترجیح دینے ہو حالانکہ آخرت خیر اور البقی ہے۔ ہر چند کہ عورتوں

کے متعلق کوئی خاص مضمون ذکر نہیں ہوا۔ مگر جو مضامین بیان ہوئے وہ جیسے

مردوں کے لئے نافع ہیں عورتوں کے لئے بھی مفید ہیں۔

چند عورتوں کے متعلق

خیر اب چند باتیں خاص ان کے متعلق بھی
 عرض کرتا ہوں۔ حُب دنیا میں ہیں تو سب

بتلا مگر یہ زیادہ ہیں۔ ان کو علم کم ہے صلحاء کی صحبت کم۔ کیونکہ یہ گھر سے تو

نکل نہیں سکتیں لیکن ان کے لئے یہی تدبیر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ان کو ان اللہ کی خدمت میں نہیں تو ان کا کلام تو میسر ہو سکتا ہے۔ بزرگوں کے کلام اور ملفوظات تو موجود ہیں۔ اگر خود ان سے وعظ نہیں سن سکتیں تو چھپے ہوئے وعظ تو ہیں۔ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ عورتیں جمع ہو اکریں۔ جو ان میں پڑھی لکھی ہو وہ پڑھا کرے اور سب سنا کریں جیسے اور دنیا کے کاروبار کرتی ہیں بس ایک اس کو بھی معمول کر لیں۔ جو برکت اہل اللہ کی خدمت میں حاصل ہو وہ اس طرح ان کو حاصل ہو جاوے گی۔

ایک یہ کہ ضروری مسائل کی کتابیں پڑھیں یا سنیں۔ اور خیال رکھیں کہ ان کے موافق عمل ہو۔ کوئی بات خلاف شرع نہ ہو۔ ایک یہ کہ اپنے عیوب کو ٹھوٹیں اور ان کا علاج کریں۔ کتابیں دیکھنے سے اس کا پتہ چل سکتا ہے۔ اگر کسی بات کا علاج معلوم نہ ہو اور کتاب میں نہ ملے تو اپنے مردوں سے خواہش کریں کہ وہ کسی بزرگ کے پاس لکھ کر بھیج دیا کریں۔ وہ تجویز کریں۔ اس کے موافق عمل کریں۔ ایک تدبیر تمام معاصی کی مشترک تدبیر ہے۔ اس سے ہر معصیہ کا مادہ عنیف ہو جاتا ہے اور وہ تدبیر مرد اور عورت دونوں کے کام ہے۔ وہ یہ کہ جس فعل کا مادہ تقاضا کرے اسے مت کر۔ مثلاً پرائی عورت کے دیکھنے کو جی چاہا تو نگاہ کو روکو۔ ہرگز مت دیکھو۔ غصہ آئے تو روکو۔ غرض جس مادہ کا تقاضا ہو اس کے خلاف کر۔ مثلاً ایک شادی ہی۔ اس میں رسومات جو کی جاتی ہیں تو غرض یہ ہوتی ہے کہ نام ہو جاوے۔

اس کا کبر اور تفاخر ہے اور وہ ہے حرام۔ پس یہ رسومات بھی حرام ہوئیں تو ان کے فائدہ کے مغلوب کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ رسومات کو مرت کر دو۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ نایح گانا ہی رسم ہے۔ نایح گانے کے علاوہ بس اور کوئی رسم نہیں۔ کھانا کھلانا وغیرہ اس میں رسم کیا ہے۔ تو سمجھ لیجئے کہ نایح گانے کی کوئی خصوصیت نہیں۔ جتنی باتیں نام کی وجہ سے کی جاتی ہیں وہ سب رسوم قبیحہ ہیں۔

علاج یہ ہے کہ ان قصوں میں مرت پڑو۔ جہیز دینے کو طبیعت چاہے خوب دو مگر ساتھ مرت کرو، دکھاؤ مرت۔ لڑکی کو خالی بھیج دو جب گھر واپس آوے تو اس کو ان تمام چیزوں پر قابض بنا دو۔ اس کی ملک ہو گیا جب چاہے لے جاوے۔ اسے مشورہ دو کہ جس چیز کی بالفعل ضرورت نہیں اسے مرت لے جا۔ جہیز کو مجتہداً مرت جانے دو۔ یہ ہے علاج کبر کا۔ نہ یہ کہ ان رسموں کو تو کرتے رہیں اور دل سے فخر اور نام کی نیت نکال دیں۔ یاد رکھو کہ جب تک ان کو ترک نہ کرو گے، اس وقت تک دل سے فخر اور تکبر ہی نہیں نکل سکتا۔ تاؤ تکنیکہ علاج طریقہ سے نہ کرو ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھ کو ایک وقت میں تعجب تھا کہ علماء دیواؤں کے نکاح کی تاکید اس قدر کیوں کرتے ہیں۔ کیوں اتنا پیچھے پڑتے ہیں۔ بس سمجھا دیا کریں کہ نکاح سنت ہے یا مستحب۔ اصل مقصود تو عقیدہ کی اصلاح ہے اس کو بُرا نہ سمجھیں۔ ورنہ دوسرا نکاح کرنا واجب تو ہے نہیں۔ یہ شبہ کئی سال تک

رہا۔ اس کے بعد یہ شبہ مرٹ گیا اور سمجھ میں آ گیا کہ واقعی اس پر عمل کرانے کی بھی ضرورت ہے۔ اگر اس پر عمل نہ ہوگا تو عقیدہ سے بھی اس کی بُرائی نہ نکلے گی۔ اس میں کامیابی جب ہی ہوگی کہ عمل کریں۔ اگر عمل نہ کریں گی تو عیب بھی سمجھیں گی اور جب اس کا رواج ہو جاوے گا تب اس کو عیب بھی نہ سمجھیں گی نہ صرف اس کا سمجھ لینا کہ نکاح کرنا چاہئے کافی نہیں تا وقتیکہ نکاح نہ کیا جاوے پس جب تک کہ عملی علاج نہ ہو اس وقت تک عقیدہ کی بھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

اب اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ

علاج شیخ کی اہمیت

لوگ یا تو اپنا علاج خود تجویز کریں یا شیخ تجویز کرے۔ دو ہی صورتیں ہیں۔ مگر شیخ کے تجویز کرنے میں دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ شیخ طبیب ہے علاج کو خوب سمجھتا ہے۔ اس لئے اس کا علاج تجویز کیا ہوا اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔ دوسرے اپنے ہاتھ سے اپنے نفس پر چھری چلانا مشکل ہے۔ نشتر لگانا مشکل ہے۔ جیسے محسوس کے خود پاؤں بانا مشکل ہے اور جب شیخ نے کہا کہ پاؤں دباؤ تو اب آسان ہو جاوے گا شیخ کے کہنے کے بعد اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔ ماں اگر طبع سلیم ہو تو خود بھی علاج سمجھ سکتا ہے۔ مگر پھر بھی شیخ کی تجویز میں توجہ رکھتے ہیں، وہ کہاں سے لائے گا۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت و لبری واند

نہ ہر کہ آئینہ دار و اسکندری واند

شیخ فلسفی ہے مگر اس کا فلسفہ ظلمانی فلسفہ نہیں جیسے اہل یونان کا فلسفہ ہے بلکہ اس کا نورانی فلسفہ ہے۔ اگر کوئی چار تدبیریں یاد کر لے تو شیخ چھوڑا ہی ہو جاوے گا۔

ہزار نکتہ بار یک تر زمو این جہانت
 نہ ہر کہ سر بنرا شد قلندری داند
 خلاصہ یہ کہ ایک گڑھ سپیکر لو۔ وہ یہ کہ جس چیز کا تقاضا ہو اور ہو وہ معصیت
 اُسے چھوڑ دو۔ اس سے تقاضا معصیت کا ضعیف ہو جاوے گا ضعیف
 اس لئے کہا کہ یوں نہ خیال کیا جاوے کہ بالکل زائل ہو جاوے گا۔ بالکل انا
 نہیں ہو سکتا۔ جیسے شہریر گھوڑا کہ وہ پہلے بہت دق کرتا تھا اب بعد اصلاح
 کے دق نہیں کرتا مگر کبھی کبھی شرارت لے ہی آتا ہے۔ مگر فرق یہ ہوتا ہے
 کہ نفس پہلے بہ دشواری قابو میں آتا تھا اب آسانی سے آجاتا ہے مثلاً نگاہ
 ہٹانا غیر عورتوں سے پہلے نہایت دشوار تھا۔ اب بعد اصلاح کے آسان
 ہو جاوے گا مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ نفس سے بالکل تقاضا ہی موقوف ہو جاوے
 ریاضت کا یہ طریقہ بہت عمدہ ہے کہ تقاضا معصیت کے خلاف کرے۔

یہ حاصل ہے سارے تصوف اور
 اصلاح نفس کا۔ میں سب کو فقیر نہیں بناتا

ہدومت کی ضرورت

صرف اس پر عمل کرنے کو کہتا ہوں۔ پھر اس میں سختی کیا ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ
 تہجد نہ پڑھے۔ مگر اللہ کا نام لیجئے اور معاصی کو چھوڑ بیٹے لیکن پھر بھی اس میں
 نفرت حق کی ضرورت ہے اور وہ بوسائط ہوتی ہے کہ شیخ کی طرف

رجوع کرنے سے۔ اس لئے کہتے ہیں۔

بے عنایات حق و خاصا حق کہ ملک باشد سیرہ پیش ورق

بہن تصوف ایک مرکب تدبیر ہے۔ وہ یہ کہ دواعی نفس کے خلاف

کرو اور التجا کرو حق کی طرف۔ ذکر کرو چاہے پندرہ منٹ ہو مگر نجاہ کرو

جیسے کنواں ایک بالشت روزانہ بھی کھو دو مگر کھو دو نجاہ کرو تو سال بھر میں

پانی نکل آئے گا۔ کام دواومت سے کرو۔ یہ نہیں کہ کبھی کیا اور کبھی نہ

کیا۔

عورتوں کو یہ بھی چاہئے کہ عمدہ کپڑا پہن کر کہیں نہ جائیں۔ جہاں جائیں

انہیں کپڑوں سے چلی جائیں جو پہلے سے پہنے ہوئے ہوں۔ اس عمل سے

جو حصہ تکبر کا ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔ مگر ان کی یہ حالت ہے کہ جہاں جائیں

گی لد بچند کر جائیں گی تاکہ نشان ظاہر ہو۔ زیور بٹنا ہوا دکھاوے کی یہ حالت

ہے کہ کان اگے دوپٹے سے ڈھکے ہوتے ہیں کہ کسی کی نظر نہیں پڑتی تو کھجلا

ہی کے بہانے سے ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے پاس اتنا ہے۔ اگر اپنے

پاس نہ ہو تو مانگ مانگ کر زیور میں لدتی ہیں۔ ان کا خیال زیور اور کپڑے

پیر رہتا ہے۔ جب ان کا مجمع ہوتا ہے تو اوروں کے زیور اور کپڑے پر

نگاہ رہتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جب مردوں کا مجمع منتشر ہوتا ہے تو

کسی کو بھی یاد نہیں رہتا کہ فلاں کی ٹوپی کسی مٹی کرتا کیسا تھا۔ بخلاف عورتوں کے

کہ سب کا زیور اور کپڑا بتادیں گے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ان میں جب

دنیا کا غلبہ زیادہ ہے۔ علاج یہ ہے کہ خاوند کے روبرو خوب پہنا کریں

مگر مخالفت یہ ہے کہ برادری میں جاملیں گی تو خوب بن ٹھن کر اور جب اٹیں گی تو فوراً اتار دیں گی۔ تاکہ جس حال میں خاوند نے پہلے دیکھا تھا اسی میں دیکھے اس کا علاج یہ ہے کہ خاوند کے سامنے بہنیں اور کہیں جاملیں تو نہ بہنیں۔ ایسے ہی علاج غیبت کا ہے اس میں استغفار کافی نہیں بلکہ مغتاب سے کہو کہ میں نے تمہاری غیبت کی ہے تم معاف کر دو۔

خاوند کے حق میں گستاخی ہو جاوے تو بہ کر و اور اس سے معاف کراؤ۔ تم خاوند کو برابر کا دوست سمجھتی ہو کہ اٹس کے ساتھ برابری کا بڑا ٹاڈ کرتی ہو یاد رکھو کہ وہ جیسے دوست ہے حاکم بھی تو ہے۔ دوست تو اس واسطے ہے کہ اٹس کے حقوق ادا کر سکو۔ کیونکہ محبت میں جیسے حقوق ادا ہو سکتے ہیں بغیر محبت کے ادا نہیں ہو سکتے۔ نہ اس لئے کہ اٹس کے جو نیاں مارو۔ عورتیں اس میں بڑی کوتاہی کرتی ہیں۔ خوش خلقی کے لئے تو سب اور بد خلقی کے لئے شہرہ۔ خاوند کی ناراضگی ایسی بڑی چیز ہے کہ اس سے فرشتے لعنت کرتے ہیں۔ عورتوں کی عادت ہے کہ شہرہ کے سامنے زبان درازی بہت کرتی ہیں۔ بھلا اس کو اس طرح تکلیف پہنچانی چاہئے۔ اول تو ہر وقت ہی اٹس کا مزاج دیکھ کر بات کہو۔ ایسی بات نہ کہو جو اس کو ناگوار ہو۔ لیکن خاص کر جب وہ باہر سے گھر میں آوے تو اس وقت تو ضرور ہی اول اٹس کے مزاج کو دیکھ لو کہ کہیں کسی سے لڑ کر نہ آیا ہو۔ کسی وجہ سے غصہ میں نہ ہو۔ مگر ان کو فوراً صبر نہیں ہوتا۔ بس آتے ہی ٹانگ لبتی ہیں۔

اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں

اس کی شکایت فرمائی ہے کہ لوگ زندگی دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں حالانکہ
 آخرت بہتر اور اچھی ہے۔ اس کے متعلق بقدر ضرورت مفصل بیان ہو گیا
 اور حجت الہی قائم ہو گئی۔ اب عمل نہ کرنے پر کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ جو
 مناسب سماں تھا میں نے اپنی طرف سے سب پہنچا دیا۔ عمل کرنا آپ کا
 کام ہے۔

اب میں دعا کرتا ہوں اور حق تعالیٰ سے التجا کرتا ہوں کہ وہ عمل کی توفیق
 دیں۔ آمین یا رب العالمین۔

مطابہ الاموال

تذکیہ نفس کے متعلق یہ وعظ بروز اتوار ماہ شعبان المعظم ۱۳۳۵ھ
 سالانہ جلسہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں منبر پر کھڑے ہو کر
 ارشاد فرمایا۔ جو ۳ گھنٹے میں ختم ہوا۔ سامعین کی تعداد قریباً
 ۲۰۰۰ تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے قلمبند فرمایا۔

خطبة بالوره

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله حمداً ونستعينه ونستغفره ولو من به نستوي
 عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا
 من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له
 ونشهد ان لا اله الا الله واحد لا شريك له ونشهد
 ان سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله صلى الله تعالى
 عليه وعلى آله واصحابه وبارك وسلم اجمعين
 بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم
 خذ من أموالهم صدقة تطهرهم وتزكيتهم
 بها وصل عليهم ان صلتك سكن لهم والله
 يسميهم عليهم

پہلے اس آیت میں ایک ضروری مضمون کا بیان ہے۔ اس لئے
 میں نے اس کو اختیار کیا ہے۔ اور پھر حیدرہ قرآن کی سب

توں میں ایسے ہی مضامین ہیں جو سب ضروری ہیں اور خاص خاص ضرورتوں
 کے لئے کافی ہیں مگر اس وقت خاص اس آیت کے اختیار کرنے کی دو وجہ

ایک یہ کہ میں ابھی دیوبند گیا تھا اور وہاں اس سے پہلی آیت

وَآخِرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا

وَآخِرِينَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنْ اللَّهُ غَفُورٌ

رَحِيمٌ

اور بعض لوگ ہیں کہ اقرار کیا انہوں نے اپنے گناہوں کا
 انہوں سے ایک کام نیک اور ایک بد۔ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ
 کرے ان کو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

کی تقریر ہوئی تھی جس میں اعتراف خطا کا بیان ہے اور اہل علم میں یہ خطا عام ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے بلکہ تاویلات و توجیہات کرنے لگتے ہیں۔ وجہ سے اس کو وہاں اختیار کیا تھا۔ اور یہ مرض طالب علمی ہی کے وقت سے میں پیدا ہوتا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ کتب درسیات میں بعض مصنفین سے غلطی ہو گئی ہے شرح اور محشین ان کی تاویلات و توجیہات کیا کرتے ہیں مصنف سے اہل علم کو بدگمانی نہ ہو۔ اس سے طلباء کو تاویل و توجیہ کی عادت پڑ جاتی ہے حالانکہ محشی اور شارح کی تاویل و توجیہ کا منشا تو اضعاف باوجود دوسرے کی غلطی معلوم ہو جانے کے اس کے کلام کو محمل حسن کرنے اور اپنے مواخذہ کو ضعیف کر دیتے ہیں مگر طلباء نے اس سے سبق سیکھا کہ اپنی خطاؤں میں خود ہی تاویل کرنے لگے۔ جس کا منشا یہ ہے جس کی اصلاح ضروری ہے۔ اس لئے میں نے وہاں اس مضمون کا بیان کیا تھا۔

پھر چونکہ سہارنپور کا سفر اسی کے متصل ہوا تو خیال ہوا کہ جیسے کہ سفر دیوبند کے سفر کے متصل ہے تو بیان بھی وہاں کے بیان سے متصل یعنی مناسب یہ معلوم ہوا کہ یہاں بیان ایسی آیت کا ہو جو پہلی آیت سے متصل ہو، تاکہ اتصال صوری کے ساتھ اتصال معنوی بھی جمع ہو جائے خیال کے بعد جو اگلی آیت میں عوذ کیا تو وہ اس جلسہ کی حالت ہی مناسب معلوم ہوئی۔ اس واسطے اس کو اختیار کر لیا گیا۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ شاید کوئی یہ سمجھے کہ بس یہاں

کا بیان کیا جا رہا ہے اس کا منشا صرف یہی ہے کہ اس سے پہلی آیت کا بیان اس سے پہلے ہو چکا ہے اور فی لغزہ اس آیت کا بیان ضروری نہ تھا۔ تو یہ ایسا ہوا جیسے ایک وزیر نے ایک قاضی کو لکھا تھا

اِنَّهَا الْقَارِضِي بِمَرَقْدَا عَزَّكَتَاكَ

اے قاضی اٹھ جاؤ ہم نے

تم کو معذول کر دیا پس اٹھ
کھڑے ہو۔

فَقَمُّ

اور اس نے سخط دیکھ کر کہا تھا۔

وَاللّٰهُ مَا عَزَّ لَقِيْنَا اِلَّا هٰذِهِ

خدا کی قسم تو نے مجھے معذول

نہیں کیا بلکہ اس رقعہ نے

السَّجَّعَةُ

معذول کیا ہے۔

سو یہ بات نہیں بلکہ واقع میں بھی اس آیت کا مضمون اس جگہ کے لئے بہت مناسب ہے۔ چنانچہ تقریر آیت سے معلوم ہو جائے گا۔

دوسری وجہ اس آیت کے اختیار کی وہ ہے، جو

اَمْوَالِهِمْ كَمَا سَفَنَ سَفَنًا مِّنْ اَنْثٰى هَوٰى

مال اور مسلمان

چونکہ قرآن سے مسلمانوں کو عام طور پر عنا سبت ہے۔ اس لئے وہ لوگ

بھی جو حوری پڑھے ہوئے نہیں اجمالاً الفاظ ہی سے مقصود کو سمجھ لیتے ہیں۔

تو آپ نے خذ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً حَتّٰى يَرْضَوْا کہ میں آج

انفاق مال کا ذکر کروں گا۔ اس کو سببیت اختیار میں اس لئے دخل ہے کہ آج

کے مسلمانوں کو انفاق مال کے مضمون سے نہایت خوش ہے۔ اس کے سنے

سے بھی گھبراتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے میں اپنے بیانات میں مال کا ذکر بہت کم کرتا ہوں۔ مگر یہ ایک بڑی کوتاہی ہے میری بھی اور سامعین کی بھی۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو قرآن میں سجا بجا ذکر فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تاکید کے ساتھ اس کو بیان فرمایا ہے۔ تو یہ بھی شریعت کی ایک جزو ہے۔ پس میری یہ کوتاہی ہے کہ میں اس جزو کا بیان بہت کم کرتا ہوں اور مسلمانوں کی یہ کوتاہی ہے کہ وہ اس سے متوحش ہوتے اور گھبراتے ہیں شریعت کے کسی جزو سے متوحش ہونا سخت مرض ہے جس کی اصلاح ضرور ہے۔ اور توحش کا علاج یہ ہے کہ جس مضمون سے توحش ہو اس کو بار بار سنا جائے۔

جیسا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے ایک حکایت سنی ہے کہ ایک ہندو ریاست کے راجہ سے پنڈتوں نے شکایت کی کہ مسلمانوں کی اذان سے ہمارے دیوتا بھاگ جاتے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں سے کہا جائے کہ اذان آہستہ کہا کریں۔ راجہ نے وزیر کو مخاطب کر کے کہا ہمارا ایک گھوڑا نوپ کی آواز سے بدگتا تھا تو ہم نے اس کی چمک اس طرح نکالی تھی کہ اس کو نوپ کے پاس بندھوا کر نوپ سے فائدہ کئے گئے۔ پھر میں اس طرح کرنے سے اس کی چمک دور ہو گئی۔ اسی طرح ہمارے دیوتا مسلمانوں کی اذان سے بھاگتے ہیں تو بڑی مشکل کی بات ہے۔ اگر مسلمانوں کو یہ راز معلوم ہو گیا تو جب ہم دیوتاؤں سے کچھ کہنے جایا کریں گے مسلمانوں سے اذان دے دیا کریں گے۔ اور دیوتا ہماری ہانت بھی نہ سن سکیں گے۔

لازم ہے کہ ان کی اس وحشت کو دور کیا جائے جس کا یہی طریقہ ہے کہ مسلمانوں سے کہا جائے کہ وہ ہمارے دیوتاؤں کے پاس کھڑے ہو کر بہت زور زور سے اذان دیا کریں تاکہ ان کی چمک دور ہو۔ یہ طریقہ مناسب نہیں کہ مسجدوں کی اذان کو بند کیا جائے یا آہستہ کیا جائے۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں پر ہمارا راز کھلے گا۔

اسی طرح اس وقت مسلمانوں کو جو مضمون مال سے گھبراہٹ ہے اس کے رفع کرنے کے لئے بھی اسی تدبیر کی ضرورت ہے کہ اس قسم کے مضامین بار بار بیان کئے جائیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وحشت رفع کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ سے چندہ مانگا جائے ہرگز نہیں۔ نہ اس وقت میرا یہ مقصود ہے نہ میرا جی چاہتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے پاس مال ہی کہاں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ان آیات کے صحیح معنی بیان کر دیئے جائیں تاکہ ان کی گھبراہٹ اور وحشت رفع ہو جائے۔ یہ جو آپ کو مال کے بیان سے وحشت ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو ان آیات و احادیث کے صحیح معنی معلوم نہیں ہیں انفاق مال کا حکم ہے۔ ہمارے بھائی مسلمانوں کو زیادہ تر کھال کھسوٹوں سے پالا پڑا ہے۔ اس لئے یہ مال کے ذکر سے گھبراتے ہیں۔ اب سچا ہے کوئی واسطہ کھال کھسوٹ بھی نہ ہو اس سے بھی اگر مال کا ذکر سنتے ہیں تو گھبراتے ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے میرا ایک بھتیجا ایک بار میرے وعظ میں بیٹھ گیا۔ گرمی کا موسم تھا۔ اس کو پیاس لگی اور وہاں پانی کا انتظام نہ تھا وعظ

دیر تک ہوا اور اس کا پیاس کے مارنے پر اس حال ہوا۔ اس روز سے وہ وعظ سے ہی ڈر گیا۔ اب جب کبھی اس سے کہا جاتا ہے کہ وعظ میں چلو گے، کہتا ہے نا، پیاسا مرنا پڑے گا۔

ایسے ہی ہمارے بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ جس وعظ میں مال کا ذکر ہوگا، ہماری کھال کھسوٹی جائے گی۔ عجبو! قرآن و حدیث میں جو اتفاق مال کی ترغیب ہے اس کا یہ مطلب نھوڑا ہی ہے کہ ہر وقت مال خرچ کیا کر ویا جب کسی واعظ کو اتفاق مال کا وعظ کہتے ہوئے سنو اس کے بعد ہر جلسہ میں مال دینا تمہارے ذمہ ضروری ہو جائے گا۔ بلکہ شریعت نے اس کے لئے حدود و قواعد مقرر کئے ہیں ان حدود و قواعد کے سننے سے معلوم ہوگا کہ نہ ہمیشہ مال خرچ کرنا ضروری ہے نہ ہر وعظ اور ہر جلسہ میں ضروری ہے بلکہ خاص وقت اور حالت میں دینا ضروری ہے۔ اب مسلمانوں کا ذکر مال سے گھبرانا اور یہ سمجھنا کہ ایسے ہوا وعظ کے سننے سے مال دینا پڑے گا ایسا ہے جیسے کوئی مسہل سے اس واسطے گھبرائے کہ اس کے پینے سے ہمیشہ دست بہتے رہے گے کبھی بند ہی نہ ہوں گے۔ بتلائیے اگر کوئی مسہل کو ایسا سمجھے اور اس سے ہمیشہ مسہل سے ڈرے تو وہ غلطی پر ہے یا نہیں۔ یقیناً غلطی پر ہے یہی آپ کی حالت ہے۔

طلب منصب

اس پر مجھے کانپور کا ایک واقعہ یاد آیا کہ وہاں کے دن ایک بزرگ آئے۔ اور انہوں نے

درخواست کی کہ جمعہ کی نماز میں پڑھاؤں گا۔ مسجد والوں نے ان کی درخواست

مظہور کر لی۔ اول تو یہی بے قاعدہ کام ہوا کہ طالب کو امامت دی گئی ہوتا تو ان
شریعت کے خلاف ہے۔ اسلام کی تعلیم ہے اور ہم بڑے فخر سے اس کو
نیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

طَالِبُ التَّوَلِيَةِ لَا يُؤْتَى
کہ طالب منصب کو کوئی

منصب نہ دو۔

کوئی قوم اس حکم کی نظیر پیش تو کرے۔ انتشار اللہ اسلام کے سوا کسی مذہب
یہ تعلیم نہ ملے گی۔ آج کل ساری دنیا کے بادشاہوں کو بھی یوں ہی دیکھا جاتا
ہے کہ وہ طلب کرنے والوں ہی کو عہدے دیتے ہیں۔ ہر عہدہ کے لئے
ان کے پاس سینکڑوں درخواستیں پہنچتی رہتی ہیں۔ انہی میں سے کسی ایک کو عہدہ
مل جاتا ہے۔ منجملہ ان مناصب کے ایک منصب مولویوں کے واسطے بھی
دیکھا گیا ہے یعنی شمس العلماء کا۔ خطاب یہ بھی گورنمنٹ خود کسی کو نہیں دیتی بلکہ جو
مخلص کو کشتی کرتا اور بہت سی سفارشات پیش کرتا ہے اور وہ پیر خراج کرتا ہے
اس کو یہ خطاب مل جاتا ہے۔ دنیا میں کیا کیا پلٹ ہوا ہے کہ لوگ اپنے
واسطے خود ہی بلے چوڑے لقب تجویز کرتے ہیں اور حکومت سے درخواست
دیتے ہیں کہ ہم کو یہ لقب دے دو۔ اور حکومت بھی ایسی سخی ہے کہ ان
درخواست سے کرنے والوں ہی کو خطاب دے دیتی ہے۔ کسی کو شمس العلماء کہ
دیا کسی کو بدر العلماء خطاب دے دیا۔

پھر یہ لوگ خطاب ملنے کے بعد قوم کی اصلاح شروع کر دیتے ہیں
مگر ویسی ہی اصلاح جیسے حجام کیا کرتے ہیں۔ وہ تو بالوں کو مونڈتا ہے اول

یہ مسلمانوں کے دین کو موڈنا شروع کرتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ وہ زائد باوجود
کو موڈنا ہے اور یہ اصلی اجڑائے دین کو۔

وجہ یہ کہ جو لوگ خود اپنے لئے القاب کی کوشش کریں گے ان کا دنیا
ہونا تو معلوم۔ ان کی بیافت و قابلیت بھی معلوم۔ جو شخص واقع میں صاحب
کمال ہوتا ہے اس کو ہرگز یہ فکر نہیں ہوتا کہ کوئی مجھے کیا کہتا ہے۔ نہ وہ
اپنے لئے القاب و خطابات تجویز کرتا ہے۔ یہ کام اپنی لوگوں کا ہے۔
کو حقیقی کمال حاصل نہیں۔ مگر ان لمبے چوڑے خطابات سے عوام دھوکا
پڑھتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ نے جب ان کو شمس العلماء کا
خطاب دیا ہے تو یہ بہت ہی بڑا عالم ہوگا۔ وہ ان کی تحقیقات کو علمی اور
شرعی تحقیقات سمجھتے ہیں حالانکہ علم دین اور شریعت سے ان کو مس بھی نہیں
ہوتا۔ غالب حالت اہل خطاب کی یہی ہے۔ شاذ و نادر کوئی ایسا بھی ہوتا
ہے جس کو بدون درخواست کے خطاب مل جاتا ہے اور وہ واقع میں اہل
خطاب کا اہل ہوتا ہے، ورنہ عام حالت یہی ہے کہ یہ خطاب اکثر نااہلوں
کو ملتا ہے اور ان کی درخواست اور کوشش کے بعد ملتا ہے۔
چنانچہ ایک شمس العلماء نے آج کل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری
لکھی ہے جس پر ان کی جماعت کو فخر و ناز ہے اور تو تعلیم یافتہ مسلمان شخص
وجہ سے کہ اس کا مصنف ایک خطاب یافتہ شمس العلماء ہے اس کو بہت شوق
سے دیکھتے اور منگاتے ہیں۔ مگر ان کو خبر نہیں کہ یہ خطاب ایک جاہل
جس میں ناواقفوں کو پھنسا یا جا رہا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

زانکہ صیاد اور وہ بانگ صغیر تاکہ گیر مرغ را آن مرغ گیر
 میں نے اس سوانح عمری کا صرف ایک مقام اتفاقاً دیکھا
مدح میں قدح ہے میں اسی سے مجھ کو مصنف کے دین کا حال معلوم
 ہو گیا اور اسی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سوانح کیسی
 ہو گی۔ عنوان تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کا اختیار کیا ہے اور حضور صلی
 اللہ علیہ وسلم کا تو نام ہی ایسا ہے کہ سنتے ہی ہر مسلمان جان دینے کو تیار ہو جاتا
 ہے مگر مدح نبوی کے عنوان میں مضمون ایسا لکھا گیا ہے جس سے حضور صلی
 اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو سخت ایذا دی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضور
 صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات تھے۔ آپ میں نبوت کے ساتھ سلطنت و
 انتظام کا بھی کامل مادہ تھا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سلطنت کا سلیقہ
 نہ تھا اسی لئے وہ جنگوں میں پھرتے تھے۔ روح علیہ السلام میں ترجمہ کم تھا اسی
 واسطے عرق کی دعا فرمائی۔

صاحبو! کیا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ہے کہ دوسرے انبیاء کی
 تحقیر تو دین کی جا رہی ہے۔ انبیاء علیہم السلام سب بھائی بھائی ہیں اور یقیناً
 ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کی تحقیر کو ارا نہیں کر سکتا۔ خصوصاً وہ بندگان
 بھائی۔ خصوصاً انبیاء علیہم السلام جو کہ نصائیت سے بالکل بیزار ہیں وہ ہرگز اپنی
 ایسی مدح سے خوش نہیں ہو سکتے جس میں ان کے دوسرے بھائی کی تنقیص کی
 گئی ہو۔

رہا یہ کہ ہم کر یہ کیسے معلوم ہوا کیسے کہ غلام مدح میں دوسرے حضرات

کی تنقیص ہے۔ سو اس کا معیار یہ ہے کہ ہر بات میں یہ سوچ لیا کرے کہ اگر اس جلسہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام تشریف فرما ہوں تو کیا ہم اس بات کو سب حضرات کے سامنے کہہ سکتے ہیں۔ اس معیار کے بعد میں کہتا ہوں کہ کیا یہ شخص ایسے مجمع میں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہوں اور نوح علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام بھی ہوں۔ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات ہیں اور نوح علیہ السلام میں نعوذ باللہ رحمہ کا مادہ نہ تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کو سلیقہ تمدن و سلطنت نہ تھا۔ یقیناً ایسے جلسہ میں اس بات کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی۔ پس لامحالہ یہ تنقیص و توہین انبیاء میں داخل ہے۔

کمالات انبیاء | انہوں اس شخص نے محض اس وجہ سے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے زمانہ میں سلطنت کا موقع نہیں ملا یہ نتیجہ نکال لیا کہ ان میں اس کا سلیقہ ہی نہ تھا۔ کیا اس کو یہ معلوم نہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام تمام کمالات کے جامع ہوتے ہیں۔ ان میں ناقص کوئی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض بعض سے اکمل ہیں لیکن ناقص ان میں کوئی نہیں۔ کوئی نبی رحم سے خالی نہیں اور نہ کوئی سلیقہ سلطنت سے خالی ہے۔ ہر ایک میں تمام کمالات حسنہ موجود ہیں۔ لیکن ان کا ظہور حق تعالیٰ کے اذن پر ہے۔ انبیاء علیہم السلام اپنے ارادہ و اختیار کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ میں فنا کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس وقت اللہ تعالیٰ جس کمال کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ اسی کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ اسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

من چو کلکم در میان اصبعین نیستم در صف طاعت میں ہیں

اور

خستہ از احوال دنیا روز و شب بچوں قلم در پنچہ تقلیب رب
 ان کی مثال ایسی ہے جیسے قلم کہ قلم سب کچھ لکھ سکتا ہے مگر کب؟
 جب کہ کوئی دوسرا ہاتھ میں لے کر اس کو چلائے۔ پھر وہ وہی لکھے گا، جو یہ
 شخص لکھنا چاہے گا۔ اگر وہ عربی لکھواتا چاہے تو یہ عربی لکھے گا۔ فارسی لکھواتا
 چاہے تو فارسی لکھے گا۔ اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس قلم سے عربی لکھی گئی
 ہے وہ فارسی نہیں لکھ سکتا یا بالعکس۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہی کہا جائے گا کہ جس کے
 ہاتھ میں قلم تھا اس نے عربی ہی لکھوائی تھی اگر وہ فارسی لکھواتا تو قلم میں اس کی
 بھی قابلیت تھی۔

یوں ہی انبیاء علیہم السلام کو سمجھو کہ ان میں تمام اخلاق حمیدہ و ملکات
 فاضلہ موجود ہیں مگر حق تعالیٰ جس وقت جس ملکہ سے کام لینا چاہتے ہیں اس وقت
 وہ اسی ملکہ سے کام لیتے ہیں۔ اس سے دوسرے ملکات کی نفی پر استدلال
 کرنا اس مورخ کی عقلمندی ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اب تک
 حق تعالیٰ نے انتظام سلطنت کا کام نہیں لیا۔ اس لئے یہ ملکہ ظاہر نہیں ہوا لیکن
 جس وقت وہ آخر زمانہ میں تشریف لائیں گے اور بہت بڑی سلطنت کریں گے
 جس کی مدد و ثنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ اس وقت
 معلوم ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام میں سلطنت کا سلیقہ ایسا ہے کہ کوئی بادشاہت
 بھی ان جیسی نہ ہوگی۔ معلوم ہوا کہ انتظام سلطنت و تمدن کا سلیقہ ان میں اس

وقت بھی بدرجہ اتم موجود تھا مگر ظہور نہیں ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر کرنا نہیں چاہا۔ اخیر زمانہ میں اس کا ظہور ہو جائے گا۔

اگر عیسیٰ علیہ السلام میں اس وقت یہ ملکہ موجود نہیں تھا تو کیا آسمان میں رہ کر یہ سلیقہ حاصل ہو گیا۔ وہاں تو سارے فرشتے نیک ہی ہیں۔ نہ وہاں کوئی مفسد نہ چور نہ کافر نہ مشرک نہ وہاں ٹیکس کی ضرورت ہے نہ فوج کی نہ محصول لینے کی نہ قواعد حرب سکھانے کی۔ ایسی جگہ رہ کر سلطنت کا طریقہ کیونکر آگیا اور اگر کہو کہ حق تعالیٰ نے سکھلا دیا یا فرشتوں نے بتلا دیا تو یہ بات تو ان کو زمین میں رہ کر بھی حاصل تھی۔ کیونکہ وہ بنی الوال اعزم ہیں جن کے پاس جبریل علیہ السلام ہمیشہ آتے رہتے تھے۔ پھر اس موذخ نے ان کو سلیقہ تمدن و سلطنت سے کیوں خالی مانا۔

اب بتلائیے اس سوا نحمری کا پڑھنا اور دیکھنا اور خریدنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ نص میں صاف حکم موجود ہے۔

اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ يَكْفُرُ بِهَا وَيَسْتَهْزِئُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا

مَعَهُمْ حَتّٰى يَخْرُجُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهَا اَنْتُمْ اِذَا مَثَلْتُمْ

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكَٰفِرِيْنَ فِىْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا

جیب کسی محفل میں یا کسی جگہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر انکار ہوتے

ہوئے یا ہنسی مذاق ہوتے ہوتے سنو تو نہ بیٹھو ایسے لوگوں

کے ساتھ یہاں تک کہ کسی دوسری بات میں مشغول ہوں راگر ایسا

نہ کر وگے، تو غم بھی انہی جیسے ہو گے۔ بیشک اللہ تعالیٰ منافقوں

اور کافروں کو دوزخ میں ایک جگہ اکٹھا فرمائے گا۔
 یعنی جب آیات اللہ و احکام الہیہ کے ساتھ کفر و استہزاء ہو رہا ہو
 تو تم وہاں نہ بیٹھو جب تک یہ بیہودہ گفتگو ختم ہو کر دوسری بات شروع نہ ہو
 اگر تم کفر و استہزاء کی باتوں کو سنو گے تو تم بھی اپنی اس کے مثل ہو گے جو کفر و
 استہزاء کے مرتکب ہیں اور یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہے جو ان باتوں کے
 بند کرنے پر قدرت رکھتے ہوں۔ اور جس کو قدرت ہو اس کے لئے یہ حکم
 ہے کہ ان لوگوں کا منہ بند کر دے اور ایسی کتابوں کی اشاعت روک دے
 ان کو ضبط کر کے ضائع کر دے۔ مگر ظاہر ہے کہ ہم کسی کا منہ بند نہیں کر
 سکتے نہ کسی کتاب کو ضبط کر کے ضائع کر سکتے ہیں۔ یہ کام حکومت کا
 ہے۔ واقعی حکومت بھی عجیب چیز ہے۔ ہمارے مولانا کا ارشاد ہے۔

الْوَعظُ يَنْفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحُكْمِ

وَالسِّيْفُ اَبْلَغُ مَوْعِظٍ عَلَى الْقَمِيَمِ

حقیقت میں سیف سب سے بڑا واعظ ہے مگر جب یہ نہیں تو اب
 وہی حکم ہے کہ ایسی باتوں کو سنو ہی نہیں اور جن کتابوں میں ایسی خرافات
 ہوں ان کو دیکھو نہیں نہ خریدو نہ ان کی اشاعت کرو۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل حالت یہ ہے کہ طالبوں کو عہد سے اور
 خطاب دیئے جاتے ہیں۔ اس پر گفتگو طویل ہو گئی اور شریعت کا قانون یہ
 ہے کہ جو شخص عہدہ کا طالب ہو اس کو ہرگز مرتد و و کیونکہ وہ خود غرض
 ہو گا۔ نذ کا پیور کی جامع مسجد میں اول تو یہی کام سب سے قاعدہ ہوا کہ طالب کو

امامت دی گئی مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ بزرگ طالب امامت ہونے کی وجہ سے بزرگ نہ رہے۔ نہیں وہ واقعی بزرگ تھے۔

بزرگوں کی قسمیں | مگر بزرگ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو کامل نائب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ حضرات بھولے نہیں

ہوتے بلکہ ہوشیار ہوتے ہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام سب ہوشیار تھے۔ کوئی نبی بھولے نہیں ہوئے۔ انبیاء علیہم السلام کا عقل انماں ہونا کفار کو بھی مسلم ہے بلکہ وہ ہم سے زیادہ انبیاء کی عقل کے معتقد ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے جو کچھ کار نمایاں ہوئے ہم تو ان کو خدا تعالیٰ کا کیا ہوا سمجھتے ہیں اور مخالف سارا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سمجھتا ہے اور سب کارناموں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل و تدبیر کا نتیجہ بتلاتا ہے۔ تو وہ ہم سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل و دانشمندی کا معتقد ہے۔ ہم تو قرآن کو جو عقول کو حیران کرنے والا کلام ہے اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھتے ہیں اور مخالف اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف بتلاتا ہے۔ تو بتلائیے وہ ہم سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کا معتقد ہے یا نہیں؟

ایک بزرگ وہ ہیں جو مقام نبوت کے وارث نہیں بلکہ مقام ولایت کے وارث ہیں۔ ان میں بعض بھولے ہوتے ہیں بعض محذوب بھی ہوتے ہیں۔ گو وہ بزرگ بھولے تھے۔ انہوں نے سادگی کے طور پر امامت کی درخواست کی تھی۔ تکبر اس کا نشانہ تھا اور گری سخت پڑ رہی تھی اور بزرگ صاحب نے سورہ ق کی تلاوت نماز میں شروع کر دی۔ پھر بعض لوگ تو ایسی روانی سے

پڑھتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دریا بہتا ہوا جاری ہے۔ ایسے شخص کی طویل قرأت بھی گراں نہیں ہوتی بلکہ لذیذ ہوتی ہے مگر بزرگ صاحب نے ایسی تزیین کی کہ لفظ لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ ان لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ بعض کوفے ہو گئی۔ کسی کو چکر آ گیا۔ اور ایک آدمی کا عجیب قصہ یہ ہوا کہ وہ نیا نمازی تھا اس کو بعض لوگ گھیر گھاڑ کر نماز کے لئے لائے تھے۔ جب بزرگ صاحب نے سورہ فاتحہ شروع کی اور کھڑے کھڑے دیر ہو گئی تو وہ نیت توڑ کر یہ کہہ کر چل دیا کہ اسی واسطے تو ہم نماز نہیں پڑھتے۔

تو جیسے یہ نیا نمازی ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ کر سب کو اٹنی پر قیاس کر کے نماز ہی سے ڈر گیا اسی طرح ہمارے بھائی کھال کھسوٹوں کے بیانات چندہ کے متعلق سن کر سب سے ڈر گئے۔ اور اب وہ کسی کی زبان سے انفاق یا کا مضمون سنتا نہیں چاہتے اور واقعی جن واعظوں سے ان کا پالا پڑتا ہے ان کا بیان ہے ہی ڈرنے کے قابل۔ یہ لوگ اس بڑی طرح سے مسلمانوں کے پیچھے پڑتے ہیں کہ سامعین کو خواہ مخواہ ذلیل ہونا پڑتا ہے۔

چنانچہ ایک جلسہ میں ایک مولوی صاحب نے چندہ کے لئے بڑی کوشش اور تقویٰ میں بہت ہی زور لگایا مگر کسی نے کچھ بھی نہ دیا۔ تو مولانا کیا کہتے ہیں کہ افسوس علماء کی قدر زندگی کے برابر بھی نہیں۔ اگر اتنی دیر کوئی زندگی ناپتی گاتی تو اس کے اوپر ہزاروں روپیہ شمار کیا جاتا۔

اے! بھلا غور تو کیجئے۔ کیا یہ مضمون تہذیب سے خارج نہ تھا۔ کیا اس میں اس شخص نے علماء کو اور مسلمانوں کو ذلیل نہیں کیا۔ اب ایسے بیانات سن کر عوام

اگر چندہ کے نام سے نہ ڈریں تو کیا کریں۔ عوام کا کچھ تصور نہیں۔ اس میں زیادہ تصور ایسے مقررہوں کا ہے جو یوں تہذیب سے باہر ہو کر چندہ مانگتے ہیں۔ البتہ عوام کا اتنا تصور ضرور ہے کہ انہوں نے سب علماء کو اپنی کمال کھوٹوں پر قیاس کر لیا اور بعض تو شریعت کے اس حکم اتفاق سے ہی ڈر گئے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے دلوں سے یہ خوف نکالا جائے اور ایک حکم شرعی سے جو ان کو انقباض ہو گیا ہے اس کو نکالا جائے جس کی صورت صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے احکام شرعیہ کے صحیح مطالب بیان کئے جائیں۔

میں لکھتا ہوں کہ اگر احکام شرعیہ اپنی اصلی صورت میں پیش کئے جائیں تو ہرگز کسی مسلمان کو ان سے

تہذیب اتفاق

انقباض نہیں ہو سکتا۔ بھلا جس نبی کی یہ تعلیم ہو۔

اَلَا تَذَكَّرُ مَا لَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ
اَلَا بِطَيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ
کہ کسی مسلمان کا مال بدوین اس کے طیب قلب کے لینا حلال نہیں ہے۔

ان کے احکام سے کسی کو وحشت اور گھبراہٹ کیونکر ہو سکتی ہے اور جس خدا کا یہ ارشاد ہے۔

وَإِنْ تَوَلَّوْاْ يَنْقُصْ أَلْوَابِكُمْ أَجْرَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ

یعنی اگر تم ایمان اور تقویٰ اختیار کرو تو تم کو اجر و ثواب دیا جائیگا

اور اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے مال نہیں مانگیں گے۔

ان کے احکام سے کون منقبض ہو سکتا ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ ہمارے ارشاد

پتے کھولتے ہیں۔

يَسْئَلُكُمْ هَا فِيمَا كُمْ تَبَدَّلُوا
وَيُخَوِّجُ اَصْغَارَكُمْ
ماں مانگنے لگیں پھر اصرار کے ساتھ
تا کہیں تو تم نخل کرنے لگو۔ اور اس وقت اللہ تعالیٰ تمہاری ناگواری
مظاہر کر دے پس اس سے بے فکر رہو۔

اللہ تعالیٰ تم سے تمہارا مال زور ڈال کر نہیں مانگتے اور صدقات واجبہ کی
مقدار اتنی قلیل ہے کہ ان میں ناگواری کا احتمال ہی نہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہے
هَآ اَنْتُمْ هُوَ لَا عَزْدَ عَوْنِكَ لِتَنْفِخُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَنْ
يَبْخُلُ۔

تمہاری تو یہ حالت ہے کہ تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے
لئے بلا یا جاتا ہے سو اس پر بھی بعضے تم میں سے نخل کرتے ہیں
یعنی تم سے لپٹ کر سوال نہیں کیا جاتا۔ صرف ترغیب دی جاتی ہے جس کا نفع
تمہاری ہی طرف عائد ہوتا ہے۔ چنانچہ شریعت نے جسے مصارف میں صرف کی
ترغیب دی ہے ان کے معلوم ہونے کے بعد اس کا یقین ہو جائے گا کہ آخرت
کا نفع تو جباراً دنیا میں بھی ان مواقع میں صرف کرنا نافع ہے۔ پھر بھی بہت لوگ
نخل کرتے ہیں۔ اگے نہایت استغنا سے فرماتے ہیں۔

وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يُبْخِلُ مِنْ
نَفْسِهِ
کہ جو کوئی انفاق فی سبیل اللہ
سے نخل کرتا ہے وہ (درحقیقت)

خود اپنے سے نخل کرتا ہے۔ یعنی اپنے ہی کو نفع دائمی سے

محروم کرتا ہے خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَانْتُمْ الْفُقَرَاءُ
اور اللہ تو کسی کا محتاج نہیں بلکہ تم سب اس کے محتاج ہو۔

پس تمہارے بخل کرنے سے یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ نعوذ باللہ خدا کو کچھ ضرر پہنچے گا بلکہ خود تم کو ہی ضرر پہنچے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جن مواقع میں صرف کی ترغیب دی ہے تمہاری ہی مصلحت کے لئے اور تمہارے ہی نفع کے لئے دی ہے۔

اس میں بخل کرنا ایسا ہے جیسے کسی مریض کو طبیب نسخہ لکھ کر دے اور

کہے کہ یہ چار روپے کا نسخہ ہے۔ چار روپے خرچ کر کے اس کو بنا لو۔ اس پر مریض کہے کہ میں تو چار روپے خرچ نہ کروں گا۔ تو حکیم کہے گا بھائی میرا کیا نقصان ہے۔ اگر تم اس میں بخل کرو گے اپنی ہی جان سے بخل کرو گے۔

غرض اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے مال مانگتے نہیں صرف ترغیب دیتے ہیں۔ وہ بھی ایک قلیل حصہ کی جو زیادہ نہیں پھر وہ ترغیب دے کر تم کو لپیٹتے نہیں بلکہ نہایت استغنا سے فرماتے ہیں کہ جو بخل کرے گا اپنے ہی سے بخل کرے گا۔ اپنے ہی کو دولت ابدیہ سے محروم کرے گا۔

ایک عجیب سوال و جواب

اب یہاں یہ سوال ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے نعمت آخرت کو اتفاق نال

پر ہی کیوں موقوف کیا۔ مفت ہی دے دیتے۔ وہ تو ایسا بھی کر سکتے تھے۔

جواب یہ ہے کہ نہ

پہر کہ ادا زان خریدار زان وہد گوہرے طفلے بقرض ناں وہد
 جو شخص کوئی چیز مفت پالیتا ہے اس کی قدر نہیں ہوتی۔ ہم نے ادا زان
 خروں کی حکایتیں سنی ہیں کہ ایک شخص پچاس روپیہ کی شمال سے دو روپیہ کا جوتنا
 صاف کر رہا تھا۔ کسی نے ملامت کی کہ ایسی قیمتی شمال کی تم نے کیسی بے قدری
 کی۔ کہنے لگا بات یہ ہے کہ جوتنا تو میرا خریدا ہوا ہے اور شمال میرا اثاثہ میں باپ
 کے ترکہ سے ملی ہے۔

ادناں خرپر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک ولایتی سے کسی رئیس نے گھوڑے
 کی قیمت سن کر کہا تھا کہ تم بڑے گراں فروش ہو۔ اس نے بے ساختہ جواب
 دیا کہ تم بڑے ادا زان خر ہو۔ غرض مفت کی چیز کی قدر نہیں ہوتی۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ایک کتاب طبع
 کے لئے عطا فرمائی تھی کہ اس کو چھاپ کر شائع کر دینا۔ پھر فرمایا کہ کسی کو مفت دینا
 دینا کیونکہ مفت کی قدر نہیں ہوتی بلکہ کچھ قیمت رکھ دینا چاہیے دو تین ہی پیسہ ہو
 اسی طرح بے شک حق تعالیٰ قاور ہیں کہ آپ کو مفت ہی سب کچھ نعمتیں دیدیں
 کہ آپ کو نہ مال خرچ کرنا پڑے نہ محنت کرنا پڑے۔ مگر ان قیود میں یہ حکمت
 ہے کہ اس سے نعمت کی قدر ہوتی ہے اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہوں گی۔ یہ
 حکمت تو کھلی ہوئی ہے جس کو ہم جیسے بھی سمجھتے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو
 واللہ حق تعالیٰ تو اب بھی آپ کو مفت ہی سب نعمتیں عطا فرماتے ہیں کیونکہ
 جو نعمتیں انفاق مال کے بعد ملتی ہیں صرف ظاہر میں وہ مفت نہیں معلوم ہوتیں

مگر حقیقت میں مفت ہی ملی ہیں۔ کیونکہ جو مال آپ نے خرچ کیا ہے بتلائیے وہ کہاں سے آیا اور کس نے دیا۔ یقیناً وہ حق تعالیٰ کا مال ہے اور حق تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔

اگر کوئی یہ سمجھے کہ یہ تو میری تدبیر و سلیقہ سے حاصل ہوا ہے۔

تدبیر و نقد پر

اسے جیسا کہ فارون نے کہا تھا۔ قال انما اوتیتہ علی علم عندی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان تدبیروں کو راست کہنے کیا کیونکہ بہت لوگ تم سے زیادہ تدبیریں کرتے ہیں مگر ان کو خاک بھی نہیں ملتا۔ و طالب علم بی سائے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ اساتذہ اور سب طلبا یہ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں سے زید زیادہ لائق ہے اور وہ نمبر اول میں پاس ہوگا مگر نتیجہ امتحان میں اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے کہ زید قیل ہو جاتا اور عمرو جو اس سے کم درجہ میں ہے پاس ہو جاتا ہے۔ بتلائیے عمرو کی تدبیر کو کس نے راست کیا اور زید کو کس نے ناکام کیا۔ اگر تدبیر پر ہی مدار تھا تو زید کو نمبر اول ہونا چاہئے تھا۔ مگر مشاہدہ بار بار اس کے خلاف ہوتا ہے اسی طرح دو شخص تجارت کرتے ہیں جن میں ایک تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہے دوسرا بیوقوف اور جاہل ہے۔ تدبیر کا مقتضایہ تھا کہ تعلیم یافتہ کی تجارت بیوقوف سے زیادہ چلتی مگر مشاہدہ بار بار اس کے خلاف ہوتا ہے کہ جاہل کی تجارت بڑھ جاتی اور ہوشیار تعلیم یافتہ کو نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔

اسی طرح آپ خود کریں گے تو ذرا صحت اور ملازمت وغیرہ تمام امور میں ایسی صدما نظر دیکھیں گے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض تدبیر

کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تدبیر راست بھی ہو جائے اور یہ بات سوا
خدا کے کسی کے قبضہ میں نہیں ورنہ اپنی تدابیر کا راست ہونا کون نہیں سچا ہوتا۔ پھر
سب کے سب مقصود میں کامیاب ہی ہوا کرتے تاکام کوئی نہ رہتا۔ حالانکہ مشاہد
یہ ہے کہ سو تدبیر کرنے والوں میں بیس بیس کامیاب ہوتے ہیں اور نہ زیادہ ناکام
ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ کامیاب ہونے والے اپنی کامیابی کو تدبیر کا ثمرہ سمجھیں،
تو یہ محض ان کی حماقت ہے۔ ان کو سوچنا چاہئے کہ تدبیر وہ لوگ بھی کر رہے
تھے جو ناکام ہوئے۔ پھر اس کی کیا وجہ کہ وہ ناکام ہوئے اور ہم کامیاب ہو گئے
یہ سب گفتگو ان لوگوں کے واسطے ہے جو سائنس کے معتقد ہیں ورنہ مسلمان تو
سب کے سب ہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ محض تدبیر مؤثر نہیں بلکہ تدبیر کے راست
ہونے کے لئے تقدیر کی موافقت کی بھی شرط ہے اور تقدیر مشیت الہیہ ہی کا
نام ہے۔

اہل سائنس ناز کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں جن کی
پہلے لوگوں کو خبر بھی نہ تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر حقیقت میں تم ہی موجد ہو تو بتلاؤ کہ جس
ایجاد کو تم نے ایک سال کے غور و فکر کے بعد ظاہر کیا ہے اس میں ایک سال
کیوں لگا۔ اگر تمہارے قبضہ میں سب کام تھا تو ایک ہی دن میں یہ ایجاد کر لی ہوتی
اور یہی ایک کیا بلکہ جو چیز ایجاد کرنا چاہو ایک دن بلکہ ایک ساعت بلکہ ایک
منٹ میں ایجاد کر لیا کرو۔ کیونکہ سب کام تمہارے قبضہ میں ہے پھر تدبیر کی کیا
وجہ؟ مگر ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کے قبضہ میں نہیں کہ جب چاہے جو کچھ چاہے
ایجاد کر لے بلکہ زمانہ و راز تک غور و فکر کرنے کے بعد ایجاد سمجھ میں آتی ہے اب

بتلاؤ جس وقت بات سمجھ میں آئی ہے وہ تمہارے اختیار سے سمجھ میں آئی ہے یا بلا اختیار خود بخود دل میں آگئی۔ اگر کہو اختیار سے سمجھ میں آئی تو اختیار تو ایک سال پہلے بھی موجود تھا اس وقت کیوں نہ سمجھ لیا یقیناً کہو گے کہ دفعۃً بلا اختیار سمجھ میں آئی ہے میں یہی تقدیر ہے اور حق تعالیٰ ہی کے سمجھانے سے تمہارے ذہن میں یہ ایجاد آئی ہے۔ کیونکہ ان کی عادت ہے کہ جب انسان کسی کام کے لئے کوشش کرتا ہے اور اپنی سعی کوشش صرف کر دیتا ہے تو وہ امداد فرماتے ہیں۔ بہر حال یہ کسی کام نہ نہیں کہ اپنے مال و متاع کو اپنی تدابیر کا نتیجہ اور عقل کا ثمر سمجھے۔ ہر شخص کو عاجز و لاچار ہو کر ماننا پڑے گا۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ اللہ کا دیا ہوا ہے یعنی حق تعالیٰ کا۔ اب فرمائیے اگر آپ خدا کا دیا ہوا مال اللہ کے راستے میں حقوڑا نما صرف کر دیں اور اس کے بعد آپ کو ثواب اور نعمت عظمیٰ عطا کی جائے تو یہ نعمت مفت ملی یا نہیں۔ یقیناً مفت ملی۔

جنت کی کنجی

مگر انسان کی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ اس کی ناتمام تدبیر کے بعد جو کچھ اسے ملتا ہے یہ اس کو اپنا مال سمجھتا ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی مظاہر اس کے جذبہ کی رعایت فرمائی ہے کہ اس کے مال کو اسی کا مال کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم تم سے تمہارے مال نہیں مانگتے ہاں اللہ کے راستے میں جس نے تم کو یہ مال دیا ہے کچھ خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں جس کا نفع تم ہی کو ملے گا۔ مگر انسان کا اس سے بھی دل دکھتا ہے۔ تم چاہتے ہو کہ یہ حکم بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا تاکہ دل بھی نہ دکھتا تو یہ نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہمارا ہی ہے۔ ہم نے ہی تم کو دیا ہے اور

ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ بدون تمہارا مال دکھائے جنت دے دیں مگر ایسا نہ ہوگا۔
 أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يَتْرُكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا
 يُفْتَنُونَ -

کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اتنا کر کے چھوٹ جائیں گے کہ ہم تو ایمان
 لے آئے ہم اور ان کے اعمال کی آزمائش نہ ہوگی۔
 کیا تمہارا امتحان بھی نہ کیا جائے۔ تم کو آزمایا بھی نہ جائے۔ یاد رکھو مال ہمارا ہی
 ہے مگر تم اپنے ہاتھ سے دو بھی جنت ملے گی۔

حضرت غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا
 حق تعالیٰ نے جنت پر فضل تو لگا رکھا ہے مگر فضل کے اندر کبھی بھی موجود ہے۔
 بس ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ کبھی کو گنہا دیں قفل کھل جاوے گا۔ پھر سب نعمتیں
 ہمارے ہی واسطے ہیں یعنی حق تعالیٰ نے جن کاموں پر جنت کو موقوف کیا ہے
 ان کے اسباب بھی سب ہم کو خود ہی عطا فرما دیئے۔ مال خرچ کر سنے پر بعض
 نعمتیں موقوف ہیں تو مال ہم کو خود ہی دیا۔ نماز پڑھنے پر بعض نعمتیں موقوف ہیں تو مانع
 پیر زبان اور ارادہ و اختیار ہم کو عطا کر دیا اور اس کے بعد دل میں داعیہ بھی خود ہی
 پیدا کر دیا۔ بس ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ اس داعیہ کا اتباع کریں مخالفت نہ کریں
 اب بتلا بیٹے میرا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں کہ فضل تو ہے مگر فضل کے اندر کبھی بھی لگ
 رہی ہے۔ صرف گھمانے کی دیر ہے۔ اگر کوئی اتنا بھی نہ کرے تو وہ نہایت
 کام چور ہے۔

مُصِیْبَت و رَاحَت

اس پر مجھے ایک کام چور کی حکایت یاد آئی وہ

ایک بزرگ کے پاس رہتا تھا اور پول چاہتا تھا کہ میرا کام صرف توجہ و تصرف سے بن جائے کچھ کرنا نہ پڑے۔ شیخ نے بہت سمجھایا کہ کچھ کام کر اور تصرف کے بھروسہ پر ہنسنے سے منع فرماتے تھے کہ اس کو یہ وسوسہ ہو گیا کہ شیخ صاحب تصرف نہیں۔ حالانکہ اگر ایسا بھی ہو تو کچھ نقص نہیں۔ مگر چونکہ وہ صاحب تصرف بھی تھے اس لئے انہوں نے اس خطرہ کو دفع کرنا چاہا۔ ایک روز مسجد کے دروازہ پر ایک مشکہ میں پانی بھر کر اور ایک بھکاری لے کر بیٹھ گئے اور راہگیروں پر پانی ڈالنا شروع کیا۔ جس پر پانی پڑتا تھا وہ بے اختیار کلمہ پڑھنے لگتا تھا۔ سینکڑوں کافروں نے کلمہ پڑھ لیا۔ پھر اس مرید کو بلا کر فرمایا کہ تصرف تو اللہ تعالیٰ نے ایسا دیا ہے مگر تجھ کو چکی ہی پسوا کر دوں گا۔ تجھے بدون محنت کے زروں گا۔ تو ابتدا ہی سے کندھے سے جو اڈال کر پہننا چاہتا ہے۔ اسے ٹھوڑا بہت خود بھی تو کچھ کیا ہوتا اس کے بعد ہی شیخ کامل کے کمال پر بھروسہ کرنا یہ کیا کہ شروع ہی سے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گئے۔

تو یاد رکھو جو شخص کچھ ٹھوڑا بہت کام کرتا ہے اس کو تو اللہ تعالیٰ مفت بھی دولت دے دیتے ہیں باقی کام چوروں کو مفت نہیں ملا کرتی۔ *وَالثَّادِرُ مَلْحِقٌ بِالْعَدَمِ*

ایک دفعہ مجھے بھی اس خیال نے ستایا تھا۔ طریق میں سے مجھے ایک الجھن پیش آئی۔ اس وقت خیال ہوا کہ ہم میں طلب بھی ہے گونا نقص بھی اور حق تعالیٰ کو ہماری طلب کا علم بھی ہے۔ اور وہ طلب ناقص کے بھی قدر دان ہیں

اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی کامل ہے اور قدرت بھی کاملہ ہے۔ وہ جلدی بھی طلب کا کام بنا سکتے ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ جلدی سے حاصل نہیں کر دیتے۔ اس خطرہ کا جواب میرے ذہن میں کچھ نہ آیا تو میں نے بسم اللہ کر کے مثنوی کھولی میں اس کا معتقد نہیں کہ مولانا کی روح آتی ہے اور وہ تصرف کرتی ہے بلکہ صرف یہ خیال ہے کہ مثنوی ایک مقبول بندہ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں تسلی کی بات ہم کو بتلا دیتے ہیں۔ چنانچہ بسم اللہ کر کے جو مثنوی کھولی تو یہ اشعار نکلے جو بعینہ میرے سوال کا جواب تھے۔

چارہ می جوید لیے من درد تو

اس میں طلب کو تسلیم کیا گیا ہے۔

می شنیدم دوش آہ سرد تو

اس میں طلب کے علم کا ذکر ہے۔

خی تو انم ہم کہ بے این انتظار رہنایم واد ہم راہ گزار
اس میں قدرت کا بیان ہے کہ تم کو بدون انتظار کے بھی مقصود تک

جلدی ہی پہنچا سکتے ہیں۔

تا زین طوفان و دریاں وارہی بر سر گنج و صالم پاہنی

تاکہ تم پریشانی سے محفوظ رہو اور راحت کے ساتھ پہنچ جاؤ۔ پھر ہم تم

کو انتظار میں کیوں ڈالتے ہیں اور جلدی کیوں نہیں پہنچاتے۔ اس کی وجہ سنو۔

لیک شیرینی و لذت مقرر ہست بر اندازہ رنج سفر

انگہ از فرزند و خویشاں بر خوری کہ عزیز ہی رنج و محنت مابری

کہ منزل پر پہنچ کر لذت اور شہوتی اپنی فرارگاہ کی اسی قدر حاصل ہوتی ہے جتنی سفر میں تکلیف پیش آتی ہے۔ جس کو سفر میں جتنی مشقت ہوگی۔ منزل پر پہنچ کر اتنی ہی راحت ہوگی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ہے

ہر کہ اوارزاں خروارزاں دید گوہرے طغیے بقرص ناں دید

جواب کا حاصل یہ تھا کہ سارے مفدمات تو تمہارے ذہن میں آگئے مگر یہ مقدمہ ذہن میں نہ آیا کہ اللہ تعالیٰ حکیم بھی ہیں۔ حکمت کا مقتضایہ ہی ہے کہ انسان کے بعد دولت دی جائے جلدی نہ دی جائے تاکہ مصیبت کے بعد راحت کی قدر ہو۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ہم بارات میں کیرا نہ گئے تھے۔ راستہ میں لوٹتے ہوئے بادش زور سے ہونے لگی۔ تمام جنگل پانی سے بھر گیا۔ رات ہو گئی۔ سخت پریشانی ہوئی۔ بس اس وقت یہ شعر ہماری حالت کا ترجمان تھا

شب تاریک و بیم موج گریہاں ہے جنیں حائل
کجا داند حال ماسک ساران ساحل ما

اور یہ حالت ہے۔

اَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ
اَمَّا بَعْضُهُمْ فِيْ اِذَا نَهَمُ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ط وَاللّٰهُ
مُحِيْطٌ بِمَا كٰفَرُوْا ط يٰۤاَكْفٰرِيْنَ ط يٰۤاَكْفٰرِيْنَ ط يٰۤاَكْفٰرِيْنَ ط يٰۤاَكْفٰرِيْنَ ط
اَضٰءٌ لَّهُمْ مَمَشُوْا فِيْهِ وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قٰمُوْا

مگر بہت دور نہ تھا۔ صرف چار پانچ کوس رہ گیا تھا مگر اس مصیبت کی

وہ سے وہ چارہ کوس طے ہونا مشکل ہو گئے۔ اس کے بعد خدا خدا کر کے جب گھر پہنچے تو گھر پر پہنچنے کی لذت مجھے اب تک یاد ہے کہ اس وقت کیسی راحت اور چین حاصل ہوئی تھی۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

ہنگامہ از فرزند و خویشاں بر خوری کز غریبی رنج و محنت ما بری
تو جس کو سلوک میں جتنی زیادہ پریشانی ہوگی اتنی ہی وصول کے بعد اس کو راحت ہوگی اور اس نعمت کی بڑی قدر کرے گا۔ اسی طرح جس کو دنیا میں زیادہ کلفت ہوگی۔ آخرت میں اتنی ہی راحت اور جنت کی قدر ہوگی۔

میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ سے عرض کیا کہ حضرت جب سارے جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے اور جنت پھر بھی خالی رہے گی اور حق تعالیٰ سے وہ عرض کرے گی کہ مجھے بھر بیٹھے کیونکہ آپ نے مجھے بھرنے کا وعدہ فرمایا تھا تو حق تعالیٰ جنت کو بھرنے کے لئے اسی وقت ایک نئی مخلوق کو پیدا فرمائیں گے تو یہ نئے لوگ بہت اچھے ہوں گے کہ ان کو مفت جنت مل گئی۔ فرمایا کیا اچھے ہوں گے ان کو جنت سے خاک بھی لذت نہ ہوگی۔ وہ تو سمجھیں گے کہ زندہ ہو کر یوں ہی چین ہونا ہوگا جیسا جنت میں ہو رہا ہے۔ اچھے انشاء اللہ تعالیٰ ہم ہوں گے کہ جنت میں دنیا کی تکالیف جھیل کر پہنچیں گے۔ ہم کو جنت کی نعمتوں سے زیادہ حنط آئے گا کہ وہاں قدم رکھنے ہی بے ساختہ زبان سے نکلے گا۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ
الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُنَاقِمَةِ مِن فَضْلِهِ لَآ يَمَسُّنَا فِيهَا نُصَبٌ

وَلَا يَمَسُّنَّهَا لُغُوبٌ -

ذہبِ ہم کو مجاہدہ اور طاعات دنیویہ کی وجہ سے قرب حق اور معرفت حق
ان سے زیادہ ہوگی۔ آپس جن لوگوں کو دنیا میں زیادہ سامان عیش نہیں دیا گیا وہ
پریشان نہ ہوں بلکہ خوش ہوں کہ ان کو امرائے زیادہ جنت میں راحت
ہوگی۔

زیادت مال کے اثرات

دوسرے یہ کہ زیادہ سامان تم کو دے
دیا جاتا تو تم دنیا ہی کے پورے ہتھے

خدا کی یاد سے غافل ہو جاتے۔ آج کل مسلمانوں کی رال ٹپکتی ہے دوسری قوموں
کے سامان عیش کو دیکھ کر مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ خیر اور سلامتی اسی میں ہے کہ ان
کو دنیا زیادہ نہ ملے۔ اگر ہم کو زیادہ مال دیا جاتا تو رات دن دنیا ہی کی فکر میں
رہتے۔ آخرت سے بالکل غافل ہو جاتے۔

کانپور میں دو شخص شب قدر میں ایک بڑا سادھیلہ رومال سے ٹھک
کر بیٹھے اور رات بھر دعا کرتے رہے کہ اے اللہ اس کو سونا بنا دے۔ وعظ
میں کسی مولوی سے من گئے تھے کہ شب قدر میں دعا قبول ہوتی ہے۔ وہ ظالم
یہ دعا کرنے بیٹھے۔ صبح کو خوشی خوشی جو رومال کھولا تو وہ ڈھیلہ کا ڈھیلہ ہی تھا۔
بڑے حیران ہوئے کہ شب قدر میں دعا کیوں قبول نہ ہوئی۔ ایک درزی نے
کہا کہ اللہ میاں حکیم ہیں۔ وہی دعا قبول فرماتے ہیں جو بندہ کے لئے مصلحت ہو
خدا کا شکر کرو کہ یہ سونا نہ بنا ورنہ تم آپس ہی میں مرگٹ جاتے۔

واقعی سچ کہا بعض لوگوں کے لئے یہی حکمت ہے کہ ان کو سامان عیش

زیادہ نہ دیا جائے۔

اس پر شاید ان کو یہ شبہ ہو کہ ہماری نیت تو یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ ہم کو سامان زیادہ دیں تو خوب نیک کام کریں اور اللہ کے راستہ میں خوب خرچ کریں، تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ تم کو کیا خبر ہے کہ اس وقت جو ارادے اور نیتیں ہیں زیادہ مال ملنے کے بعد بھی باقی رہیں گی یا نہیں۔ اس کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

حضرات صحابہ سے بڑھ کر خوش نیت کون ہوگا مگر حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ سے فرمایا کہ تمہاری کیا حالت ہوگی جب میرے بعد مالک و بلا و مفتوح ہوں گے اور تمہارے پاس کثرت سے مال و متاع اور غلام و خادم ہوں گے۔ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ہم اللہ کی عبادت کے لئے فارغ ہو جائیں گے۔ تَتَقَرَّبُ غُ بِلْعِبَادَةِ وَبِكَفَى الْمُؤْنَةَ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں تمہاری یہی حالت اچھی ہے جو آج کل ہے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے لئے زیادت مال کو پسند نہیں کیا حالانکہ ان حضرات نے واقعی زیادہ سامان ہونے پر عبادات میں پہلے سے زیادہ ترقی کی اور دنیا میں منہمک نہیں ہوئے پھر ہمارے لئے کثرت مال کیونکر مفید ہو سکتی ہے۔ بس مسلمانوں کو دوسری قوموں کی حالت دیکھ کر رال نہ ٹپکانا چاہئے۔ اُولَئِكَ عَجِلْتُ لَهُمْ طَيِّبًا تَهَيَّمُ فِي حَيَاتِهِمْ اَللّٰهُمَّ اِنِّكَ كُوَسْرِب رَاحَتِ يٰمَنْ رَسَدِي كُوِي۔ اور مسلمانوں کے واسطے راحت جنت میں ہے

بہن مسلمان کو اتنی دنیا حاصل کرنا چاہیے کہ پیٹ بھر کے روٹی مل جائے اور
متر عورت کے لئے کپڑا اور رہنے کو مختصر مکان اور اتنا بجز اللہ اکثر مسلمانوں
کو آج کل حاصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو صحابہ کو اتنا
کھنی سامان میسر نہ تھا۔ ہم لوگ تو اس زمانہ کے اعتبار سے آج کل بادشاہ ہیں
کیونکہ حدیث میں ہے۔

أَقْبَبَ مَعَانِي فِي جَسَدِي إِهْنَانِي سُرِّيهِ عِنْدَهُ قُوَّتُ يَوْمِهِ
فَكَأَنَّمَا حَبِزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذِّ أَقْبِيوَهَا۔

کہ جو شخص اس حال میں صبح کیے کہ بدن میں صحت ہو اور نفس میں
بے فکری۔ ایک دن کا کھانا پاس ہو اس کو تمام دنیا مل گئی۔

جب صحت و اطمینان کے ساتھ ایک دن کا کھانا گھوٹا موجود ہو، تو
یوں سمجھو کہ تمام دنیا گھوٹا آگئی۔ اگلے دن کی فکری نہ کرو۔ ج
مترس ازہ بلائے کہ شب درمیانست

جس مصیبت کے درمیان میں رات سائل ہو اس سے اندیشہ نہ کرو جب
کل ہوگی ویکھا جائے گا۔ کیا خبر کل کو تم بھی ہو گے یا نہیں۔ ایک بزرگ امی کو
فرماتے ہیں۔

چوں نراتانے و خرقانے بود ہر آن موئے تو ملباسانے بود

غرض حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ بعض لوگوں کو غریب رکھتے ہیں۔ اس

کو کیا خبر کہ امیر ہونے کے بعد وہ کیسا ہوتا۔ ایسے شخص کو ثواب دینے کے
لئے اللہ تعالیٰ نیت صالحہ عطا فرما دیتے ہیں۔ اس کے لئے یہ نیت ہی رہتا

عالیہ حاصل کرنے کے لئے کافی ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو یوں خرچ کرتا
حق تعالیٰ کے یہاں عجیب و دربار ہے۔ وہاں کچھ اتفاق ہی پر مدار نہیں، غریب
کے حق میں نیت اتفاق بھی بمنزلہ اتفاق کے ہے۔ خود نفس میں ارشاد ہے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَّبِعُهَا أَزًى
وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ۔

نرم جواب دینا اور رگزر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے
دینے کے پیچھے ستانا ہو اور اللہ تعالیٰ مستغنی اور عقل والا ہے۔

پس جس کے پاس مال نہ ہو وہ حال اور قال سے ثواب حاصل کرے۔

لَا خَيْرَ عِنْدَكَ تَهْدِيهَا وَلَا مَالٌ

فَلْيَسْعِدِ النَّاطِقَ إِنْ لَمْ يَسْعِدِ الْمَالُ

اور جس کو خدا نے مال دیا ہو وہ اپنی وسعت کے موافق خرچ کر کے خدا

تعالیٰ کو راضی کرے۔

اس میں واعظین و علماء بھی داخل ہیں ان کو بھی خرچ کرنا
چاہئے۔ اگر زیادہ نہیں کر سکتے تو کچھ تو کریں۔ علماء کا

علماء کی کوتاہی

اکثر طبقہ اس میں بہت کوتاہی کرتا ہے۔ سارا امر بالمعروف اپنی ہی بچت کے

واسطے ان کو سو جھٹتا ہے۔ خود خرچ کرنا بہت کم جانتے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ

کہ اپنے بھائی کی روٹی بچوائیں اور اپنے پاس سے خرچ کریں اور جب کسی

کام کے لئے چندہ کی تحریک کریں تو سب سے پہلے خود بھی چندہ دیا کریں

یہ صورت اچھی نہیں کہ دوسروں ہی کو ترغیب دی جائے اور اپنے گھر سے

کچھ نہ نکالا جائے۔ اس صورت میں اثر بھی نہیں ہوتا اور لوگ متوحش ہونے
 ہیں۔ اگر تم بھی تخریح کیا کرو تو لوگوں کو وحشت نہ ہوگی۔ اب تو لوگ یہ سمجھتے
 ہیں کہ چندہ کے سارے وعظ کا حاصل یہ ہے کہ مولوی اپنی بچت کرنا چاہتے
 ہیں اور دوسروں سے وصول کرنا چاہتے ہیں۔ اگر علماء یہ کہیں کہ ہمارے پاس
 کہاں ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ کے مدرسہ میں جو مزدور و آنہ مہینہ دیتا ہے
 تم اس سے کم نہیں ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم دو آنے بھی نہ دو۔

ماموں رشید کے پاس ایک شخص سوال کرنے آیا۔ ماموں نے کہا کہ
 ہٹے کئے مضبوط آدمی کو سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا کہ
 میں ماموں رشید کے پاس فتویٰ لینے نہیں آیا۔ فتویٰ دینے والے بہت
 ہیں۔ میں آپ کو بادشاہ سمجھ کر آیا ہوں۔ اگر دینا ہو تو دے دو ورنہ صاف
 جواب دے دو۔ ماموں رشید نے اس کو بہت سا روپیہ دیا۔ اس کے
 اخلاق بہت اچھے تھے۔ رعایا کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا تھا جیسا ماموں
 بھانجہ کے ساتھ کرتا ہے مگر عقائد اچھے نہ تھے۔

میرا مقصود اس حکایت سے یہ ہے کہ جب امر بالمعروف سے
 اپنی بچت مقصود ہو تو اس کا اثر نہیں ہوا کرتا۔ پس علماء کو خود بھی تخریح کرنا
 چاہئے تاکہ عوام کا یہ خیال دور ہو جائے کہ مولوی اپنی بچت کے لئے
 ہم سے چندے وصول کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ چندہ میں استغناء کے ساتھ تخریب کرنا چاہئے۔ لگنا
 پٹنا نہیں چاہئے۔ صاف کہہ دو وَلَا اسْتغْنَاؤْ عَلَیْہِمْ اَجْرًا۔ جیسا کہ انبیاء

علیہم السلام کا طریقہ تھا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَمْ كَسَبْتُمْ مَخْرَجًا فَوَجَّحَ رَبُّكُمْ حَيْرًا وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ

کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے جو کفار اعراض

کرتے ہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ آپ ان سے چندہ مانگتے ہیں

تو ایہ وجہ تو ہرگز نہیں، کیونکہ خدا کی عطا سب سے بہتر ہے اور

وہ سب سے بڑھ کر روزی دینے والا ہے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار سے چندہ مانگنے کی کیا ضرورت

ہے، اس سے معلوم ہوا کہ چندہ مانگنا مخاطبین کی وحشت کا سبب ہوتا ہے

پس تم لگ بپٹ کہ ہرگز تحریک نہ کرو۔ ہاں استغناء کے ساتھ ترغیب دو۔

جیسا قرآن وحدیث میں ترغیب دی گئی ہے۔ پس صاحبو! شریعت کے حکم

انفاق سے آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ آپ سے کوئی مانگتا نہیں ہے۔ ہاں خرچ

کرنے کا طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ اگر نیک کام میں اپنے نفع کے لئے خرچ

کرنا چاہو تو اس کی یہ صورت ہے۔ آگے تمہیں اختیار ہے اور یہ بھی محض تمہاری

مصلحت کے واسطے طریقہ بتلایا گیا ہے۔

اور نہ خدا تعالیٰ کو اپنے دین کی حفاظت

کے واسطے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔

حفاظت دین کا انتظام

وَإِنْ تَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ فَوْمًا غَيْرَ كُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا

أَمْثَالَكُمْ۔

اگر تم (دین کے واسطے خرچ کرنے سے) روگردانی کرو گے تو

اللہ تعالیٰ ایک دوسری قوم کو پیدا کر دین گئے جو تمہاری طرح
بخیل نہ ہوگی۔

بلکہ جان و مال سے خدا کے دین پر قربان ہوگی۔ دیکھئے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کے زمانہ سے اب تک یہ دین محفوظ چلا آ رہا ہے۔ کیا آپ کے ہی
مان گاڑی چل رہی ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ یہی قاعدہ چلا آ رہا ہے کہ جس قوم نے
دین کی خدمت سے پہلو تھی کیا اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ دوسری قوم پیدا کر دی
صاحبو! مجھے اس کی شکایت نہیں کہ مسلمان چندہ نہیں دیتے یا کم دیتے ہیں،
بلکہ اصل شکایت یہ ہے کہ دین پر توجہ نہیں۔ آپ چاہے کچھ بھی خرچ نہ کریں
لیکن اپنی حالت کی اصلاح کر کے دین پر توجہ کریں اور توجہ کا طریقہ یہ ہے
کہ قلوب کو یکجا کریں۔ سب مل کر دین کی حفاظت کا اہتمام کریں۔ اجتماع میں
برکت اور طاقت ہے۔

دو دل یک شونہ لٹکت کوہ را

جب توجہ کر دو گے تو احکام دین پر عمل بھی کر دو گے۔ پھر عمل کے لئے
جن چیزوں کی ضرورت ہوگی ان کا بھی سامان ہو جائے گا۔ ہم کو دوسری
قوموں کی تقلید کی ضرورت نہیں کہ جس طرح وہ ترقی کر رہی ہیں اسی طرح ہم
بھی ترقی کریں۔ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ مسلمان جو کئے ہیں۔ ان کے گھر
میں ترقی کے ذرائع موجود نہیں دوسروں سے مانگتے پھرتے ہیں۔ صاحبو! ہم کو
واللہ اپنے گھر کی دولت کی خبر نہیں اس لئے ہماری یہ حالت ہے۔
یک سبد پر نمان ترا بر فرق سر۔ تو بھی جوئی لب نمان در بدر۔

تاریخ زانوی میان نعر آب و عطش و زجور گشتنی خراب
 ہمارے گھر میں ترقی کے وہ ذرائع موجود ہیں جن کے سامنے تمام عالم
 گردن جھکا چکا ہے۔ پھر ہم دوسروں سے بھیک کیوں مانگیں اور وہ ذریعہ ہی ہے
 کہ اجتماعی حالت کے ساتھ سب اپنے دین پر توجہ کریں۔ اور دین کی پابندی
 کریں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب مولوی بن جاؤ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دین
 سے باخبر بن جاؤ۔ کچھ ٹوٹے ٹکڑے باخبر بنیں اور باقی لوگ علماء کی صحبت
 اختیار کریں اور ان سے مل کر دین کے احکام معلوم کریں۔ مگر صحبت انی علماء کی
 اختیار کرو جن کے یہاں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ زیادہ رہتا
 ہو نہ کہ دنیا کا۔ اور اس کے منتظر نہ رہو کہ علماء خود تمہارے گھر آکر وعظ کیا کریں
 بلکہ تم خود ان سے جا کر ملو اور دین کی باتیں دریافت کرو۔ اس طرح کر کے
 دیکھو۔ انشاء اللہ تم کو ترقی حاصل ہو جائے گی اور غیر قوموں کے طریقہ پر چلنے
 کی تم کو کچھ ضرورت نہیں بلکہ اسی سادگی کے طریقہ پر چلو جو اسلام نے ہم کو
 سکھایا ہے۔

سادی اور عزت | حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شام سے لشکر
 اسلام نے ایک عرضداشت بھیجی تھی کہ بیت

المقدس فتح نہیں ہوتا اور وہاں کا پادری یہ کہتا ہے کہ فاتح بیت المقدس کا علیہ
 ہماری کتاب میں موجود ہے۔ تم اپنے خلیفہ کو بلا لو ہم دیکھیں گے۔ اگر ان کا
 وہی علیہ ہوا جو اس کتاب میں ہے تو ہم بارون لڑائی کے قلعہ کھول دیں گے
 ورنہ تم قیامت تک فتح نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ امیر المؤمنین

یہاں تشریف لے آئیں۔ شاید یہ قلعہ بدون لڑائی کے فتح ہو جائے۔ امیر المومنین نے اس درخواست پر سفر کا ارادہ فرمایا۔ اب غور فرمائیے کہ یہ ایک ایسے شخص کا دورہ تھا جس کے نام سے کسری و ہرقل بھی مخراتے تھے مگر حالت یہ تھی کہ جس قبیل میں آپ نے سفر کیا ہے اس میں چند در چند بیوند تھے اور سواری کے لئے صرف ایک اونٹ تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ جس پر کبھی آپ سوار ہوتے کبھی آپ کا غلام۔ آج کل ادنیٰ سے ادنیٰ ڈپٹی کے دورہ میں بڑا سامان ہوتا ہے۔ یہاں خلیفہ اعظم کے دورہ میں کچھ بھی سامان نہ تھا۔ پھر آج کل ادنیٰ حاکم کے دورہ میں رعایا پر لیشان ہو جاتی ہے۔ کیونکہ رعایا کو ان کے دورہ کے لئے صدکا سامان کرنا پڑتا ہے۔ یہاں خلیفہ کے دورہ سے ایک متنفس کو بھی تکلیف نہیں ہوتی کیونکہ ہر شخص کے ساتھ ایک تھیلے میں سنتو اور ایک تھیلے میں چھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ منزل پر اتار کر سنتو گھول کر پی لئے اور چھوڑے کھائے۔ نہ رعایا سے مرغے لئے نہ انڈے نہ دو دھلیا نہ گھی۔

جب آپ اس شان سے کبھی سوار اور کبھی پیدل چلتے ہوئے شام کے قریب پہنچے تو لشکر اسلام نے استقبال کرنا چاہا۔ آپ نے ممانعت کر دی۔ خاص خاص حضرات نے آپ کا استقبال کیا۔ اس وقت بعض صحابہ نے کہا کہ امیر المومنین اس وقت آپ دشمن کے ملک میں ہیں اور وہ لوگ آپ کو دیکھیں گے۔ اس لئے مناسب ہے کہ اپنا یہ قبیل اتار کر دوسرا قبیلہ عمارہ ساہن پیٹے اور اونٹ کی سواری چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔

تاکہ ان کی نظر میں عزت ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔
 نَحْنُ قَوْمٌ نَعُوذُ بِاللَّهِ بِإِسْلَامِمْ کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے
 اسلام سے عزت دی ہے۔

ہماری عزت قیمتی لباس سے نہیں ہے بلکہ خدا کی اطاعت سے عزت
 ہے مگر صحابہ کے اصرار سے ان کا دل خوش کرنے کے لئے درخواست منظور
 کر لی۔ چنانچہ ایک عمدہ قمیض لایا گیا جس کو پہن کر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے
 دو چار ہی قدم چلے تھے کہ فوراً گھوڑے سے اتر پڑے اور فرمایا کہ میرے
 دوستوں! تم نے تو اپنے بھائی عمر کو ہلاک ہی کرنا چاہا تھا۔ واللہ! میں دیکھتا ہوں
 کہ اس لباس اور اس سواری سے میرا دل بگڑنے لگا ہے۔ تم میرا وہی پیوند لگا
 قمیض اور اونٹ لے آؤ۔ میں اسی لباس میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر چلوں گا
 اے صاحبو! جب ایسے شخص کا دل قیمتی لباس سے بگڑتا ہے تو کیا
 ہمارا دل اور ہمارا منہ نہ بگڑے گا۔ پھر ہم اپنے قلب کی نگہداشت سے لنتہ
 خافل کیوں ہیں اور ہم کو کس چیز نے مٹھن کر دیا ہے کہ ہمارے لئے کوئی لباس
 مضر نہیں۔ اودیہ جو حضرت عمر نے فرمایا تھا کہ نَحْنُ قَوْمٌ نَعُوذُ بِاللَّهِ بِالْحَقِّ بَاتِ
 ہے کہ اگر ہم خدا کے مطیع و فرمانبردار ہیں تو ہم سادہ لباس میں بھی معزز ہیں
 ورنہ قیمتی لباس سے بھی کچھ عزت نہیں ہو سکتی ہے۔

ز عشقنا تمام ما جمالی بار مستغنی ست

بآب رنگ و خال و خط چہ حاجت دہ و زنی بار

خوبصورت چہرہ کو زیب و زینت کی حاجت نہیں وہ تو ہر لباس میں

حسین ہے۔ بناوٹ کی اختیاج اس کو ہے جس کو قدرتی حسن نصیب نہ ہو چنانچہ
 حضرت عمرؓ اپنا وہی لباس پہن کر چلے اور اونٹ ہی پر سوار ہوئے اور اسی
 لباس اور اسی سواری پر آپ کو دیکھ کر نصاریٰ نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا
 کیونکہ جب آپ فصیل شہر کے قریب پہنچے اور نصاریٰ کو اطلاع ہوئی کہ
 خلیفہ اسلام تشریف لے آئے تو ان کا بڑا پادری فصیل پر آیا اور کتاب
 کھول کر حضرت عمرؓ کے حلیہ کو ان اوصاف سے ملائے لگا جو کتاب میں
 لکھے ہوئے تھے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ حضرت عمرؓ ایسے لباس اور
 ایسی سواری پر تشریف لائیں گے۔ اس معمولی لباس ہی میں آپ کی عزت
 مخفی تھی۔

کہ آپ چشمہ جیواں درون تاریکی ست

اگر آپ قیمتی لباس میں آتے تو پیشین گوئی پوری نہ ہوتی۔ چنانچہ پادری
 نے جب سارے اوصاف کتاب کے موافق دیکھ لئے تو وہ چیخ مار کر
 گر پڑا اور کہا جلدی سے قلعہ کھول دو۔ زبدا یہی وہ شخص ہے جس کا لقب
 توراہ میں سدید ہے، یہی فاتح بیت المقدس ہے۔ غم اس کا مقابلہ نہیں
 کر سکتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بدون جنگ و جدال کے بیت المقدس
 کو فتح کر دیا۔ تو صاحبو! ہمیں تکلیف اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ ہماری
 عزت تو سادگی ہی میں ہے۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج
 مراد آبادی اسی زمانہ میں ایک بزرگ

سادگی کی جینڈ مٹھالیں

ہوتے ہیں۔ آپ سے لفٹنگ گورنر نے ملنے کی اجازت چاہی۔ یہاں سے اجازت ہو گئی۔ اس وقت تو آپ یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ لفٹنگ گورنر کے واسطے سونے کی کرسی ہم کہاں سے لائیں گے۔ خدام نے عرض کیا کہ اس کی حاجت نہیں وہ چوبی کرسی پر بیٹھ سکتے ہیں۔ چونکہ لفٹنگ گورنر اس وقت مہمان ہو کر آ رہے تھے اور مہمان کی مدارات اس کے مذاق کے موافق ہوتی ہے۔ اس لئے یہ خیال ہوا مگر یہ سارے منصوبے پہلے ہی پہلے تھے وقت پر کچھ بھی اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ آپ کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ لفٹنگ گورنر کس دن آئیں گے۔ چنانچہ جب دن آیا اور لفٹنگ گورنر حضرت کی خانقاہ میں پہنچے تو وہاں کوئی تکلف نہ تھا۔ سب معمولی سامان تھا۔ بعد ملاقات لفٹنگ گورنر نے کہا کہ حضرت ہمیں کچھ نصیحت و وصیت فرمائیں۔ ارشاد فرمایا یا ظلم کبھی نہ کرنا۔ پھر اس نے درخواست کی کہ ہم کو کچھ تبرک عطا فرمایا جائے۔ فرمایا میرے پاس کیا رکھا ہے۔ پھر خدام سے فرمایا کہ اسے دیکھنا مٹھائی کی ہنڈیا میں کچھ ہوا تو ان کو دے دے۔ یہ مانگ رہے ہیں۔ چنانچہ ہنڈیا میں سے مٹھائی کا چورا تھوڑا تھوڑا سب کو دیا گیا۔ جس کو سب نے نہایت ادب سے لیا اور بڑے خوش خوش واپس ہوئے۔

تو دیکھئے کہ مولانا کو اول تو اس زمانہ کے لحاظ سے کچھ تکلف کا خیال ہونا بھی تھا مگر آخر میں یہ سب منصوبے مٹ گئے اور وہی اسلامی ساوگی رہ گئی اور اسی میں ان کی عظمت و عزت ظاہر ہوئی۔

نہ کچھ شوخی جلی باد صبا کی بگڑنے میں بھی زلف ان کی بنا کی

غرض ہم کو اسلامی لباس کی پر رہنا چاہیے۔ اگر کسی مہمان کی خاطر سے کچھ تکلف بھی کیا جائے تو اس میں بھی اعتدال اسلامی کا لحاظ ضروری ہے۔ مبالغہ نہ کیا جائے۔ اسی میں ہماری عزت ہے مگر آج کل مسلمان تعلیم یورپ میں اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ ان کا لباس، ان کا طرز معاشرت، ان کا طریقہ تمدن و تجارت اختیار کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی اس میں عزت نہیں ہے۔

ایک بار میں بریگی میں تھا۔ بھائی سے جنت نے کہا کہ ہم آپ کے بھائی سے ملنا چاہتے ہیں۔ بھائی نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا ہم خود تو حکام سے نہیں ملتے لیکن جب وہ خود ملنا چاہتے ہیں تو اعراض کرنا مناسب بھی نہیں ہے۔ آخر وہ حاکم ہیں۔ ہم کو حق حکومت کا لحاظ ضروری ہے۔ میں سیولنگ بھائی نے میرے واسطے قیمتی لباس کا اہتمام کرنا چاہا۔ میں نے کہا ہرگز نہیں جس لباس میں میں یہاں آیا ہوں اسی میں جاؤں گا۔ پٹا نیچے میں اچکن اور کتہ میں ان سے ملنے گیا۔ وہ شاید غسل کر رہے تھے۔ ہم کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ عصر کی نماز کا وقت آگیا اور میں نے اور بھائی نے ان کے بنگلہ ہی پر نماز پڑھی۔ پھر وہ آکر ملے اور مجھ کو اپنی خاص کرسی پر بٹھلایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے اصرار بھی کیا مگر نہیں مانے۔ پھر نہایت احترام کے ساتھ باتیں کیں اور حضورؐ کی تصویر میں رخصت ہو کر آگئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں ان کی بیوی لباس میں اس سے ملتا تو وہ عزت ہرگز نہ ہوتی جو اسلامی لباس میں ہوتی ہے۔ کلکتہ میں مولوی عبد الجبار صاحب والسر سے ملے اور جو غہ میں

کیا اور عامہ باندھ کر ملے۔ دوسرے روٹیاں انگریزی لباس میں لگے تھے تو واٹر سے
نے ان سے کہا کہ مولوی صاحب آپ اس لباس میں شہزادہ معلوم ہوتے ہیں
یہ لباس بڑی راحت کا ہے اور ہمارا لباس بہت تکلیف دہ ہے مگر ہم اپنی ترقی
وضع سے مجبور ہیں۔ ہم کو آپ کے لباس پر بہت رشک آتا ہے۔

غرض ہم کو شریعت نے جو تعلیم دی ہے اس پر چلنا چاہئے۔ پس ہر چکا
خاتمہ۔ ہم کو دوسروں کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس میں اپنی ہی ذلت ہے
گویا زبان حال سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے گھر میں ترقی کے اسباب ذرا
موجود نہیں ہیں۔

تعلیم شریعت کا اتباع یوں ہی ہو سکتا ہے کہ علماء
طلب و اتباع کا اتباع کیا جائے مگر ایسے علماء کا ہونا آپ کے

متبع نہ ہوں۔ یعنی وہ آپ کے مذاق کا اتباع نہ کریں بلکہ آپ سے اپنے مذاق
کا اتباع کریں۔ کیونکہ جو طبیب مرلین کے مذاق کا اتباع کرے گا، وہ اسے
ہلاک کرے گا۔ طبیب وہ ہے جو مرلین سے اپنے مذاق کا اتباع کرے۔
آج کل بعض علماء تو طالب جاہ و مال ہیں۔ ان کو تو علماء کہنا ہی غلط ہے کیونکہ
علم کتاب پڑھنے کا نام نہیں بلکہ علم دوسری چیز ہے۔

شاید ان نینت کہ موٹے و میا نے وارو

بندہ طلعت اہل باش کہ آنے وارو

ایسے ہی مولویوں نے عوام کو چنہ کے نام سے متوجس کیا ہے جنہوں
نے صرف کتابی علم حاصل کیا ہے اور حقیقی علم یعنی دین کی روح حاصل نہیں کی۔

اور بعض علماء محقق ہیں صاحب علم ہیں اور طالب آخرت۔ وہ دنیا کے طالب نہیں مگر محقق ہیں۔ خوش اخلاق بہت ہیں۔ وہ اکثر دوسروں کے مذاق کا اتباع کرتے ہیں جس میں نیت صرف دوسروں کی دینی مصلحت ہوتی ہے مگر ان سے اپنے مذاق کا اتباع نہیں کرتے۔ ان سے مخلوق کو نفع عام تو ہوتا ہے مگر نام نہیں ہوتا۔ اور بعض متعارف معنی کہ خوش اخلاق نہیں بلکہ کم فہول میں بد اخلاق مشہور ہیں کیونکہ وہ مریض کی رائے اور مذاق کا اتباع نہیں کرتے بلکہ مریضوں کو اپنی رائے اور اپنے مذاق پر چلاتے ہیں۔ ان سے نفع عام تو نہیں ہوتا کیونکہ لوگ ان سے گھبراتے ہیں مگر نفع تمام ضرور ہوتا ہے کہ جو ان کے مذاق کا اتباع کرتا ہے اس کی اصلاح پوری ہو جاتی ہے کہ پھر وہ کسی کے قابو میں نہیں آسکتا۔ یہ لوگ محقق ہیں اور محقق سے طالب کے مذاق کا اتباع نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تو طبیب کی خیانت ہے کہ مریض میں ایک مرض دیکھ رہا ہے اور خوش اخلاقی کی وجہ سے اس کو مرض پر مطلع نہیں کرتا کہ یہ ناراض ہو جائے گا اگر وہ کسے ناراض ہونے آیا ہے تو پھر علاج اور طلب صحت کا نام کیوں لیتا ہے۔ وہ ہمان بن کر آئے پھر ہم اس کے لئے سونے کی کرسی تک کی فکر کریں گے۔ جیسے شاہ فضل الرحمن صاحب نے کی تھی۔ گو وقت پر یاد نہ آئے غرض ہم ہمان کے مذاق کا اتباع کرنے کو تیار ہیں۔ کوئی صرف ہمان بن کر دیکھے۔ انشاء اللہ ہم بھی خوش اخلاق بن کر دکھلا دیں گے۔ باقی مریض اور طالب علاج کے مذاق کا اتباع ہم سے نہیں ہو سکتا۔ یہ گفتگو درمیان میں آگئی تھی۔

بے جا گھبراہٹ

میں یہ کہہ رہا تھا کہ لوگوں کو استغناء کے ساتھ
ترغیب دینا چاہیے۔ لگ بپٹ کر چندہ نہ

مانگنا چاہئے جس سے دوسروں کو علماء پر احتیاج کا شبہ ہو۔ کیونکہ یہ طریقہ
شریعت کے خلاف ہے۔ یہاں تو یہ حالت ہے کہ

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو
دار و گیر و صاحبے درباں دریں درگاہ نیست

بلکہ یہ طریقہ شرافت کے بھی خلاف ہے۔ شریف آدمی کو احتیاج بھی
ہو جب بھی وہ لگ بپٹ کر سوال نہیں کرتا۔ چنانچہ ایسے ہی فقراء کی شان قرآن
میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا
فِي الْأَرْضِ يَحْسِبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ الْقَعْقَبَةِ تَعْرِفُهُمْ
بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِعْثَافًا

ہم نے عرب میں مسلمانوں کی یہ حالت دیکھی ہے کہ جہاں ان سے
کسی نے اللہ اکبر کہہ دیا تو فوراً اللہ کریم کہتے ہوئے چل ویٹے۔ اس لفظ کے
سننے کے بعد دوبارہ ہرگز نہیں مانگتے۔ اب اگر کسی کو دینا ہو تو خود دوڑ کر
انہیں دے دے وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ اور جو لوگ سر ہو جاتے ہیں وہ
اکثر ہندوستان کی نسل ہیں عرب نہیں ہیں۔ مگر وہاں رہ کر صورت عربوں کی سی بنا
لی ہے۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جن کو عربی بولنا بھی نہیں آتی۔

چنانچہ ایک عرب مجھ سے ملے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ عرب میں

آپ کتنے دنوں سے ہیں تو بولے۔

ثالث پیر طحی فی المدینہ کہ مدینہ میں تین پیر حیاں گیز

چکے ہیں۔

میں نے دل میں کہا کہ تیرے پیروں میں تو پیریاں ڈالنا چاہئیں اگر تیری
ایک پشت بھی عرب میں گیزتی تو پیر طحی کا لفظ تیری زبان سے قیامت تک
نہ نکلتا۔ ایسے لوگ عرب ہر گز نہیں بلکہ ہندوستان و بنگال کی نسل ہیں۔ ورنہ جو
خالص عرب ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ اول تو وہ مدینہ سے نکلتا ہی نہیں جانتے
ان کو مکہ مدینہ سے ایسی محبت ہے کہ اس کے باہر ان کو چین ہی نہیں مل سکتا
چنانچہ ایک بادو کے لڑکے کو بعض حاجیوں نے ہندوستان ساتھ لانا چاہا اور
اس کے سامنے ہندوستان کی سرسبزی اور لذاتی کا خوب تذکرہ کیا۔ وہ سب
اوصاف سن کر کہنے لگا کہ ہندوستان میں کعبہ بھی ہے؟ کہا نہیں کعبہ تو وہاں نہیں
تو وہ صاف کہتا ہے کہ پھر ہندوستان میں کچھ بھی نہیں، جب وہاں کعبہ نہیں مائے
خوب کہا ہے

ومن ویدائی حب الایار لاهلہا

وللناس فیما یعشوقون مذاہب

مولانا نے قنوی میں ایک عاشق و معشوق کی گفتگو نقل فرمائی ہے۔ اس
بادو کے لڑکے کا جواب بالکل اسی جواب کے موافق ہے جو مولانا نے عاشق
کی طرف سے بیان فرمایا ہے۔

گفت معشوقے بعاشقائے قنایہ۔ تو بہ غربت دیدہ بس شہزادہ

پس کداحی شہر زانہا خوشترست گفت آن شہرے کہ درے دلبرست

ہر کجا دلبر بود خرم نشین فوق گردول نرت نے قعرزین

ہر کجا یوسف رُخے باشت چو ماہ

جنت بست اُل گرچہ باشت قعرچاہ

واقعی اہل عرب کی نظر میں جہاں کعبہ نہیں وہاں کچھ بھی نہیں۔ تو یہ لوگ اول

تو باہر کم جاتے ہیں اور کبھی جاتے ہیں تو بہت جلد واپس ہو جاتے ہیں اور جو

لوگ برسوں ہندوستان کا دورہ لگاتے رہتے ہیں ان میں خاص عرب کم ہیں۔ زیادہ

تو یہ ہیں کہ لوگ ہیں جو عبا قبا پہن کر عرب بن گئے ہیں۔ اسی لئے ان میں عربوں

کی سی غیرت نہیں کہ سوال میں الحاح و لجاج کرتے ہیں۔

ہمارے ساتھ حج میں ایک عالم پٹنہ ولے تھے۔ انہوں نے وہاں پٹنہ

ہی کا کام کیا تھا۔ وہ یہ کہ جعفر آفندی یا ثنا کے مترجم۔ اصل میں ہندی تھے

اہل ہند سے محبت کرتے تھے۔ ایک دفعہ حرم میں ان مولوی صاحب کا سامنا

ہو گیا۔ مصافحہ کیا۔ مولوی صاحب سمجھے کہ کوئی سائل ہے۔ بہت خشک لہجہ میں

پوچھا کچھ کہنا ہے۔ جعفر آفندی میں ظرافت بہت تھی۔ کہنے لگے حضور بھوکا ہوں

کچھ دسے دیجئے۔ وہ مولوی صاحب بڑے غصہ سے بولے تم کو شرم نہیں آتی

ایسا عبا چغہ پن کر سوال کرتے ہو اس کو بیچ کہ نہیں خریدا کیا جاتا۔ جعفر نے کہا،

حضور اگر معمولی لباس میں ہم سوال کریں گے تو آپ پیسہ دو پیسہ پر تال دیں گے

اور اس لباس میں دیکھ کر کم از کم دو تین روپے تو دیں گے۔ مولوی صاحب اس

جواب سے اور بھی جھٹلائے اور بڑبڑ کر تے چل دیئے۔ دوسرے وقت وہ

مولوی صاحب خرم میں میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ جعفر آفندی سامنے سے آئے۔ میں ان کی تعظیم کو اٹھا۔ وہ پتھر والے مولوی صاحب بڑے حیران ہوئے کہ یہ تو کوئی سائل نہیں معلوم ہوتا کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جعفر آفندی نے بیٹھے کہ باتیں کریں اور یہ بھی کہا کہ آپ تو میری تعظیم کرتے ہیں اور یہ مولوی صاحب ہم سے بے رنجی کرتے ہیں۔ مولوی صاحب ایسے ناوم ہوئے کہ سر نہ اٹھا سکے۔ کہا صاحب معاف فرمائیے گا میں معذور ہوں۔ میں نے کتاب میں دیکھا تھا کہ مکہ میں قیمتی عبا تھا ولے سوال کرتے ہیں۔ اور اس کا مشاہدہ بھی میں نے کیا ہے۔ اس لئے مجھے آپ پر بھی یہی شبہ ہوا۔ جعفر آفندی نے کہا کہ آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ یہ حالت، عمامے والوں کی ہے یا نر کی ٹوپی والوں کی کہنے لگے کہ ہاں صاحب جتنے سائل میں نے دیکھے وہ سب عمامے ہی والے تھے جعفر آفندی نے کہا پھر آپ نے مجھے ان پر کیوں قیاس کیا۔ میں تو نر کی ٹوپی پہن رہا تھا۔

چندہ کی تحریک

صاحبو! جیسے وہ پتھر والے مولوی صاحب عمامے اور عبا والوں کی صورت سے گھبراتے تھے ایسے

ہی آج کل مسلمان مولویوں کی صورت سے گھبراتے ہیں کہ بس اب چندہ کا سوال ہوگا۔ حالانکہ علماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں۔ وارثان رسول سے مسلمانوں کو وحشت ہونا سخت مضر ہے۔ اس کی اصلاح ضروری ہے۔ جس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ علماء چندہ کی تحریک نہ کیا کریں۔ اور بعد اللہ جو لوگ حضور کے پیچھے وارث ہیں وہ اس سے خود ہی بچتے ہیں۔ بس صحیح طریقہ

یہ ہے کہ استغناء کے ساتھ لوگوں کو ترغیب عام دی جائے۔ چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے۔ پھر انشاء اللہ وحشت نہ ہوگی۔

ایک بات اور قابل اہتمام ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ چندہ کا وعدہ کریں پھر کسی وجہ سے وہ چندہ نہ بھیجیں تو ان کے پاس تقاضے کے خطوط نہ بھیجے جائیں۔ نہ کچھ عرصہ کے بعد ان کے نام فہرست خارج کر دگان میں شائع کئے جائیں۔ اس سے بھی لوگوں کو وحشت ہوتی ہے۔

یہ تو تمہید تھی مگر تمہید بہت طویل ہو گئی۔ اب میں آیت کا بیان شروع کرتا ہوں۔

اس آیت کے نزول کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ

آیت منلوہ کا شان نزول

تبوک میں تشریف لے گئے تھے اور بجز معذورین کے سب کو ساتھ چلنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مگر کچھ لوگ غزوہ میں نہیں گئے۔ مدینہ ہی میں رہ گئے۔ جن میں زیادہ تر تو منافقین تھے اور دو چار مخلصین بھی تھے۔ آپ کی واپسی پر منافقین نے تو آکر جھوٹے بہانے کر دیئے کہ ہم کو فلاں عذر مانع تھا۔ یہ سبب پیش آ گیا تھا مگر مخلصین نے اپنی خطا کا صاف صاف اقرار کر لیا کہ یا رسول اللہ ہم کو کوئی عذر مانع نہ تھا۔ محض کاہلی اور کسستی سے پیچھے رہ گئے۔ حضور نے منافقین کا عذر سن کر ان کو تو معذورین میں داخل کر کے رخصت فرما دیا۔ اور ان مخلصین سے فرمایا کہ تمہارا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ خواہ معاف فرماویں یا سزا تجویز کر دیں چنانچہ پچاس روز تک سب مسلمانوں کو ان سے قطع تعلق کا حکم دیا گیا کہ کوئی

ان سے بات چیت اور سلام و کلام نہ کرے۔ پچاس دن کے بعد ان کی توبہ نازل ہوئی تو یہ حضرات خوش خوش حضور کے پاس آئے اور تشریح قبول توبہ میں اپنا مال حضور کے پاس لائے کہ اس کو کادخیر میں صرف فرما دیا جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا مال قبول کرنے میں سوچ ہوئی۔ آپ نے فوراً نہیں لیا کیونکہ آپ کو کیا خبر کہ ان کی حالت کیسی ہے۔ اس وقت محض جوش بر وے رہے ہیں کہ بعد کو پچھتائیں گے یا اخلاص قلب سے دے رہے ہیں تو حق تعالیٰ ان مخلصین کی سفارش فرماتے ہیں کہ ان کے اموال سے صدقہ وصول فرمایا جائے۔ یہ لوگ مخلص ہیں۔

جیسا کہ بعض دفعہ ہمارے سامنے کوئی شخص بہت زیادہ رقم لاتا ہے اور اس کے لینے سے رکاوٹ ہوتی ہے کہ شاید یہ اپنی وسعت سے زائد رقم رکھا ہو۔ تو احباب سفارش کرتے ہیں کہ یہ تو بڑی آمدنی والے ہیں مگر سادہ لباس پہنتے ہیں۔ اس لئے یہ رقم ان کی حیثیت سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ کانپور میں ایک شخص میرے پاس ساٹھ روپے لائے اور مجھے ان کے لینے سے تامل ہوا۔ پھر بعض لوگوں نے بیان کیا کہ ان کی آمدنی تو کبھی سو روپے ماہوار کی ہے جب میں نے قبول کیا۔ اور ان سے کہا کہ ذرا اپنی صورت ایسی بناؤ جس سے معلوم ہو کہ خدا نے تم کو کتنا دیا ہے۔ حدیث میں یہی حکم ہے۔

لِيُرَآئُوا التَّعْمَةَ عَلَيْهِ
 تاکہ نعمت کا اثر تم پر معلوم ہو
 تو ایسے ہی یہاں اللہ تعالیٰ سفارش فرماتے ہیں کہ یہ لوگ مخلص ہیں ان کا صدقہ

منظور کر لیا جائے اور اصلاحی کاموں میں لگا دیا جائے۔

اور عَنْ اَمْرِ الْوَالِدِ فِي ظَاهِرِ يَدِ يَسَّ كَمَا مِنْ تَبْعِيضِيهِ هِيَ۔ گواہتوں میں یہ بھی ہے کہ بیان یہ ہو تو من تبعضیہ کے اعتبار سے مطلب یہ ہے کہ ان کے اموال کا کوئی جزو قبول کر لیا جائے۔ جس سے معلوم ہوا کہ کل مال نہ لیا جائے۔ کیونکہ یہ ہر شخص کی حالت کے مناسب نہیں۔ صدیق اکبرؑ کی اور ثمانؑ ہے وہ تو عاشق تھے۔ ان کی سخاوت تو جان دینا ہے۔ پھر ان کا کل مال لینے سے کیا انکار ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

مال و اول خود بخائے صادق سستہ جان اول خود بخائے عاشق دست

لیکن ہر شخص کی یہ نشان نہیں اس لئے من تبعضیہ سے جزو مال لینے کا امر کیا گیا مگر جزو مال عام ہے۔ اگر تلبسین سے لیا جائے جب بھی جزو صادق ہے اور ایک لاکھ میں ایک سو روپیہ لے لیا جائے تو اس پر بھی جزو مال صادق ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا مقتضایہ تھا کہ آپ جزو اقل پر کفایت فرماتے کیونکہ آپ کو دوسرے سے اسی میں تیز د تھا کہ لوں یا نہ لوں۔ اب حق تعالیٰ کی سفارش کے بعد لینے کا خیال تو ہوا مگر جزو قلیل کی طرف توجہ فرمائی گئی ہو گا کہ ٹھوڑا سا لے لیا جائے لیکن اس سے روپینے والے کا جی بھلا نہ ہوتا۔ تو حق تعالیٰ اشارہ اس کا معیار بیان فرماتے ہیں کہ کس قدر لینا چاہئے اور یہاں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ انبیاء علیہم السلام کسی کا ہر حصہ اس وجہ سے قبول فرماتے ہیں تاکہ دوسرے کا دل خوش ہو جائے کیونکہ واپس کرنے سے اس کی دل شکنی ہوتی ہے اور یہی نشان اہل اللہ کی ہے کہ لوگ سر ہو کر ان کو دیتے ہیں۔ ناک رکھتے

ہیں جب وہ ہدیہ قبول فرماتے ہیں۔

اس پر مجھے اپنے ایک بھتیجے کی بات یاد آئی۔ جب وہ چھوٹا سا تھا تو شوقی کرتا پھرتا تھا۔ میں نے اُسے بلا یا کہ آؤ باتیں کہیں۔ چنانچہ وہ آیا اور میں نے اُس سے پوچھا کہ تبتلا و عربی اچھی ہے یا انگریزی۔ کہنے لگا کہ عربی۔ میں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگا کہ قرآن عربی میں ہے میں نے کہا ٹھیک لیکن عربی پڑھ کر کھامیکا کہاں سے؟ کہنے لگا بات یہ ہے کہ جب آدمی عربی پڑھتا ہے تو وہ اللہ کا ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دل میں ڈالتا ہے کہ اس کو دو۔ وہ دیتے ہیں۔ میں نے کہا یہ سچ ہے مگر اس کو ذلت سمجھتے ہیں کہنے لگا ذلت کی کیا بات ہے۔ یہ خود تو کسی سے نہیں مانگتا۔ لوگ خوشامد کر کے خود دیتے ہیں۔ مجھے اس کی عقل پر حیرت ہوئی کہ ذرا سی عمر میں اُس نے حقیقت کو خوب سمجھا۔

میں نے یہ واقعہ بھائی سے بیان کیا اور کہا کہ اس بچے کو تو خواہ مخواہ تم نے انگریزی میں ڈالا۔ اس کو عربی پڑھانی ہوتی۔ وہ بھی بہت ذہین ہیں۔ کہنے لگے کہ جب اس کی طبیعت میں عربی سے مناسبت اور شوق ہے تو اس کو تو یہ خود بھی حاصل کر لے گا۔ مجھے تو وہی تعلیم دینا چاہئے جس سے اس کو مناسبت نہیں اور ہے ضرورت کی چیز تاکہ میرے اثر سے اس کو حاصل کر کے دنیا میں راحت سے رہے۔ پھر دین کا علم تو یہ اپنی مناسبت کی وجہ سے خود حاصل کر لے گا۔ میں نے کہا کہ یہ مناسبت جو اس وقت ہے وہ انگریزی پڑھنے سے زائل ہو جائے گی۔ پھر یہ محض دنیا کارہ جائے گا۔ اور جو ہر اس میں اس وقت

ہے برباد ہو جائے گا۔

غرض میرا مطلب یہ ہے کہ شریعت تو اس چیز کو قبول کرتی ہے جس کی یہ حالت ہو کہ واپس کرنے میں دینے والوں کی دشمنی ہو اور وہ خود اصرار کریں کہ ہمارے مال کا معتد بہ حصہ لے لو اور اگر ہم حقوق اس لئے لیں تو اس سے ان کا جی خوش نہ ہو بلکہ زیادہ لینے کے لئے خوشامد کریں۔ تو ایسے چیز میں کوئی حرج نہیں۔

یہ سب بیان مقصود سے پہلے ہی کا ہے۔ ابھی میں نے مقصود عرض نہیں کیا مقصود آگے سے۔ یہ تو تمہید تھی جس میں میں نے بتلا دیا کہ علماء مسلمانوں سے مال نہیں مانگتے بلکہ محض ترغیب دیتے ہیں۔ آگے آپ کو اختیار ہے چاہے دو یا نہ دو اور جو لوگ ترغیب سے آگے بڑھتے ہیں وہ شرعی حدود سے تجاوز کرتے ہیں۔ پس ان کے فعل کی بنا پر مسلمانوں کو حکم شرعی سے متوجس نہ ہونا چاہئے۔ خیر یہ گھائی تو پار ہو گئی۔

اب مقصود سنئے۔ اس وقت میرا مقصود

اس آیت کے اس جزو کو بیان کرنا ہے

طہارت ظاہری و باطنی

صَدَقَةٌ تَطْهَرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا۔ جس میں حضور کو ارشاد ہے کہ صدقہ اتنا لیا جائے اور ایسا ہونا چاہئے کہ جس سے آپ ان کو پاک کریں اور طہارت کریں۔ بہا میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ تُزَكِّيهِمْ کے متعلق ہو تَطْهَرُهُمْ کے متعلق نہ ہو۔ اس صورت میں تَطْهَرُهُمْ میں خطاب نہ ہوگا بلکہ یہ صیغہ فاعل کا ہے جو صدقہ کی صفت ہے کہ وہ صدقہ ایسا ہو کہ گناہوں سے

پاک کرنے والا ہوا اور آپ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کا تزکیہ فرمائیں اس صورت میں اولاً صدقہ کی صفت مذکور ہوئی۔ پھر حضور کا فعل مذکور ہوا کہ آپ جو مسلمانوں کے صدقات قبول کر لیتے ہیں تو نہ اپنی مصلحت کے لئے بلکہ مسلمانوں کے تزکیہ کے لئے۔ اور ظاہر ہے کہ تزکیہ اسی کا ہو سکتا ہے جو خود بھی طالب تزکیہ ہو۔ تو اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو شخص صدقہ سے طالب تزکیہ نہ ہو اس کا صدقہ قبول نہ کیا جائے۔

ایک احتمال یہ ہے کہ بہا دونوں کے متعلق ہو تپھر ہر کے بھی اور تزکیہم کے بھی اور یہی میرے نزدیک ظاہر ہے کہ دونوں صیغے خطا کے ہیں اور بہا دونوں کے متعلق ہے۔ اس میں تناسب و تناسب کلام بھی باقی رہے گا۔ بہر حال اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ پاک صاف ہونا کوئی ضروری چیز ہے۔ دوسرے یہ کہ مال خرچ کرنے کو پاکی میں دخل ہے۔

اب آج کل عام مذاق یہ ہے کہ لوگ پاک ہونا ہی نہیں چاہتے نہ اس کا قصد کرتے ہیں نہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ و قلیل ما ہم۔ اس پریشانی کوئی یہ کہے کہ ہم کو استنجا کرنا تو آتا ہے ہم تو روز غسل کرتے ہیں۔ پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ہم پاک ہونا نہیں چاہتے۔

تو صاف جواب میں آپ نے اسی پاکی کو سیکھا ہے اور اسی پر کفایت کی ہے کہ بدن کو دھویا ماستنجا اور مستعین ہو گئے اس کے سوا اور کوئی پاکی آپ کو معلوم ہی نہیں۔ اس لئے اس کا قصد کیونکر کریں۔ سو اس پاکی کا یہاں ذکر نہیں

جس کو آپ پاکی سمجھتے ہیں بلکہ یہاں وہ پاکی مراد ہے جس میں صدقہ کو بھی بڑا دخل ہے۔ ورنہ کیا معاذ اللہ آپ یہ کہیں گے کہ حضرات صحابہ کو استنجا کرنا اور نہانا دھونا نہیں آتا تھا۔ حضرت یہ وہ پاکی ہے جو سات سمندروں کے پانی سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی اور مظاہری تا پاکی اس کو ذرا بھی ضرر نہیں پہنچاتی۔

رامپور کے ایک قاری صاحب کی ہیں نے حکایت سنی ہے کہ ان کو حج کا اشتیاق ہوا لیکن روپیہ پاس نہ تھا کہیں سے ان کو سوار روپیہ مل گیا تھا۔ ان میں سے چار آنے کا ایک تختیہ منگوا یا اور ایک روپیہ کے چنے بھنوا کر ان میں بھر لئے اور پیادہ پا چل پڑے۔ راستہ میں کہیں کسی نے دعوت کر دی

اور دل نے منظور کیا تو دعوت قبول فرمائی ورنہ چنے چاب کر پانی پی لیا اور آگے چل پڑے۔ اسی طرح کئی مہینے میں پہنچے۔ جب جدہ کو جہاز جانے لگا

تو قاری صاحب جہاز پر پہنچے اور کپتان سے کہا کہ اگر جہاز میں کوئی لوگری خالی ہو تو میں لوگری چاہتا ہوں۔ کپتان نے کہا کہ لوگری تو ہے مگر آپ کے مناسب نہیں کیونکہ اس نے صورت سے دیکھا کہ ایک شریف بزرگ انسان ہے

اس کے لئے کوئی پاکیزہ کام چاہئے۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ آپ مناسب وغیر مناسب کو نہ دیکھئے اگر کوئی ملازمت خالی ہو مجھے دے دیجئے۔ کپتان

نے کہا ایک بھنگی کی ملازمت خالی ہے مگر آپ اس کو نہیں کر سکتے کیونکہ قوت کا کام ہے اور آپ ضعیف و نحیف آدمی ہیں۔ فرمایا تم اس کی فکر نہ

کیو میں سب کام کر لوں گا۔ اس نے امتحان کے طور پر کہا کہ اچھا یہ بورا پڑا ہے ان کو تو اٹھاؤ۔ وہ بورا اڑھائی تین من کا تھا جس کو قوی مزدور بھی نہ اٹھا سکتا تھا

قاری صاحب نے اس کو ہاتھ لگایا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یہاں تک تو میرا کام تھا آگے آپ کا کام ہے میری مدد فرمائیے۔ دعا کر کے جو بسم اللہ کر کے اٹھایا ہے تو سر سے اوپر لے گئے اور نہایت سہولت سے دوسری جگہ رکھ دیا۔ کپتان نے کہا شاباس! تم واقعی یہ کام کر لو گے اور آپ کا نام لکھ لیا۔ دو غریب مسلمان شائق حج اور کھڑے تھے۔ انہوں نے بھی کپتان سے ملازمت کی درخواست کی۔ کپتان نے کہا کہ یہی ملازمت خالی ہے۔ اگر تم کہتا سچا ہو تم بھی آ جاؤ۔ اس کام کو سن کر سب رک گئے کہ یہ تو ہم سے نہ ہو گا۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ اللہ کے بندو! محبوب کے دربار میں جانے کے لئے رشتہ موجود ہے اور تم محض اس کام کی وجہ سے رکتے ہو۔ چلو تم نام لکھوا لو میں تمہارا کام بھی کر دیا کروں گا۔ چنانچہ ان کا نام بھی لکھوا دیا اور خود سب کے کام کا ذمہ لیا۔ اب جہاز میں دن بھر آپ بھنگی کا کام کرتے اور نماز کے وقت نہاد صو کہ پاک کپڑے پہن کر نماز پڑھتے اور رات کو تہجد میں قرآن پڑھتے۔ ہائے کیسے عجیب لوگ تھے۔

ایں چنین شیخے گداٹے کو بکو عشق آنند لا ابالی فائقوا
ایک اور شاعر کہتا ہے۔

عشق را نازم کہ یوسف را بازار آورد
ہجو صنعا ز اہدے لہ ازیر ز نار آورد

ایک رات قاری صاحب تہجد میں قرآن پڑھ رہے تھے۔ قرآن بہت اچھا پڑھتے تھے کہ کپتان ان کے پاس سے گزرا۔ اس کو ان کا قرآن

پڑھنا پسند آیا۔ گھڑا ہو گیا۔ جب نماز سے سلام پھیرا تو پوچھا کہ تم کیا پڑھتا ہے۔ کہا یہ خدا کا کلام ہے۔ کہا ہم کو بھی سکھلا دو۔ فرمایا کہ ہاں مگر ایک شرط ہے کہ پہلے غسل کر دو۔ پھر ایک کلمہ پڑھو۔ اس کے بعد قرآن سکھلائیں گے۔ چونکہ اُسے قرآن کا شوق ہو گیا تھا، اُس نے غسل بھی کیا اور کلمہ بھی پڑھا۔ الحمد اور قل ہو اللہ سبھی اور شوق میں چلتے پھرتے اُن کو پڑھنا تھا دوسرے انگریزوں نے جو اُس کو قرآن پڑھنے سنا، کہا یہ تم کیا پڑھتے ہو؟ کہا ہمارے بھنگی نے ہم کو سکھایا ہے۔ ہم قرآن پڑھتے ہیں۔ انگریزوں نے کہا کہ تم تو مسلمان ہو گیا۔ کہا نہیں ہم مسلمان نہیں ہوا۔ انگریزوں نے کہا نہیں تم مسلمان ہو گیا۔ تو وہ دوڑا ہوا قاری صاحب کے پاس آیا کہ کیا ہم مسلمان ہو گیا۔ قاری صاحب نے کہا کیا آج ہوئے تم تو کئی روز سے مسلمان ہو چکے ہو۔ اُس کو یہ سن کر اول تو کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ پھر کہنے لگا اگر اس کے پڑھنے سے آدمی مسلمان ہو جاتا ہے تو ہم مسلمان ہی رہیں گے لیکن اس کلام کو نہ چھوڑینگے اس کے بعد اپنی میم سے کہا کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں، اگر تم ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو تم بھی مسلمان ہو جاؤ ورنہ تم بھی ہم سے الگ ہو جاؤ۔ میم نے اسلام قبول نہ کیا۔ اُس نے اس کو الگ کر دیا۔ پھر جب جاہ آگیا تو قاری صاحب کے ساتھ وہ بھی جہاز کی ملازمت سے استعفا دے کر مکہ چلا گیا اور حج ادا کیا۔

تو حضرت یہ وہ پاکی ہے جو پاخانہ اٹھانے سے زائل نہیں ہوتی ہاں اس میں زائل باطنی سے ضرور کمی آجاتی ہے۔

اہل اللہ کی اصلاح

اس پر اس وقت حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب
والد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا ایک

واقعہ یاد آیا۔ مقصود تو یہی واقعہ ہے مگر اس سے پہلے ایک اور واقعہ ان
ہی کا بیان کرتا ہوں۔ کیونکہ اس کا واقعہ مقصودہ سے تعلق ہے۔

وہ تہیدی واقعہ یہ ہے کہ ایک بار بادشاہ وہلی نے آپ کو بلایا اور

یہ حضرات سلاطین کی توہین نہ کرتے تھے بلکہ ان کے حقوق حاکمانہ کی رعایت

فرماتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ کے بلاسنے پر آپ چلے اور قمیٹی لباس پہن کر

چلے۔ راستہ میں ایک کتے کا بچہ ایک گندی تالی میں سردی سے سکر رہا ہوا پڑا

دیکھا۔ اول سخاوم سے فرمایا اس کو باہر نکالے۔ وہ ذرا منتقبض سا ہوا۔ آپ

سے نہ رٹا گیا۔ فوراً اپنے ہاتھ سے نکالا اور حمام و ماں قریب تھا و ماں لے

جا کر اس کو گرم پانی سے غسل دیا۔ اس کو گرمی پہنچی تو وہ حرکت کرنے لگا۔

پھر اس حملہ کے آدمیوں سے فرمایا کہ اگر تم اس کی خبر گیری کا وعدہ کر لو تو میں

اس کو یہاں چھوڑ دوں ورنہ اپنے ہاتھ لے جاؤں۔ کسی نے ذمہ لے لیا تب

آپ اس کے حوالے کر کے دربار شاہی میں تشریف لے گئے۔

اس واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ مقصودہ یہ ہوا کہ ایک دن آپ جنگل میں

بٹیا کے راستہ سے جاز ہے تھے۔ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بٹیا کے دونوں

طرف پانی اور کیچر تھا۔ صرف بٹیا کا راستہ خشک تھا کہ سامنے سے ایک کتا

اسی بٹیا پر آگیا۔ بٹیا اتنی تلی تھی کہ شاہ صاحب کتے سے بچ کر نہ نکل سکتے تھے

بلکہ دونوں میں سے ایک کو پانی کیچر میں اتارنا پڑتا تھا۔ اب شاہ صاحب ٹھہر گئے

اور کتابھی سامنے کھڑا ہو گیا۔ شاہ صاحب نے اس سے فرمایا کہ بھائی تم کیچڑ میں
 اترو۔ کہا کیوں میں ہی کیوں اتروں؟ کیا تم اپنے کو مجھ سے افضل سمجھتے ہو۔ فرمایا
 نہیں! صرف اس لئے تم سے اترنے کو کہہ رہا ہوں کہ میں مکلف ہوں۔ تمہارے
 وغیرہ پڑھنا ہوں کیچڑ میں میرے کیچڑے خراب ہو جائیں گے۔ تو غیر مکلف ہے
 پانی سے نکل کر سوکھ جائے گا۔ تیرا کچھ خرچ نہ ہوگا۔ کتے نے جواب دیا کہ ہاں
 میرا اترنے سے کوئی حرج نہیں لیکن یہ سمجھ لو کہ اگر تم اترے تو صرف کیچڑ سے ناپاک
 ہوں گے جو ایک لٹا پانی سے پاک ہو جاویں گے۔ لیکن میں اتر گیا اور تمہارے
 دل میں وسوسہ آ گیا کہ میں اس کتے سے افضل ہوں تو تمہارا دل اتنا ناپاک ہو
 جائے گا کہ سات سمندر دل سے بھی اس کی نجاست زائل نہ ہوگی۔ اب تم
 کو اختیار ہے جس شوق کو چاہو اختیار کر لو۔ بس یہ سن کر شاہ صاحب نے کیچڑ سے
 سنبھالے اور بسم اللہ کر کے خود ہی کیچڑ میں اتر گئے اور کتابتیا کے راستے
 سے چلا گیا۔

اس کے بعد شاہ صاحب کو الہام ہوا کہ عبدالرحیم خیر بھی ہے کہ یہ
 علم عظیم تم پر کتنے کی زبان سے کیوں عطا ہوا گیا۔ تم نے جو فلاں دن ایک کتے
 کے بچہ کی خدمت کی تھی۔ یہ اس کی برکت سے عطا ہوا اور ہم نے کتے ہی
 کے واسطے سے تم کو یہ علم دیا تاکہ تمہارا اس کتے کے بچہ پر احسان نہ رہے کیونکہ
 اسی کی برادری کے ایک فرد نے اس کی مکافات کر دی۔ حضرات اہل اللہ
 کی یوں اصلاح ہوتی ہے کسی کو کیا خبر ہے کہ ان حضرات کو کیا کیا واقعات
 پیش آتے ہیں۔

اُسے تراخا رہے یا تشکینہ کے اہلی کہ حسیت

حالی شیرانے کہ شمشیر بلا برس خوردند

ان کو پریشانی بھی ایسی پیش آتی ہے کہ اہل دنیا کی پریشانی اُس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتی اور خوشی بھی ایسی ہوتی ہے کہ دنیا داروں کو اُس کی ہوا نہیں لگی۔ اُس خوشی کا یہ حال ہے۔

بفراغ دل نہ مانے نظر سے بہاہ روئے

بہ ازماں کہ چتر شاہی ہمہ روز و ماٹے ہوئے

بعض لوگ اہل اللہ کو ظاہر میں خوش پوشاک اور بے فکر دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو کچھ فکر نہیں۔ ہاں سچ ہے جس چیز کی تم کو فکر ہے اُس کی انہیں فکر نہیں یعنی دنیا کی اور جس کی انہیں فکر ہے اُس کی تم کو خبر ہی نہیں یعنی خدا کے تعلق میں کمی نہ ہونے کا۔ تم اہل اللہ کی پس نہ کرو۔ اُن کی طرح خوش پوشاک نہ بنو، نہ اُن کے اقوال کی نقل کرو۔

درنیابد حال پختہ مسیح خام بس سخن کوتاہ پاید والسلام

اگر تم نقل کرو گے تو وہی حالت ہوگی جیسے ایک بندر نے برصیح کی

نقل کی تھی کہ اس کو لکڑی چیرنے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ بھی اُس کے جانے

کے بعد لکڑی پر اُبیٹھے اور میخ جو دو تختوں کو چیرتے ہوئے درمیان میں لگا دی

جاتی ہے اُن کے درمیان میں اتفاق سے آپ کی سب جمع پونجی آگئی اور

آپ نے اسی میخ کو ہلانا شروع کیا۔ اُس پر جو زور پڑا وہ میخ نکل آئی اور دونوں

تختے یا ہم مل گئے اور دونوں کے بیچ میں آپ کی سب جمع پونجی آگئی۔ اب

کیا تھا قرطیبہ ہو گیا۔ لگا پھینچنے چلا نے۔ کچھ دیر کے بعد جو بڑھئی آیا اس نے
خوب مرمت کی۔ اسی لئے کہتے ہیں۔ ع

کار بوزینہ نیست شجاری

یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو بلا تحقیق اہل اسرار کی نقل کرتے ہیں۔
بس بزرگوں کا اتباع ان افعال و اقوال میں کرو جن کے اتباع کا وہ حکم کریں۔
باقی ان کی خاص حالت یا ان اقوال کی نقل نہ کرو جو اسرار کے متعلق ہیں۔ عرض
دل کی طہارت اور چیز ہے۔ وہ استنجا سے یا دھونے مانجنے سے حاصل نہیں
ہوتی۔ اس کے حصول کا طریق دوسرا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ ایک بار چلے جا رہے تھے۔ کتا سامنے آ گیا
آپ نے اس سے دامن بچایا۔ کتے نے کہا کہ مجھ سے دامن اس لئے بچانے
ہو کہ میں ناپاک ہوں۔ مگر یاد رکھو میرا تو ظاہر ہی ناپاک ہے اور تمہارا باطن تکبر
کی وجہ سے ناپاک ہے۔ میری ناپاکی تو سات بار پانی بہانے سے دور ہو سکتی
ہے مگر تمہاری ناپاکی باطنی سات سمندروں سے بھی پاک نہیں ہو سکتی۔ حضرت
بایزید روئے اور کہا او دونوں دوستی کر لیں۔ ہم بھی ناپاک تو بھئی ناپاک۔ اس
نے کہا میری تمہاری کیا دوستی۔ تم جہاں جاتے ہو تمہاری تعظیم کی جاتی ہے اور
میں جہاں جاتا ہوں دھنکارا جاتا ہوں۔ آپ پھر روئے اور فرمایا جو شخص کتے
کی دوستی کے لائق نہ ہو وہ خدا تعالیٰ کی دوستی کے کب لائق ہوگا۔

صاحبو! اہل اللہ کی اس طرح اصلاح ہوتی ہے اور یوں ان کے دل
کو پاک کیا جاتا ہے۔ ان ہی حضرت بایزید کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک

بار عید کے دن حمام سے نہا دھو کر عمارہ لباس پہن کر نکلے آ رہے تھے کہ راستہ میں ایک شخص نے اپنے مکان سے کورے اور راکھ کا ٹوکرا غلطی سے آپ کے اوپر ڈال دیا۔ تمام بدن اور لباس بلوٹ ہو گیا مگر آپ کے چہرہ پر بل نہیں پڑا۔ فوراً نفس کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے نفس تو تو جہنم کے لائق ہے۔ اگر راکھ ہی پر صلح ہو جائے تو تیری خوش نصیبی ہے۔

صاحبو! یہ ہے دل کی پاکی جس کا اس جگہ بیان ہے اس سے آج کل مسلمان بالکل بے خبر ہیں۔ اس بے خبری کی بدولت ہماری یہ حالت ہے کہ دشمنوں سے تو کیا موافقت کرتے دوستوں سے بھی اختلاف و جدال کرتے رہتے ہیں۔

شہیدیم کہ مردان راہ خدا دل دشمنان ہم نگر و نڈنگ
 تڑا کے پیسے شہود این مقام کہ بادوسانت خلاف است جنگ
 حضرت جس کو اپنی اصلاح کی فکر ہوتی ہے اس کو اتنی مہلت ہی نہیں ہوتی
 جو کسی سے لڑائی جھگڑا کرے۔ اس کو دشمنوں سے لڑائی کا موقع تو کیا ملتا،
 دوستوں سے ملاقات کا وقت بھی نہیں ملتا۔ وہ سب سے الگ رہتا ہے نہ
 کسی سے دوستی بڑھاتا ہے نہ دشمنی پیدا کرتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں
 خود چہ جائے جنگ بدل نیک بد کیں وطم از صلح ماہم سے برد
 کیونکہ تجربہ ہے کہ دشمن اتنا وقت ضائع نہیں کرتا جتنا دوست ضائع
 کرتے ہیں۔ اس لئے وہ دوستی سے بھی گھبراتے ہیں۔ صاحبو! اللہ والے بن کر
 دیکھو اس وقت تم کو اس کا یقین آئے گا کہ ان کو نہ دوستی کی فرصت ملتی ہے

نہ عداوت کی۔ سعدی فرماتے ہیں کہ

چہ خون گھت بہلول فرخندہ خوی

چو بگذشتت بر عارف جنگ خوی

گر این مدعی دوست بشناسختے

نہ پیکار دشمن پروا داشتے

اس تقریر سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ دل کا پاک ہونا کیا ہے اور اس

کی کس قدر ضرورت ہے۔ بس ضروری مضمون تو اسی قدر تھا کہ لوگ جس چیز کی ضرورت سے غافل ہیں ان کی ضرورت کو ظاہر کر دیا جائے۔ اب ایک ضرورت اس کی رہ گئی کہ اس کے حصول کا طریقہ بتا دیا جائے۔

سو وہ بھی اس آیت کے سیاق و

سباق اور نشان نزول میں غور کرنے

طہارت باطنہ کے حصول کا طریقہ

سے معلوم ہو جائے گا۔ وہ یہ کہ جن حضرات صحابہ سے یہ خطا ہوئی تھی کہ وہ غزوہ

تبوک سے متخلف ہو گئے، انہوں نے اس کا تدارک یوں کیا کہ اول تو اپنی

خطا کا اعتراف صاف صاف کیا۔ کوئی عذر یا بہانہ نہیں تراشا۔ پھر حضور نے

قطع کلام و سلام کا حکم فرمایا اور وہ اس سزا پر راضی رہے یہ غزوہ تبوک

سے واپسی میں ہوا، پھر جب ان حضرات کی توبہ قبول ہوئی تو حضور کی خدمت

میں اپنا مال لے کر حاضر ہوئے کہ اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیا جائے

مجھے ان واقعات کی صورت مفصود نہیں بلکہ ان کی اصل مفصود ہے

اصل ان سب کی مجاہدہ ہے جس کے معنی لغت میں مشقت میں ڈالنے کے

ہیں اور شریعت میں مجاہدہ کی تفسیر یہ ہے کہ نفس کی ان خواہشوں کی مخالفت

کرنا تو ہر شخص کے نزدیک ضروری ہے۔ علماء و ظاہر بھی اس کے وجوب کا

انکار نہیں کر سکتے۔ مگر شاید مقدمات معصیت کی مخالفت میں کسی کو کلام ہو لیکن علماء ظاہر نے بھی طے کر دیا ہے کہ مقدمۃ الواجب واجب و مقدمۃ المحرم حرام۔ اس لئے اس میں بھی کلام نہیں ہو سکتا کہ ان خواہشوں کی مخالفت بھی ضروری ہے۔ جو مقدمات معاصی ہیں۔ چنانچہ حضرات صوفیہ نے اپنے تجربہ سے کثرت کلام مباح و کثرت اختلاط مباح و کثرت طعام مباح و کثرت منام مباح کو مقدمۃ معاصی سمجھا ہے اور تفصیل کا موقع نہیں ورنہ میں ثابت کر دیتا کہ واقعی زیادہ تر معاصی ان مباحات کی کثرت ہی سے پیدا ہوتے ہیں اور جب تک ان میں تقلیل نہ کی جائے گی اس وقت تک مخالفت تقاضائے معاصی پر آسانی سے ہرگز قدرت نہ ہوگی۔ اس لئے صوفیہ تقلیل کلام و تقلیل اختلاط مع الانام و تقلیل منام کا حکم فرماتے ہیں۔ اور تقلیل تو میں کہہ رہا ہوں ورنہ وہ تو ترک کا حکم کرتے ہیں۔ لیکن مراد ان کی بھی تقلیل ہے جس کو ترک سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ برکت گیر تار تپ راضی شود۔

صوفیاء کی یہ تعلیم ایسی ہے جیسے طبیب مسہل میں یاتین کرنے اور سونے سے منع کیا کرتا ہے کیونکہ یاتین کرنا اور سونا مسہل کے اثر کو باطل کرتا ہے اسی طرح صوفیاء کہتے ہیں کہ یہ اعمال صلوات و صوم وغیرہ جو شریعت نے بتلائے ہیں یہ باطن کے لئے مسہل ہیں۔ مگر ان کی تاثیر کبھی ظاہر ہوگی جب کہ کلام و منام و اختلاط و طعام میں تقلیل کی جائے ورنہ مسہل کا اثر ظاہر نہ ہوگا۔

اس مثال سے میرا مقصود یہ ہے کہ حضرات صوفیہ کوئی نئی بات نہیں بتلاتے بلکہ وہی طریقہ بتلاتے ہیں جو ہم معالجہ اجسام میں استعمال کرتے ہو مگر

حیرت ہے کہ علماء و ظاہر اطباء پر تو اعتراض نہیں کرتے کہ یہ سکوت و سہر کو کدھر سے لازم کر رہے ہیں اور صوفیاء پر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ دونوں کے الزام کا نشا ایک ہی ہے۔ پس معلوم ہو گیا کہ طہارت باطنیہ کا طریقہ مجاہدہ ہے یعنی مخالفت نفس جس میں اصل مقصود تو مخالفت تقاضائے معاصی میں ہے مگر تجربہ سے اس کا حصول مخالفت تقاضائے بعض مباحات پر موقوف ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ باتیں کم کرو اور سوئچ کر کرو۔ کوئی بات خلاف شریعت نہ کرو اور کلام مباح بھی ضرورت سے زیادہ نہ کرو۔ اور سونا کم کرو۔ اگر زیادہ نہیں جاگ سکتے تو کم از کم عشاء کی نماز سے پہلے مرت سوو۔ وَتَجَانِي جَنُوبَهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ کر سوتے ہیں۔ اس لئے اگر تہجد میں نہ اٹھ سکو تو کم از کم اتنی ہی بیداری کے عادی ہو جاؤ کہ عشاء کے بعد سویا کرو اس سے پہلے نہ سوو۔ مگر اب تو مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ بس ہمیں کچھ بھی نہ کرنا پڑے اور خود بخود سارا کام ہو جائے باطن کی طہارت حاصل ہو جائے۔ اسے صاحبو! آخر کچھ تو ظاہری طہارت میں بھی اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ پھر ستم ہے کہ باطنی طہارت میں جو اس سے اہم و اشد ہے اتنا اہتمام بھی نہ ہو جتنا ظاہری صفائی میں کیا جاتا ہے۔

حالت یہ ہے کہ نماز میں نیند کی شکایت ہے۔ روزہ میں گرمی اور پیاس کی شکایت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تم یہ شکایت اسی وقت تک کر رہے ہو جب تک توجہ نہیں کی۔ بخدا تم توجہ کر کے دیکھو۔ اگر تم توجہ کر کے تو انشاء اللہ تم کو ایسے پاک کرنے والے بھی ملیں گے جو آسان راستہ سے

آپ کو پہنچا دیں گے۔ جیسے ظاہری سفر میں آج کل سہولت ہو گئی ہے۔ کہیں
 پسنجیر ہے کہیں ڈاک کہیں اسپیشل ہے۔ اسی طرح آج کل طریق باطن میں بھی ڈاک
 اور اسپیشل موجود ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہیں وہ اپنے بندوں کی حالت سے
 واقف ہیں۔ جب تک لوگوں میں قوت تھی اس وقت تک یہ سہولت کے سامان
 موجود نہ تھے۔ جب سے لوگوں میں ضعف آ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہر میں
 بھی سہولت کے سامان کر دیئے اور باطن میں بھی پس آپ مجاہدہ کا نام سن کر
 نہ گھبرائیں۔ آج کل بعض لے جانے والے ایسے بھی ہیں، جنہوں نے راستہ کو
 آسان کر دیا ہے۔ لیکن اتنا مجاہدہ تو کرنا پڑے گا کہ ارادہ کرو، قصد کرو اور اس میں
 پورا پورا ٹکڑ خریدو۔ پھر انشاء اللہ بہت جلد پہنچ جاؤ گے۔ نہ راستہ میں ٹکڑ
 کا خطرہ ہوگا، نہ پیاس اور بھوک کا اندیشہ۔ بلکہ ہر مقام پر راحت کا سامان
 ملتا رہے گا۔ بہت سے اللہ کے بند سے راحت کے ساتھ مقصود پر
 پہنچ گئے ہیں۔ آپ بھی توجہ کر کے دیکھئے۔

اُس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب سے

تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ترکِ معاصی کی ضرورت

ہیں یہ بات تجربہ اولہ تحقیق سے کہہ رہے
 ہوں کہ آج کل بعض مشائخ نہایت سہولت

سے طریق طے کر اتے ہیں۔ ہمارے حاجی صاحب فرماتے تھے کہ بعض مشائخ
 ایک مقام سے دفعۃً دوسرے مقام پر پہنچا دیتے ہیں کہ درمیانی مقامات
 کی بھی اطلاع نہیں ہوتی گویا طریق باطن کا یہ طغرا ہے۔ اسی کو مولانا صاحب

فرما تھیں :-

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار آئندہ کہ بہ تازہ پورہ پہنچان بحر م قافلہ را
 ہمہ شیران جہاں بستہ این سلسلہ اندہ روبرو از جملہ جہاں بگسلد این سلسلہ را
 اور یہ محض نقشبندیہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر محقق کی یہی حالت ہے اب
 بعض نادان یوں کہتے ہیں کہ ہم کو بعض کیفیات تو پیش آتی ہی نہیں جو دوسروں
 کو پیش آتی ہیں۔ اب یہ شیخ سے شکایت کرتے ہیں اور اس کے احسان کا شکر
 نہیں کرتے کہ اس نے سب گھاٹیوں سے دفعہ پار کر کے اتنا جلدی پہنچا دیا
 ہے کہ کیفیات وغیرہ سب درمیان میں رہ گئیں اور یہ مقصود تک پہنچ گیا۔ اگر
 میں اس کی تفصیل کرنے بیٹھوں تو وقت بہت چاہئے۔ مگر تفصیل سے کیا ہونا
 ہے۔ یہ تو کرنے کا کام ہے تفصیل یا کرنے سے کام نہ چلے گا۔ تو ہم کو کام
 میں لگو خود مشاہدہ ہو جائے گا۔ یہ طریقہ پہلے مشائخ کا تھا کہ تمام رات بیداری
 کرتے تھے۔ اب تو شیوخ کا یہ طرز ہے کہ اگر مرید تمام رات جاگنا بھی چاہے
 تو اس کو روکتے ہیں اور تمام دشواری کی صورتوں سے منع کرتے ہیں بس اب
 طالبین کی وہ حالت ہے جو حدیث میں پرندوں کی حالت مذکور ہے کہ

تَعْدُوْا حَمَامًا وَتَرَوْهُم بِطَانًا
 صبح کو بھوکے اٹھتے ہیں شام

کو پیٹ بھر کے اپنے گھونسلے میں چلے جاتے ہیں۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں تدبیر کا ابطال کر دیا ہوں۔ ہرگز نہیں بلکہ اس مثال
 سے بھی تھوڑی سی تدبیر کا تو اثبات ہو گیا کیونکہ پرندے جو شام کو پیٹ بھر
 کے لوٹتے ہیں۔ وہ اسی کا نتیجہ ہے کہ صبح کو گھونسلوں سے نکل کر جنگل کی طرف

اڑ کر جاتے ہیں۔ تو اس تدبیر کی ضرورت تو ہر حال میں ہے کہ طالب علم کو کسی کے پاس پہنچ سکاؤ۔ میں مطلقاً تدبیر کا ابطال نہیں کر رہا بلکہ سہولت تدبیر بتلا رہا ہوں کہ آج کل شیوخ محققین تو منطوق کا امر کرتے ہیں۔ مبالغہ سے منہم کرتے ہیں۔ میں دو باتوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ معاصی کو قاطبہ چھوڑ دو اور یہ کچھ دشوار نہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ معاصی کا چھوڑنا بہت آسان ہے۔ اس میں کچھ تکلیف نہیں ہوتی بلکہ ترک معاصی پر قلب کو لذت و راحت ہوتی ہے۔ جب کسی نامحرم پر نظر پڑتی ہے اس وقت دل چاہتا ہے کہ اس کو دیکھو مگر دیکھنے اور گھورنے کے بعد دل میں ایک وحشت و پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ اور نگاہ نیچی کرنے میں اس وقت ٹھوڑی دیر تو کلفت ہوگی لیکن اس عورت کے چلے جاتے کے بعد قلب پر نگاہ کرو تو ایک حلاوت موجود ہوگی اور دل خوش ہو کر یوں کہتا ہوگا۔

شکر اللہ کہ ہر دم و رسیدیم بدست

آفریں باد بریں ہمت مردانہ نا

حدیث میں وعدہ ہے کہ جب کوئی شخص نامحرم سے نگاہ ہٹا لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں خاص حلاوت پیدا کرتے ہیں اور ثواب آخرت جدا رہا۔ دنیا میں یہ مترہ حاصل ہوتا ہے کہ دل کو چین و حلاوت نصیب ہوتی ہے جس سے واللہ موت بھی شیریں ہو جاتی ہے۔ اس کے واقعات سے بھی مزے لیتا ہے۔ اسی کو حضرت عوث اعظم فرماتے ہیں۔

گر تکیر آید و پرسد کہ بگورب تو کیت

گویم آنکس کہ ر بود این دل دیوانہ نا

پس گناہوں سے قاطبۂ استرازا کرو اور اگر کسی سے سب گناہ و فتنہ نہ
 چھوٹ سکیں تو کم از کم وہ گناہ تو چھوڑ دے جن کے ترک میں دنیا کا بھی کوئی
 نقصان نہیں۔ جیسے بد نگاہی، جھوٹ، فریب، دغا بازی، تکبر، ریا، نخوت وغیرہ
 اور صورت و لباس میں کفار فتنان کا تشبہ کرنا وغیرہ وغیرہ اور جن معاصی کے
 ترک میں دنیا کا نقصان معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی کی ملازمت ناجائز ہو یا تنخواہ
 ٹھوڑی ہو اور ثروت لیتا ہوا ان سے یہاں یہ کہنا ہوں کہ ابھی آپ اس ملازمت
 کو ترک نہ کریں بلکہ اسی وقت سے جائز ملازمت اور حلال روزی کی فکر میں سچے
 دل سے لگ جائیں اور جب تک حلال روزی اور جائز ملازمت نہ ملے اسی حرام
 ملازمت میں رہئے۔ مگر خدا کے لئے اس کو حرام سمجھئے اور یوں سمجھئے کہ میں مجبوری
 میں کھا رہا ہوں۔ ایک کام تو یہ کیجئے۔

دوسرا کام یہ کیجئے کہ روزانہ اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کیجئے کہ میرا اس
 حرام ملازمت کا گناہ معاف کیجئے اور دعا کیجئے کہ اللہ مجھے حلال روزی عطا کیجئے
 اس طرح آپ عمل کرتے رہیں۔ انشاء اللہ کوئی سبیل خلاصی کی پیدا ہو جائے گی اور
 جب تک خلاصی نہ ہو آپ ناجائز ہی ملازمت میں رہئے۔ مگر اس عمل کو ترک
 نہ کیجئے۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ناجائز ملازمت کی اجازت دے رہا ہوں
 بلکہ اس ناجائز ابتلاء کو دوسری بلا کا وقایہ بنا رہا ہوں۔ جیسا مولانا فرماتے ہیں مع
 این بلا دفع بلا ہائے بزرگ

کیونکہ آج کل زمانہ ایسا ہے کہ بعض لوگ فاقہ اور تنگی میں ایمان کو خیر باد

کہہ دیتے ہیں۔ ایسے بہت سے واقعات ہمارے سامنے ہیں اور جو مفہمی اپنے زمانہ سے واقف نہ ہو وہ جاہل ہے۔ اس لئے میں کسی کو جلدی ترک ملازمت کا مشورہ نہیں دیا کرتا بلکہ یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم اسی حالت میں رہ کر محبت خدا دل میں پیدا کرو۔ جب محبت پیدا ہو جائے گی، تو پھر فاقہ اور تنگی سب آسان ہو جائے گی۔

حضرت رابعہؓ کی یہ حالت تھی کہ جب مسلسل کئی روز تک کھانے کو ملتا اور فاقہ نہ ہوتا تو رو دیا کرتے تھے کہ شاید اللہ تعالیٰ ناراض ہو گئے، روٹھ گئے ہو فاقہ نہیں دیا۔ کیونکہ وہ اپنے دوستوں ہی کو فاقہ دیا کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت رابعہؓ کے یہاں مہمان آئے۔ آپ کے گھر میں کل دو روٹیاں تھیں۔ تھوڑی دیر میں ایک فقیر سائل آگیا۔ آپ نے وہ دو روٹیاں سائل کو دے دیں۔ مہانوں کو حیرت ہوئی کہ اتنے تو مہمان گھر میں ہیں اور سوائے دو روٹیوں کے کچھ اور ہے ہی نہیں وہ بھی گھروں میں نہ رکھیں۔ مگر کسی کو کیا معلوم کہ خدا کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص جوان لایا کہ فلاں میرے نے حضرت کے واسطے کھانا بھیجا ہے۔ فرمایا لاؤ دسترخوان کھول کر۔ آپ روٹیاں شمار کیں تو اٹھارہ تھیں۔ فرمایا واپس لے جاؤ۔ یہ میرے واسطے نہیں دی ہیں کسی اور کو دی ہوں گی کیونکہ میرے لئے ہیں سب سے کم نہیں ہو سکتیں۔ میں نے ابھی فقیر کو دو روٹیاں دی ہیں اور میرے محبوب کا وعدہ ہے۔ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَهْلًا تو اس حساب سے پوری ہیں روٹیاں ہونا چاہئیں۔ قاصد نے کہا حضور آپ کا

حساب در سبت ہے۔ دور وٹیاں میں نے چرائی تھیں وہ یہ ہیں۔ اب آپ نے وہ کھانا قبول کیا اور مہمان سمجھ گئے کہ حضرت رابعہؓ نے دور وٹیاں سائل کو کس لئے دی تھیں۔ حضرت جب نسبت رابعہ ہو جائے گی تو اس وقت آپ بھوکے بھی رہیں گے تو مزے میں رہیں گے اور یوں کہیں گے۔

نشود نصیب دشمن کہ نشود ہلاک تیغیت

سردوستناں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور یوں کہیں گے۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے پار دل رنجان من
اب آپ سے نوکری بھی چھوڑا دیں گے اور آپ کو کچھ تکلیف نہ ہوگی
اے صاحبو! ایک ادنیٰ معشوق کی محبت میں کھانا پینا چھوٹ جاتا ہے۔ اس کی
نظائر رات دن مشاہدہ میں آتی ہیں۔ اُس سے کوئی پوچھے کہ اب یہ فاقہ کیونکر
گوارا ہو گیا۔ پھر عشاق خداوندی پر کیوں تعجب ہے۔ اگر وہ فاقہ سے خوش ہوں
حضرت اہل اللہ کی تو یہ حالت ہے کہ محبوب سے مل کر بھی اُن کا دل سیر نہیں
ہوتا۔ اُس وقت بھی وہ تڑپتے ہی رہتے ہیں۔ پھر وہ فاقہ اور بھوک کی کیا پروا کر
سکتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے عشق کا اضطراب دنیا میں ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ تو آخرت
ہی میں ختم ہوگا۔ عشاق مجازہ تو وصال محبوب سے پہلے ہی کھانا پینا، سونا چھوڑ
ہیں۔ وصال کے بعد ہر چیز کے ہوش اُٹھاتے ہیں۔ مگر عشاق خدا کو عمر بھر کسی چیز
کا ہوش نہیں آتا۔ یعنی وہ کسی چیز کے طالب نہیں ہوتے۔

عجب داری از سالکانِ طریق کہ باشند در بحر معنی غریق

تکویم کہ برآب قاور نیست کہ برسا حل نین مستشید!

اور یہ ایسی باتیں ہیں کہ جب چاہو اپنے اندر ان کا مشاہدہ کر لو۔

سقم است گریہ است کشد کہ بسیر سز و سخن در آ

توزد غنچہ کم زدمسیدہ در دل گشایین ودا

ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک تو معاصی کو قاطبہ چھوڑ

دو۔ دوسرا کام یہ کر دو کہ غمور اسما مجاہدہ کیا کرو یعنی

مجاہدہ کی ضرورت

ففس کی مخالفت کیا کرو۔ اور مجاہدہ کے دو شعبے ہیں۔

ایک مجاہدہ بدنیہ دوسرے مجاہدہ مالیہ

مجاہدہ مالیہ میں بہت لوگ کوتاہی کرتے ہیں۔ اکثر نسا لیکن مجاہدہ بدنیہ

پر تو جلد جلد راضی ہو جاتے ہیں مگر مجاہدہ مالیہ دشوار معلوم ہوتا ہے۔ بس وہی حالت

ہے۔

گر جاں طلبی مصلحت نیست و زردہ طلبی سخن درین است

سالانہ مجاہدہ مالیہ بھی مجاہدہ کی ایک فرسہ ہے اس کو بھی اختیار کرنا چاہیے

بعض لوگ ایسے ہیں جو نہ مجاہدہ بدنیہ کریں نہ مجاہدہ مالیہ۔ وہ محض وظیفوں ہی سے

کام نکالنا چاہتے ہیں۔ بھلا جس کا قلب مریض ہو اس کا علاج زبان کے لطائف

سے کیونکر ہو سکتا ہے۔ بس اس معالجہ کی وہی حالت ہے جو فنوی میں طبیب

روحانی کے قصہ میں مولانا نے فرمایا ہے کہ جب وہ طبیب روحانی آیا اور

اس نے دوسرے اطباء کا طریقہ علاج دیکھا تو کہا ہے

گفت آن دارو کہ ایشان کردہ اند آن عمارت نیست بران کردہ اند

بجریں لو دنہ از حال دروں استخیرنا اللہ بما یفترون

ایک صاحب نے مجھ سے شکایت کی کہ رات کو آنکھ نہیں کھلتی۔ کوئی وظیفہ تیار دو۔ میں نے کہا اگر اس وظیفہ کو پورا نہ کر سکے تو پھر دوسرا وظیفہ اس وظیفہ کی تکمیل کے واسطے پوچھنے آؤ گے۔ اور اگر آنکھ کھل بھی گئی اور اٹھنے میں مستی رہی تو پھر مستی کے لئے وظیفہ پوچھو گے۔ بس ایک دن یوں ہی مجموعۃ المظالم ہو جاؤ گے۔ اس طرح کام نہیں چلا کرتا۔ پابندی تہجد کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دن ناغہ ہو تو چار آنے نفس پر جرمانہ کر کے کسی غریب کو دے دو اور جماعت صبح کی قضا ہو تو آٹھ آنے دو اور غیبت ہو جائے تو بیس رکعت پڑھو۔ چند دن میں انشاء اللہ تہجد کی عادت اور نماز باجماعت کی عادت ہو جائے گی۔ وظیفوں سے بھی ہیں امراض قلب کا علاج ہوا ہے۔ ان کا علاج بجز مجاہدہ کے کچھ نہیں ہاں ایک تدبیر اور ہے جو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے اور مجاہدہ میں بھی برکت و تاثیر اسی کی بدولت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کر لو اور ان کے پاس جایا کرو۔ اگر جانہ سکو، خط و کتابت ہی رکھو اور غیبت کی حالت میں ان کے ملفوظات و مواعظ روزانہ مطالعہ کیا کرو۔ ناول ہی سمجھ کر ان کو دیکھ لیا کیجئے جیسے ایک گھنٹہ ناولوں کے دیکھنے میں صرف کرتے ہو۔ بخور اس وقت اسی میں سے اہل اللہ کے مواعظ کے مطالعہ کے لئے بھی نکال لو۔ انشاء اللہ چند روز میں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

ایک کام اس کے ساتھ یہ بھی کرو کہ رات کو لیٹتے ہوئے اپنے اعمال کا محاسبہ کیا کرو

مراقبہ موت کی ضرورت

دن بھر کے کاموں کو سوچا کر دیکھو کہ آج ہم نے کتنے گناہ کیے ہیں اور کتنے نیک کام
 کئے۔ گناہوں سے توبہ استغفار کرو۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور رزق کی
 صورت ہی بنا لو اگر روزانہ آئے۔ اور نیک کاموں پر شکر کیا کرو۔ اس کے بعد
 سونے سے پہلے موت کا تصور کر لیا کرو کہ جیسے ہم آج سو رہے ہیں ایسی طرح
 ایک دن ایسے سوئیں گے کہ قیامت ہی میں آنکھ کھلے گی۔ پھر ملک الموت کے
 آنے کا اور روح قبض کرنے کا اور قبر میں تنہا دفن ہونے کا تصور کرو۔ اس سے
 دنیا کی محبت اور اس کے ساتھ دل لٹگی کم ہوگی اور گناہوں سے نفرت ہوگی۔
 کیونکہ گناہوں کا منشأ غفلت عن الآخرة ہی تو ہے۔ جب موت اور آخرت کا
 دھیان غالب ہوگا تو گناہ خود بخود چھوڑنے لگیں گے۔ اس کو کر کے دیکھو پھر تو آپ
 بچوں کی طرح کھینچ کر بلائے جا میں گے کہ پاپ دست و گریبے دست بدست
 دگرے۔ پھر انشاء اللہ ایک دن وہ بھی ہوگا کہ آپ بچن سے نکل کر بلوغ کی حد
 میں داخل ہو جائیں گے اور باطنی بلوغ کیا ہے۔ اس کو مولانا فرماتے ہیں ہے
 خلق اطلاقاً لہ خبر مستخرجاً منہ نیت بالغ خبر مفیدہ انہ ہوا
 بالغ وہ ہے جو ہوائے نفس اپنے نکل جائے۔ جب تک مسلمان ہوائے
 نفس سے نہ نکلے نا بالغ ہے طفل ہے اور جب اس سے نکل گیا بالغ ہو گیا پھر
 جیسے بالغ ہو کر کوئی نا بالغ نہیں ہو سکتا گو اس سے سارا سامان عیش چھین لیا جائے
 کپڑا اور روپیہ کچھ بھی اس کے پاس نہ رہے۔ مگر اس سے وہ نا بالغ نہیں ہو سکتا ایسی
 طرح طریق باطن میں وصول کے بعد رجوع نہیں ہوتا۔ قبول کے بعد بد نہیں ہوتا
 جتنے لوگ ہیں راستہ میں اسے لوستے ہیں وہ اصل ہو کر کوئی راجع نہیں ہوتا۔ الغافی

لا یرد کیسے ہی معنی میں۔

پھر بہر حال یہ طریق ہے پاکی قلب کا جس کا حاصل مجاہدہ ہے اور مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجاہدہ بالمال ایک مجاہدہ بالبدن پس اب دونوں مضمون ادا ہونا گئے اور معلوم ہو گیا کہ طہارت قلب کا طریق کیا ہے اور طہارت قلب کی ضرورت پہلے معلوم ہو چکی تھی تو اب مقصود مکمل ہو گیا۔

اس مضمون کو سن کر معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس مقام کے مناسب **خاتمہ البیان** یہی مضمون تھا اور اس کی یہاں ضرورت تھی اور یہ بھی معلوم ہوا ہو گا کہ شریعت نے مال کے خرچ کرنے کی کس طرح ترغیب دی ہے۔ کہ کسی پر حیر و اکراہ نہیں ہے بلکہ انفاق مال کو چونکہ تطہیر و تزکیہ میں دخل ہے اس لئے شریعت نے ہم کو اس کا امر کیا ہے۔ باقی سوال کسی سے نہیں کیا جاتا ہر شخص کو اختیار ہے جو پاک ہونا چاہے وہ مجاہدہ مالیہ کرے۔ جو پاک نہ ہونا چاہے وہ اپنے گھر بیٹھے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا، جو علماء و احکام شریعیہ کی تبلیغ کرنے والے ہیں وہ انفاق مال کا مضمون بھی محض تبلیغ کے طور پر بیان کیا کرتے ہیں۔ کسی سے اصرار و الحاح نہیں کرتے ہیں۔

پس اب میں ختم کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس مضمون سے اس مدرسہ کو بھی نفع ہو گا جہاں یہ بیان ہو رہا ہے اور میں صاف عرض کرتا ہوں کہ اس مضمون کے اختیار کرنے سے میرا یہ مقصود بھی ضرور تھا کہ سامعین کو ادا و مدرسہ کی ترغیب ہو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی مقصود ضرور تھا کہ ان کو ترغیب کا طریقہ بتا دوں کہ اہل حق اس طرح ترغیب دیا کرتے ہیں جس سے کسی کو وحشت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ محض

مبلغ احکام شریعت ہوتے ہیں اور شریعت نے جس استغناء کے ساتھ تہذیب
 دی ہے اس سے وحشت ہو ہی نہیں سکتی۔
 میں اس وعظ کا نام تزکیہ و تطہیر رکھتا ہوں۔ دوسرے بیانات کے ناموں
 کی مناسبت سے انہی کے وزن پر مطالعہ الاموال رکھتا ہوں جس میں اضافت
 بسبب ہے اور جمع کا صیغہ ولالت علی الانواع کے لئے ہے۔ اب
 حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق ہو۔ وصلی
 اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ واصحابہ وبارک و سلم و
 انحر و عوننا ان الحمد للہ رب العالمین۔

تائیس البیان

علا

تفتویٰ من اللہ ورضوان

احکام و آداب عمارات کے متعلق یہ وعظ ۲۷ ذوالحجہ ۱۳۲۵ھ
کو کا ندھلہ میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ جو تین گھنٹے میں ختم ہوا۔ پوری
اشفاق صاحب نے قلمبند فرمایا۔ حاضری ۱۵۰ کے قریب تھی

خطبة ماثوره

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله وحده واستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتمسك
 عليه ونعوذ بالله من شور الفسنا ومن سيئات اعمالنا
 من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له و
 نشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان
 سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله عليه وعلى
 اله واصحابه وبارك وسلم اما بعد فاعوذ بالله من شيطان
 الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم افمن اسس بنيانه
 على تقوى من الله ورضوان خيرا ممن اسس بنيانه على شفا
 جوف هار فانه ارببه في نار جهنم والله لا يهدي القوم
 الظالمين لا يزال بنيانهم الذي بنوا ريبة في قلوبهم
 الا ان تقطع قلوبهم والله عليم حكيم

تہذیب

یہ دو آیتیں ہیں جن میں ایک خاص مضمون ایک خاص موقع کے
 مناسب مذکور ہے مگر مجھے اس سے ایک عام مضمون بیان
 کرنا ہے۔ لیکن اس بنا پر اس خاص مضمون کی آیات کا تلاوت کرنا بیکار اور زائد
 نہ سمجھا جائے نیز اس خاص مضمون سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ کل جو بنیاد
 مدرسہ کی رکھی ہے اس کے متعلق و عطف ہوگا۔ اور تحریک چندہ کے لئے و عطف
 ہوگا۔ ایسا خیال محض غلط خیال ہے۔ اس لئے کہ میں یہ مضمون بیان نہ کروں گا اور
 نہ مجھے اس مضمون کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کو دینا ہوگا خود ہی
 دے گا۔ مجھے تحریک چندہ کی کیا ضرورت ہے بلکہ میں اس وقت ایک دوسرا
 مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں۔

گویہ آیت خاص ہے اور خاص موقع پر نازل ہوئی ہے مگر اس وقت
 اس آیت سے کوئی خاص مضمون بیان کرنا مقصود اور مد نظر نہیں ہے بلکہ ایک

عام مضمون بیان کرنا محفوظ خاطر ہے گو وہ زیادہ عام بھی نہیں جس کا تعلق تمام حالات سے ہو بلکہ ایسا عام اس خاص کے اعتبار سے ہے۔ اس میں ایک درجہ کا ایسا عموم ہے کہ اکثر لوگوں کو اس سے سابقہ پڑتا ہے یعنی آیات تو خاص مساجد کے احکام کے متعلق ہیں اور میں ذکر کروں گا عام عمارات کے متعلق جس کا عموم بھی نسبت خاص عمارات مساجد کے ظاہر ہے اور جس سے بکثرت لوگوں کو سابقہ بھی پڑتا ہے۔ مگر جن بعض لوگوں کو مطلقاً عمارات سے سابقہ نہیں پڑتا ان کے لئے عام نہیں پس یہ کہنا صحیح ہو گیا کہ عام تو ہے مگر زیادہ عام بھی نہیں ہے۔

تفصیل اس عموم و خصوص اور اس کے اعتبار سے درجات ضرورت کے تفاوت کی یہ ہے کہ مخاطب عام معکضین ہیں۔ اور ان سے سب کو سابقہ پڑتا ہے اور بعض مضامین وہ ہیں جن سے بعض کو سابقہ پڑتا ہے اور بعض کو نہیں اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے وہ زیادہ قابل اہتمام ہیں جن سے اکثر کو سابقہ پڑتا ہے گو قدر غلیل کو نہ پڑتا ہو۔ اور جن سے بعض کو سابقہ پڑتا ہو نہ کہ اکثر کو وہ اس درجہ کے اہتمام کے لائق نہیں۔

اس میں اصل کلی یہ ہے کہ احکام تابع واقعات کے ہیں اور ہر واقعہ کے متعلق کچھ احکام شرعیہ ہیں جس کو وہ واقعہ پیش آوے اس کو وہ احکام سیکھنا فرض اور ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کے احکام ہیں کہ ملک مال سے متعلق ہیں جب تک آدمی مال کا مالک نہ ہو اس وقت تک اس کو احکام علیہ زکوٰۃ کے سیکھنا فرض اور ضروری نہیں۔ گو اعتقاد فرضیت کا فرض ہے اور جب

مال کا مالک ہوا اس وقت احکام عملیہ زکوٰۃ کے سیکھنا ضروری اور فرض ہو گئے۔ اور احکام عملیہ کی قید اس لئے لگائی کہ عقیدہ کے درجہ میں تو ہر شخص سے زکوٰۃ کی فرضیت وغیرہ کا تعلق ہے جیسا اوپر بیان ہوا مگر عمل کے درجہ میں ہر شخص سے نہیں بلکہ اسی شخص سے ہوگا جس کے پاس بقدر نصاب مال ہو اور عملی سے بھی مراد عمل ظاہری ہے نہ کہ عمل باطنی۔ کیونکہ عمل باطنی کا بھی ہر شخص سے تعلق ہے جیسا عنقریب آتا ہے۔

اعمال باطنیہ | ہر چیز کہ عمل باطنی کو آج کل عمل ہی نہیں سمجھتے حالانکہ اعمال باطنی بھی ضروری ہیں بلکہ اس وجہ سے اعمال باطنیہ زیادہ ضروری ہیں کہ ان پر ہی مدار قبول اور عدم قبول کا ہے اور نیز اعمال باطنیہ کا تعلق بحسب المعمل سب سے ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کے اندر عمل باطنی یہ ہے کہ یہ عزم ہو کہ اگر مال ہوا تو میں زکوٰۃ دوں گا۔ یہ عمل باطنی ہے۔ تو یہ عمل ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور اس عمل کا تعلق ہر شخص سے ہے۔ اس مفہوم کو جو مالدار نہ ہو یہ عزم رکھنا ضروری ہے کہ اگر میں مالدار ہوا تو زکوٰۃ دوں گا۔ اور یہ فرض ہے۔ اور اگر یہ عزم نہ کرے یا یہ عزم کرے کہ میں اگر مالک مال ہوا تو زکوٰۃ نہ دوں گا۔ تو اس سے گنہگار ہوگا۔ کیونکہ اس نے ایک عمل باطنی فرض کو ضائع کیا۔ عزم یہ عزم عمل باطنی ہے اور ضروری و فرض ہے اور اس عمل کا ہر شخص سے تعلق ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بعض احکام باغبار عمل ظاہر کے وہ ہیں جن کا تعلق سب سے نہیں بلکہ بعض سے ہوتا ہے۔ اس وقت کا بیان بھی ایسا ہی خاص

ہے کہ جس کو تعلق بعض اعمال ظاہرہ سے ہے اعمال باطنہ سے نہیں جس کا ہر عمل

فرد مکلف انسان سے تعلق ہوتا۔ اس وجہ سے ایسا تو عام نہیں ہے جیسا کہ

عمل باطنی یا بعض عمل ظاہری عام ہوتا ہے۔ اور وہ ایسا خاص ہے جیسا کہ بعض

احکام ظاہرہ مخصوصہ ہوا کرتے ہیں۔ لہذا یہ مضمون بہ نسبت عمل باطنی و بعض عمل ظاہری

کے تو خاص ہے اور بلحاظ عمل ظاہری خاص کے عام ہے کہ سب سے تعلق

نہیں صرف اکثر سے تعلق ہے۔ چنانچہ آیت سنتی ہی سمجھو میں آگیا ہوگا کہ وہ

عمل جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں مکان بناانا اور تعمیر کرنا ہے۔ سو اس کے

متعلق بھی احکام شرعیہ ہیں۔ اور ان احکام کے وہی مخاطب ہوں گے جن کو

تعمیر کا اتفاق پیش آتا ہے اور جن کو کبھی ایسا اتفاق ہی پیش نہیں آیا اور انہوں

نے کبھی اینٹ بھی نہیں رکھی ان لوگوں سے ان احکام کا تعلق نہ ہوگا۔ جیسے جو

شخص مالک مال نہ ہو اس سے احکام زکوٰۃ کا تعلق نہیں۔

اسی طرح سفر حج کے احکام ہیں۔ یہ احکام بھی اسی شخص سے متعلق ہوں گے

جس پر حج فرض ہے۔ اسی طرح وہ احکام ہیں جن کا وہاں جانے کے بعد سیکھنا

اور معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جیسے احکام طواف، احکام عمرہ، احکام اورام

احکام رمی وغیرہ۔ اور جس شخص پر حج فرض نہیں اسے ہنوز احکام حج سیکھنا فرض

نہیں۔ اور جن کے ذمہ فرض نہیں ہے مگر وہاں پہنچنے سے فرض ہو جاتا ہے،

اس وقت ان کو بھی احکام سیکھنا فرض ہوں گے۔

رسبحان اللہ! شریعت بھی نہایت اعتدال اور سہولت

اعتدال شریعت

یہ ہے کہ دنیا میں اس قدر مشاغل کثیرہ ہیں کہ ہر شخص کے بے سود و حساب مشاغل ہیں مگر قانون شریعت سب کو محیط ہے۔ کوئی جزئی قانون شریعت سے خارج نہیں۔ عادتاً اس قدر مشاغل کثیرہ پر کسی قانون کا احاطہ ناممکن و دشوار تھا یہی بڑی دلیل ہے قانون شریعت کے منجانب اللہ ہونے کی، اور اسی طرح سے کسی شخص نے نکاح نہ کیا ہو اور نہ ارادہ نکاح کا ہو۔ اس پر احکام نکاح سیکھنا ضروری نہیں اور جس وقت نکاح کا ارادہ کرے اس وقت احکام سیکھنا ضروری اور فرض ہے۔

اس پر اگر کوئی شخص یہ شبہ کرے کہ احکام شرعیہ کا معلوم کرنا اس طرح سے فرض ہو تو شریعت میں بے حد تنگی اور حرج لازم آوے گا۔ کیونکہ ایک عمل کے متعلق بہت بہت احکام ہیں جن کا مجتمعاً حاصل کرنا ظاہر ہے کہ سخت دشوار ہے۔ حالانکہ قرآن میں صاف واضح طور پر موجود ہے۔ وما جعل علیکم فی الدین من حرج۔ جس سے یہی طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ دین میں کسی قسم کی تنگی اور حرج نہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حرج اس وقت ہوتا کہ ایک وقت میں تمام احکام کا علم واجب ہوتا۔ اس لئے کہ یہ امر یہ بیہیات سے ہے کہ سب احکام کا ایک وقت میں محفوظ کرنا سخت دشوار ہے مگر ایسا نہیں بلکہ جس وقت جس عمل کی ضرورت ہو اس وقت اس کے احکام کا جاننا ضروری ہے اور یہ کچھ دشوار نہیں۔ لہذا روز روشن کی طرح معلوم ہو گیا کہ حرج علمی بھی دین میں نہیں اور حرج عملی نہ ہوتا تو اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اس میں اعمال کا اجتماع نہیں

ہوتا۔ ایک ایک وقت میں ایک ایک عمل ہے اور وہ بھی بہت سہل اور کوئی حکم دشوار نہیں۔

تمام احکام سہولت پر مبنی اور بچہ سہل ہیں۔ باقی اگر سہولت احکام خود ہی کوئی شخص دشوار سمجھنے لگے اور عہدی بن جائے اس کا علاج نہیں ورنہ کسی کام میں بھی تو مصیبت اور تنگی نہیں بلکہ تمام احکام میں سہولت ہے۔

چنانچہ دیکھئے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھنا فرض ہے۔ اگر کسی شخص کو قیام پر قدرت نہ ہو بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے اور اس کے لئے حکم ہے کہ بیٹھ کر پڑھے اور اگر بیٹھ کر بھی قدرت نہ ہو تو لیٹ کر پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح رمضان کے روزے فرض ہیں لیکن اگر کوئی شخص مریض ہو اور اس کو رمضان کے روزے پر قدرت نہ ہو تو اسے اجازت ہے کہ اور ایام میں رکھے اور اگر یہ یقین ہو کہ اب مجھے عمر بھر قدرت نہ ہوگی تو فدیہ دے دے اور اگر فدیہ پر بھی قدرت نہ ہو تو استغفار کرے۔

غرض اسی طرح سے احکام میں تشقین و تفصیل ہے جو محض سہولت کی وجہ سے کی گئی ہے۔ تو دین پر عمل کرنے میں کسی قسم کی تنگی اور حرج نہیں۔ اسی طرح جو شخص نکاح کا ارادہ کرے اس پر نکاح کے احکام سیکھنا ضروری اور فرض ہیں مگر اس وقت وہی احکام فرض ہوں گے کہ جو وقت تزوج کے ہیں طلاق کے احکام اس وقت سیکھنے فرض نہ ہوں گے۔ کیونکہ نکاح بہ نیت طلاق موجب مصیبت ہے یعنی اس نیت سے نکاح کرنا کہ میں طلاق دے دوں گا موجب

گناہ ہے۔ اور اس نیت سے گناہ ہوتا ہے البتہ نکاح ہو جاوے گا مگر گناہ ضرور ہوگا۔ اور نکاح نافذ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ زنا کا گناہ نہ ہوگا۔ بہر حال جب یہ عزم اور یہ ارادہ معصیت ہوا تو یہ ارادہ نہ کیا جائے گا کہ طلاق دوں گا اور جب یہ ارادہ نہ ہوگا تو تزوج کے وقت احکام طلاق کا سیکھنا ضروری اور فرض بھی نہ ہوگا البتہ جب عزم طلاق ہو، اس وقت احکام طلاق سیکھنے فرض ہونگے کہ طلاق کس وقت دینی چاہئے۔ طہریں یا حیض میں اور کسے دینی چاہئیں۔ مثلاً تین طلاق دفعہ دینی چاہئیں یا متفرق طور سے۔ پھر جب طلاق موافق سنت دے دی تو اب یہ احکام سیکھنے ضروری ہیں کہ یہ طلاق رجعی ہوئی یا بائن اور عدت کے احکام سیکھنے لازم ہوں گے کہ عدت میں نفقہ ضروری ہے یا نہیں تو ان احکام کا اس وقت سیکھنا ضروری ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں۔ زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں۔

پس اسی طرح یہ مضمون بمقصد و بالبیان بھی اسی قسم سے ہے کہ اس کی ہر شخص کو ضرورت نہیں ہے کیونکہ مکان تعمیر کرنے کا ہر شخص کو سابقہ نہیں پڑتا ہے۔ گو شوق اور خبط تقریباً عام طور پر سب کو تعمیر مکانات کا ہے الا نادراً چنانچہ جو لوگ مکان بناتے ہیں اگر ان کو گنجائش نہیں بھی ہوتی تب بھی اپنی وسعت سے زیادہ صرف کر دیتے ہیں یہاں تک اگر حوصلہ سوکا ہے تو پانچ سو سو خرچ کر کے پریشان ہوتے ہیں۔ عرض تعمیر مکان کی تمام شخصوں کو حاجت نہیں ہے البتہ اکثر کو بے شک ضرورت ہے۔ ایسے افراد بہت کم ہیں کہ جن کو تعمیر مکان کی حاجت نہیں ہے۔ زیادہ وہی ہیں جن کو ضرورت ہے۔ پکا نہ سہی تو کچا سہی

اور لحاظ زیادہ افراد کا ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہ لاکھ حکم اکل اس لئے اگر کوئی شخص اس مجمع میں ایسا ہو کہ اس کو تعمیر مکان کی حاجت نہ ہو تو اس کی رعایت سے اس وقت اس بیان کو چھوڑا نہ جائے گا کیونکہ النادر کا معدوم۔

خلاصہ یہ ہوا کہ یہ مضمون یعنی تعمیر مکان کا اکثر کے متعلق ہے اور چونکہ اس کے آداب اور شرائط معلوم نہیں اور ہم خود مختار ہیں نہیں اور کچھ احکام ہم پر اس کے متعلق بھی ہیں۔ اس لئے ان احکام کے بدلنے کی ضرورت ہے اس سے بعضہ جہلا یہ خیال کرتے ہیں کہ شریعت میں بڑی تنگی ہے کہ ہر چیز کے احکام ہیں کہ اس طرح کھاؤ اور اس طرح پیو۔ تمام چیزوں کے قواعد بنا دیئے ہیں بلکہ مزید برآں فی زمانہ بہت لوگ تو احکام شرعیہ کو مولویوں کی گھڑت خیال کرتے ہیں۔ خداوندی حکم بھی خیال نہیں کرتے اور جو خداوندی احکام خیال کرتے ہیں وہ ان احکام میں تنگی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ احکام میں بے حد سہولت ہے اور حیرت تو یہ ہے کہ گمان یہ ہو گیا ہے کہ احکام تنگی کے واسطے موقوف ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی طبیب کسی مریض کے واسطے مسہل کا نسخہ تجویز کرے مگر مریض اس مسہل کی حمایت پر نظر نہ کرے اس کے ذائقہ کی تلخی دیکھ کر طبیب کو برا بھلا کہنے لگے۔ تو جیسے اس شخص پر حیرت ہوتی ہے اسی طرح اس شخص پر بھی حیرت ہے جو دین کے احکام کو تنگی کے واسطے موضوع قرار دے۔ چنانچہ ہر شخص مریض کی باتوں کو سن کر یہی کہے گا کہ اس مریض نے غایت پر نظر نہیں کی

صاحبو! مسہل کی ناگواری اسی وقت تک ہے جب تک مواد فاسدہ

دفع ہو کر فوت نمود نہ کرے اور جب مواد دفع ہو جاوے گا اور دو میل تک تفریح کے لئے بے تکلف جا سکے گا اور فرحت اور تازگی پیدا ہوگی جو پہلے نہ تھی اس وقت مجوز مسہل کی قدر ہوگی کہ واقعی طبیب بہت شفیق تھا جس نے غایت شفقت سے مسہل دے کر مواد فاسدہ کو دفع کر دیا۔ اسی طرح سے احکام شریعہ کی حالت ہے۔ جو لوگ عمل کرتے ہیں ان کو عمر بھر کبھی تنگی اور پریشانی پیش نہیں آتی بلکہ وہ بیکراحت ہیں رہتے ہیں۔ اس مضمون کو دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔

شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ ہم تو اہل اللہ کو بھی تنگی اور مصیبت میں دیکھتے ہیں۔ وہ راحت میں کہاں ہیں۔ تو اصل یہ ہے کہ معترض تنگی اور پریشانی کو ذات واقعہ کی صفت اور اثر خیال کرتا ہے حالانکہ یہ اس کا محض خیال ہی ہے۔

تنگی اور پریشانی کی وجہ | حقیقت میں تنگی اور پریشانی ذات واقعہ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ دوسرے عوارض کی

وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً ایک واقعہ جو یہ ہے کسی کو بغل میں دیا لینا سو اس کے متعلق ایک حالت تو یہ ہے کہ کوئی شخص جاراٹھا اور پیچھے سے کسی شخص نے آکر دبا لیا۔ جب اس نے پیچھے پھیر کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک جانی دشمن ہے۔ تو اس وقت اس کی حالت جو کچھ ہوگی وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہی کوشش کرے گا کہ کسی صورت سے جلدی چھوڑوں اور اس صورت سے بچوں ہو میں اس کے ہاتھ سے نکل جاؤں۔

ایک حالت یہ ہے کہ یہ چلا جاراٹھا اور پیچھے سے کسی شخص نے آ

کر دیا لیا۔ اُس نے پیٹھ پھیر کر جو دیکھا تو اُس کا وہ محبوب تھا جس کی بریسوں سے تلاش میں تھا اور مدت سے اُس کی وجہ سے خاک چھانٹا پھرتا تھا۔ وہ اُس کو دبائے ہوئے ہے۔ بتلائیے اس وقت اُس کی کیا حالت ہوگی۔ کیا اُس کا دباننا کچھ ناگوار ہوگا۔ ہرگز نہیں! بلکہ اگر وہ محبوب اُس سے یوں کہے کہ اگر تجھے میرا دباننا گوارا معلوم ہو تو میں اس تیرے رقیب کو اسی طرح سے دبا لوں تو ہرگز یہ شخص پسند نہ کرے گا بلکہ یہی خواہش کرے گا کہ جتنا جی چاہے مجھے دبا لے اور اپنی لکر کو اُس سے ملا دے گا۔

تو ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں واقعہ ایک ہی ہے یعنی دونوں جگہ وہ واقعہ بغل میں دیا لیا ہی ہے۔ مگر دونوں واقعوں میں بڑا فرق ہے۔ تو اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذات واقعہ موجب پریشانی اور حزن نہیں بلکہ عوارض موجب حزن ہوتے ہیں۔ اگر واقعات فی نفسہ موثر ہوتے تو اُس واقعہ میں دونوں جگہ اثر یکساں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ واقعہ فی نفسہ موثر نہیں بلکہ عارض موثر ہے انتساب الی العدو کا اور اثر ہے اور انتساب الی الصديق کا اور اثر ہے۔ یہی فرق ہے اُن واقعات میں جو اہل اللہ اور اہل دنیا دونوں کو پیش آتے ہیں کیونکہ ذات واقعہ تو پریشانی اور حزن میں موثر ہے۔

اہل دنیا کو اگر کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو تنگ اور بدحوال ہوتے ہیں اور اہل اللہ کو اگر کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو اُن کے لئے موجب فرحت ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ کلفت وہ چیز سے اُن کو طبعی تکلیف بھی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن تکلیف میں بھی اُن کو فرحت عظیم ہوتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی شخص کے چھوڑا نکل رہا ہو۔ جراح یا ڈاکٹر نے اس کی حالت دیکھ کر نشتر لگانا تجویز کیا مگر ڈاکٹر کے پاس بیہوش کرنے کی دوا (کلوروفارم) اس وقت موجود نہ تھی۔ اس نے ہوش ہی میں نشتر لگا دیا۔ نشتر لگتے ہی تکلیف کی وجہ سے ایک آہ نکلی۔ مگر جب مواد نکل چکا اس وقت منس رہے ہیں اور ڈاکٹر کو انعام میں پچاس روپیہ دیئے جا رہے ہیں مگر ڈاکٹر اس کو کم سمجھ کر واپس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ زیادہ انعام لو لگا اور یہ خوش ہو رہے ہیں۔ گو نشتر لگتے ہی طبعاً تکلیف بھی ہوئی اور آہ بھی نکلی مگر باوجود اس کے بعد میں خوش ہو رہے ہیں اور انعام دیا جا رہا ہے اور مانگا جا رہا ہے۔ تو صاف ظاہر ہے کہ گورنچ طبعی ہوا مگر فرحت عقلی کی وجہ سے وہ رنج رنج نہیں سمجھا گیا۔

اسی طرح سے جو لوگ اہل اللہ ہیں ان کو جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے خواہ کتنا ہی موجب حزن و پریشانی ہو مگر ناگواری جس کا نام ہے وہ ان کے پاس بھی نہیں آتی۔ گو کسی واقعہ کلفت وہ سے طبعی تکلیف ہو مگر ناگواری کا نام نہیں ہوتا بلکہ فرحت عقلمند ہوتی ہے انتساب الی الحق کی وجہ سے کیونکہ ذاتی واقعہ تو موثر نہیں بلکہ انتساب موثر ہے۔ تو انتساب الی الحق کی وجہ سے ان کو فرحت ہوتی ہے اور اس وقت وہ یوں کہتے ہیں۔

زندہ کنی عطاے تو ور بکشی فدائے تو

جہاں شدہ قبلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

غرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ احکام شرعیہ تنگی کے واسطے موضوع نہیں

اور احکام شریعہ میں فی نفسہ آسانی ہے محض آثار سے تنگی ہوتی ہے اور وہ آثار
 اسی شخص کے حالات ہوتے ہیں جن کو یہ درست کر سکتا ہے۔ اس کی شرح
 یہ ہے۔ یہ تنگی اسی وقت تک ہے کہ صرف علم الیقین کا درجہ ہو جو بشرط ایمان
 ہے اور عین الیقین میسر نہ ہوا ہو۔ جب عین الیقین کا مرتبہ میسر ہوگا۔ یہی معنی ہیں
 ان آثار کے درست کرنے کے، اس وقت آپ کو بھی ہر حکم میں سہولت
 معلوم ہوگی۔ اور یہ درجہ کوئی سلف صالحین کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اب بھی
 حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ یہ مقام ولایت کا ایک درجہ ہے اور نبوت تو بیشک
 ختم ہو گئی مگر ولایت ختم نہیں ہوئی ہے۔

ہنوز اہل ابر رحمت و نشان است خم و خمانہ باہر و نشان است

تو تیرے کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ جب طاعت کرو گے اسی وقت
 اثر معلوم ہوگا کہ کس قدر اور کس درجہ عمل میں سہولت ہے اور کس قدر عمل سے
 فرحت ہوتی ہے۔ عرض احکام شریعت میں یہ خیال کر لینا کہ ان میں تنگی ہے
 محض خیال تمام ہے۔ شریعت میں اصلاً تنگی نہیں۔ شریعت کی تنگی تو ایسی تنگی ہے
 جیسے ایک حکیم نے ایک مریض کے واسطے بہت سی چیزیں بتلا دیں کہ یہ مضر ہے
 اور یہ مفید ہے۔ اس پر کوئی یہ کہے کہ ان حکیم صاحب کے مزاج میں تنگی ہے،
 ان سے تو فلانے حکیم بڑے اچھے ہیں کہ وہ کسی چیز کو بھی منع نہیں کرتے اصل
 یہ ہے کہ وہ محض نام ہی کا حکیم ہے جو کسی چیز سے نہیں روکتا اور وہ حکیم شفیق ہے
 جو مضرات سے روکتا ہے اور اس وقت ہر شخص یہ کہے گا کہ طبیب کا مقصود تنگی
 نہیں بلکہ مقصود شفقت ہے۔ اسی طرح احکام شریعہ کا مقصود تنگی نہیں بلکہ خوش

ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت اور شفقت ہی مقتضی ہوئی ہے ہر امر سے
تصریح کرنے کی اور احکام بتلانے کی۔ تو احکام کا اصل منشاء رحمت ہے تنگی
نہیں ہے اس لئے ہر چیز کا قانون اور حکم معلوم کرنا ضروری ہے۔

البتہ احکام میں درجات ہیں۔ سب میں اہم تو عقائد ہیں۔ اس کے بعد
مرتبہ شعائر دین کا ہے جیسے نماز روزہ۔ اس کے بعد بقیہ احکام۔ حجہ کو اس وقت
عقائد یا نماز روزہ کے متعلق بیان کی چنداں ضرورت نہیں گو وہ سب سے زیادہ
ضروری ہیں۔ مگر اس کی ضرورت اور جزو دین ہونا سب کو معلوم ہے بلکہ ایسے
حکم کے بیان کی حاجت ہے جو واقع میں جزو دین ہے مگر لوگ اس کو جزو
دین نہیں خیال کرتے۔ ایسے مضمون کے بیان کی سخت ضرورت ہے اور میں
نے ایسا ہی مضمون اختیار کیا ہے۔

مگر یہ مضمون اس بنیاد کی بابت نہ سمجھا جاوے جو کل رکھی گئی ہے جو
بوجہ عموم کے اس کو بھی مشتمل ضرور ہے اور نہ مجھ کو اس بنیاد کی بابت زیادہ
مضمون بیان کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی زور دینے اور نہ تزیینی مضمون
بیان کرنے کی حاجت ہے۔ وہ کام خود اپنی ضرورت ظاہر کر دے گا کہ مجھے
اعانت کی حاجت ہے۔ ج

مشک آنتست کہ خود بید نہ کہ عطار بگوید

ہاں کوئی اس کام کو کام ہی نہ سمجھے تو دوسری بات ہے۔ اس وقت
انتظاراً بنیاد مدرسہ پر ایک مضمون ذہن میں آگیا۔ وہ یہ کہ بعض لوگ دینی مدارس
و مساجد پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ ان میں انتظام اور صفائی نہیں۔ نہ بوریئے

دست ہیں نہ کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے۔ اگر ہم کبھی سبائیں بھی تو کہاں بیٹھیں۔ مگر میں ان معترضین سے کہتا ہوں کہ آپ یہ اعتراض کس پر کرو ہے ہیں صاحب مدرسہ کسی ہتھم یا منولی کا گھر نہیں۔ سب مسلمانوں کا مشترک مدرسہ ہے اگر وہاں کی بے انتظامی اور عدم صفائی سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے تو اپنے مدرسہ کی صفائی اور نظافت کا آپ خود کیوں نہیں خیال کرتے۔ مگر ہماری یہ حالت ہے کہ دوسروں کو کہتے ہیں کہ اُن کی یہ حالت ہے اور واقع میں وہ خود اپنی حالت ہے اور وہ اعتراض خود اپنے اوپر پڑتا ہے۔

حملہ بر خود میکنی اسے سادہ مرد ہچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسا ایک مشہور قصہ ہے کہ ایک بیوقوف کا لڑکا روٹی کھا رہا تھا۔ پانی پینے کی غرض سے اٹھا تو ٹکڑا لوٹے میں جا پڑا جھانک کر دیکھا تو اس میں اپنی صورت نظر پڑی۔ باپ کو آواز دی کہ ابا! اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا۔ باپ نے آکر دیکھا تو اسے اپنی صورت نظر پڑی۔ تو آپ کہتے ہیں کہ نف ہے تیرے اوپر۔ بڑھے ہو کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا۔ شرم نہیں آتی۔ نف ہے تیری اوقات پر۔

تو جیسے وہ اپنے زعم میں دوسرے کو کہہ رہا تھا اور واقع میں اپنے

ہی کو کہہ رہا تھا۔ یہی حال ہمارا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

حملہ بر خود میکنی اسے سادہ مرد ہچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

میں ایک دفعہ شاہجہاںپور گیا۔ ایک رئیس کے مساجد کی عدم خبر گیری یہاں دعوت تھی۔ ہم لوگ دعوت میں گئے

مگر نماز عشاء کا وقت قریب تھا۔ اس لئے میں نے کہا کہ پیشتر ہم نماز پڑھ لیں۔ نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھاویں گے۔ چنانچہ ہم لوگ مسجد میں گئے مگر وہ میزبان صاحب تشریف نہ لائے۔ وہ نماز تو پڑھتے تھے مگر مسجد میں نہ آتے تھے۔ مسجد کی حالت بہت خراب تھی۔ افسوس ہے کہ اللہ میاں کے گھر کی ایسی بیفردی کی جاتی ہے کہ نہ اس کی صفائی کا اہتمام ہے نہ خبر گیری کی جاتی ہے۔ عرض اس مسجد میں کسی قسم کا بھی انتظام نہ تھا مٹی کی ایک ڈبیا رکھی تھی اور روشن ہو رہی تھی۔ جس کے دھوپیں اور بوسے سخت کلفت ہوئی۔ مسجد سے واپسی کے بعد میں نے اس حالت پر افسوس ظاہر کیا تو وہ رہیں شرا گئے۔

غیبت ہے یعنی تو ایسے موقع پر فتوحی سے یوں کہنے لگتے ہیں کہ ہم تو اسی واسطے اپنے گھر پر نماز پڑھ لیتے ہیں کہ مسجد میں صفائی کا اہتمام نہیں۔ مگر میں ادب و تہذیب سے عرض کرتا ہوں کہ آپ جو گھر پر نماز پڑھتے ہیں اسی لئے تو وہاں صفائی نہیں کیونکہ اب نماز پڑھنے والے صرف غریب ہیں۔ وہ بیچارے اپنی ہمت کے موافق جو کچھ ان سے ہو سکتا ہے انتظام کرتے ہیں۔ تو آپ کا مسجد والوں پر اعتراض کرنا درحقیقت اپنے اوپر اعتراض ہے کیونکہ مسجد سب مسلمانوں کی ہے۔ صرف غریبوں کی نہیں ہے۔ آپ بھی تو مسجد والوں میں داخل ہیں۔ پھر آپ خود کیوں نہیں انتظام کرتے۔ جب کوئی پر دہی مسجد کو اس حالت میں دیکھے گا، وہ تو یہی کہیگا کہ یہاں کے مسلمان بہت ہی ناقد سے ہیں جو مسجد کو اس حال سے رکھتے

ہیں جس میں آپ بھی داخل ہوں گے۔ کم از کم ایک اوجہ وقت کی نماز تو آپ مسجد میں پڑھ لیا کیجئے۔ اور مسجد کی خبر گیری رکھئے۔ مسجد خود بنلا دے گی کہ میرے اندر فلاں فلاں کمی ہے۔

اسی طرح سے مجھے یہاں کچھ ضرورت نثر غیبی مضامین بیان کرنے کی نہیں ہے۔ مدرسہ خود بنلا دے گا کہ مجھے اعانت کی حاجت سے اور اگر اس پر بھی اعانت نہ کریں تو حق تعالیٰ ہمارے محتاج نہیں ہیں۔ اگر میں اس پر نثر غیبی مضمون بیان کوٹا تو اس وقت تو سامعین جوش میں کچھ دے دیتے مگر بعد میں بعض لوگ میری طرف نسبت کرتے کہ ہم نے اس کی وجہ سے دے دیا۔ لہذا مجھے احسان لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ دین کا کام سب مسلمانوں کا ہے میں اپنے اوپر کیوں احسان لوں۔

ابھی قریب کا واقعہ ہے کہ جلال آباد میں ایک شخص نے مدرسہ کے لئے کچھ رقم دی، مرض موت کی حالت میں۔ پھر اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے لئے فرائض کا مسئلہ مجھ سے پوچھا گیا۔ میں نے جواب تو لکھ دیا جس میں وصیت اور میراث دونوں حکموں کی تحقیق لکھ دی مگر دستخط نہیں کئے۔ بعض لوگوں نے دستخط پر اصرار کیا۔ میں نے کہہ دیا کہ دستخط سے ورثہ مجبور ہو جائیں گے۔ اور یہ لوں کہیں گے کہ ہم نے فلاں شخص کے کہنے کی وجہ سے وصیت کو مان لیا ورنہ نہ ماننے۔ تو میں خواہ مخواہ کیوں احسان لوں ضروری جواب میں نے لکھ دیا ہے۔ اگر اس میں شبہ ہے کسی اور عالم سے فرائض نکلوالیں۔ اور اپنا اطمینان کر کے جو کچھ کریں خود کریں۔ میرے

اوپر احسان رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

سفرِ ایش کی خرابیاں | صاحبِ ہوا اسی واسطے تجربہ کاروں کی طبیعت آج کل سفرِ ایش سے رک گئی ہے۔ اس لئے کہ اولاً

تو سفرِ ایش کا اس زمانہ میں کوئی اثر ہی نہیں اور اگر اثر بھی ہو تو بہت ذلت سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ساری عمر دوسرے کا اپنی گردن پر احسان رہتا ہے کہ اس کی سفرِ ایش سے ہم نے ایسا کر دیا اور یہ تو ظاہر ہے کہ ہم جیبوں کا کوئی اثر بھی نہیں ہے۔ مگر جہاں اثر نہیں ہوتا وہاں کے لئے کوئی سفرِ ایش بھی نہیں چاہتا۔ سفرِ ایش دین کر لیتے ہیں جہاں کچھ اثر ہو۔ سو ایسی جگہ دوسرے کو تکلیف ہے اور جہاں اثر نہ ہو وہاں اپنی ذلت ہے۔

اس تقریر سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس میں ایجاب و سلب کا مقابلہ ہے اور یہ حصرِ عقلی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ حصرِ عقلی نہیں ہے بلکہ ان میں باہم تضاد ہے جہاں ارتقاع دونوں کا ممکن ہے۔ اس لئے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ نہ ذلت ہو اور نہ کسی کو تکلیف ہو بلکہ سفرِ ایش کا اثر ہو محبت کی وجہ سے۔ تو جہاں یہ صورت ہو وہاں سفرِ ایش کا مضائقہ نہیں۔ مگر آج کل ایسا نادر ہے۔ و نادر کا معدوم۔

الحاصل سفرِ ایش کی تین صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ نہ تو محبت کا اثر ہو اور نہ وجاہت کا اس میں تو ذلت ہے۔

ایک یہ کہ وجاہت کا اثر ہو محبت کا نہ ہو اس میں مخاطب کو تکلیف ہے

ایک یہ کہ وجاہت کا اثر نہ ہو محض محبت کا ہو۔ اس میں مضائقہ نہیں اس میں سفارش کرنے والے کو ذلت نہ مخاطب کو تکلیف۔ بشرطیکہ محبت کافی ہو۔ اور بے تکلفی بھی ہو۔ چونکہ تیسری قسم نا اور الوجود ہے اس لئے میں نے سفارش کرنی چھوڑ دی۔

اسی طرح تحریک چندہ کی بھی یہی دو حالتیں ہیں یا تو محرک کا اثر ہے یا نہیں۔ اگر محرک کا اثر نہیں تو ذلت ہے اور اگر ہے تو تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اثر وجاہت ہی کا عموماً ہوتا ہے اور اس اثر سے چندہ لینا حلال نہیں (اللا یجوز مال امر مسلم الا بطیب نفس منہ حدیث ہے) اور اس وجہ سے میں بھی تحریک نہیں کرتا اور اس میں زبان کا بند کرنا ہی بہتر خیال کرتا ہوں۔ اور چونکہ خدا کا کام ہے اس لئے زبان سے چنداں تحریک کرنے کی حاجت بھی نہیں۔ اس کی صورت خود ہی شفاعت کرے گی اور کرتی ہے۔ صرف خلوص کی ضرورت ہے۔ کسی اثر ڈالنے اور پالیسی کی حاجت نہیں۔ کام شروع کر دینا چاہئے۔

چنانچہ حضور نے تبلیغ اسلام میں کوئی تدبیر نہیں کی۔ کوئی کاوش نہیں کی۔ ہم لوگ اگر اس وقت موجود ہوتے تو ہم تو یہی مشورہ دیتے کہ پہلے ہی اثر لوگوں کو اپنا متفق کرنا چاہئے۔ جب وہ متفق اور ہم خیال ہو جاویں گے تو اول لوگوں پر زیادہ اثر ہوگا۔ مگر حضور نے ہرگز ہرگز یہ تدبیر نہیں کی۔ یا اثر لوگوں کو دد کے لئے جمع نہیں کیا بلکہ چند عزا ہی اول حضور کے ہم خیال ہونے اور پھر آپ نے کفار کے مقابلہ میں کتنی سخت بات کہی تھی کہ خالی سے وحدہ

لاشریک لہ پر ایمان لاؤ اور اپنے جھوٹے معبودوں کو چھوڑ دو۔ سو ایسی ناگوار بات پھر وہ بھی علی الاعلان۔ پھر اس میں ذی اثر لوگ ہم خیال بھی نہیں مگر پھر بھی آپ کو تبلیغ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی اور نہ کسی تدبیر کا اہتمام ہوا اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کو ذی اثر لوگوں کو ہم خیال کرنے کی حاجت ہی کیا تھی۔ حضورؐ کا تو سچا رنگ تھا جو خود لوگوں کو اپنی طرف جذب کرتا تھا۔ اس کو کسی دوسرے اثر کی ضرورت نہ تھی۔

ز عشقنا تمام ما جمال یار مستغنی است

بآب رنگ خال و خط چہ حاجت روئی بیار

صاحبو! شعبدوں کی اس کو ضرورت ہوتی ہے جو واقعی تصرفات پر قادر نہ ہو اور جو واقعی

حضورؐ کی تبلیغ اسلام

تصرفات پر قادر ہوں انہیں شعبدوں کی کیا ضرورت ہے۔ حضورؐ کو یہ حکم ہوا تھا کہ فاصدع بما تو مروا عنہ عن المشركین اور یہ حکم ہوا تھا کہ وانذر عشیرتک الا قدرین اور انجن کرنے کا اور انجن بنانے کا حکم آپ کو نہیں ہوا۔

چنانچہ حضورؐ یہ حکم سنتے ہی پہاڑ پر تشریف لے گئے اور تمام آدمیوں کو جمع کر کے فرمایا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک غنیم پڑا ہوا ہے اور وہ تم کو لوٹنا چاہتا ہے تو تم میرے قول کو کیا سمجھو گے۔ سب بولے کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچا اور امین دیکھا ہے اس لئے ہم ضرور آپ کے قول پر یقین اور اعتماد کریں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ

اُس خدا کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ورنہ سخت عذاب کا سامنا ہوگا۔ یہ سن کر سب لوگ بگڑ گئے اور گستاخیاں کرتے ہوئے واپس ہوئے۔ اِس کے بعد بھی اسلام میں ضعف ہی داخل ہوئے اور کسی ذی اثر کے متفق کرنے کی سعی نہیں کی گئی مگر جب حق واضح ہو گیا تو بیساختہ ذی اثر لوگوں کو بھی حلقہ بگوش اسلام ہونا پڑا اور سمجھ گئے کہ واقعی یہی طریق فلاح ہے۔

اسی طرح ہم کو بھی اول کام کرنا چاہئے اور کسی کے متفق بنانے کا وہم نہ کرنا چاہئے۔ مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ جب تک کسی ذی اثر کو کام میں داخل نہ کریں اُس وقت تک یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری انجمن کو ترقی نہ ہوگی۔ بس انجمن کی ترقی کا موجب با اثر لوگوں کو خیال کرتے ہیں۔ یہاں تک مذاق بگڑ گیا ہے۔

کانپور میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ ایک صاحب نے تقریر کی اور پہلے سے ایک سیٹھ کو اثر ڈالنے کے واسطے پڑھا کر لائے تھے کہ جب میں تقریر کر چکوں تو کھڑے ہو کر کہہ دینا کہ میں تائید کرتا ہوں۔ چنانچہ جلسہ میں اُن صاحب نے تقریر کی۔ جب تقریر کر چکے تو وہ مہاجن صاحب کھڑے ہو کر بولے میں بھی تائید کرتا ہوں۔ ان صاحب نے آہستہ سے کہا کہ تائید تو انہوں نے کہا کہ تروید کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے آہستہ سے تعلیم کی مہاجن صاحب بولے کہ میں تائید کرتا ہوں۔ خبر وہ ساکت ہو گئے کہ تاہم تائید ہو گئی۔

عزم یہ حالت ہو گئی ہے۔ یہ بھی سلیقہ نہیں رہا کہ تائید کا کون اہل

ہے اور کون نااہل۔ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کس شخص کا اثر ہوگا۔ پس جس شخص کو ذی اثر سمجھتے ہیں اسی کو تلاش کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے اذا واصل الاموال
غیر اہلہ فانظر الساعۃ۔ آج کل

نااہل کو منظم یا ہتھیام بنانا

یہی حالت ہے کہ نااہل کے کام سپرد کرتے ہیں اور اہل کے اس واسطے سپرد نہیں کرتے کہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو آپ اہل کہتے ہیں، ان کے کرتے پا جائے پھٹے ہوئے ہیں۔ وضع قطع غیر مناسب ہے۔ ایسے لوگوں سے ہماری مجلس کی بیقراری ہوگی۔

اس لباس پر نظر کرنے پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ مجھے ایک مرتبہ مدعو ہو کر اپنے احباب کے ساتھ شملہ جانے کا اتفاق ہوا۔ بعد جمعہ میرا بیان تھا۔ کرنل عبدالمجید خاں جن کی طرف سے وعظ کا اعلان تھا، ان سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ کیا انہیں کا بیان ہوگا۔ انہوں نے کہا، ہاں۔ وہ صاحب بولے کہ ان کا لباس کیسا ہے جیسے پانخانہ میں سے آئے۔ انہوں نے کہا کہ بعد وعظ کے کہنا۔ چنانچہ انہوں نے بیان سنا۔ بعد وعظ کے بولے کہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ جیسے کپڑے ہیں ویسی لیاقت ہوگی مگر ان تو برعکس قصہ ہے۔

یہ قصہ مجھے بھی معلوم ہوا تو دوسرے بیان میں میں نے کہا کہ صاحبو! غصے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مولویوں کو اعلیٰ درجہ کے اور قیمتی کپڑے پہنانا چاہیے۔ میں اس راستے کی تائید کرتا ہوں کیونکہ اس کا نشاء محض بری مصلحت

ہے کہ باوقفت لباس سے واعظ کے اثر کی وقعت ہوگی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہم لوگوں کو قیمتی کپڑے بنانے دشوار ہیں۔ اس لئے کہ اگر جائز آمدنی سے روپیہ کمانا چاہیں تو کوئی مولوی تھیں کتب کا گہ کے کھانا ہے اور کوئی تدریس میں مشغول ہے جن میں کوئی دس کا ملازم ہے اور کوئی بیس کا۔ انتہائی معرکہ اور نہایت عزت ہوئی تو پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ اس آمدنی میں تو قیمتی کپڑے بننا دشوار ہیں اور اگر اس کے سوا دوسرا طریقہ اختیار کریں کہ وعظ کہتے اور وصول کرتے پھریں۔ سو وہ عقلاً و نقلاً دونوں طرح ناجائز ہے۔ بس اس حالت میں صرف ایک یہ طریقہ رہ گیا کہ آپ لوگ ایک جوڑا بنا دیجئے اور حلتی قیمت کا چاہے بنواد دیجئے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اسے اپنے گھرنے جاویں گے بلکہ شملہ میں ہی رکھ جاویں گے اور جہت یہاں آنا ہوا کرے گا تو اسے پہن کر وعظ کہہ دیا کریں گے۔ اور اگر کسی دوسری جگہ بھی اس مذاق کے آدمی ملیں گے ہم ان سے بھی جوڑا بنا کر رکھ لیں گے۔ اب میں منتظر ہوں کہ یہ معترض صاحب جنہوں نے محض تہمت خواہی کی وجہ سے ہمارے لباس پر اعتراض کیا ہے کیسا قیمتی جوڑا بنا کر لاتے ہیں۔ ان معترض صاحب کو یہ سن کر بے حد عبرت آئی۔

بس آج کل لباس کو دیکھا جاتا ہے۔ جن کے کپڑے اچھے ہوں گے اس کو لیدر اور سکیڑی بنا لیا جنہیں کام کا طریقہ بھی معلوم نہیں۔ محض نکتے لوگ انجنیوں کے منتظم ہیں۔ ایسے مواقع میں کام کے آدمی رکھے نہیں جاتے۔ چنانچہ آج کل ایسے منتظمین بہت ہیں اور وہ جو جی میں آتا ہے کہ لگتے

یہ حالت ہے آج کل کے کام کرنے والوں کی۔ اسی کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔ اذا وسد الاموالی غیر اھلہ فانظر الساعة۔ صاحبو حضور نے تو ضعفاء کو پہلے متوجہ کیا تھا اور ہم ذی اثر لوگوں کو پہلے لیتے ہیں۔ حالانکہ حضور کے انتخاب سے ضعفاء کا مرتبہ پہلے ہے تو یا کا پیچھے۔ ضعفاء میں باطنی قوت، ہمت، برکت، خلوص زیادہ ہوتا ہے نسبت تو یا کے۔ چنانچہ مجھے ایک مرتبہ یہ قصہ پیش آیا کہ ایک گاؤں سے کیرانہ کے راستہ میں۔ وہاں سے ایک شخص میرے پاس آیا اور اس نے مجھے اڑھائی آنے دیئے۔ میں نے فوراً لے لئے اور عادی۔ اس لئے کہ اڑھائی آنے کے پیسے میں اگر کوئی زبردستی بھی ربا کی نیت کرے تب بھی قادر نہیں۔ خدا تعالیٰ جانتا ہے۔ اگر کوئی سو پچاس دینا ہے تو طبیعت رکتی ہے۔ کیونکہ احتمال ربا وغیرہ کا ہوتا ہے اور اڑھائی آنے کے پیسے میں کسی چیز کا بھی احتمال نہیں۔

بہر حال غریبوں اور ضعفاء ہی کے پیسے میں خاص برکت ہوتی ہے حدیث میں ہے هل تنصرون و تدرقون الا بضعافکم۔ معلوم ہوا کہ نصرت علی الاعداء بھی ضعفاء ہی کی وجہ سے ہے۔ تو بیرونی برکت اور اندرونی برکت دونوں ضعفاء ہی کی وجہ سے ہیں۔ نصرت سے مراد بیرونی برکت ہے اور رزق سے مراد اندرونی برکت ہے۔ یہ سب غریبوں کی بدولت ہے گو یہ ظاہری سائنس کے خلاف ہے کیونکہ ضعفاء میں کوئی ظاہری اثر نہیں ہوتا مگر مشاہدہ یہی ہے۔

عزیز آج کل ظاہری وجاہت پر نظر کر کے ہر کام نااہل کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور ہر کام میں نااہل گھسے ہوئے ہوتے ہیں جو بجائے کام کے روپیہ جمع کرنے کو بڑا مقصود سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اصل مقصود کام ہے خواہ کسی پیمانہ پر ہو۔ پس جس پیمانہ پر کام کرنا قدرت میں ہو اس کے موافق شروع کر دینا چاہئے۔

کام کی برکت حق تعالیٰ نے کام میں برکت رکھی ہے۔ چنانچہ چند صحفہ نے اسلام کا کام شروع کر دیا تھا۔ تو مشرق سے مغرب تک آواز گونج گئی۔ چنانچہ انجیل کی ایک مثال صحفہ اہل حق کے متعلق حق تعالیٰ نے قرآن میں نقل فرمائی ہے ارشاد فرماتے ہیں۔
 كذَرَعَا حُجْرًا شَطَاةً فَآذَرْتَا سَلْتَظْلًا فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ

سَوْفَةٍ لَّيْجِبُ الزَّرْعَ لَيَغِيظُ بِهِمُ الْكُفْرَ

کہ جیسے دانہ زمین میں ڈالا گیا تو جیسے کھیتی کہ اس نے اپنی سوٹی نکالی۔ پھر اس نے اس کو قوی کیا۔ پھر وہ کھیتی موٹی ہوئی پھر اپنے نئے پر سیدی کھڑی ہو گئی کہ کسانوں کو کھلی معلوم ہونے لگی۔ تاکہ ان سے کافروں کو جلاوے۔

یہ برکت ہے کام کی کہ اگر رات کا بھی دانہ ڈالو تو کھیت میں کس قدر بڑا درخت ہو جاتا ہے۔ جب کام شروع کرنے میں اس قدر برکت ہے تو مجھے تحریک چتہ کی کیا ضرورت ہے۔

میں کانپور میں تھا جب کام شروع کیا۔ اور مدرسہ جامع العلوم کی

ابتداء ہوئی تو صرف پانچ روپیہ ہاتھ میں تھے۔ مدرسہ خدا کے نام پر شروع کر دیا۔ پھر بعد اللہ مدرسہ نے اس قدر ترقی کی کہ کانپور میں باوجودیکہ اکثریت مدرسے تھے مگر اس کے سامنے سب ماند پڑ گئے۔ لوگ دوسرے مدارس کے چتڑہ کی تحریک کرتے مگر سننے والے انہیں تو دیتے نہیں تھے اور جامع العلوم میں دیتے تھے۔ شہر کے لوگ کسی جگہ کے منولی کا اعتبار نہ کرتے تھے اگر کوئی مسلمان ہوتا تو اس کے اسلام کا اعتبار نہ کرتے جب تک جامع العلوم میں آکر مسلمان نہ ہوتا۔

ان سب امور کی وجہ صرف نیت خالص تھی۔ کوئی دنیاوی غرض نہ تھی۔ کسی سے یہ کبھی نہیں کہا کہ ہمارے مدرسہ میں چتڑہ دو اور اگر ان خود دینا چاہا اور قرآن سے معلوم ہو گیا کہ یہ دوسرے میں دیا کرتا ہے اور دلال کا چتڑہ یہاں منتقل کرتا ہے تو لینے سے انکار کر دیا جاتا تھا کیونکہ یہ نیت کر لی تھی کہ جب نہیں چلے گا چھوڑ دیں گے۔ اس لئے کہ غایت تو حق تعالیٰ کی خوشنودی تھی۔ اپنی ذات کے واسطے نہیں کیا تھا۔ بس جب تک انہوں نے چاہا کام لیا۔ اگر وہ نہ چاہتے تو ہم چھوڑ کر کسی اور کام میں لگ جاتے۔

صاحبو! مدارس اور مساجد کی غایت یہی ہونی چاہئے۔ اور اگر اس کے خلاف ذہن میں ایک مقدار معین کر لیتے کہ مدرسہ اس قدر اونچا ہوتا چاہئے ایسے انداز کا ہو تو جب اس انداز کا حلال آمدنی سے نہ بنتا تو حرام سے بنانے کی سعی کرتے۔ اس کا انجام سوائے بربادی کے کچھ نہ ہوتا۔ مگر

چونکہ رضا مندی خدا تعالیٰ غایت تھی اس لئے کسی قسم کی سعی نہیں کی گئی۔ خدا نے اس میں برکت کر دی۔ واللہ خدا کے واسطے کام کر کے تو دیکھو۔ انشاء اللہ خوب خوب ترقی ہوگی۔

پہلی بھیت میں ایک بزرگ تھے اور وہ اصطلاحی عالم بھی نہ تھے گناہی بنا یا کرتے تھے۔ ایک دفعہ شاہ صاحب نے اسٹیشن پر مسجد بنانا شروع کی۔ ہندوں نے بھی مندر بنانے کی درخواست دے دی۔ کلکٹر نے خوف فساد مسجد کی تعمیر کو بھی روک دیا۔ شاہ صاحب کو خبر کی گئی فرمایا اچھا بھائی خدا تیرا بھلا کرے اور تعمیر بند کر دی۔ لوگوں نے کہا کہ حضور اس میں کوشش کی اجازت دیجئے۔ ضرور کامیابی ہوگی۔ فرمایا ہم کو اس کی ضرورت نہیں۔ ہم مسجد کس کے واسطے بناتے تھے۔ ہم تو خدا کے لئے بناتے تھے لوگ نہیں بننے دیتے پس نہیں بناتے۔ ہم اپنا گھر کب بناتے تھے۔ کلکٹر کو جو کہ مسلمان تھے اس امر کی اطلاع ہوئی۔ کلکٹر خود شاہ صاحب کے مکان پر آئے۔ اور ایسی صورت سے کہ لوگ نہ پہچانیں۔ شاہ صاحب دروازہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ وہاں ایک تخت آنے والوں کے لئے بٹا ہوا تھا اور ایک چار پائی پر شاہ صاحب تشریف فرما تھے۔ کلکٹر پہنچے، تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ اس نے بیٹھ کر کہا کہ سنا ہے کہ آپ کوئی مسجد بنانا چاہتے تھے اس کا کیا واقعہ ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ہاں بھائی ایک مسجد بنانا چاہتے تھے مگر کلکٹر نے روک دیا۔ ہم نے کہہ دیا اچھا بھائی خدا تیرا بھلا کرے ہمیں تو ثواب مقصود تھا اور وہ نیت

سے مل گیا۔ اگر خدا کو منظور ہوتا مسجد بھی بن جاتی۔ اب ان کو منظور نہیں ہے تو ہم بھی اصرار نہیں کرتے۔ شاہ صاحب نے جب کلکٹر سے یہ بیان کیا تو وہ اس سادگی سے متاثر ہوا اور کہا کہ وہ کلکٹر میں ہی ہوں۔ چلتے آپ مسجد کی تعمیر جاری کر دیجئے۔ فرمایا بہت اچھا خدا تمہارا بھلا کرے۔

اس پر کچھ اس کا شکریہ ادا نہیں کیا کیونکہ مسجد کوئی کسی کے باوا کا گھر تھا جو کسی کا شکریہ ادا کیا جائے۔ اسے خدا کا گھر ہے جو بنوادے گا اُسے خود ثواب ملے گا۔ ہم پر کیا احسان ہوا۔ مگر آج کل یہ بھی ایک طریقہ نکلا ہے کہ جب کوئی مدرسہ میں چندہ دیتا ہے تو اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں یہ معلوم یہ کس چیز کا شکریہ ہے۔

میں نے ایک جلسہ میں کہہ دیا تھا کہ ہم کسی چندہ دینے والے کا شکریہ ادا نہیں کریں گے بلکہ دینے والوں کو الٹا ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ ہم مصیبت جھیل کر ان کی رقم کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کو موقع خیر میں صرف کرتے ہیں۔ اور جو لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے گھر رکھنا چاہتے ہیں۔ دیکھئے شاہ صاحب کی اس سادگی اور خلوص کی کس قدر برکت ہوئی اور کس قدر اثر ہوا۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ

دلفریب ان تباہی ہمہ زبور بستند و لبراست کہ باحسن خدا داد آمد

زیر بار نذر درختاں کہ شہرہ داد آمد

اے خوشامرو کہ از بندِ غم آزاد آمد

بنادگی اور جاؤ بیت | غرض سادگی تو خود جاؤب ہوتی ہے مگر یہ
 یہ تکلفات لہے ہوئے ہیں۔ اس لئے

اس جذب کا احساس نہیں ہے۔ واللہ اگر علماء اس سادگی کو اختیار کریں
 اور یہ تصنع اور بناوٹ چھوڑ دیں تو اہل دنیا ان کے دروازہ پر خود ہی آکر
 مانٹھا کر گئے گلیں۔

پچھلے دنوں دیوبند میں کچھ مخالفت تھی۔ کچھ آدمی شہر کے مدرسہ کا
 ممبر ہونا چاہتے تھے اور مدرسہ والوں کی طرف سے انکار تھا۔ حضرت
 مولانا گنگوہی سرپرست تھے۔ میں نے مولانا کی خدمت میں گنگوہ خط لکھا
 کہ اگر یہ لوگ ممبر بناویں تو کسی سے اندیشہ تو کچھ ہے نہیں کیونکہ
 یہ تو ظاہر ہے کہ فیصلہ تو کثرت رائے پر ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مدرسہ
 کے لوگ کثیر ہیں۔ اس وقت مصلحت ایسی کو مقتضی ہے کہ ان لوگوں کو
 ممبر بناویا جاوے ورنہ یہ لوگ مخالف رہیں گے۔ جس میں مدرسہ کی قوی
 حضرت کا اندیشہ ہے۔

مگر ان حضرات کی عقل تو قدسی ہوتی ہے وہ دوسری ہی عقل ہے
 کہ اس کے برابر کسی عقل کا ہونا مشکل ہے۔ حضرت نے تحریر فرمایا کہ
 ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اگر ہم ان کو مدرسہ میں داخل نہ کریں گے
 تو غایت مافی الباب وہ لوگ مخالفت کریں گے اور ان کی مخالفت مدرسہ
 کو مضر ہوگی۔ اور مدرسہ ٹوٹ جاوے گا تو بلا سے ٹوٹ جاوے ہم
 تو نہیں توڑنے، جو ہم سے سوال ہو اور اگر ہم نے ان کو داخل کر لیا تو

آخرت میں یہ سوال ہوگا کہ تم نے نا اہل کو کیوں داخل کیا اور تخریر فرمایا کہ ہم کو حق تعالیٰ کی رضا مقصود ہے اور نہ مقصود نہیں۔

اللہ اکبر! کس قدر قوت کی بات ہے۔ پھر حضرت نے اہل شہر کی مہربی کو منظور ہی نہ کیا۔ آخر دو چار دن چلا کہ سب خود ہی بیٹھ رہے اور بعد کو سب سیدھے ہو گئے۔ یہ کاہے کا اثر تھا صرف اس کا کہ حضرت کو رضائے حق مطلوب تھی، بقاد مدرسہ مقصود بالذات نہ تھی۔ جس کا یہ مذاق ہوگا وہ اہل دنیا کی ہرگز خوشامد نہ کرے گا۔ اہل مدارس کو یہی طرز اختیار کرنا چاہئے۔ پس یاد رکھو کہ بڑی پیروی کی محبت اور عزت ہے۔ علماء کو دین کی عزت کا لحاظ رکھنا چاہئے جس میں ان کی بھی عزت ہوگی۔ اور دین کی عزت استغناء میں ہے۔ علماء دنیا داروں سے جب تک استغناء نہ کیجئے اس وقت تک ان کی عزت نہ ہوگی۔ اور جب علماء استغناء کریں گے، اسی وقت عزت اور عظمت رونما ہوگی اور یہ دنیا دار خود ان کے دروازوں پر ہاتھ گرٹتے پھریں گے۔

خود داری کا تقاضا

مگر آج کل تو علماء نے اپنی قدر خود کھودی ہے کہ دنیا داروں کے دروازوں پر جاتے اور

کھانا لاتے ہیں۔ چنانچہ دیوبند کا واقعہ ہے کہ وہاں ایک تحصیلدار صاحب تھے۔ ایک طالب علم کا کھانا ان کے یہاں مقرر تھا۔ وہ طالب علم روزانہ کھانا لینے کے واسطے آیا کرتے تھے اور کھانے میں اکثر دیر ہو جایا کرتی تھی تو ان کا خالی وقت بیکار رہتا تھا۔ انہوں نے تحصیلدار صاحب سے

ایک فن و سوزی سے کہا کہ میں روزانہ اتنی دیر بیکار رہتا ہوں اور آپ کا لڑکا بھی کھیلتا پھرتا ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں اتنی دیر آپ کے لڑکے کو کچھ عربی پڑھا دیا کروں۔ تحصیلدار صاحب نے فرمایا کہ مولانا کیا ہوگا آپ نے پڑھا کہ کیا کیا۔ میرے دروازہ پر بھیک مانگنے آتے ہیں اور یہ پڑھ کر آپ کے دروازہ پر بھیک مانگنے جاوے گا۔ یہ ہے آج کل علم دین کی قدر۔ علماء کو بھی چاہئے کہ ایسوں کے دروازوں پر پیشاب بھی نہ کریں مگر صرف احتیاج کی وجہ سے ان کی طرف دوڑتے ہیں۔ یہ دوڑنے والے عذر کہتے ہیں کہ۔

آنکہ شیریں را کدرو باہ مزاج احتیاج است احتیاج است احتیاج

مگر دوسرا شعر اس کا جواب بھی ہے کہ۔

شیرین کے بیشتر وہ بہ مزاج میزند بر کفش خود صد احتیاج

انبیاء علیہم السلام کی تو یہ نشان اور حالت تھی کہ جب وعظ و پند فرماتے تو

صاف فرماتے ہیں۔ یقوم لا اسئکم علیہ اجرا اور یقوم لا اسئکم

علیہ مال۔ کہ ہم تم سے اجرا اور مال نہیں مانگتے۔ یہی تمہاری بھی حالت

ہونی چاہئے۔ اگر یہ کہا جاوے کہ اگر نہ مانگیں تو کام کس طرح چلے گا۔ تو

صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ کام خود ہی چلے گا۔ میں تو اکثر وعظ میں یہی کہہ

دیتا ہوں کہ آپ مانگنا چھوڑ کر دیکھئے کہ اہل دنیا خود ماٹھا رکھیں گے اور

آپ کو دیں گے۔

مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں کی خودیہ حالت ہو گئی کہ ایک جگہ ایک دوسرے

تھا۔ اس کے جلسہ میں ایک واعظ صاحب فرما رہے تھے کہ افسوس کی بات ہے کہ اتنی دیر اگر ایک کسی ناچتی تو اس کو لوگ کس قدر دیتے۔ ہمیں ایک کسی کے برابر بھی نہیں سمجھتے کہ گھنٹہ بھر سے ہم مانگ رہے ہیں اور کوئی کچھ نہیں دیتا۔ افسوس اس واعظ کو بیان کرتے ہوئے غیرت بھی تو نہ آئی۔ مجھے تو اگر کوئی لاکھ روپیہ بھی دے تو انشاء اللہ تعالیٰ ایسی بات زبان سے کبھی نہ نکلے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک وفد میں نواب صاحب کی خواہش پر میرا ڈھاکہ جانے کا قصد ہوا اور راہ میں کلکتہ بھی ٹھہرنا ہوا۔ وہاں نواب صاحب کے ایک دست ہم لوگوں کو لینے آئے ہوئے تھے۔ وہ مل کر کہنے لگے ہمیں آپ کے تشریف لانے سے بہت مسرت ہوئی کیونکہ آنے کی اس لئے امید نہ ہی تھی کہ یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ نے یہ شرط لگائی ہے کہ کچھ دیا نہ جائے۔ میں نے کہا یہ شرط کون سی دشوار تھی۔ کہنے لگے ایسا کب ہو سکتا ہے اپنے محبوب کی خدمت کو توجی چاہتا ہی ہے۔ میں نے کہا کیا محبوب کی خدمت اسی میں منحصر ہے کہ محبوب ہی محبوب کے گھر جاوے۔ محبوب بھی تو محبوب کے گھر جا کر خدمت کر سکتا ہے۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ معاف کیجئے پیاسا کنوئیں کے پاس جایا کرتا ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جایا کرتا۔ بدتمیزی تو دیکھئے۔ مجھ کو بے حد غصہ آیا اور میں نے کہا کہ صاحب آپ کا تو یہ خیال ہے کہ ہم پیاسے ہیں اور ہمارا یہ خیال ہے کہ آپ ہی پیاسے ہیں۔ مگر ہمارے پاس تو دلیل ہے آپ کے پاس دلیل نہیں۔ وہ

ویل سنیے کہ ہمارے پاس دین ہے اور اس کی آپ کو ضرورت ہے اور وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں اور آپ کے پاس دینا ہے اور وہ بجز اللہ تعالیٰ ہمارے پاس بقدر ضرورت موجود ہے۔ اب آپ خود فیصلہ فرمادیں کہ پیاسا کون ہے۔ وہ صاحب یرگن کر معافی کے خواستگار ہوئے اور پشیمان ہوئے۔

میں نے قوالاً تو اپنے مجمع کا استفتاء اس طور سے ظاہر کیا اور علماء اس طرح ظاہر کیا کہ میں پھر ڈھکا کہ نہیں گیا۔ کلکتہ ہی سے واپس ہو گیا اور مکان چلا آیا۔ اس پر بعض نو تعلیم یافتہ لوگوں کے خطوط میرے پاس آئے کہ ہم کو تمہارا ڈھکا کہ جانے کا بہت افسوس تھا اور اب یرگن کہ بہت خوشی ہوئی کہ کلکتہ ہی سے واپس چلے آئے۔

صاحبو! آپ لوگ جو ہمیں رائے دیتے ہیں کہ ترقی کرنی چاہئے تو ہمارے اندر اوٹا تو وسائل بھی ترقی کے نہیں اور وسائل اختیار کریں مثلاً حکام سے ملیں، لوہوں کے یہاں وفد بنا کر لے جائیں تو بعد میں پھر آپ ہی اعتراض کریں گے کہ مولویوں کو ایسا مناسب نہیں۔ چنانچہ میرا ڈھکا کہ جانا بظاہر مذاق اہل ترقی کے موافق تھا۔ مگر دیکھئے انہیں لوگوں نے بعد میں اس کا نامناسب ہونا ظاہر کیا اور واپسی پر مسرت کا اظہار کیا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اس قسم کے وسیلے اختیار کرتا ہے کہ حکام سے ملاقات وغیرہ کرے تاکہ مسلمانوں کو نفع پہنچے اور اس میں مشغول ہو کر

اُسے شمس العلماء وغیرہ کا خطاب مل جائے تو یہی ترقی کی رائے دینے والے
 بعد میں اعتراض کرتے ہیں کہ صاحب یہ تو خبریں اور چٹاں ہیں اور چین ہیں
 ایسے لوگوں کی حمایت نہیں کرتا جن کو شمس العلماء وغیرہ کا خطاب مل گیا ہے
 اور نہ مجھے حمایت کی ضرورت ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کو ان پر اعتراض
 کا حق نہیں کیونکہ آپ کی ٹورائے کے موافق انہوں نے عمل کیا۔ مگر افسوس
 اہل دنیا کی رائے پر عمل کر کے بھی وہ نیک نام نہ ہوتے بلکہ بد نام ہو گئے
 اگر ہم اس قسم کے وسائل اور ذرائع کو اختیار نہ کرتے تو بے اعتبار نہ ہوتے
 اس وقت ترقی کا صرف ایک اعتراض ہوتا کہ مولوی ترقی نہیں کرتے۔ مگر
 وہ حالت عدم ترقی کی اس ترقی کی حالت سے ہزار درجہ افضل تھی۔

پس مولویوں کو تو اس طرح رہنا چاہیے۔

شانِ علماء

نہ برا شتر بر سواری نہ چوں اختر زیر بارم

نہ خداوند رعیت نہ غلام شہر بارم

یعنی ان حضرات کو صرف تبلیغ عام یا خاص سے تعلق رکھنا چاہیے حال
 سے تعلق ہی نہ رکھنا چاہیے۔ بلکہ اس باب میں نہایت آن بان سے رہنا
 چاہیے۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے یہاں پانچ روپے بھیجے اور یہ لکھا کہ طلبا
 سے دعا کر دینا۔ میں نے روپے واپس کر دیئے۔ اور یہ لکھ دیا کہ یہاں دعا
 کی دکان نہیں ہے اور دعا بکتی نہیں ہے۔

ایک مرتبہ کا اور واقعہ ہے کہ ایک شخص پانی پت کے قریب کے

رہنے والے تھے اور مجھ سے بیعت تھے انہوں نے مدرسہ کے لئے
 پندرہ روپیہ مجھے دیئے ہیں نے کہا کہ باوجود پانی پیت ہیں مدرسہ ہونے کے
 جو آپ سے قریب ہے آپ یہاں کے مدرسہ میں کیوں دیتے ہیں اس میں
 مجھے یہ شبہ ہے کہ تم یہاں اس نیت سے دیتے ہو کہ مدرسہ میں بھی یہ روپیہ
 صرف ہوگا۔ اور پیر صاحب بھی خوش ہوں گے۔ دونوں باتیں حاصل ہو جاویں
 اور میں نے یہ بھی کہا، دیکھو سچ بتانا اخفاء نہ کرنا۔ انہوں نے کہا جی ہاں مقصود
 تو یہی تھا۔ میں نے کہا ایسے روپیہ کو میں پسند نہیں کرتا جن سے خوشنودی خدا
 تعالیٰ اور میری خوشی و ولوں مقصود ہوں۔ میں اسے شریک سمجھتا ہوں۔ آپ
 نے تقرب خدا تعالیٰ میں مجھے بھی شریک کیا۔ ان کی سمجھ میں آگیا اور واپس
 لینے پر رضا مند ہو گئے۔ پھر صبح کو انہوں نے کہا کہ بے شک اس وقت تو
 میرا ہی مقصود تھا لیکن اب رات کو میں نے سوچا تو اب میرا جی یہی چاہتا
 ہے کہ اسی مدرسہ میں دول اور دوسری نیت سے تو بہ کر لی اس وقت
 وہ روپے میں لے لئے۔ میری اس عبرت سے آخر وی فائدہ تو ظاہر تھا مگر
 ظاہری اور دنیاوی فائدہ بھی نہ ہوا۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ایک صاحب نے دوسروں کے لئے میرے پاس
 مدرسہ کے لئے بھیجے اور اسی کے ساتھ وہاں بلاسنے کی تحریک بھی کی۔ میں
 نے روپے واپس کر دیئے اور ان کو لکھ دیا کہ اگر ان کے ساتھ میرے
 بلاسنے کی درخواست نہ ہوتی تو میں قبول کر لیتا۔ اب تو یہ شبہ ہے کہ آپ
 مدرسہ میں یہ رقم دے کر گویا مجھ پر احسان رکھ کر دیا۔ ڈالنا چاہتے ہیں سو

مدرسہ میں رقم دینے کا مجھ پر کیا احسان ہے۔ اُن صاحب کا جواب ہے یا آپ
روپیہ وصول کر لیجئے میں نہیں بلاتا۔

تو یہ سارا استغناء محض اس وجہ سے ہے کہ مجھے مدرسہ کا چلانا مقصود
نہیں بلکہ محض رضائے حق مطلوب ہے اور یہ نیت کر لی ہے کہ اگر حدود
کے اندر کام چلتا رہا چلاتے رہیں گے اور جس دن کچھ تجاوز کرنا پڑے یا تاہم سیر
سوچنا پڑیں کہ اب کیا انتظام کریں، کہاں سے رقم لائیں، اسی دن مدرسہ بند
کر دوں گا۔ غرض یہ نیت رکھنی چاہئے کہ جس روز مدرسہ نہ چلے گا نہ چلے۔
ٹوٹ جاوے گا تو بلا سے۔ کوئی ہمارا ذاتی کام تو ہے نہیں۔

اگر یہ کہا جاوے کہ اس طرح مسلمانوں کی سبکی اور ذلت ہے، تو
اس کا جواب یہ ہے کہ علوشان کی حاجت ہی کیا ہے۔ حضرت عمر رضی
اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام۔ تو ہماری
علوشان کے لئے اسلام کافی ہے۔ ہمیں تو خدا نے اسلام سے عزت
دی ہے۔ اگر مسجد چوڑا اور بچتر کی نہ بنے بلا سے نہ بنے۔ جعلت الارض
لنا مسجداً وطهوراً۔ تمام زمین مسجد ہے۔ یہ نیت کر لینا کہ اس قدر طول
وطویل ہو اور ایسی ہیئت و شکل پر ہو فضول ہے۔ ہر کام میں یہی نیت رکھئے
کہ کوئی شخص آپ کے ساتھ خوشی سے شریک ہو، فہا ورنہ چھوڑ دیجئے
یہ نیت رکھو کہ بالکل نہ رہے گا نہ سہی اور کم پیمانہ پر ہوگا تو کم ہی سہی۔
ایک ہندو کی حکایت ہے کہ وہ جے پور سے ہر دوار کو چلا جس کے
پاس گنی تھی۔ پھر کسی موقع پر خیرات کرنے کے لئے روپوں کی ضرورت ہوئی۔

تو ایک دکاندار سے کہا کہ مجھے ایک گنی کے روپے دے دو۔ اُس نے کہا کہ پورے پچیس روپے نہ دوں گا بلکہ بیس دوں گا۔ یہ راضی ہو گیا تو اُس نے اور کم کرنا شروع کئے اور یہ راضی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ دس تک نوبت آگئی۔ اُس نے کہا کہ لا تو دس ہی دے دے۔ تو وہ بولا کہ معلوم ہوتا ہے تم چڑا کر لائے ہو جو اس طرح کم کرتے جاتے ہو۔ تو اُس نے جواب دیا کہ اہل یہ کہ میں اس وقت دان پُن کے واسطے چلا تھا۔ تو تو جس قدر کم دیتا میں اُس میں پُن کی نیت کر لیتا۔ اگر تو یہ بھی کہتا کہ میں کچھ بھی نہیں دیتا تب بھی میں راضی ہو جاتا اور تجھے گنی دے دیتا۔

تو صاحبو! حیرت ہے کہ ایک ہندو تو مقصودِ اصلی کو سمجھا اور مسلمان مقصودِ اصلی کو نہ سمجھے۔ جس طرح اُس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مقصودِ ثواب ہے خواہ گنی زیادہ میں جائے یا کم میں مجھے ثواب پورا ہی ملے گا، اسی طرح مسلمان کو سمجھنا چاہئے کہ کام خواہ اعلیٰ پیمانہ پر چلے یا ادنیٰ پیمانہ پر مقصود تو ثواب ہے اس کی فکر نہ ہونا چاہئے کہ اعلیٰ پیمانہ پر ہی کام ہو۔

طاعت اور توفیق | صاحبو! اسلام نے غیرت کی بھی تعلیم دی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اَنْلَوْا مَكْتُوبًا وَاَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ۔ تو کیا ہم اس کو تمہارے گلے مڑھیں اور تم اس سے نفرت کئے چلے جاؤ۔ اور فرماتے ہیں کہ لست علیہم بمصیط۔ آپ اُن پر مسلط نہیں ہیں اور فرماتے ہیں۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مِنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا فَاِنَّت تَكْفُرُ

الناس حتی یقولوا مؤمنین وما كان لنفس ان تؤمن الا
بإذن الله۔

اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روٹے زمین کے لوگ
سب کے سب ایمان لے آتے۔ سو کیا آپ لوگوں پر بروقتی
کر سکتے ہیں جس میں وہ ایمان لے ہی آویں حالانکہ کسی شخص کا
ایمان لانا بدون خدا کے حکم کے ممکن نہیں۔

اور فرماتے ہیں۔

وان كان كبر عليك اعراضهم فان استطعت ان تبتغي
نفقاني الارض او سلما في السماء فأتيتهم بآيته ولو شاء
الله لجمعهم على الهدى فلا تكونن من الجاهلين۔
اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے اور اگر آپ کو
یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی
سیڑھی ڈھونڈ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ تو کرو اور اگر اللہ کو
منظور ہوتا تو ان سب کو راہ پر جمع کر دیتا۔ سو آپ نادانوں
میں نہ ہو جیئے۔

اور فرماتے ہیں۔

قل الحق من ربكم فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر۔
اور آپ کہہ دیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے
سو جس کا جی چاہے ایمان لے آوے اور جس کا جی چاہے

کافر ہے۔

تو ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو استغناء کے ساتھ رہنا چاہئے۔ کسی کے پیچھے نہ پڑے۔ اسی طرح مدرسہ والے بھی اس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ بھی مدرسہ میں کچھ دے دے، وہ بھی کچھ امداد کر دے۔ کسی کے پیچھے پڑنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب خدا کا حکم ہوتا ہے جب ہی کوئی دیتا ہے۔

جب کوئی دیتا ہے تو کسی پر کیا
زکوٰۃ، خیرات اور احسان
 احسان ہے۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہی کنی
 منت شناس ازو کہ بخدمت بادشہنت

خدا کا احسان ہے کہ وہ ہم کو اپنی طاعت کی توفیق دے دیں اور ہماری طاعت بدنیہ اور مالیہ کو قبول فرمائیں۔ اگر وہ قبول نہ فرمائیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں غرض جو کوئی مدرسہ کی امداد کرتا ہے خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے۔ ہتھم مدرسہ پر کیا احسان ہے۔ پھر وہ کیوں کسی کی خوشامد کرے اور کیوں کسی کا تشکر یہ ادا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استغناء ہی سے کام لیا ہے۔

چنانچہ ایک شخص منان تھا۔ اس نے بکریاں پالیں اور حضور سے دعا کرتی چاہی۔ آپ نے دعا فرمادی۔ وہ بہت بڑھ گئی۔ اس سے زکوٰۃ مانگی گئی تو اس نے زکوٰۃ ادا نہ کی۔ پھر خود لایا تو حضور نے بوجہ وحی کے نہ لی۔ پھر حضرت ابو بکر کے زمانہ میں زکوٰۃ دینا چاہی مگر حضور کی متابعت میں زکوٰۃ نہ

قبول کی گئی۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں دینی چاہی اس وقت بھی نہیں قبول کی گئی۔ حضرت عثمانؓ نے بھی نہیں لی۔ پھر وہ آپ کے زمانہ میں سر گیا۔ اس وحی خاص میں جس کی متابعت حضرات خلفاء نے بھی کی یہ بھی نکتہ تھا تا کہ ظاہر ہو جاوے کہ زکوٰۃ ادا کرنے میں کسی پر کچھ احسان نہیں صرف اپنا ہی نفع ہے اگر تخم ایک بار انکار کر و گے تو ہم دس بار واپس کر دیں گے۔ اس وجہ سے میں کہتا ہوں کہ آپ کا کوئی احسان نہیں بلکہ چندہ لینے والے کا احسان ہے کہ اس نے لے کر آپ کو پاک صاف کیا۔

تخاص کر جب کہ یہ ایسی جگہ ہے جو ایک زمانہ بقا و علم کی صورت تک مرجع خلافت رہی ہے تو اس کا حق ادا کرنا سب ہی کے ذمہ ہے نہ کہ ایک شخص پر تمام بار ڈال کر اس کا ایشیاء کیا جاوے۔ کیا وہ سب سے مانگے اور وہ زمانہ منصفی الہی بخش صاحب کا تھا جو اپنے وقت کے اقطاب تھے اور وہ حق یہ ہے کہ ایسی جگہ درس تدریس کا سلسلہ ضرور قائم و باقی رکھا جاوے۔

اس کی بقا کی صورت ہمارے تجربہ سے تو یہ ثابت ہوئی ہے کہ مدرسہ کا ایک نصاب مکان ہو جس میں کچھ جگہ درس تدریس کے لئے ہو اور کچھ جگہ طلباء کے رہنے کی ہو اور کتب خانہ بھی ہو اور وہ مکان وقف ہو اور مدرسہ کی ملک ہو اور اس میں طلبہ و مدرسین درس و تدریس میں مشغول رہیں اگر عقلاء اس کے سوا ہمیں اور کوئی صورت قیام علم کی بنیادیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھ کو سمجھا دی جاوے میں ضرور قبول کر لوں گا۔ اور یہ بھی وعدہ

کرتا ہوں کہ دو چار مدرسے جن میں میرا من و بہ اختیار ہے ان کے ویران کرنے کی سب سے اول میں ہی کوشش کر دوں گا۔ مگر یہ شرط ہے کہ وہ ایسی صورت ہو کہ تجربہ سے اس کا صحیح اور درست ہونا معلوم ہو گیا ہو۔ تو اس وقت میں ان منظم مدرسوں کو اس مجذوب کی لنگوٹی کی طرح رخصت کر دوں گا جیسے ایک مجذوب کا قصہ ہے یہ خدا کو معلوم ہے کہ واقع میں بھی مجذوب تھے یا نہیں۔ غرض وہ ننگے پھرا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مریدوں نے لنگوٹا باندھ دیا مگر چونکہ مجذوب تھے اس واسطے کھانا اس طرح کھاتے تھے کہ روغن وغیرہ سب لنگوٹے پر گرتا تھا آخر وہ چکنا ہو گیا۔ چوہوں نے اسے کترنا شروع کر دیا۔ جب چوہے بکثرت ہو گئے تو ان کے لئے بلی پالی گئی تاکہ چوہوں کو کم کرے۔ بلی نے ہر چیز کھانی شروع کر دی۔ جو چیز کھانے کو رکھی گئی وہی کھا گئی اس کے واسطے کتا پالا گیا۔ جب کتے نے سنانا شروع کیا تو اس کی حفاظت کے واسطے ایک نوکر رکھا گیا اور جب وہ ادھر ادھر نظر کرنے لگا تو اس کا نکاح کر دیا گیا اور اقران صغریٰ و کبریٰ سے نتیجہ پیدا ہو گیا۔ ایک دن مجذوب صاحب کو جو کچھ افادہ ہوا تو ایک ہجوم دیکھ کر پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ میرے اس پاس یہ ہجوم کیسا ہے مریدوں نے سارا قصہ بیان کیا تو مجذوب صاحب نے لنگوٹی اتار کر پھینک دی کہ یہی بکھیرے کی جڑ ہے ہم اسی کو نہیں باندھتے۔

تو ہم بھی اگر آپ تقاضے علم کی اور کوئی تدبیر بتلائیں گے اور سمجھا سکیں گے تو ان مدرسوں کو لنگوٹا سمجھ کر پھینک دیں گے۔ مگر جب بقاء علم

کی صورت اہل تجربہ کے تجربہ سے اسی صورت میں منحصر ہو گئی ہے تو اب
 اس کے ابقاء کی کوشش میں کیا عذر ہے اور اس کو خوب سمجھ لیجئے کہ صرف
 مدرسہ ہی آپ کا محتاج نہیں بلکہ آپ بھی اس کے محتاج ہیں۔ یعنی مدرسہ جیسے
 آپ کی اعانت کا محتاج ہے اسی طرح آپ مدرسہ کی برکت کے محتاج
 ہیں بلکہ مدرسہ تو مجازاً ہی محتاج ہے مگر آپ حقیقت میں محتاج ہیں۔ جیسے
 فقیر سخاوت کا حقیقتہً محتاج ہے اور سخاوت کو فقیر کی مجازاً حاجت ہے
 اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

بامگ می آید کہ اسے طالبِ بیا جو محتاج گدایاں چوں گدا
 اور احتیاج سے مراد توقفِ ظہور ہے مجازاً احتیاج سے تعبیر کر دیا
 اور عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ ظاہراً مولانا پر جذب کا علم ہے عارف
 شیرازی سے مگر اس مضمون کو حافظ شیرازی نے نہایت مستین عنوان سے
 تعبیر کیا ہے اور مولانا کا عنوان ذرا موہم ہے۔ اس لئے کہ مولانا نے
 احتیاج سے تعبیر کیا ہے برخلاف حافظ صاحب کے کہ انہوں نے شوق
 سے تعبیر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

سایہ معشوق گرا قباد بر عاشق چہ شد

ما بہ او محتاج بودیم او بہا مشتاق بود

تو حافظ کا اشتیاق سے تعبیر کرنا مولانا کی اس تعبیر سے سہل ہے
 گو حق تعالیٰ تو اشتیاقِ لغوی سے بھی جو کہ ایک قسم کا انفعال ہے بمنزہ
 ہیں۔ مگر اس کے سہل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لفظ اشتیاق حدیث میں وارد

ہے۔ چنانچہ حدیث بیہقی میں ہے۔ قال جبریل علیہ السلام ان اللہ
قد اشتاق الی لقائک۔ (کذا فی نشر الطیب) تو اشتیاق کا لفظ حدیث
میں موجود ہے بر خلاف لفظ احتیاج کے کہ وہ حدیث میں موجود نہیں ہے
یہ سب کلام مدارس و بینہ کی ضرورت کے متعلق تھا۔

مسجد ضرارہ کی وجہ تسمیہ | اب مقصود آیت کی طرف عود کرتا ہوں جس
کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اس وقت مدرسہ

کی عمارت کی نسبت خصوصاً اور جملہ عمارات کی بابت عموماً بیان ہوگا چنانچہ
حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں افعن اسس بنیانہ علی تقویٰ۔ یہ آیت
ایک خاص قصہ اور ایک خاص مسجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر مجھے
اس سے عدت مشترکہ نکال کر دیگر مساجد اور مدارس کی تعمیر کا حکم بیان کرنا
ہے۔ اور اس پر پھر جملہ تعمیرات کو قیاس کرنا ہے۔ عرض یہ آیت مسجد
خاص کے قصہ میں نازل ہوئی ہے۔

ماتخص قصہ کا یہ ہے کہ مدینہ منورہ کے قریب ایک محلہ ہے قبا
اس کا نام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ
تشریف لائے ہیں تو اول اسی محلہ میں قیام فرمایا۔ پھر شہر میں تشریف
لائے تھے تو زمانہ قیام میں جس جگہ آپ نماز پڑھتے تھے وہاں اس
محلہ کے مومنین مخلصین نے ایک مسجد بنالی اور اس میں نماز پڑھا کرتے
کسی نے خوب کہا ہے کہ

در منزلیکہ جاناں و نئے رے سیدہ باشد با خاک آستانش داریم سر جانی

منافقین نے جو کہ اسلام کی بیخ کنی کی تدبیروں میں ہر وقت لگے رہتے تھے، یہ سوچا کہ ایک مکان مسجد کے نام سے جداگانہ بنایا جاوے اور ظاہر میں وہ مسجد کی شکل ہو اور واقع میں انجمن ہو اور اس کا پریذیڈنٹ ابو عمار راسیب بنایا گیا جو کہ اسلام کا سخت دشمن تھا۔ اور ابو عامر کا ہر قتل شاہ دم سے میل جول تھا۔ ابو عامر نے مسلمانوں کے ضعف پر نظر کر کے یہ کہا کہ میں ہر قتل سے اہل اسلام کے مقابلہ کے لئے لشکر لاؤں گا۔ جس سے اسلام نیست و نابود ہو جاوے گا۔

ان لوگوں نے اپنی کثرت اور مسلمانوں کی قلت دیکھ کر یہ خیال پختہ کر لیا تھا مگر یہ نہ سمجھے کہ خربوزوں کی چاہ ہے کتنی ہی کثرت ہو مگر چھریوں کی قلت بھی ان کے نیست و نابود کرنے کے لئے کافی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ تو ایک چھری ان اللہ معنا کی تھی کہ کفار کسی صورت سے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور افسوس ہے کہ آج کل بھی چھری مسلمانوں کے پاس نہیں رہی اور اگر ہے بھی تو تیز نہیں ہے کنا۔ ہو رہی ہے۔ کیونکہ مرغیات الہی سے مسلمان بہت کچھ بہٹ رہے ہیں۔ اس لئے مخالفوں کا کبھی ان پر غلبہ ہو جاتا ہے۔ اگر مسلمان اس چھری کو تیز کر لیں یعنی خدا تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کریں تو پھر وہی نمونہ سامنے آجائے جو کبھی پہلے تھا۔

غرض ان لوگوں نے انجمن کی نیت سے مسجد کی شکل میں ایک مکان اس غرض سے بنایا کہ اس میں تخریب اسلام کا مشورہ کیا کریں گے مسجد

کی نیت سے نہیں بنایا تھا۔ صرف صورتہ مسجد کی شکل تھی۔ عرض حسب وہ مکان تیار ہوا تو حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ ایک بار وہاں چل کر نماز پڑھ لیجئے تو پھر وہاں نماز ہونے لگے گی۔ تو گویا مقصود رخصتی کرانا تھا۔ جیسے بیعت نامہ کی رخصتی کرائی جاتی ہے۔

حضور نے جداگانہ مسجد بنانے کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگے کہ ہماری نیت بالکل نیک ہے۔ محض عام مسلمانوں کی آسائش کی غرض سے بنائی تھی تاکہ وسعت و سہولت ہو۔ گویا سردی میں سایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مسجد میں سب سما نہیں سکتے۔ اس سے گنجائش ہو گئی۔ نیز کوئی بیمار ضعیف دور نہ جاسکے تو پاس کے پاس اس میں نماز پڑھ لے۔ حضور نے بنا پر حسن ظن تصدیق فرما کر وعدہ کر لیا۔ عرض حضور نے وعدہ فرمایا کہ نبوک سے آکر اس میں نماز پڑھوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حقیقت حال کی اطلاع کر دی اور وہاں نماز پڑھنے سے منع فرما دیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا وَضُرًّا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَأَرْضًا لِّلْمُنَافِقِينَ وَاللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الَّتِي هُمْ يَكْفُرُونَ
لَا تَقْرَأُ فِيهِ أَبَدًا مَّسْجِدًا هُوَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِن أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ
أَن تَقْرَأَ فِيهِ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ

اور بعض ایسے ہیں کہ جنہوں نے ان اغراض کے لئے مسجد

بتائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں۔ اور ایمانداروں میں تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس کے قبل سے خدا و رسول کا مخالف ہے اور قسمیں کھا جاویں گے کہ بجز بھلائی کے ہماری اور کچھ نیت نہیں اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ آپ اس میں کبھی نہ کھڑے ہوں البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

عرض آیت میں خدا کے یہاں سے اس مسجد کی مذمت ظاہر کی گئی کہ یہ مسجد صرف صورت ہے اور واقع میں کفر کی قوت کے واسطے اور مسلمانوں کو ضرر پہنچانے اور ان میں تفریق ڈالنے کے واسطے تیار ہوئی ہے۔ اور ابو عامر راہب کے ٹھہرنے کے لئے اور اس کی پناہ کے واسطے تیار کی گئی ہے۔ اور یہ لوگ قسمیں کھا جاویں گے کہ بجز بھلائی کے اور کچھ نیت نہیں حالانکہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ آپ اس مسجد میں نہ کھڑے ہو جائیں اور نہ نماز پڑھیں۔ البتہ آپ اس مسجد میں نماز پڑھیں جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ اس میں ایسے آدمی ہیں کہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

عرض اس مسجد میں نماز کی نیت سے جانے سے ممانعت ہو گئی چنانچہ

حصنوں نے بوجھ اس کے کہ وہ مسجد کی نیت سے نہ بنائی گئی تھی اور اس کے علاوہ مفاسد کثیرہ اس سے ناشی ہونے لگے چند صحابہ کو بھیج کر اس میں آگ لگوا دی اور منہدم کرادی۔ اس مسجد کا لقب مسجد ضرار مشہور ہے کیونکہ وہ اضرار کے لئے بنائی گئی تھی۔

اس سے آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ افسمن
اسس بنیائے علی تقویٰ من اللہ ورضوان

قرآنی طرز نصیحت

خبیرا من اسس بنیائے علی شفا جوف ہارقا نہار بہ فی نار جہنم۔
ہمزہ استفہام کا ہے اور فاعل علی کا ہے۔ اوپر دو قسم کی مساجد کا ذکر فرمایا
ہے۔ اب یہ بتلا کر کہ ان میں سے ایک کی تو بنا تقویٰ پر رکھی گئی ہے اور
دوسری کی کفر پر۔ اس پر تفسیر فرماتے ہیں کہ بتلاؤ ان میں سے کون افضل ہے
جب بناؤں کی حالت معلوم ہو گئی تو اس سے بانی کی بھی فضیلت معلوم ہو
گئی اور بنیان مصدر ہے مبنی کے معنی میں اور ہ کی ضمیر من کی طرف راجع ہے
اور من اللہ تقویٰ کی قید ہے تاکہ کوئی متقی ایسی پاکی پر ناز نہ کرے کہ ہم نے
پاکی حاصل کی اس واسطے کہ تقویٰ من بجانب اللہ ہے اور رضوان بھی مقید
ہے من اللہ کے ساتھ۔

مطلب یہ ہے کہ آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی
بنیاد خوف خدا و خوشنودی خدا پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی
بنیاد کسی گھائی کے کنارے پر جو کہ گرنے ہی کو ہو رکھی ہو یہ طرز بنا
ہے کہ فیصلہ مخاطب کے اوپر چھوڑ دیا۔ پس دونوں کے افعال بیان کر

ویسے اور مخاطب کے ذمہ فیصلہ چھوڑ دیا کہ تم سوچ لو یہ بہتر ہے یا یہ بہتر ہے۔ یہ طرز نصیحت کا بڑا موثر ہے۔ اور اگر نا صحیح خود ہی فیصلہ کر دے تو اس سے مخاطب پر گرائی ہوتی ہے۔

چنانچہ اس کی تائید میں ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک مدرسہ میں جلسہ تھا۔ ایک واعظ صاحب نے وعظ فرمایا اور وعظ میں یہ فرمایا کہ علی گڑھ کالج والے سووی ڈگریاں کرتے ہیں اس لئے ملعون ہیں۔ بات تو صحیح تھی مگر الفاظ سخت تھے اس لئے سامعین کو گراں گزرا اور ناگوار ہوا۔ سامعین بگڑ گئے جب لوگوں کی ناگواری کا مہتمم جلسہ کو احساس ہوا تو اس کا تدارک کرنے کے واسطے کھڑے ہوئے۔ اور خود تقریر کی کہ خدا اور رسول نے یہی کہا ہے جو واعظ صاحب نے فرمایا ہے۔ وغیر ذلک مگر مہتمم صاحب کی تقریر سے بھی اس کا کوئی تدارک نہ ہوا۔ تو مہتمم صاحب میرے پاس بھاگے ہوئے آئے۔ غریب کی جو درد سب کی بھابی۔ چونکہ مجھ کو اپنے کرم فرماؤں سے انکار کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس لئے ہر ایسے موقع پر مجھے ہی سب پھسنا نا چاہئے ہیں۔ اول تو میں نے کہا کہ تمہاری یہی سزا ہے۔ بات کہو مگر نرمی سے کہو سختی کی کیا ضرورت ہے۔ کرو تم اور بھگتوں میں۔ یہ اچھی رہی مگر وہ اصرار کرنے لگے تو میں کھڑا ہوا۔

میں نے کہا، صاحبو! اعمال و افعال مباحہ میں نیت پر مدار ہے۔ تو اگر کوئی شخص سخت لفظ کہہ دے مگر نیت مذموم نہ ہو تو ناگوار نہ ہونا چاہئے کیونکہ نیت تو مذموم نہیں ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ مولوی صاحب

کی نیت کیا تھی ظاہر ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے محض شفقت کی راہ سے کہا ہے۔ جیسے کسی کا لڑکا زیر کھانے لگے اور وہ اس کو سختی کے ساتھ دھمکائے تو اس سے کسی کو ناگواری نہیں ہوتی کیونکہ جانتے ہیں کہ منشاء اس کا محض شفقت ہے۔ اب بتلائیے کہ ہم لوگ جو بڑے افعال کرتے ہیں۔ ان سے مولوی صاحب کا کیا نقصان ہے اور اگر ہم پارسا ہو جائیں تو اس سے مولوی صاحب کا کیا نفع ہے۔ ظاہر ہے کہ نفع نقصان جو کچھ ہے ہمارا ہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص ہم کو مضر باتوں سے سختی کے ساتھ روکتا ہے تو یہ اس کی شفقت ہے یا نہیں۔ اس کو آپ کی حالت بگڑنے پر افسوس ہوتا ہے اس لئے غصہ اور تیزی کے ساتھ آپ کو روکتا چاہتا ہے۔ اگر شفقت نہ ہوتی تو اس کی جوتی کو عرض پڑی تھی جو کسی کی اصلاح کے درپے ہوتا۔

علاوہ ازیں مجھ کو حیرت ہے کہ آپ لوگ تو فطرت کے بہت معتقد ہیں اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ آدمی فطرۃً مختلف المزاج پیدا ہوئے ہیں۔ مزاجوں میں باہم بہت بڑا تفاوت ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تیزی سب کو معلوم ہے اور ایک حضرت جیسے علیہ السلام ہیں اور ایک ہمارے حضور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو آپ نے مولوی صاحب کی سختی کو فطرت کا تابع کیوں نہ تجویز کر لیا۔

پھر میں نے اسلامی احکام اور کالج والوں کا اہل سے بعد بیان کر

کے اخیر میں کہا کہ اب آپ ہی بتلائیے کہ ایسا شخص جو ان احکام کی پابندی نہ کرے مروجہ برحمت خاص ہو سکتا ہے یا رحمت خاص سے اس کو بعد ہوگا اور یہی معنی ہیں لعنت کے۔ بس آپ ہی فیصلہ کر دیجئے ہم کچھ نہیں کہتے تو میں نے دونوں قسم کے افعال بیان کر کے فیصلہ خود ان سے چاہا۔ جس سے سب سامعین خود معترف ہو گئے کہ ہم ہی خطا وار ہیں۔

تو ایک طرز تو یہ ہے کہ ان کے اقوال و افعال اجنبیانہ طور پر بیان کر دیئے جائیں اور کسی خاص شخص کو مخاطب نہ کیا جائے۔ پھر خود ان سے ہی فیصلہ دریافت کر لیا جائے تو یہ طرز زیادہ مؤثر ہوتا ہے اور ایک طرز یہ ہے کہ خود فیصلہ کر کے حکم لگا دو کہ تم ملعون ہو۔ جیسے ان مولوی صاحب نے کیا تھا۔ یہ طرز مؤثر نہیں ہوتا۔

تو حق سبحانہ تعالیٰ بھی یہی پہلا طرز اختیار فرما کر دریافت فرماتے ہیں کہ تبار و ان دونوں میں کون تہیر ہے یعنی جس شخص نے اپنی بنیاد تقویٰ اور خدا کی رضا پر رکھی ایک شخص تو یہ ہے اور ایک شخص وہ ہے جس نے بنیاد کسی گھائی کے کنارہ پر جو گرنے ہی کو ہو رکھی ہو۔ یعنی ڈھانگ پر رکھی ہو۔ جس کی عمارت میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ ڈھانگ پر رکھی ہے اور پھر یہ خرابی ہے کہ وہ ڈھانگ گرنے ہی کو ہے۔ تیسری خرابی یہ ہے کہ بانی کو لے کر گرے گی۔ جب مکان گرا تو بانی جو اس میں رہتا تھا، وہ بھی گر گیا۔ یہ سب سے زیادہ ضرر ہے۔ اور اگر بانی سلامت رہے تو کیا غم ہے۔

تعمیری بنیاد | ایک نظیر یاد آگئی۔ میں بھرت پور گیا تھا۔ خواجہ عزیز الحسن صاحب میرے ہمراہ تھے۔ چند وعظ بیان کرنے کا اتفاق ہوا جو خواجہ صاحب نے لکھے۔ وہ سفر میں تھے ان کے ہمراہ ایک بیگ تھا جس میں وعظ بھی تھے۔ وہ بیگ ریل میں چوری چلا گیا خواجہ صاحب کو وعظوں کے ضائع ہونے کا بہت رنج ہوا۔ میں نے ان کے رنج دفع کرنے کو کہا کہ میاں سر سلامت چاہئے تو پیاں بہت۔ یعنی واعظ رہے تو وعظ بہت۔

اسی طرح اگر بانی رہ جاوے اور مکان گر جاوے تو ایسا ضرر نہیں۔ مکان بہت بن سکتے ہیں۔ اصل ضرر یہ ہے کہ بانی کو لے کر مکان بیٹھ گیا۔

اس بیٹھ جانے کے متعلق ایک بات یاد آگئی کہ آج کل یہ بھی مرض ہے کہ بہت اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں۔ پھر جب وہ گرتی ہیں تو کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا۔ سب کو لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ان آفات سے محفوظ تو گاؤں کے مکان ہیں جو نیچا ہونے کی وجہ سے زلزلہ میں بھی نہیں گرتا۔ ۲۸ اپریل منگل کے دن کانگریسے میں زلزلہ آیا۔ زلزلہ میں شدت تھی۔ ایک تو زلزلہ کی شدت دوسرے بڑے اور اونچے مکانات میں حرکت تو میں نے کہا یا اللہ تیرا شکر ہے کہ ہمارے مکان چھوٹے چھوٹے ہیں جو زلزلوں کے اثر سے محفوظ ہیں۔ اس واسطے کہ یہ قاعدہ ہے کہ مرکز سے محیط کو جس قدر بعد ہوگا۔ اُس میں حرکت زیادہ ہوگی۔ ویسا ہی قدرتی ہونگی

زلزلہ میں حرکت زیادہ ہوگی۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ نیچے نیچے گھر والے دنیا میں بھی شدت زلزلہ سے محفوظ رہیں گے اور خدا تعالیٰ کے یہاں بھی محفوظ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ کو یہ مسئلہ بھی بتانا تھا کہ مکان ایسا بنانا چاہئے جو بلین کو نہ لے بیٹھے اور پتے مکالوں اور نیچے گھروں میں گو بعض تکالیف ہوتی ہیں مگر راحتیں زیادہ ہیں۔ اگر کبھی گر پڑا تو جلدی سے دوسرا ویسا ہی بن سکتا ہے۔

خدا اگر بحکمت بہ بندوں کے کتاید بہ فضل و کرم دیگر سے اور یہاں اللہ تعالیٰ نے تائیس بنیان پر نکیر نہیں فرمایا بلکہ بنیان مقید بقید خاص پر نکیر فرمایا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ خود مکان بنانا مذموم نہیں بلکہ وہ تو اگر بقید ضرورت ہو تو محمود ہے۔

مکان کی اہمیت | ماں بنا الفاسد علی الفاسد نہ ہو۔ وجہ یہ کہ بغیر مکان کے گزر نہیں ہو سکتا اور سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب مکہ تشریف لے گئے تو قاتوں کو تو جیل لیا مگر مکان کی تکلیف نہ برداشت فرما سکے۔ دعا کی کہ اے اللہ ایسی بیٹھنے کی جگہ مرحمت فرما بیٹھے کہ جس سے کوئی اٹھا نہ سکے۔ ایک سوڑ مطاف میں تشریف رکھتے ہوئے ذکر میں مشغول تھے کہ حضرت خواجہ معین الدین حشتی تشریف لائے اور کچھ پیسے لاکھ پر رکھے اور فرمایا تمہارے لاکھوں لاکھوں کا خرچ رکھا گیا۔ حضرت نے عرض کیا میں اس کا متحمل نہیں۔ البتہ ایک ایسا گھر چاہئے۔ فرمایا یہ بھی ہو جائے گا۔ جس کا غیب سے

یہ سامان ہوا کہ ایک شخص نے حضرت کے نام مکان خرید دیا۔ حضرت نے اس مکان میں بیٹھ ہی معاً وقف نامہ لکھا کہ حیات تک میں رہوں گا پھر میرے بعد یہ مکان دوسرے اغراض محمودہ کے لئے وقف ہے۔ اور اس طرح کی شرط لگانا وقف میں جائز ہے کہ اپنے انتفاع کی یا اپنی اولاد کے یا اولاد کی اولاد کے انتفاع کی شرط لگالے۔ یہ بھی ثواب کا مرتبہ ہے مگر میں اس کا کسی کو مشورہ نہیں دیتا۔ کیونکہ بعض دفعہ وقف کرنے کے بعد اولاد کو کوئی ایسی تکلیف ہوتی ہے جس سے اولاد کو مجبوری کی وجہ سے مکان بیچنا پڑتا ہے۔ مثلاً کسی وقت وہ محلہ ویران اور خطرناک ہو گیا یا ہمسائے شریہ ہو گئے۔ اب مکان بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے، مگر وقف کی وجہ سے اس کو بیع نہیں کر سکتے۔ آگے ہر شخص اپنی مصلحت سمجھ سکتا ہے۔

عرض مکان کے نہ ہونے کی بہت تکلیف ہوتی ہے۔ حافظ عارف شیرازیؒ بھی مقام امن کی ضرورت کو فرماتے ہیں۔

مقام امن و مے بے عیش و رفیق شفیق
گرت مدام بیسرت شود نہ ہے تو رفیق

ہاں شرط یہ ہے کہ مقام امن ہو گویا بڑے ہو ورنہ پھر مکان سے خاک بھی فراغت نہیں ہوتی۔

اپنے اختیار کی جگہ نہ ہونے کی تکلیف پر ایک قصہ یاد آیا۔ ہم ایک دفعہ عدن میں اترے۔ عدن مشہور جگہ ہے اولیہ بھی عوام میں مشہور

ہے کہ وہاں بہشت تھی مگر وہ جنت اسی قبیل سے ہے کہ تمع بالعبید
 خیر من ان ثواب غرض یہ غلط مشہور ہے کہ وہاں بہشت ہے۔ تو میں جب
 حدین پہنچا ایک دوسرا تھی اور بھی ہمراہ تھے ہم کو عدن کی بیکر کرتے کرتے
 شام ہو گئی۔ سوچا کہ مسجد میں جا کر سو رہیں گے کیونکہ مسجد خدا کا گھر ہے وہاں
 کسی کا دعویٰ نہیں چل سکتا۔ چنانچہ مسجد میں پہنچے۔ پھر سوچا کہ چپکے سے چھت
 پر جا کر لیٹ رہیں۔ تاکہ مؤذن وغیرہ آکر نہ نکال دیں۔ چنانچہ چھت پر لیٹ کر بچھا
 کر چپکے سے لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مؤذن آیا۔ اس نے آکر کہ نکلو کون
 ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ ہم نے بھی بہت مسافروں کو مسجد سے نکالا ہے
 آج اس کی قدر ہوگی۔ غرض ایک ساتھی نے مؤذن کو دھمکایا اور کہا کہ تمہیں
 خبر نہیں کہ ہم آتے جاتے ہمیشہ یہاں کھڑے ہیں اور تجارت کرتے ہیں اور
 عربی میں کہا کہ تو جانتا نہیں ہم عرب ہیں۔ تو وہ مؤذن ذرا ٹھنڈا ہوا اور کہا کہ
 کہ آکر اندر مسجد میں لیٹ جاؤ۔ اس وقت ہم چھت سے اتر کر مسجد کے
 اندر آگئے اور پر وہ چھوڑ کر لیٹے اور کہا کہ خدا تیرا بھلا کرے۔ تو واقعی مکان
 نہ ہونے سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔

قوم عاد کی تقلید مگر مختصر مکان ضرورت کے لائق کافی ہے۔ زیادہ
 اونچا مناسب نہیں۔ حدیث میں ہے وبيت يتدلى
 فیہ کہ مکان ایسا ہو جس میں بے تکلف داخل ہو سکے۔ زیادہ اونچا کہ نامکان کا
 قوم عاد کی میراث ہے۔ قوم عاد شان کے لئے نئے نئے اونچے اونچے
 مکان بنا پا کرتے تھے۔ ہمارے یہاں تھانہ بھون میں بھی بعض مکان اندر سے

تو بہت ہی مختصر ہیں مگر دروازہ نہایت عالی شان اور نہایت بلند ہے۔ عذر
 یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چوروں سے حفاظت نہ ہتی ہے مگر یہ سب امور
 فضول اور لغو ہیں۔ چور تو جہاں چوری کرنا چاہتے ہیں تو اونچے سے اونچا
 مکان بھی مانع نہیں ہو سکتا۔ وہ تو لقب کے ذریعہ سے کام کرتے ہیں بہت
 لوگ ایسے ہیں جن کے مکان بہت چھوٹے چھوٹے اور نیچے ہیں مگر چور
 ساری عمر میں بھی کبھی ان کے گھر نہیں آئے تو اونچے مکان کے لئے چور
 کا نہ آنا اور نیچے مکان کے واسطے چور کا آنا لازم نہیں۔ چور کے آنے کے
 اسباب اور ہیں۔

غرض بلا ضرورت اور نچا اور وسیع مکان بنانا فضول ہے بقدر ضرورت
 بنانا چاہئے۔ ہاں اگر کسی شخص کو ضرورت زیادہ ہو کہ اونچی گھٹی ہوں اور جانور
 گھٹی ان کی مقدار کے موافق وسعت کرنے میں مضائقہ نہیں ہے غرض اللہ
 تعالیٰ نے نفس بنیان پر نکیر نہیں فرمایا۔ ہاں بنیان مذموم پر نکیر فرمایا ہے
 چنانچہ اس کی ایک فرد کے باب میں فرمایا ہے کہ فانہار بہ فی نار جہنم
 اور تاکید و عید کے لئے یہ بھی فرمایا۔ واللہ لا یهدی القوم الظالمین۔
 غرض یہاں دو مسجدوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک وہ مسجد جس کی بنائیں غرض
 باطل اور نیت فاسد پر تھی۔ اور ایک وہ جس میں غرض صحیح تھی۔ یہ تو مساجد خدا
 تعالیٰ جن کا ذکر اس مقام پر ہے۔ اب میں ان سے اور مساجد کی طرف حکم
 کا تعدیہ کروں گا۔ پھر مدارس کی طرف پھر جملہ عمارات کی طرف۔ مگر اول ایک
 غلطی پر متنبہ کر دینا ضروری ہے۔

یہاں پر بعض اہل فتاویٰ کو مسجد کے متعلق سنت
اہل فتاویٰ کی غلطی

مقابلہ میں کوئی جدید مسجد بنی تو انہوں نے جدید پر فوراً مسجد ہزارہ کا حکم لکھایا
کہ یہ مسجد فساد اور لڑائی کی وجہ سے ہے اور محض تقاضا پر بنی ہے۔ یہ یقیناً امر
ہے کہ اگر نیت مذکورہ ہے تو معصیت ضرور ہے مگر اس سے یہ حکم نکلنا
کہ مسجد ہزارہ ہے کیسے صحیح ہے۔ عزم جو مسجد جدید بنی اس کو مسجد ہزارہ فوراً
کہہ دیا اور اشیٰ اذا ثبتت ثبوت بلوازمہ ہی کے لاعدہ سے بعض اس
سے آگے بڑھے کہ اس کے جمانے اور گرانے کا حکم کر دیا جسے شک
مسجد ہزارہ کا تو یہی حکم ہے مگر پہلے یہ تو ثابت ہو جاوے کہ یہ مسجد ہزارہ ہے
یا نہیں۔ اس کے بعد ہی تو بقیہ تفریعات ہو سکتی ہیں۔ تو جو مسجد ریا اور تقاضا
کے لئے بنائی جاوے مجھے اس کے مسجد ہزارہ کہنے میں کلام ہے۔

اگر کوئی کہے کہ مسجد ہزارہ پر قیاس ہے تو میں کہوں گا کہ یہ قیاس مع
الفارق ہے کیونکہ مقنن علیہ میں تو درحقیقت مسجد ہی بنانے کی نیت نہ تھی
کیونکہ ان کے اعتقاد سے مسجد بنانا موجب تقرب نہ تھا۔ بخلاف مقنن کے
کہ وہاں ہانی مسجد بنانے ہی کی نیت کرنا ہے اور مسجد بنانے کے موجب
کو تقرب سمجھتا ہے گو اس میں نیت فساد بھی ملی ہوئی ہے۔ تو فساد نیت
کو فساد عقیدہ پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

اصل یہ ہے کہ مساجد کی تین قسمیں ہیں۔ ایک مسجد صلوات، ایک مسجد ہزارہ،
ایک مسجد صلوات و ہزار یعنی ایک تو وہ محض نماز کے لئے ہو اور ایک وہ جو محض ہزار

کے لئے ہو اور ایک وہ جو اضرار اور نماز دونوں کے لئے ہو۔ تو جو بعض اضرار کے لئے ہو وہ مسجد اضرار ہے اور جو نماز اور اضرار دونوں کے لئے ہو وہ مسجد اضرار نہیں۔ خوب سمجھ لو مسجد اضرار کے لئے اصل شرط یہ ہے کہ مسجد ہی بنانے کی نیت نہ ہو جو حاصل ہے آیت کا اور جب یہ شرط متحقق نہ ہو گویا اور کوئی دوسری عرض بھی شامل ہو تو مسجد اضرار نہ ہوگی۔ اس لئے احکام ظاہری میں وہ مسجد ہے گو عند اللہ وہ مقبول نہ ہو۔

جیسے کوئی شخص کافروں کے ہاتھ سے قتل ہوا اور نیت خالص نہ تھی تو گو وہ عند اللہ شہید نہ ہو مگر ظاہری احکام شہید کے تو اس پر لگائے ہی جاویں گے عرض مسجدیت اور مقبولیت میں تلازم نہیں۔ فقہاء جن کی شان یہ تھی کہ لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احضرھا کہ تمام جو بیات کا انہوں نے احاطہ کیا ہے مگر یہ جزئی کہیں ان سے منقول نہیں کہ مسجد بہ نیت دیا وغیرہ احکام میں بھی مسجد نہیں ہوتی۔ اگر کوئی صاحب منقول پورے کا دعویٰ کریں تو ہرمانی کر کے دکھائیں ہم نے کسی مجتہد سے کہیں یہ جزئی منقول نہیں دیکھی۔ باوجودیکہ فقہاء کے زمانہ میں بھی اس کی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر فقہاء نے کہیں یہ تفریح نہیں کی حالانکہ احکام مساجد کتب فقہ میں موجود ہیں۔ اور مسجد ہونا نہ ہونا احکام فقہ میں سے ہے پھر عدم تعرض دلیل ہے اس امر کی کہ مسجد تقاضا وغیرہ کی نیت سے بنانا احکام ظاہری اور فقہی کے اعتبار سے مسجد ہی کا حکم رکھتی ہے۔ لہذا ہر مسجد کو ضرور کہہ دینا دعویٰ بلا دلیل ہے۔

پھر جب ایسی مسجد مسجد اضرار کے حکم میں نہیں ہو سکتی تو یہ خیال کر کے کہ

یہ مسجد ضرار ہے اس کے ویران کرنے کی کوشش جائز نہیں ہو سکتی۔ پھر کسی کی نیت پر فتویٰ کا مدار کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ نیت کا علم کسی کو سوائے خدا کے نہیں ہو سکتا۔ پہلے اس شخص سے تو تحقیق کر لو جو بانی مسجد ہے ممکن ہے کہ اس کی نیت اچھی ہو۔ اور وہاں تو نیت کا حال وحی سے معلوم ہو گیا تھا اور اب بوجہ انقطاع وحی ہمیں نیت کا حال معلوم ہو نہیں سکتا، اور جس طرح کسی مسجد کو مسجد ضرار نہیں کہہ سکتے اسی طرح کسی مدرسہ پر بھی مدرسہ ضرار کا حکم نہیں لگا سکتے اس لئے کہ مسجد دار العمل ہے اور مدرسہ دار العلم ہے۔

در سے اور کھالیں | جب ایک شہر میں مساجد متعدد ہو سکتی ہیں تو مدارس کے متعدد ہونے میں کیا مضائقہ ہے۔ البتہ اسی طرح

دو دو یا تین تین مدرسے چلانے سے کیا فائدہ جیسے مدارس آج کل چل رہے ہیں اور چلتے ہیں کہ جب قربانی کے دن آئے تو جہاں مدارس متعدد ہیں وہاں گھر گھر مدرسہ والے بھاگے پھرتے ہیں۔ پھر ہر ایک اپنے مدرسہ کے لئے کھال لینے کی کوشش کرتا ہے۔ جانوروں کی کھال اترنے سے پہلے آدمیوں کی کھال اترنے لگتی ہے۔ اس قدر ذلیل افعال سے غیرت بھی تو نہیں آتی! ایسے مدرسہ کے چلانے سے کیا فائدہ؟ ایسی صورت میں تو مدرسہ والوں کو چاہئے کہ ایک جگہ دو مدرسے چلانے کا نام بھی نہ لیں۔ اور کھال کی کوشش تو مدرسہ والوں کو کسی حال میں بھی مناسب نہیں گو ایک ہی مدرسہ ہو۔ اس میں دوسرے اہل حاجت سے کشمکش ہوتی ہے۔ چنانچہ جہاں پہلے سے قربانی کی کھال موڈوں کو دینے کی عادت تھی وہاں موڈوں کی کھال اترتی ہے۔

جہاں بقر عید کے دن آئے اور موذنوں نے مدرسہ والوں کو دیکھا، کوستا شروع کر دیا کہ خدا ان مدرسہ والوں کو کھوسے۔ انہوں نے ہماری آمدنی تباہ کر دی۔ غرض کھال کے قصہ میں مولویوں سے اکثر لوگ ناخوش ہیں تو علماء بلا ضرورت کیوں مبعوض نہیں۔

فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ علماء کو دستاویز پر دستخط نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس سے عداوت ہوتی ہے۔ اسی طرح علماء کو کھال کے قصہ میں بھی نہ پڑنا چاہئے کیونکہ یہ بھی باعث عداوت ہے۔ اگر کہیں سے آگئی لے لی ورنہ پھرنے پھرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مدرسہ دیوبند پھر غنیمت ہے کہ وہ اس طرح کھالوں وغیرہ پر زور نہیں دیتے بلکہ یہ لکھ دیتے ہیں کہ جہاں اوروں کا خیال کرتے ہو وہاں ہمارا بھی خیال کہ لینا۔ غرض علماء کو آزاد رہنا مناسب ہے۔ خوب کہا ہے۔

زیر باند درختاں کہ شرٹا وارند خوشتر آں سرو کہ از بند عم آزاداند
 خصوص جہاں کٹی مدرسہ ہیں وہاں تو بہت ہی چیقلش ہے اور کسی
 کا کسی پر بس تو چلتا نہیں۔ لہذا مسجد حزار و مدرسہ حزار کے لقب سے ملقب
 کر کے اپنے دل کا غبار نکالتے ہیں۔ حالانکہ صاف اور واضح طور سے قرآن
 میں ایسے القاب سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ولاتنابزوا باللقاب
 بلکہ اگر واقعی بھی کسی کا کوئی بڑا لقب ہو تو پڑانے کی نیت سے بھی نہ
 کہنا چاہئے۔

تعمیر مساجد اور احتیاط

اب میں خاص مسجد کی خاص عمارت سے مطلق
 مساجد کی عمارت عامہ کی طرف حکم کا تعدیہ
 کرتا ہوں اور مساجد کی عمارت میں جو کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں، ان کا مختصر
 بیان کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ آج کل لوگ تعمیر مساجد میں اپنے کو شتر بے ہمار سمجھتے ہیں کسی
 قسم کی حدود و قیود کی رعایت نہیں کرتے اور اس جواب کو کافی خیال کرتے
 ہیں کہ ہم اپنا گھر تو نہیں بناتے۔ حالانکہ یہ جواب بالکل نا کافی ہے کیونکہ خدا
 کے گھر میں تو بدرجہ اولیٰ احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہاں احتیاط نہ کرنا زیادہ
 رنج و ملال کی بات ہے۔ چنانچہ مساجد میں گنبد کو ضروری خیال کرتے ہیں اور
 استرکاری تو درجہ فرائض میں سے ہے۔ بلا ان امور کے تو مسجد مسجد ہی
 نہیں ہو سکتی۔ منارہ کو اس قدر طویل کرتے ہیں کہ جس کا بیان نہیں۔ اور منارہ
 کی طوالت کی اکثر یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ دُور سے نظر آوے کہ مسجد ہے
 مگر یہ وجہ بھی صحیح نہیں۔ بعض دفعہ آڑھ ہوتی ہے تو طویل منارہ بھی دُور سے
 نظر نہیں آتا۔

علاوہ ازیں دُور سے نظر آنا بھی ضروری نہیں۔ منارہ بنانے کی اصل
 وجہ تو صرف یہ ہے کہ مسجد دوسری عمارت سے مشتبہ نہ ہو۔ منارہ مسجد
 ہونے کی علامت ہے اور وہ علامت نفس منارہ ہے نہ کہ منارہ کا ان قدر
 طول و طویل ہونا۔ سو علامت کے لئے چھوٹے چھوٹے گز گز بھر کے منارے
 کافی ہیں۔ یا بجائے منارہ کے اور کوئی علامت کر دی جائے۔

بعض لوگ طوالت منارہ کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں شانِ اسلام ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر یہ بات ہے تو شان کے برابر تو لمبا ہونا چاہئے تھا۔ پھر تو سب مساجد کے منارے کم از کم قطب کی لاکھ کے برابر تو ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسجد بٹتا تو دشوار ہی ہو جاتی ہے۔

لیکن ایک منارہ پر ہی عمریں تمام ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ قطب کی لاکھ کی بابت مشہور ہے کہ بادشاہ کا مسجد بنانے کا قصد تھا مگر اس وقت تک ایک ہی منارہ بنا تھا کہ بادشاہ صاحبِ محل بسے۔ دوسرا منارہ نہ بنا اور نہ پوری مسجد بنی ورنہ معلوم نہیں کیا کیا تکلفا ہوتے۔ ہماری ان رسوم سے ہماری مساجد کی واقعی وہی حالت ہو رہی ہے کہ مساجد عامتہ وہی خواب کہ ظاہر میں تو مساجد آباد ہیں مگر باطن میں خراب ہیں۔ ان میں روح نہیں فقط ظاہر ہی ظاہر ہے۔

چنانچہ بیٹی کی یہ حالت ہے کہ ظاہر میں تو وہاں کی مساجد بسے حد آباد ہیں۔ بسے اور بہت جھاڑ فالوں فروش فروش مگر سنت کے خلاف جماعت میں متفرق طور پر آؤ گی کھڑے رہتے ہیں اور پورے طور سے صرف بندی بھی نہیں ہوتی۔ اور اس کی وجہ فکر مکرمہ کی تقلید ہے مگر وہاں تو خط مستقیم کھینچنا دشوار ہوتا ہے اس لئے کہ خانہ کعبہ کے رخ پر نماز پڑھتے ہیں اس لئے پورے طور سے صرف بندی دشوار ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اکثر متفرق طور پر صفوف رہتی ہیں۔ مگر بیٹی ہیں کوئی عذر نہیں۔ بیٹی والے نماز کے افعال و ہیئت میں اکثر مکہ والوں کی تقلید کرتے ہیں۔ امام و مؤذن بھی

زیادہ تر عرب ہی ہیں مگر یہ سب دین کی ظاہری صورت ہے اور باطنی حالت یہ ہے کہ مہر سے پیر تک بدعات میں غرق ہیں۔

ایک ہمارے دوست طالب علم مدینہ میں ملے اور قصہ بیان کیا کہ ان سے کسی نے شیخ سدو کے بکرے کی بابت دریافت کیا۔ انہوں نے نا سبائز کہہ دیا بس ٹکوری صبح گیا۔ اب جس مسجد میں جاتے ہیں وہاں حکم ہوتا ہے کہ نکالو وہابی ہے۔ اس جہالت کی بھی کوئی حد ہے کہ مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روکتے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں ہے ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان ینذکر فیہا اسمہ وسعی فی جواربہا۔ عرض جس جگہ اور جس مسجد میں جاتے ہیں وہابی وہابی کہہ کر نکال دیئے جاتے ہیں۔ اتفاق سے ایک مسجد شافعیہ کی تختی وٹاں سجا کر نماز پڑھی۔ میں نے کہا کہ میاں فتویٰ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کہہ دیا ہوتا کہ مجھے معلوم نہیں۔

عرض یہ بہانہ محض لغو ہے کہ مسجد کی زینت و آرائش سے شوکت اسلام بڑھتی ہے۔ اسلام کی شوکت تو اتباع احکام سے بڑھتی ہے۔ اگر ان باتوں سے شوکت اسلام بڑھا کر تی تو جس زمانہ میں شوکت اسلام عروج پر تھی اس زمانہ میں ان باتوں کا ضرور وجود ہوتا مگر ان چیزوں کا کہیں پتہ نہیں۔ دیکھیے حضرت عمرؓ کتنے بڑے صاحب شوکت و سلطنت و سیاست

تھے اور کس قدر عالی دماغ اور بلند حوصلہ تھے۔ لیکن جب مسجد نبوی بنوانے لگے تو بخاری میں ہے کہ مستری سے فرمایا کہ کن الناس من الجرو والعبود یعنی مسجد ایسی بناؤ کہ گرجی اور بارش سے بچاؤ ہو جاوے۔ چنانچہ حضرت

عمر نے باوجود کثرت فتوحات کے نقش و نگار کی اجازت نہیں دی۔ تو اس زمانہ میں قلت زینت مساجد کی وجہ سے کیا عروج اسلام میں کچھ کمی آگئی تھی یہ گز نہیں بلکہ ایسا عروج تھا کہ آج مسلمان اس کو ترستے ہیں۔

تھانہ بھون کے اسٹیشن پر جب مسجد بنی ہے تو معمار نے اس میں نقش و نگار بھی نکالنا شروع کر دیئے تھے۔ خر بوزہ اور تریبوزہ بنانے شروع کر دیئے منتظم نے روکا کہ یہ قصہ مرت کرو اور میرا حوالہ دیا کہ وہ پسند نہ کرے گا۔ معمار نے کہا کہ اگر وہ پسند نہ کرے گا تو مزوری نہ دینا۔ منتظم نے کہا کہ یہ تو یقینی امر ہے کہ وہ پسند نہ کریں گے۔ پھر مزوری بھی یقینی طور پر نہ ملے گی۔ معمار نے اس کو بھی منظور کیا۔ پھر میرا مسجد دیکھنے کی غرض سے وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے سب نقش و نگار دیکھا کہ صاف کرا دیئے۔ اور معمار کو موافق و مددہ دونوں پوجہ قاعدہ شریعہ اُجرت نہیں دی گئی۔ کیونکہ اگر مسجد میں اس طرح سے نقش و نگار کئے جاویں تو مسجد مسجد نہیں رہتی بلکہ تماشا گاہ ہو جاتی ہے کہ سیاح اس کو دیکھنے کو آتے ہیں اور نمازی بھی اگر وہاں نماز پڑھتے ہیں تو خیال نقش و نگار کی طرف رہتا ہے۔ نماز کی طرف نہیں رہتا۔ جب مساجد میں ان خرافات کی اجازت نہیں اور مساجد میں یہ خرافات فضول ہیں حالانکہ ان کی زینت یا شوکت میں ایک گونہ دینی مصلحت بھی محتمل ہے تو بقیہ عمارت میں بدرجہ اولیٰ یہ قصہ فضول ہے۔

غرض عمارت میں ربا و تقاضی و اسراف سے نخر لازم ہے۔ یہ عمارت میں تقویٰ اور رضوان کی ضرورت ہے۔

مکان اور تقویٰ

اگر دونوں جمع ہو جائیں سبحان اللہ اور نہ صرف تقویٰ بھی بدرجہ اولیٰ کافی ہے اور تقویٰ اور رضوان میں جو فرق ہے اس کو بیان کرتا ہوں۔

طلب رضوان جو جو ریاست سے ہے اور تقویٰ عدمیاست سے یعنی طلب رضوان کا حاصل ثواب کے لئے فعل مامورات ہے خواہ واجب ہوں یا مستحب اور تقویٰ کا حاصل استراذ عن المنہیات ہے۔ پھر تقویٰ اور رضوان کو یہاں لفظ واو سے جمع کیا گیا ہے اور لفظ واو ہر چند کہ جمع کے لئے آتا ہے مگر اجتماع کے لئے نہیں آتا۔ پس ہر عمارت میں تقویٰ اور رضوان کا جمع کرنا ضروری نہیں کیونکہ عمارت کی دو قسمیں ہیں یعنی عمارت جیسے مساجد وغیرہ میں تو رضوان و تقویٰ کا اجتماع ہوتا ہے کیونکہ نیت بھی ثواب کی ہوتی ہے اور خلاف شرع افعال و نیت سے بھی بچنا ضروری ہوتا ہے اور اگر اپنا مکان بناویں تو اس میں تقویٰ تو ہر حال میں ضروری ہے لیکن رضوان و ثواب کی رعایت قدرے مشکل ہے۔ اگر اس میں بھی رضوان و ثواب کا قصد شرعاً ضروری ہوتا تو ہم اس صورت میں مکان بنانے میں خوشنودی خداوندی کی آخر کیا نیت کہ لئے تکلف ہی کرنا پڑتا۔ چاہے حق تعالیٰ ہمیں کسی نیک نیت پر جو ہم بہ تکلف کر لیں، ثواب دے دیں مگر نیت کرنا خود ہونا تکلف۔

جیسے ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کے ایک مرید نے مکان بنا یا تھا تو وہ بزرگ مکان دیکھنے تشریف لائے۔ دریافت کیا کہ بھائی یہ روشن دان کیوں رکھا ہے۔ عرض کیا کہ حضور روشنی کے واسطے۔ فرمایا اگر یہ نیت کر لیتے کہ اس میں سے اذان کی آواز آوے گی تو ثواب بھی ملتا اور

دستی تو ہر صورت میں ہوتی ہی۔

مگر یہ ہے کہ ہر فعل میں اس قسم کی نیت ہے۔ مشکل یہ خاص لوگوں کا کام ہے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ عنوان کی رعایت ہر عمارت میں مامور نہیں۔ ہاں اگر نیت خیر ہو اس کے مستحب ہونے میں کلام بھی نہیں مگر سب میں ایسی ہمت کہاں کہ کھانا کھاوے، چلے پھرے، ہر ایک فعل مباح میں کوئی خاص نیت کرے۔ عوام اگر نیت کریں گے بھی تو محض درجہ لفظ میں ہوگی نہ کہ حقیقت۔ بہر حال ہر کام میں ایسی نیت دشوار ہے۔ نتیجہ اس کا وہ ہوتا کہ غیر ضروری نیت کے ساتھ ضروری نیت بھی چھوٹ جاتی۔

جیسے ایک صاحب کو میں نے دیکھا میزان پر ٹھانے بیٹھے تو الحمد للہ میں تقریر کرنے لگے کہ الف لام کی چار قسمیں ہیں۔ استغراق اور جنس اور عہد و پیمانہ اور عہد خارجی وغیرہ۔ حالت یہ تھی کہ وہ بیان کر رہے تھے اور طلباء ان کا منہ تک رہے تھے۔ میں نے کہا کہ ان پڑھنے والوں کے نزدیک تو الف لام کی ایک ہی قسم ہے یعنی استغراق۔ کیونکہ یہ بیچارے سب مستغرق ہو گئے۔ تو وہ بتدی جس نے میزان شروع کی ہے۔ ان باتوں کو کیا سمجھ سکتا ہے پھر اس کا نتیجہ کیا ہے۔ بجز اس کے کچھ نہیں کہ جب سمجھیں نہ اوسے تو چھوڑ دے تو نتیجہ اس دشواری کا اکثر ضروری چیز کا بھی ترک ہوتا ہے۔

اکثر و اعظم اس قسم کی حکایات عوام کے سامنے بیان کر دینے میں اول ان کا درجہ بیان کرتے نہیں۔ عوام ان کو ضروری سمجھ جاتے ہیں۔ جس سے ان سب امور کا نتیجہ ترک عمل ہوتا ہے۔ اگر ہر عمارت میں طلبہ عنوان و ثواب

کی نیت کا مکلف بنایا جائے تو عوام تقویٰ کو بھی چھوڑ بیٹھیں گے۔ عرص
 عمارت کے لئے دو چیزوں میں سے بطور مانعہ الخلو کے کسی ایک کی ضرورت
 ہے تقویٰ کی یا رضوان کی اور اس لفظ واؤ سے تقویٰ اور رضوان کا محتملاً پایا جانا
 ضروری نہیں ہو گیا۔ کیونکہ یہاں تو واؤ سے فقط حکم میں دونوں کو جمع کرنا منظور
 ہے نہ کہ وجود میں اور وہ حکم ہے خیریت۔ تو یہاں جمع فی الخیریت مراد ہے
 کہ خیر ہونے میں دونوں شریک ہیں۔ پس ہر شخص کے ذمہ یہ ضروری نہیں کہ ہر
 عمارت میں تقویٰ اور رضوان دونوں باتوں کو مجتمع کرے بلکہ بعض عمارت میں
 جہاں رضوان و ثواب کی نیت میں تکلف ہو، صرف تقویٰ بھی کافی ہے۔

اب تقویٰ کی مختصر فہرست بتلاتا ہوں جس میں سب سے
 پہلی بات تو یہ ہے کہ بے ضرورت مکان نہ بناؤ

مکان اور ضرورت

یہ بھی خلاف تقویٰ ہے۔ جب ضرورت ہی شدید ہو تو مجبوری ہے۔ حدیث
 میں آیا ہے کہ سب چیزوں میں اجر ملتا ہے مگر عمارت کہ اس میں اجر نہیں
 ملتا اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمارت میں زیادتی ہو ہی جاتی ہے اور
 میں خود اس تجربہ میں مبتلا ہوں۔ کہیں ذرا سا گوشہ نکلا ہو اور معلوم ہوتا ہے کہیں
 نیچا ہے اس کا مساوی کرنا ہے۔ کہیں صرف اس ضرورت سے کہ مقابلہ
 ٹھیک نہیں ہوتا کوئی چیز بنا لی جاتی ہے۔ اگر دروازہ سے پورا تقابل نہیں
 ہوتا تو مقابلہ میں دروں کے نشان بلا ضرورت ڈالتے ہیں۔ عرص عمارت
 وہاں ہے البتہ ضرورت مستثنیٰ ہے۔ حدیث میں او بیت یتداخل فیہ
 وارد ہے مگر یہ ضرور ہے کہ ہر شخص کی ضرورت مختلف قسم کی ہوتی ہے

اس لئے اختصار بھی ہر اک کے لحاظ سے مختلف ہے۔

جیسے مشہور ہے کہ ایک بزرگ کی مخالفاہ میں ایک شخص اٹھ دس روٹی کھایا کرتا تھا۔ لوگوں نے شکایت کی۔ بزرگ نے نصیحت کی کہ بھائی کم کھانا چاہئے۔ خیر الامور اوسطا تھا۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت میری خوراک چالیس روٹیاں ہے اس لئے میرا اوسط یہی ہے بلکہ اوسط سے بھی کم ہے۔ عرض ہر شخص کی ضرورت جدا ہے۔

ایک شخص ہے کہ اس کے گھوڑے وغیرہ بھی ہیں۔ اس کو ان وجوہ سے بڑے مکان کی حاجت ہے۔ اس لئے ہر شخص کا اوسط جدا ہے۔ عرض بعد ضرورت میں تعمیر کرنا چاہئے اور ضرورت سے زائد کو ترک کرنا چاہئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو آرائش ہے اور ایک آرائش ہے آرائش کی مقدار تک تو مکانوں میں وسعت جائز ہے۔ مگر آرائش کا اہتمام مذموم ہے۔ خصوصاً جب ساخت میں نماش بھی ہو۔ بس ہر عمارت میں یہ امر ضروری اور قابل لحاظ ہے کہ یہ تعمیر آرائش کے واسطے یا آرائش و نماش کے واسطے ہے۔ تو جو عمارتیں آرائش و نماش کے واسطے ہوں وہ تقویٰ کے خلاف ہیں۔ اور اکثر عمارت تو ایسی ہی ہیں جن میں ضرورت کا لحاظ نہیں کیا جاتا چونکہ بعض مکانوں میں دروازے بہت بلند ہیں بلکہ بعضے مکان تو ایسے ہیں کہ دروازہ تو نہایت عالی شان مگر اندر سے مکان بہت ہی مختصر۔ وہی مثل ہے کہ خوان بڑا خوان پوش بڑا، کھول کے دیکھا تو اچھا بڑا پرانی عمارتوں میں اکثر ایسے دروازے دیکھے جاتے ہیں جو ٹھیک اس مختصر کے مصداق ہیں۔

از نقش و نگار در دیوار شکستہ آثار پدید دست صنایع عمیق را
ان مکانوں میں اکثر مکان ایسے بنائے گئے ہیں کہ جس لاکت میں ان
کے دروازے بنتے ہیں اتنی لاکت میں دو تین جوئیلیاں تیار ہو سکتی تھیں۔ تو اس
کو سوا آرائش بلکہ نمائش کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

میرے ایک عزیز بھتیجے انہوں نے تین سو روپیہ میں ایک جوئی خرید
لی جس میں ایسا عالی شان برج تھا کہ تین سو روپیہ کا تو وہی ہو گا اور اندر سے
مکان کچھ بھی نہیں۔ عرض آج کل شان اور فخر سے بہت کام لیا جاتا ہے
معمولی مکان بنانے سے عار آتی ہے۔

عشق اور وظیفہ | یہ عار وہ بلا ہے کہ انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ ایسی
عار ہی کی وجہ سے ابوطالب مفسود سے رہ گئے حالانکہ

وہ حضور کے عاشق اور جاثار تھے۔ حضور نے مرتے وقت ان سے فرمایا کہ
ایک دفعہ کلمہ کہہ دو۔ احب بہاری اس وقت ابو جہل بھی پاس بیٹھا تھا
کہنے لگا۔ انرغب عن ملتہ قریش۔ تو ابوطالب حضور سے کہنے لگے
کہ میرے بھتیجے! میں تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا مگر لوگ کہیں گے کہ ابوطالب
نے عذاب کے ڈر سے اپنا دین چھوڑ دیا۔ عرض آنحضرتؐ ان کی زبان سے
یہ نکلا ہو علی دین عبدالمطلب۔

عرض یہ عار وہ بلا ہے جس کی وجہ سے ابوطالب ایمان نہ لاسکے۔
پس اس کا علاج کریو اور اس کا علاج وظیفوں کا پڑھنا نہیں بلکہ عشق پر دیا
کر لویو۔ یہ اس سے ضرور جاتا رہے گا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ہر کہ اس جاہلہ ز عشقے سچاک شد
 اور جس و عیب کلی پاک شد
 شاد باش اے عشق خوش سرواے
 اے طیب جملہ علمتہائے ما
 اے دوائے نوحہ و ناموس ما
 اے تو افلاطون و جالینوس ما
 اور فرماتے ہیں کہ :-

عشق آل شعلہ است کو چوں بر فروخت

ہر چہ بہر معشوق باقی جسد سوخت

تبع لا در قتل غیر حق براند
 در گنج آنخر کہ بعد لا چہ ماند
 ماند لا اللہ باقی جملہ رفت
 مر جا اے عشق نہ ترکت سوخت

اور خود یہ عشق بھی وظیفوں سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ صحبت سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے خر بوزہ کو دیکھ کر خود بوزہ رنگ بدلتا ہے۔ پس اس کی تائید یہ ہے

قال را بگذار مرد و حال شو
 پیش مرد کا ملے پا مال شو

تو عشق کے پیدا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ عشاق کی صحبت اختیار کرو

یعنی ان کا اتباع اور انقیاد کرو جو وہ تجویز کریں اور تعلیم کریں اس پر عمل کرو

یاد رکھو وہ وظیفہ نہ بناویں گے نہ وہ اپنے پاؤں دیوادیں گے بلکہ لوگوں کی

خدمت کراویں گے۔ ان امور کو جان و دل سے قبول کرنا چاہئے اگر نفس

کو تا گوارا ہو۔

عبر کن در کار خضر اے بے تفاق
 تا نہ گوید خضر و ہذا فراق

مگر یہ سخنی چنڈ ہی روز ہوتی ہے۔ پھر ان سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں

ہوتا۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادیوں ایک بزرگ

تھے۔ میں اُن کی خدمت میں دو دفعہ گیا۔ آخری مرتبہ اُن کی ایسی شفقت تھی کہ جب میں روانگی کی اجازت چاہتا تھا۔ فرماتے تھے کیا جلدی ہے۔ مگر اول مرتبہ لہجہ تند تھا اور خفگی نمایاں تھی۔

اکثر خفگی اور تندی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان حضرات کو خلاف سنت سے تنگی ہوتی ہے۔ چنانچہ مسجد میں جاتے وقت کوئی بایاں پیر پہلے رکھ دیتا تھا تو مولانا کو ناگوار ہوتا تھا اور غصہ اُجھاتا تھا۔ مجھ سے جس مرتبہ تند لہجہ میں بولے تھے اُس کی وجہ بھی یہ تھی کہ میں راستہ کو گیا تھا اور حدیث میں رات کو جانے کی ممانعت آئی ہے، لہذا خفگی ہوئی۔ مگر میں نے سمجھا کہ یہ خفگی میرے لئے اصلاح ہے۔ اس لئے ذرا ناگوار نہ ہوئی۔ بلکہ دوبارہ پھر حاضر ہوا۔ اُس وقت مولانا غایت شفقت سے پیش آئے اور حصین حصین کا درس شروع کر دیا اور حدیث وغیرہ کی اجازت دی اور بہت توجہ فرمائی۔

پس بزرگوں کی خفگی کو چند روز برداشت کر لو تو پھر غم کو وہ اپنی دولت سے رنگ دیں گے اور اگر خفگی کی وجہ سے کوئی اُن سے بھاگے تو ان حضرات کا اس میں کیا نقصان ہے اپنا ہی نقصان ہے۔ افسوس عیش کی طلب اور ذرا سی خفگی سے ناگوا رہی ہے۔

تو بیک زخمے گریزانی ز عشق تو بجز نامے چہ می دانی ز عشق اور خود اُن کی یہ شان ہوتی ہے کہ اگر کوئی اُن کو برا بھی کہے تو اُن کو اس کی بھی پرواہ نہیں بقول حافظؒ

گر چہ بدنامی مست نزو عافلاں تا بخی خواہیم ننگ و نام را

یہ یہ تکالیف جانتے ہیں۔ تکالیف کے متعلق ان کا مذاق یہ ہوتا ہے
 کہ خرقہ کو بھی تکلف سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ
 ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولی
 ویں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولی
 اس شراب سے مراد شراب محبت ہے یعنی اس خرقہ کو شراب محبت
 میں ڈیونا چاہئے۔ ورنہ بدیون اس کے وہ آگ میں جلانے کے قابل ہے
 کما قالہ

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بیغش باشد
 اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد
 بہت لوگ خرقہ پہن کر عجب و تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ حقیقت
 میں صوفی نہیں۔ ان میں کھوٹ ہے۔ ان کو ابھی مجاہدہ کی ضرورت ہے تاکہ
 یہ خناس و مانع سے نکلے۔ اگر یہ خناس موجود ہے تو حقیقت میں وہ صوفی
 نہیں۔ جب یہ خناس نکل جاوے گا تب صوفی ہوگا۔ اس وقت یہ حال ہوگا
 کہ نہ سجاہ کی طلب رہے گی نہ عزت کی بلکہ ہر حال پر راضی ہو کر کہے گا
 زندہ کنی عطائے تو و رہکتی فائے تو
 جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو
 جب یہ حالت ہو جاوے گی تب عشق پیدا ہو جاوے گا۔ اور جب عشق پیدا
 ہوگا اس سے نخوت خود بخود جاتی رہے گی۔ پس نفاخر کا علاج یہی ہے
 کہ عشق پیدا کرو اور جب تک عشق پیدا نہ ہوگا اس وقت تک عمارت میں لباس

میں ادھار قطع میں ہر چیز میں یقیناً نفاذ پیدا ہوگا اور اُس سے پہنچنا دشوار اور قریب بہ محال ہوگا۔ عرض ایک امر تقویٰ کے خلاف تو یہ ہے کہ عمارت فضول اور بے ضرورت بناتے ہیں۔

تواضع اور رحم کا فقدان

دوسری چیز اُس فہرست کی یہ ہے کہ اپنی عمارت کی اصلاح کے لئے جس کی زمین

پاس دیکھی دہالی تاکہ اپنی عمارت نہ بگڑے۔ ہاں جو! افسوس ہے کہ پہلے زمانے میں تو کفار سلاطین بھی ایسا نہ کرتے تھے۔ پھر حیرت ہے کہ ہم مسلمان اور ضعیف القدرہ ہو کر یہ حرکتیں کریں

نوشیرواں بادشاہ تھا۔ جب اپنا محل بنانا چاہا تو ایک بڑھیا کا مکان محل کے قریب تھا جس کے ملائے کی ضرورت تھی ورنہ محل میں رہنا ہی رہتا تھا لگیا اُس نے دینے سے انکار کر دیا تو نوشیرواں نے اُس پر زور نہ دیا اور نہ جبر کیا بلکہ اپنا مکان ٹیڑھا ہی بنا لیا اور ایک گوشہ کے بگڑنے کا خیال نہ کیا۔

اصل یہ ہے کہ پہلے لوگوں میں طبعاً یا عقلاً نملوس اور تواضع اور حفاظت حدود تھی۔ اسی لئے اُن کی تعمیرات پائدار اور مضبوط اور خوشنما بھی ہیں اور آج کل یہ حالت ہے کہ سب سے پہلے اس پر نظر پڑتی ہے کہ کسی کی زمین پاس ہے اُس کو دیکھ کر آدمی باڈلا بن جاتا ہے کہ کسی طرح یہ بھی میرے مکان کے اندر آجائے، اور اگر کسی عزیز اور کمزور کی ہے تو روز بروز اپنی عمارت کو تھوڑا تھوڑا ادھر کھسکانا شروع کر دیتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ آج کل تواضع اور رحم بالکل نہیں اور اس کے فقدان سے آخرت کا تو ضرر ہے ہی۔ مشاہدہ ہے

کہ عمارت بھی تاپاٹدار ہوتی ہے۔

تواضع کے ذکر پر اس کے متعلق ایک ضروری بات یاد آگئی۔ وہ یہ کہ تواضع سے میرا مطلب یہ نہیں کہ تم چھوٹوں کو اپنے سر پر بٹھاؤ بلکہ یہ مطلب ہے کہ کسی کو حقیر نہ سمجھو، کسی کا حق ضائع نہ کرو، نہ کسی کا حق دباؤ اور بعض بزرگوں سے جو ایسے واقعات منقول ہیں کہ انہوں نے چھوٹوں کو سر ہانے بٹھلایا تو یہ غلبہ حال ہے۔ بعض اہل حال بزرگوں پر تواضع کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

چنانچہ مولانا محمد مظہر صاحب ایک مرتبہ پائنتی بیٹھے تھے۔ حجام خط بنانے کے واسطے آیا تو آپ نے فرمایا کہ سر ہانے بیٹھ کر بنا دو۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت آپ سر ہانے بیٹھ جاویں۔ فرمایا اگر تمہیں خط بنانا ہو، تو یہیں بیٹھ کر بنا دو، ورنہ پھر کسی وقت جب مجھے سر ہانے بیٹھا دیکھو اس وقت آکر بنا دینا۔ اب تو میں اٹھ کر سر ہانے نہیں بیٹھتا۔ وہ حجام مجبور ہو گیا اور سر ہانے بیٹھ کر ہی خط بنانا شروع کر دیا۔

مگر یہ غلبہ حال ہے۔ اس وقت مولانا پر کوئی خاص کیفیت تھی بسبب بزرگوں کا ایسا ہونا ضروری نہیں بلکہ بعض دفعہ بزرگ جن پر اس حالت کا غلبہ نہیں ہوتا اپنے چھوٹوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرتے بلکہ چھوٹوں ہی کا سا معاملہ کرتے ہیں کیونکہ انہیں فرائض سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر ہم اس درجہ تواضع کریں گے تو چھوٹوں کو تکلیف ہوگی یا گرامی ہوگی یا اس کے لئے مضر ہوگا اس مصلحت سے وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ معاملہ چھوٹوں کا سا کرتے

ہیں اور نواضع نہیں کرتے۔ لیکن اگر کوئی بزرگ تو اصغاً ایسا کریں بھی تب بھی
چھوٹوں کو نہ چاہئے کہ ان کے سر ہانے بیٹھیں اور حکم موکد اس سے مستثنیٰ

ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب پر ایسی نواضع کا خاص طور پر مذاق
غالب تھا۔ چنانچہ ایک بار مولانا تھانہ بھون نیشنل لائے اور آپ کا وعظ
ہوا تو مولانا پائنتی بیٹھے تھے اور ہماری قوم شیخ زادہ کو دیکھتے کہ وہ مولانا کے
سر ہانے بیٹھے تھے۔ مولانا تو قوم کے بھی شیخ زادہ تھے۔ اگر مولانا سر ہانے
نہ بیٹھے تھے تو ان لوگوں کو یہ زیبا تھا کہ اس پلنگ کو خالی چھوڑ دیتے اور
اس پر کوئی نہ بیٹھتا۔ مگر اللہ بچائے ایسی شیخ زادگی سے بھی کہ کسی کی تعظیم
و تکریم بھی نہ کریں۔ مگر مولانا کی یہ خاص شان تھی کہ ان کو اپنے سر ہانے کسی
کے بیٹھنے سے ذرا ناگواری نہ ہوتی تھی بلکہ وہ تو قصداً پائنتی بیٹھتے تھے مگر
بعض کا مذاق دوسرا ہوتا تھا۔

چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اپنے
چھوٹوں کے ساتھ چھوٹوں ہی کا سا معاملہ کرنا چاہئے۔ اس سے ان کا
دل خوش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مجھے عزیز
میاں انشرف علی لکھا کرتے تھے۔ اور حضرت مولانا محمود الحسن صاحب
خط میں مخاروم مکرم وغیرہ الفاظ لکھتے۔ میں نے ایک مرتبہ عربیہ لکھا کہ کھڑ
سے یہ تو توقع نہیں کہ حضرت چھوٹوں کے القاب سے مجھے یاد فرماویں
اس لئے اگر حضرت عنایت فرما "وغیرہ تحریر فرما دیا کریں تو بھی گوارا کرونگا

پھر اس کے جواب میں جو خط آیا اس میں بھی وہی مخدوم و مکرم وغیرہ القاب موجود تھے۔

حضرت مولانا سلمہ بر بھی تواضع کا ذوق غالب ہے اور حکماء و شریع پر یہ مذاق غالب ہے کہ اگر کوئی چھوٹا شخص ان کی پائنتوں بیٹھتا ہے تو بیٹھنے دیتے ہیں۔ اہتمام کر کے اس کو اپنے سر ہانے نہیں بھلاتے۔ لیکن اگر وہ چھوٹا پہلے سے سر ہانے بیٹھا ہو تو خود اہتمام کر کے اس کے سر ہانے بھی جا کر نہیں بیٹھتے۔ مگر بیماری نخوت کی تو یہ حالت ہے کہ اگر کہیں مجلس میں جائیں اور کوئی عزیز آدمی سر ہانے کی طرف پہلے سے بیٹھا ہو تو اس کو دھمکا کر پائنتی کی طرف کر کے خود سر ہانے بیٹھیں گے۔

بھلا یہ تو عادات میں نخوت مٹی بعض مشکبران تو عبادات میں بھی نخوت کرتے ہیں۔ کاپی کی

عبادات اور نخوت

مسجد میں ایک داروغہ صاحب تشریف لائے اور ایک بچا را گندھی مسافر تاجر بھی اسی مسجد میں آیا۔ داروغہ صاحب نے نماز بہت جلدی جلدی پڑھی جب وہ سلام پھیر چکے تو اس گندھی نے کہا کہ آپ نماز کا اعادہ کر لیجئے۔ آپ کی نماز نہیں ہوئی۔ داروغہ جی کو گندھی کی اصلاح بہت ناگوار معلوم ہوئی اور اس کو دھمکایا کہ تو ہمیں اصلاح دیتا ہے۔ گندھی نے کہا، صاحب چاہے آپ پڑوا بھی لیجئے مگر نماز کا اعادہ کر لیجئے آپ کی نماز نہیں ہوئی اور لوگوں

لہ اس بیان کے وقت حضرت زندہ تھے۔

نے جو وہاں حاضر تھے ان سے کہا کہ وارو غریجی اس میں آپ کا نفع ان ہی کیا ہے آپ نماز کا اعادہ کر لیجئے۔ خیر انہوں نے مجبور ہو کر نماز کا اعادہ کیا۔ اب تو وہ گندھی صاحب مشہور ہو گئے۔ جدھر جاتے ہیں لوگ بلاتے ہیں کہ حضرت یہاں آئیے۔ ہر ایک اپنے پاس آنے کی درخواست کرتا ہے۔ خوب عطر تیل کی بکری ہوئی اور تعظیم تکریم بھی ہوئی۔ اور واقعی ان کی یہ بات تھی بھی تعظیم کے لائق۔ دیکھئے ان وارو نے عبادت میں بھی نجات سے کام لیا۔

ہماری اکثر یہ حالت ہے کہ ظاہر میں تو متواضع ہیں۔ بات بات پر خاکساری ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر کوئی نصیحت کر دے تو یہ سماں ہو جاتا ہے واذاقیل له اتق الله اخذته العزة بالاشمہ پس ہماری تواضع محض تصنع ہے بقول مولانا

کہ گے آپے ور وغے میرنی از برائے مسکے ور وغے میرنی
مگر بناوٹ سے کام نہیں چل سکتا۔ نہ تصنع حق تعالیٰ پر مخفی رہ سکتا ہے۔
کار با اور است باید و اشتن رایت اخلاص و صدق اشتن
غرض یہ نجات بہت ہی بڑی چیز ہے اور یہ عشق ہی سے زائل ہوتی ہے اور عشق کے پیدا کرنے کی تدبیر جیسا اوپر مذکور ہوا صحبت عشاق ہے اور جب تک صحبت عشاق بیسرنہ ہو اس وقت تک یہ تدبیر کی جاوے کہ وقت کے افعال اختیار کئے جائیں اور متواضعین کے طریقہ کو بشکلف دستور العمل بنایا جاوے۔ مثلاً کوئی مسجد میں نماز کی غرض سے آوے، کسے

یا شہ اُس کے واسطے لوٹ بھر کر رکھ دیا یا اُس کے جوتے اٹھا کر رکھ دیئے
اس لئے کہ

النفس كالطفل ان تهمله شب على

حب الرضاع وان تطفمه ينظم

یعنی نفس کی مثال بچہ کی سی ہے اُس کو جیسے کاموں کی عادت ڈالو گے
اُسی کا اثر قبول کر لے گا۔ پس ابتداء ہی میں نفس کو ذلت کے کاموں کا عادی
کر دو۔ پہلے ہی دن بڑے بننے کی فکر نہ کرو۔ پس جیسا ابھی مذکور ہوا ابتداء میں
یہ کام کرو کہ مسجد میں جا کر فرش بچھا دیا، اذان کہہ دی۔ کیونکہ آج کل لوگ اذان
کہنے کو بھی بہت عجیب خیال کرتے ہیں اور مؤذن کو بہت ذلیل سمجھتے ہیں
اس سے نخوت کا علاج ہو جاوے گا۔ جن کی وجہ سے عمارات میں کسی کا حق
دبانے کا خیال ہو جاتا ہے۔ اگر تم سب کو اپنے سے بڑا سمجھو تو پھر ایسی
بے راہی کی کبھی ہمت نہ ہو۔

غرض مکان بنانے میں اس کی رعایت رکھو کہ
کسی کی زمین نہ دباؤ۔ کسی کی زمین میں دروازہ

تعمیر میں خلوص کا اثر

کھولو۔ کسی کی ملک میں نالی نہ نکالو۔

مجھے ایک مکان کی ضرورت تھی۔ اس لئے میں نے ایک مکان خریدا
اُس مکان کا جو صدر دروازہ تھا اُس کی بابت لوگوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا
کہ یہ دروازہ دوسرے کی زمین میں بنا ہوا ہے۔ گو صدر دروازہ کے لائق وہی
جگہ تھی مگر میں نے اُسے بند کر دیا اور بند بھی اس طرح کرایا کہ اینٹ نکلا

کہ بطور اتصال تریع کے ردہ سے ردہ ملوادیا تا کہ کبھی ملک کا شہہ تک نہ رہے۔ اگر کوئی زمیندار اس مکان کو خریدتا تو ایسے موقع کو غنیمت خیال کرتا مہتمم تعمیر نے اس سمت میں باجارت مالکان زمین موریاں رکھ دی تھیں۔ میں نے ان کو بھی بند کرا دیا کیونکہ اب تو یہ تبرع ہے۔ پھر یہی حق سمجھا جانے لگے گا۔ تو مکان میں ان امور کا لحاظ رکھا جاوے۔

تیسری چیز اس فہرست کی یہ ہے کہ تعمیر میں حرام مال نہ لگایا جاوے ورنہ بروئے حدیث ویرانی کی جڑ پٹی ہے۔ ٹھکانہ بھون میں پیر محمد صاحب کی مسجد عالمگیر کے وقت کی ہے جس کی دیواریں اور گنبد گارے سے کسے ہیں۔ مگر پائیداری کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ مال حلال ٹھا اور نیرت میں خلوص تھا۔ اور جو شخص تعمیر میں ان امور کی رعایت نہ کر سکے تو مثل مشہور شعر گفتن پر ضرور، وہ تعمیر ہی نہ کرے۔ اور ان امور کی رعایت تو قدر ضرورت کی تعمیر میں ہے۔ باقی ضرورت سے زیادہ تعمیر تو اصل ہی سے ناپسند ہے اس کی نسبت ختم آیت پر فرماتے ہیں۔

واللہ لا یهدی الظالمین

کہ حق تعالیٰ حد سے بڑھنے

والوں کو ہدایت نہیں کرتے۔

یہ اپنے عموم سے اس کو بھی شامل ہے۔ اگے ان منافقوں کی عمارت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ اس کے گرنے کے بعد ان کے قلب کی کیا حالت ہونے والی ہے۔ فرماتے ہیں۔

لا یزال بنیانہم الذی بنواریبۃ فی قلوبہم الا ان یقطع

قلوبہم والیہ حلیم حکیم۔

ان کی یہ عمارت یعنی وہ مسجد جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان
 دلوں میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہے گی۔ کیونکہ جس عزم سے بنائی تھی وہ
 نہ ہوئی اور نیت کی قلبی کھل گئی وہ انگ۔ اور پھر اوپر سے منہدم کر دی
 عزم کوئی ارمان نہ نکلا۔ اس لئے ساری عمر اس کا افسوس اور ارمان
 ہاں ان کے وہ دل جن میں یہ ارمان ہے اگر وہی فنا ہو جاویں تو وہ اور
 اس وقت ختم ہو جاوے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں۔ ان
 شرارتوں کو جانتے ہیں۔ حکمت والے ہیں۔ مناسب سزا دیں گے۔
 جس چیز کو مقصود سمجھتا ہے اس کے عدم حصول سے جو حالت ہوتی
 حالت ان کی تھی جنہوں نے یہ انجمن تخریب اسلام کے لئے بنائی تھی
 عدت بھی مشترک ہے تمام عمارت میں کہ جن لوگوں نے اپنی عمارت
 ناپاک اغراض کے لئے ایسے مواقع پر بنائی ہیں وہ سب برباد بھی ہوں
 ان لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ بے چینی ان کے لازم حال ہو گئی۔ چنانچہ
 اور مشاہدہ ہے کہ بڑی نیت سے جو عمارت بنائی گئی ہے اس کو قیام میں
 اب میں ان قطع قلوبہم کے متعلق ایک نکتہ بیان کرتا ہوں۔

ختم کرتا ہوں۔

قلب اور موت

اس کا ایک مطلب تو ظاہر ہی ہے کہ یہ ارمان ان
 لوگوں کے دل سے کبھی نہ نکلے گا۔ بجز اس کے کہ ان
 کے دل ہی قطع ہو جاویں اور یہ مر جاویں۔ تب تو یہ حسرت نکل سکتی ہے۔

جب دل ہی نہ رہے گا جو محل ہے حسرت کا تو پھر ارمان اور حسرت کس طور سے باقی رہے گا۔ پس ایک تو یہ تو جیہ ہے الا ان تقطع قلوبہم کی کہ بعد فنا و موت کے اس خاص حسرت سے راحت ہو جاوے گی۔

ایک تو جیہ یہ بھی ہو سکتی ہے اور یہ نہایت لطیف ہے کہ الا ان تقطع قلوبہم تاکید ہے وہ ام حسرت اور ارمان کی کہ ان کو حسرت اور ارمان ہمیشہ رہے گا اور یہ کھٹک ہمیشہ رہے گی۔ موت سے بھی یہ کھٹک تو نہ ہو گی کیونکہ قلب کو موت نہیں آسکتی۔ اس لئے کہ قلب کی دو قسمیں ہیں ایک تو قلب جو مصنفہ صنوبری ہے۔

دوسرا قلب حقیقی جو محل ادراکات ہے۔ عقائد و غیرہ کا حصول بھی یہی قلب سے ہوتا ہے۔

یہ قلب جس چیز کو ادراک کرتا ہے اس کی بقا ضروری ہے اس وجہ سے کہ یہ قلب ہمیشہ باقی رہتا ہے اس لئے کہ کئی بھی باقی رہتا ہے۔ اشفاق ہونا پاک ہیں وہ بھی ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ عشق کا ذب بھی باقی رہتا ہے۔ اگر کسی پر عاشق ہو جاوے تو یہ عشق مرنے سے چھوڑتا نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اس مصیبت میں گرفتار رہتا ہے۔ بعض عشاق مرنے کے بعد اس دم سے رشتہ نگار ہو جانے کا دعوے کرتے پھرتے ہیں، بالکل غلط ہے اس سے واقع میں جدائی مشکل ہے کیونکہ قلب حقیقی پر موت نہیں آتی اور نہ ان کی کیفیات زائل ہوتی ہیں۔ عرض کہ اگر قلب کی تفسیر قلب حقیقی کی جاوے کیونکہ قلب حقیقی کو موت نہیں۔ اس لئے اس کے ارمان اور حسرت کو

بھی دوام رہے گا۔ اس تقدیر پر الا ان تقطع قلوبہم میں اشتنا
جیسا کہ اس شعر میں ہے۔

ولا عیب فیہم غیر ان سیوفہم
بھن فلول من قراع الکثائب

ای ان کان فیہم فہو ذاک

ولہذا لیس لعیب فلا عیب فیہم اصلاً

اسی طرح یہاں پر مطلب ہے کہ ان کے ارمان جب نکلیں
قلب ہلاک ہو جاوے اور عدم ہلاک قلب ثابت ہے لہذا دوام حس
وارمان بھی دوام ثابت ہے۔

حاصل یہ ہے کہ یہ نتیجہ ہے ان کی عمارت کے غیر تقویٰ و رضوان

لئے ہونے کا۔ تو جو عمارت غیر تقویٰ و رضوان حق پر مبنی ہوں گی ان کے

کے لئے بے چینی لازم حال رہے گی۔ مگر تقویٰ اور رضوان اور حسن عمل

کی بنا تقویٰ اور رضوان پر ہو وہ البتہ خیر ہی خیر بہتر ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں کہ کس شخص کی کیا نیت ہے اور وہ

ہیں کہ قوانین حکمت سے مقرر کرتے ہیں اور عامل و تارک کو مناسب

سزا دیتے ہیں۔

الحمد للہ! بیان ختم ہو گیا۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے

آمین! والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ

اجمعین۔

مواہی انسان کو سپرد یا

- اگر ہم اپنے حالات کا جائزہ لیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں :-
- ① ہم اللہ جل شانہ کا دبا ہوا رزق کھاتے ہیں لیکن اس کی اطاعت نہیں کرتے۔
 - ② ہم اس کے ملک میں رہتے ہیں لیکن اس کے قانون کا احترام نہیں کرتے۔
 - ③ ہم دوستوں کے وعدوں پر یقین رکھتے ہیں لیکن اس کے وعدوں پر اعتبار نہیں کرتے۔
 - ④ ہم اس کے رسول مقبول کو برحق سمجھتے ہیں لیکن ان کے اسوۂ حسنہ کا اتباع نہیں کرتے۔
 - ⑤ ہم اس کے قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں لیکن اس کے مطابق عمل نہیں کرتے۔
 - ⑥ ہم موت کو یقینی سمجھتے ہیں لیکن دوسروں کو دفن ہوتے دیکھ کر عبرت حاصل نہیں کرتے۔

- ⑦ ہم حساب روز محشر کا عقیدہ رکھتے ہیں لیکن دوسروں کی حق تلفی سے دریغ نہیں کرتے۔
- ⑧ ہم جنت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اس کے حصول کی قطعاً فکر نہیں کرتے۔
- ⑨ ہم دوزخ کا یقین رکھتے ہیں لیکن اس کی آگ سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔
- ⑩ ہم شیطان اور نفس کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں لیکن ان کی خواہش پر چلنا ترک نہیں کرتے۔
- ⑪ ہم دوسروں سے خدمت خلیق چاہتے ہیں لیکن خود کسی کی خدمت نہیں کرتے۔
- ⑫ ہم دوسروں سے ہمدردی چاہتے ہیں لیکن خود رشوت، سفارش یا واقفیت کے بغیر کسی کا کام نہیں کرتے۔

ہم برائے نام مسلمان ہیں اور ایک جھوٹی اور مناقضہ زندگی بسر کر رہے ہیں ایسی

لئے قرآن نے کہا ہے:-

لَا تُؤْمِنُوا بِالْكِتَابِ قَوْلًا أَسْلَمْنَا وَلَا مَائِدُجِينَ الْإِيمَانِ فِي قُلُوبِكُمْ وَالْحَقُّ

”تم یوں نہ کہو کہ ہم ایمان لائے بلکہ کہو کہ اسلام لائے اس لئے کہ ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔“

وہ تمہارا عمل کتاب و سنت کے مطابق ہوتا۔ یہیں حکم دیا گیا تھا کہ:-

أَوْعِظَ عَلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ! لَوْ كُنَّا كُوفِرًا كُفِرْنَا كَمَا كُفِرْنَا بِكُمْ

اور اس طرح اس دین حق کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچاؤ:-

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَ عَلَىٰ الدِّينِ كُلِّهِ ۚ وَالصَّحَّاحُ

وہی ہے جس نے اپنا رسول بھیجا ہدایت اور سچے دین کے ساتھ تاکہ اُسے غالب کرے ہر دین پر۔

دوسروں کو دین کی طرف بلا تا جبائے خود رہا ہم خود ہی دین حق پر مستقیم نہیں رہے

اور جنہیں ہم کافر کہتے ہیں وہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں اپنے اپنے دین، مذہب اور عقیدہ

کو پھیلا سنے میں اجتماعی طور پر شرب روز مضر و فہم کیونست دنیا کے گوشہ گوشہ میں

ہر ممکن ذریعہ سے لاندہ ہیبت پھیلا رہے ہیں ہندوستان میں پورے جبر و تشدد کے

ساتھ مسلمانوں کو ہندو بنا یا جا رہا ہے۔ مرزائی بڑی جدوجہد کے ساتھ یورپ، امریکہ

اور افریقہ میں اپنے مراکز قائم کر کے اپنا دین پھیلا رہے ہیں۔ قرآن کریم کے مختلف نبالوں

نظام چھاپ رہے ہیں اور عیسائی یورپ کنیڈا اور امریکہ ایسے دور دراز ممالک سے
نیا نیا ممالک میں خدمت نخلق اور تبلیغ دین مسیح کا فریضہ ادا کر رہے ہیں مگر ایک ہم ہیں کہ
فریضہ تبلیغ کو بھلائے ہوئے ہیں اور عاقبت کی نیند سو رہے ہیں۔

اس لئے موجودہ دینی بے حس اور بے رغبتی کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے
م خود دین کا ضروری علم حاصل کریں اور اپنی اولاد کو دینی تعلیم دلائیں اور اپنے قرب و
دین میں تبلیغی مہم پہلائیں اور اس غرض کے لئے ان بزرگان دین کی کتابوں سے مدد لیں۔
لی ساری عمر وعظ و تبلیغ میں گزار گئی اور جن کی خدمت دین حق تعالیٰ کو اتنی پسند آتی
ہوں نے ان کے تمام سرمایہ شد و ہدایت کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ
نے کے اسباب پیدا کر دیئے۔ جس کی بدولت آج ہمارے پاس بیش بہا علمی، دینی
رفانی ذخیرہ موجود ہے۔

ان علماء میں سرفہرست حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا نام نامی ہے
کے مواعظ و خطبات کا ایک ایک لفظ خود ان کا نظر ثانی کردہ محفوظ ہے ان میں تمام
ی، اجتماعی، قومی اور روحانی بیماریوں کا بے خطا علاج موجود ہے۔ ان میں آج بھی وہی
رنگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے جو وعظ و ارشاد کے وقت تھی۔ یہ ایک ایسا مواظظی
یکلو پیڈیا ہے جس سے دین کے متعلق پوری پوری واقفیت و بصیرت حاصل
نی ہے اور طبیعت خود بخود مائل بہ اصلاح ہوسنے لگتی ہے۔

ہم نے ان مواعظ اشرفیہ کو آٹھ سو صفحات کی ۳ جلدوں میں شائع کرنے
م کیا ہے۔ ہر جلد بذات خود اپنے موضوع پر ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتی
ن وقت بفضلہ تعالیٰ مندرجہ ذیل جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ دنیا و آخرت ۲۔ علم و عمل ۳۔ دین و دنیا ۴۔ میلاد النبی ۵۔ حقوق و فرائض ۶۔

نظام شریعت۔ ان میں سے جلد ۲-۳ اس وقت تالیف ہے۔ اس سال ۱۹۴۲ء میں ہم مندرجہ ذیل جلدیں شائع کر رہے ہیں۔ ۷۔ حقیقت عبادت ۸۔ حقیقت مال و سبھاہ ۹۔ فضائل صبر و شکر ۱۰۔ فضائل صوم و صلوٰۃ۔ ہم اس سیرٹ کے مستقل خریداروں کو موجودہ قیمتوں میں بھی ایک تہائی رعایت دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو یہ دینی لٹریچر قریباً اصل لاگت پر مل جاتا ہے۔ اس طرح ہماری نشر و اشاعت کا نفع براہ راست خریدار کو پہنچتا ہے اور بصورت ثواب ان حضرات کو پہنچتا ہے جو اس تبلیغی سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے مالی امداد دیتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں آپ سے یہ اعانت چاہتے ہیں:-

- ۱۔ آپ اس سلسلہ کے مستقل خریدار بن کر اس سے دینی اور دنیوی فائدہ اٹھائیں۔
- ۲۔ اگر ممکن ہو تو ایک کی بجائے دو جلدیں خریدیں۔ ایک اپنی ذات اور گھر والوں کے مطالعہ کے لئے رکھیں اور دوسری اپنے دوستوں، ہمسایوں وغیرہ کو بڑھائیں۔
- ۳۔ اگر کچھ وقت نکال سکیں تو کسی مناسب جگہ پر اپنے قریب و چواریہ کے لوگوں کو جمع کر کے روزانہ یا ہفتہ وار اس کے کچھ صفحات پڑھ کر منانے کا اہتمام کریں۔
- ۴۔ اپنے عزیزوں بزرگوں کے ایصالِ ثواب کیلئے زیادہ مقدار میں خرید کر عوام میں تقسیم فرمائیں۔
- ۵۔ اپنی زکوٰۃ یا مالی امداد سے اس تبلیغی منصوبہ کو جو ایک صدقہ جاریہ کی حیثیت رکھتا ہے مستحکم بنائیں اور اس طرح مگر بیٹھے بٹھائے تبلیغی فریضہ ادا فرمائیں۔

ہر جلد کا حجم قریباً ۸۰۰ صفحات۔ سیاہ پارچہ کی سنہری ڈائیر مضبوط جلد۔ قیمت ۱۹۴ روپے
 حصولِ ڈاک فی جلد ۸۸ پیسے۔
 آپ کا خادم:- منشی عبدالرحمن خاں
 ناظم مکتبہ اشرف المعارف۔ چہلیک۔ ملتان شہر۔

سلسلہ مواعظِ اشرفیہ نمبر ۸

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

حقیقت مال و حیاہ

از افاضات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

ترتیب
عشقِ عبسِ الرحمن خاں

تالیف کردہ

مکتبہ اشرف المعارف، حیدرآباد

ملتان شہر ————— قون نمبر ۲۶۷